حکیم الامتؒ

"نقوش و تاثرات"

حکیم الامت علامہ اشرف علیؒ تھانوی کے آخری ۱۵ سالہ زندگی

کا ایک نرالا مرقع، فقہ تفسیر حدیث، سلوک کلام، ادب و حکمت کے صدہا مضامین

بعد نظر ثانی ترمیم و اضافہ

عبدالماجد دریابادی

ایم۔ شمس الدین تاجران کتب ۰ مسلم مسجد لاہور

حکیم الامّت

نقوش و تاثرات

حکیم الامّت، امام وقت، علّامہ اشرف علی تھانوی کے آخری ۱۵ سالہ حصۂ زندگی کا ایک نرالا مرقع

فقہ، تفسیر، حدیث و سُنّت، سلوک و کلام، ادب، حکمت، صحافت و سیاست کے صدہا مضامین کا گُلدستہ

بعد نظرِ ثانی و ترمیم و اضافہ

عبدالماجد دریابادی

مصنّف تفسیر القرآن (انگریزی، اُردو) محمد علی کی ذاتی ڈائری وغیرہ

(ایڈیٹر "صدق" لکھنؤ)

سول ایجنٹ:-

ایم شمس الدین تاجران کتب نادرہ، مسلم مسجد، لاہور

فہرست

حکیم الامّت

نقوش و تاثرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

حکیم الامت امام اشرف علی تھانویؒ بزرگ کس مرتبہ اور ولی اللہ کس پایہ کے تھے، اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے، جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو۔ اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے اگر کسی صاحب نے کتاب کو اس شوق میں کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبۂ معرفت و ولایت کی تفصیل درج ہوگی، یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدارج رُوحانی کا بیان ہوگا، تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں ——— حضرت کے مُریدین و مسترشدین میں بڑے بڑے پایہ کے لوگ گذر چکے ہیں، اور ماشاء اللہ اب بھی سلامت باکرامت ہیں۔ بعض اُن میں سے حضرت کی سوانح نگاری کا حق ادا کر چکے ہیں، اور بعض حضرت کی تعلیمات کی بہترین شرح و ترجمانی حالاً و عملاً کر رہے ہیں۔

یہ مجموعۂ اوراق نہ کتاب المناقب ہے، نہ ملفوظاتِ مُرشد، اور نہ سیرۃ الشیخ۔ اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں، سب سے پست بھی ہے۔

"حضرت شیخ" کے کمالات و فضائل اپنی جگہ پر، بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان بھی تو اسی صدی میں ہوئے ہیں۔ اُن کی عُمر کے آخری ۱۶،۱۵ سال کے زمانے میں اس نامہ سیاہ کو اُن سے نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا۔ اور اُس نے اپنے لئے تجربے اور سابقے میں

اُنھیں ایک بہترین انسان پایا۔ بس اُن کی اسی انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس اِن "نقوش و تاثرات" کے اندر بند کر دینے کی کوشش اُلٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی۔ اور چونکہ اُن کی انسانیت اُن کے مفسّر، فقیہ و درویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جا سکتی، اس لئے ضمناً ذکر اُن کے علم و فضل، تفقہ و سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا۔ ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ورنہ حقیقت مصوّری صرف اُن کی انسانیت کی کرنی تھی، وہ بھی اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے حدود کے اندر۔

اِن گزارشوں کے بعد بھی اگر کوئی خوش عقیدہ بزرگ مطالعۂ کتاب پر اصرار ہی جاری رکھیں، اور آگے چل کر کہیں اپنے جذباتِ عقیدت کو مجروح ہوتا ہوا پائیں، یا لاابالی مصنّف کے طرزِ بیان میں انھیں کہیں سوءِ ادب کی جھلک نظر آئے۔ تو اس کی ذمّہ داری خود ان ہی بزرگوار پر رہے گی۔

اِن اوراق کی ترتیب و تسوید سے فراغت، حضرت کی وفات کے دو سال بعد ۱۹۴۵ء میں ہو گئی تھی۔ مدّتیں مسودہ کی صفائی میں گزر گئیں۔ اب وسط ۵۰ء میں نوبت نظرِ ثانی کے بعد اِس دیباچہ نگاری کی آ رہی ہے۔ طبع و اشاعت کی منزلیں اب بھی بہت دور رہیں۔ والامر بید اللہ

عبد الماجد

دریاباد۔ بارہ بنکی

مئی ۱۹۵۰ء (رجب ۱۳۶۹ھ)

دیباچہ طبع دوم

حکیم الامت اوّل بار پریس سے ۱۹۵۲ء میں نکلی۔ اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ وہ ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اور مانگ پاکستان و ہندوستان دونوں میں ہر طرف سے جاری تھی۔ اصل سوال کسی اچھے ناشر کا تھا۔ کئی ہزار کا سرمایہ لگا کر خود چھاپنے کی ہمت نہ تھی۔

آخر، جون ۱۹۶۷ء میں یہ مشکل مخلص عزیز مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی خیرآبادی ثم لاہوری کی پیش کش نے حل کر دی۔ جلدی جلدی نظر ثانی کر کے مسودہ اُن کی خدمت میں جا رہا ہے۔ مستقبل خدائے عالم الغیب کے ہاتھ میں ہے۔

پہلے ایڈیشن پر جو خطوط کثرت سے داد و تحسین کے آئے اُن میں خصوصیت کے ساتھ ہمت افزائی علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم اور مولوی عبدالباری ندوی کے مکتوبات نے کی۔ اور سب سے زیادہ کام کا خط حضرتؒ کے عزیز قریب مولانا ظفر احمد عثمانی کا نکلا۔ اُس کی روشنی میں دو تین مقامات پر تصحیح و اضافہ عمل میں آیا ـــــ نظر ثانی مضمون و عبارت دونوں کے اعتبار سے کتاب اوّل سے آخر تک لفظ بہ لفظ پڑھ کر کی گئی ہے۔ اور کوشش اپنی والی یہی رہی ہے کہ اب خامیاں اور کوتاہیاں کم سے کم رہ جائیں۔ ۱۹۳۱ء کے خطوط میں دو کا اضافہ اِس ایڈیشن میں ہوا ہے۔ طبع اوّل میں محض اتفاق سے چھوٹ گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا مکتوب ۱۹۲۵ء کا بھی اب کی بہ طور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب میں مکتوبات و ملفوظات کے علاوہ حضرتؒ کے چند مستقل رسالے بھی شامل ہیں۔ مثلاً "الاعتدال فی متابعۃ الرجال"، "کلمۃ الحق فی حکمۃ العلوم"، "الماقیہ من لعق الجامیۃ" وغیرہ اور مستقل عنوانات کے بغیر ہی بہت سی تحقیقات عالیہ، تفسیر، فقہ، سلوک، و کلام سے متعلق شامل ہیں ——— حضرت کو جو شفقت خصوصی اس بدحال پر تھی، کتاب اس کا پورا مرقع ہے۔

ناظرین سے التماس دعائے خیر کا ہے۔

عبدالماجد

دریاباد (بارہ بنکی) ہند

جون ۱۹۶۲ء مطابق صفر ۱۳۸۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۹۲۷ء — ۱۹۲۸ء

(۱)

مہینہ یہی جولائی کا تھا[۱] ——— ہائے یہی مہینہ، جس نے پندرہ سال بعد، دل و جگر خون کر ڈالا! ——— اور شروع، بالکل شروع کی کوئی تاریخ، عجب نہیں کہ ۳ر جون ہی کی شب ہو، سہارنپور، شاہدرہ لائن کے قدیم اسٹیشن تھانہ بھون پر[۲] تین مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ سہارنپور کی طرف سے کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا، سالارِ قافلہ، دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب، اور باقی دو میں سے ایک مولانا عبدالباری ندوی (استاد جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن) اور دوسرا یہ نامہ سیاہ، سچ[۳] کا ایڈیٹر، ہمدرد (دہلی) کا ڈاکٹر[۴] اور صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کا صدر ——— داستانِ سفر کی طویل اور پیچ در پیچ منزلیں طے کرنے سے قبل بہتر یہ ہوگا کہ ایک نظر سفر کے پس منظر پر بھی ڈالتے چلے، اور نازل ہونے والے قافلے کی شانِ نزول، ذہن و حافظہ، دونوں کی گرفت میں لے آئی جائے، وقت اس میں لگے گا، لیکن یہ وقت ضائع انشاء اللہ نہ ہوگا۔

نام، مولانا اشرف علی تھانوی کا، اجنبی و نامانوس زندگی کے کسی بھی دور میں یاد نہیں پڑتا،

---

۱ حضرت کا وصال جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوا ۲ تھانہ بھون ٹاؤن کے نام سے جدید اور چھوٹا اسٹیشن، اس کے بعد بنا ہے، اس وقت قدیم اسٹیشن صرف تھانہ بھون کے نام کا تھا ۳ صدق کا نقشِ اول ۴ مولانا محمد علی ۱۹۲۶ء میں جب یورپ علاج کے لئے روانہ ہوئے، تو اپنا مشہور روزنامہ ہمدرد [illegible] سپرد کر گئے تھے

چرچے اور شہرے بچپن ہی سے سُننے میں آرہے تھے، لیکن ذکر ہمیشہ ذکرِ خیر ہی کا مرادف نہیں ہوتا، کبھی اگر یہ سُننے میں آیا کہ بڑے پایہ کے مولوی ہیں، کانپور میں درس دیتے ہیں، اور فتوے لکھتے ہیں، تو دوسری طرف بریلی کی سمت سے یہ آواز بھی کان میں پڑ گئی کہ بڑے بدعقیدہ ہیں، پکے وہابی ہیں، "بہشتی زیور" کے کُل حصّے اسی زمانہ میں دیکھے، بلکہ بعض حصّوں کے سبق بھی بن میں ایک بہت بڑی عزیزہ کو پڑھائے، فقہ کی کتاب سمجھ کر نہیں، محض اُردو زبان کی ایک کتاب کی حیثیت سے شکل کلید مثنوی کی بھی اسی سن میں دیکھنے میں آئی تھی، بہرحال دل میں یہ جم گئی کہ یہ کوئی کٹر قسم کے مولوی ہیں، تشدّد میں بسے ہوئے اور تقشّف میں رچے ہوئے، بات بات پر گھُڑکی، قدم قدم پر جھڑکی، فلاں عمل حرام، فلاں عمل بدعت، یہ چیز ناجائز، وہ چیز معصیت!

روایتیں، مخالفوں اور دشمنوں ہی کی پہنچائی ہوئی دتھیں، بڑے بڑے مخلص وجان نثار، اسی پلیٹ میں تھے، دوست مگر نادان، معتقد مگر نافہم، مخلص مگر کج رائے، گویا نعتِ مسیح نصرانیوں کی زبان سے مناقب اہلبیت، مرثیہ خوانی کے منبر سے! ہائے، ہائے اے

مردم اندر حسرت فہم درست!

یہ تو سب تھا ہی کہ اُدھر ہوا یہ اُڑ گئی کہ مولانا نے ترکِ موالات و تحریکِ خلافت کی مخالفت کر دی، مخالفت تحریک خلافت کی! وہ تحریک، جو وقت کے ہر غیرت مند مُسلمان کے لئے، عین دین و ایمان تھی، دیوبند اس میں پیش پیش، شیخ الہند اس کے مقدمۃ الجیش، جمعیۃ العلماء اس کی علمبردار، بڑے چھوٹے سارے متدین و معتبر علماء اس کے ساتھ، مخالف تنہا ایک خانقاہ تھانہ بھون!

خلقے بہ منت یک طرف آں شیخ تنہا یک طرف!

اس کا کیا اثر پڑا ہوگا، اُس انگریزی خواں ۳۰-۳۵ کے سن والے خادم خلافت پر، جس کے پاس فخر کا سب سے بڑا سرمایہ، محمد علیؒ کی رفاقت و پیروی تھی؟ اس کی تلاش، یہاں لفظ و عبارت میں نہ کی جائے، بس اپنے دل کو ٹٹول کر، وہیں محسوس کر لی جائے، ۱۹۲۰ء میں "سچ" کی شہرت کا شباب تھا، ایک نوٹ گرما گرم، کچھ اسی بحث پر نکلا، ایک فقرہ آج تک دماغ میں گونج رہا ہے:-

"جب "بہشتی زیور" کے لکھنے کا نہیں، پہننے کا وقت آئے گا، تو اُس وقت معلوم ہوگا" الخ
نوٹ کے الفاظ بحمد اللہ! اُس وقت بھی مہذب رہے، اور پیرایۂ بیان، کچھ زیادہ غیر مہذب نہ
ہونے پایا۔ پھر بھی تنقید، تنقید ہی تھی، اور اعتراض، بہرحال اعتراض۔
مُرشد کی تلاش ایک عرصہ سے جاری تھی، تصوّف اور سلوک کا ذخیرہ، جتنا کچھ بھی فارسی اور
اُردو اور ایک حد تک عربی میں ہاتھ لگ سکا تھا، پڑھ لیا گیا تھا، اِتنی کتابیں پڑھ ڈالنے اور
اِتنے ملفوظات چاٹ جانے کے بعد، اب آرزو اگر تھی، تو ایک زندہ بزرگ کی، حیدرآباد اور
دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہر، اور اجمیر اور کلیر، دیوہ اور بانسہ، ردولی اور صفی پور چھوٹے بڑے
"آستانے" خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے، اور سُن گُن جہاں کہیں کسی بزرگ کی بھی پائی، حاضری میں
دیر نہ لگائی، حال والے بھی دیکھنے میں آگئے اور قال والے بھی، اچھے اچھے عابد، زاہد، مرتاض بھی
اور بعض نرے دُکاندار قسم کے گیسو دراز بھی، آخر میں فیصلہ یہ کیا کہ حق حلقہ دیوبند میں محصور ہے
اِنتخاب کے دائرہ کو محدود کرکے، اب تفصیلی جائزہ اِسی حلقے کا لیجئے، اور جس نے بہترین متن
سلوک (مثنوی معنوی) کی بہترین شرح لکھ ڈالی، اور اپنے چھوٹے چھوٹے سہل فقروں میں
حقائق و معارف کی رُوح بھر دی ہے، دامن اسی کے کسی تربیت یافتہ کا تھامیے،[1]
۱۹۲۳ء کا ستمبر یا اکتوبر تھا، اُس بیچ والے نوٹ کی سیاہی کو خشک ہوئے ابھی دن ہی
کتے ہوئے تھے، کہ اِسی تلاش مُرشد کے سلسلہ میں ایک سفر صفی پور ضلع اناؤ کا ہُوا، رفیق سفر
اب کی وصل بلگرامی مرحوم تھے، واپسی میں بولے کہ "بہت دَوڑ دھوپ آپ کر چکے، ذرا
ہمارے مولانا کا بھی تجربہ کیجئے، سب کو بھول جائیے گا، تھانہ بھون اگر دُور ہے تو قصد السبیل،
تربیت السالک، وغیرہ تو میرے پاس ہی ہیں، انھیں تو دیکھ ڈالئے۔"
—— اچھا! تو ان خشک مولوی صاحب نے تصوّف پر بھی کچھ لکھا لکھایا ہے، خیر، دیکھ ڈالنے میں

[1] اشارہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مشہور شارح مثنوی کی جانب ہے، جو بزرگان دیوبند
و تھانہ بھون کے شیخ یا شیخ الشیوخ تھے۔

کیا مضائقہ ہے، بشرطیکہ کہیں مل گئیں،

"کہیں مل گئیں" اس کی سند، وصل صاحب کے ہاں نہ تھی، دوسری ہی صبح، کتابوں کا ایک پورا پلندا لئے ہوئے، وصل صاحب میرے ہاں لکھنؤ میں موجود! ہائے کیا خوب شخص تھا یہ وصل مرحوم بھی، عجب ہر جہتی ہستی تھی، ہر صحبت میں، ہر مذاق کی مجلس میں موجود، موجود ہی نہیں، گھُلے ملے ہوئے، میں تو خیر اُن کی گودوں کا کھلایا ہُوا تھا، بیگانوں، راہ چلتوں کا کام ہر طرح کا نکالنے کو پیش پیش، دوست دشمن سب کے حق میں "مُشکل کُشا"

کتابیں پڑھ کر جب بند کیں، تو عالم ہی دُوسرا تھا، ع

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں!

اپنا جہل اپنے سامنے آئینہ! معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ اس سلسلہ میں پڑھا تھا، سُنا تھا، جانا تھا، وہ بس جھک ماری تھی، تصوّف کی حقیقت، طریق کی تعریف، آج پہلی بار دل و دماغ کے سامنے آئی۔ قصد السبیل پڑھتا جاتا تھا، اور سطر سطر پر، پردے نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ رہ رہ کر طبیعت اپنے ہی اُوپر جھنجھلاتی تھی کہ اب تک کیوں نہ پڑھا تھا۔ ۱۶۔ برس کی مدّت کوئی تھوڑی ہوتی ہے، آج تک اپنے اس جہل کے انکشاف کی یاد تازہ ہے ——— خوش قسمتی کہ عین اُسی زمانہ میں مولانا کے ایک خلیفۂ خاص، اور عاشق باختصاص لکھنؤ میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز تھے، خواجہ عزیز الحسن غوری نام، علیگڈھ کے بی اے تخلص کے اعتبار سے مجذوب، اور سیرت و مزاج کے لحاظ سے نیم مجذوب، لیکن مُرشد کی نظر فیض اثر سے سالک بنے ہوئے تھے، ایک روز اپنے ایک رفیق قدیم کو ساتھ لے اُن کے ہاں جا پہنچا، اور کچھ دیر میں اُنھیں بھی پڑھ لیا، نقش یونہی ہلکا نہ تھا، اب اور گہرا ہو گیا، یہ ٹھہری کہ خط مولانا کی خدمت میں لکھیئے، اور کچّا چٹھا کہہ سُنایئے، اپنی کہانی، اپنی ہی زبانی، عقیدت گہری ہوئی، مگر اندھی نہیں، نظر اپنی خطا داریوں پر بھی رہی، اور مکتوب الیہ کی بشریت پر بھی، سیاسی اختلافات، خصوصاً تحریکِ خلافت سے مخالفت کا کانٹا دل میں کھٹکے گیا، عقل نے سُجھایا کہ معالج کا انتخاب ان ہی سے کرایئے، مُبصّر ان سے زیادہ گہرا اور کون ملے گا۔

لیکن یہ نہ کہا کہ رہا تھا اُن ہی کے ہاتھ میں آنکھ بند کرکے دے دیجئے، نظر کے سامنے مولانا حسین احمد صاحب تھے، اُن کا سیاسی مسلک خوب جانا ہوا، پہچانا ہُوا تھا، شخصی نیاز بھی اُن سے ایک عرصہ سے حاصل، خلافت کمیٹی کے جلسوں اور سفر وغیرہ میں اُن کے ساتھ کا تجربہ ایک بار کا نہیں بار ہا کا، تواضع انکسار، خدمتِ خلق میں اپنے نظیر آپ۔ پھر مُلک کے نامور فاضل و محدّث مولانا انور شاہ کاشمیری تھے، تبحّرِ علمی میں لاجواب، دیوبند ہی کے حلقہ کے ایک آدھ بزرگ اور بھی ـــــ خط لکھنے بیٹھا تو رُک رُک کر، ڈر ڈر کر، لیکن ساتھ ہی خوب کھُل کر بھی !

(۲)

خط پُورے دو صفحہ کا تھا، وہ بھی باریک انگریزی قلم سے، صرف خلاصہ سُن لیجئے :۔

"ایک انگریزی خواں ہوں، مدّتوں مغربی فلسفہ کے اثر ضلالت بلکہ الحاد کی وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا، خُدا اور رسُول کی شان میں گستاخیاں کرتا رہا، برسوں کے بعد اسلام و ایمان کی طرف مُراجعت نصیب ہوئی، زیادہ تر مثنوی کی برکت سے، گو اسے بھی بے سمجھے ہی پڑھا، اکبر الہ آبادی[۱] کی صحبتیں بھی اصلاحی اثر ڈالتی رہیں، اب سچ ہفتہ وار کے ذریعہ سے، اپنی بساط کے لائق، دین کی خدمت میں لگا لپٹا ہوا ہوں، اور اپنے لکھے ہوئے کو آپ ہی مٹاتا رہتا ہوں۔

ماضی کی بیہودگیوں کا تو ذکر و حساب ہی نہیں، بڑی فکر حال کی ہے، خُدا معلوم اب بھی صراطِ مُستقیم سے کتنی دُور ہوں، اب تک کسی بزرگ سے نہ بیعت نصیب ہوئی نہ طویل صحبت، دل کی کشش صاحب مثنوی کے بعد، شارح مثنوی، حاجی صاحب مہاجر مکّی[۲] کی جانب رہی، زندہ ہستیوں میں نظر بار بار مولانا حسین احمد صاحب کی جانب اُٹھتی ہے، بعض احباب کا مشورہ مولانا انور شاہ صاحب سے متعلق ہے، مبشر و مبصّر آپ سے بڑھ کر اور کون مل سکتا ہے، جناب کی تصانیف سلوک حال میں دیکھیں اور دل بھڑک گیا، اب تک آپ کو صرف مولوی کی حیثیت سے جانتا تھا، عارفانہ کمال کا

---

[۱] یہ مولانا کے بڑے معتقد و مدّاح تھے، اور مولانا بھی اُن کے بڑے معترف۔

[۲] حضرت شاہ امداد اللہ مہاجر مکّی، مولانا کے پیر و مُرشد۔

حال تو اب کھلا، گو گستاخی معاف، جناب کی سیاسی رائیں، اب بھی میرے لئے ایک معمّا ہیں۔

بہرحال اب درخواست امور ذیل میں رہنمائی کی ہے:۔

(۱) موجودہ بزرگوں میں سے کس کا انتخاب بیعت یا صحبت کے لئے کروں؟

(۲) اپنی اصلاحِ قلب کے لئے خود جناب والا سے بھی مراسلت اور تھانہ بھون میں حاضری کی اجازت چاہتا ہوں،

یہ خلاصہ حافظہ کے بھروسہ پر نہیں، اصل خط کو دیکھ کر درج ہوا ہے، مولانا کے ہاں کا ایک دستور یہ تھا کہ خط جب جاتا تو لفافہ کے اندر ایک جوابی لفافہ بھی پتہ لکھا ہُوا ملفوف کرنا ہوتا، اُسی لفافہ میں جواب کے ساتھ اصل خط بھی واپس آجاتا، بلکہ عموماً جواب تحریر ہی اُسی خط پر ہوتا، تجربہ سے معلوم ہُوا کہ حکیم الامت کے دستور العمل کے اکثر جزئیات کی طرح، یہ قاعدہ بھی بڑے کام کا ہے،

خط پر میں نے صرف سنہ ہجری تحریر کیا تھا، تاریخ ۲۳ر جمادی الاوّل ۱۳۴۶ھ کی پڑی ہوئی ہے، ابھی جنتری سے ملایا تو ۱۸ر نومبر ۱۹۲۷ء نکلی، خط ڈاک میں پڑا، اور جواب کا انتظار شروع ہوگیا، مولانا کا دستور یہ تھا کہ خط کا جواب عموماً فوراً ہی مرحمت فرما دیتے، ہاں خط کا مضمون ہی اُلجھا ہوا ہو، یا جواب کے لئے کتابوں کی اُلٹ پلٹ کی ضرورت ہو تو اُس کی بات ہی دوسری تھی، مولانا کے خطوط کی ڈاک، گڈ کی گڈ ہوا کرتی، لیکن مولانا، جواب ایک ایک کا اپنے ہی قلم سے لکھتے، آخر تک جب تک ضُعف نے بالکل ہی معذور نہ کر دیا، یہی روش قائم رہی ——— سارے انتظامات اور مُستعدی کے باوجود خط کو بہرحال، تین ساڑھے تین سَو میل سے زائد، سہارنپور کے آگے، ضلع مظفر نگر تک فاصلہ طے کرنا تھا، اور پھر اسی قدر فاصلہ واپسی میں، یہ توقع ہی آپ نے کیوں قائم کر لی کہ کتاب میں جہاں خط درج ہے، اُسی کے متصل جواب خط بھی مل جائے گا؟ جواب ۲۵ر نومبر کو موصول ہوا، خلاصۃً نہیں، پُورے کا پُورا سُنئے گا، اور ابھی ابھی سُنیئے گا، لیکن ایک ذرا ٹھہر کر ——— ایک شیخ وقت کے حالات سُننے سُنانے آپ بیٹھے ہیں، تو خود بھی ایک ہلکا سا مجاہدہ صبر کا اور شوق و اشتیاق کے ضبط کا، کرتے چلیئے نہ:

ماجرا ۱۹۲۶ء کا بیان ہورہا ہے، ۱۹۴۳ء کا نہیں، جو آج بھی نادان ہے، وہ سترہ سال قبل نادان تر تھا، دُنیا بھی دُوسری تھی، اور دل کی دُنیا بھی دُوسری، جن خیالات پر اُس وقت ناز تھا، آج اُن پر ہنسی آرہی ہے، جن سے انکار تھا، وُہ اب مسلّمات میں داخل ہیں، مولاناؒ کی ہستی، اُس وقت ایک راز، ایک معمّہ تھی، جمعیۃ العلماء کا زور تھا، گو گھٹا ہُوا، محمد علیؒ شوکت علیؒ کا دَور تھا، گو شباب اُترا ہُوا، مُسلمان خلافت کمیٹی کے ساتھ تھے، اور خلافت کمیٹی کانگریس اور گاندھی جی کا ساتھ دے رہی تھی، شیخ الہند محمود حسنؒ دیوبندی، اور اُن کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ دونوں اپنے اپنے وقت میں مُسلمانوں کی آنکھوں کے تارے بن کر رہے، اور اب جانشین شیخ الہند کی حیثیت مولانا حسین احمد صاحب کو حاصل ہو رہی تھی، ——— جواب ۲۵ کو لکھنؤ میں موصول ہوا، اشتیاق کے ہاتھوں سے کھولا، عقیدت کی آنکھوں سے پڑھا، آئیے آپ بھی شریک ہو جائیں :-

از ” اشرف علی، السلام علیکم

آپ کی راستی و سادگی سے جی خوش ہُوا، اللہ تعالیٰ آپ کو حقائق امور تک پہنچائے، ہر چند کہ مفصّل جواب غیر ضروری ہے، بعد انتخاب مہمات کا جواب عرض کرتا ہوں،

(۱) بیعت کا معیار آپ نے کیا تجویز کیا ہے؟ اُس کی تنقیح اوّل ضروری ہے، تاکہ اُسی معیار پر مُصلح کا انتخاب ہو سکے،

(۲) تھانہ بھون کا ارادہ کس خیال سے ہے، ضرورت تحقیق کی یہ ہے کہ میں دیکھ سکوں کہ آپ کا وہ مقصود یہاں آنے سے حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں، نیز اس کا ظاہر فرمانا بھی ضروری ہے کہ آپ یہاں تشریف لاکر خاموش رہیں گے یا کچھ بولیں گے بھی۔

(۳) امراض قلبی کا علاج، ترتیب میں تجویز شیخ سے موخر ہے۔ والسلام، از تھانہ بھون“

اِس قلیل و دل جواب کا آنا تھا کہ دل کی بساط پر انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، خوش ہو کر، خُدا جانے کتنوں کو دکھایا، سُنایا، اور اپنی سادہ دلی سے دُوسرا خط، دُوسرے ہی دن ۲۶ نومبر کو لکھ ڈالا، اقتباسات مُلاحظہ ہوں :-

(۱) بیعت سے مقصود اپنے ذہن میں یہ ہے کہ نجات کی حقیقی و یقینی سیدھی راہ عملاً نصیب ہو اور تسکین قلب و پختگیٔ ایمان حاصل ہو جائے،

(۲) حاضری سے غرض ایک تو یہی ہے کہ ایک برگزیدہ بزرگ کی زیارت۔

(الف) یک زمان بودن حضور اولیاء الخ (ب) اور بہر حال جتنی دیر حاضری رہے گی، بہت سی اچھی باتیں دیکھنے اور سننے میں آئیں گی (ج) ساتھ ہی اپنے حق میں دعائے خیر کرانا اور (د) ارشادات حسنہ سے مستفید ہونا بھی مقصود ہے، (ھ) جناب کی عملی زندگی کی بہت تعریف سننے میں آئی ہے، (و) علمی حالت کا پتہ تو تصانیف سے چل جاتا ہے، لیکن عملی زندگی کا تجربہ، بغیر حاضری ممکن نہیں۔

(۳) ارادہ اپنی طرف سے تو محض خاموشی کے ساتھ دیکھنے اور سننے کا ہے، ہاں جناب کا ارشاد ہوگا تو کچھ عرض بھی کر دیا کروں گا، ارادہ ہے کہ اوّل بار مختصر قیام کی نیّت سے آؤں گا، پھر اگر طبیعت نے اچھا اثر قبول کیا اور جناب والا کی بھی مرضی ہوئی، تو دوبارہ طویل قیام کا قصد کروں گا۔

(۴) جناب سے بیعت ہونے پر جو زیادہ زور نہیں دیتا تو وہ اِس لئے کہ جناب ہی کی تصانیف میں پڑھا ہے کہ "حصول فیض کے لئے بیعت کوئی لازمی شرط نہیں، بلا بیعت بھی امراض نفس کا علاج ہو سکتا ہے"۔

یہ "الف، ب" اصل خط میں نہ تھی، اس نقل میں یہ نمبر اس لئے ڈال دیئے گئے کہ بغیر اس کے جواب سمجھ میں نہ آتا، جواب آیا، ملاحظہ ہو:-

(۱) میں نے مقصود نہیں پوچھا تھا، معیار پوچھا تھا، جس کی بنا پر شیخ کی تعیین میں سہولت ہو، مکرر عرض کرتا ہوں کہ شیخ کامل کی پہچان آپ کے ذہن میں کیا ہے؟

(۲) (الف) میں سچی اطلاع کرتا ہوں کہ میں اِس صفت کا نہیں۔

(ب) یہ محض ذہنی حساب ہے ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح نہ ثابت ہو۔

(ج) یہ خطرہ بھی ممکن ہے۔

(د) حسنہ کی قید مثل سابق کے ذہنی ہے۔

(ھ) مجھ سے اس کے خلاف سن لیجئے کہ بیہودہ زندگی ہے، اب کس سننے کو صحیح سمجھیئے گا؟

(۵) مَیں نے تجربہ کا نتیجہ، بلا مشقت تجربہ عرض کر دیا۔

(۳) ابھی تو آنے ہی کی غرض متعین نہیں ہوئی مجھ کو اس میں جو کلام تھا، اُوپر عرض کر دیا،

اِس نمبر کا درجہ اس کے بعد ہے،

(۴) "جب تک معیار بیعت کا تجویز نہ ہو جائے، کسی پر بھی زور نہ دینا چاہیئے"

مولانا نرے صُوفی محض عارف، صرف زاہد نہ تھے، متکلّم بھی تھے، معقولی بھی تھے، اور سب سے بڑھ کر مصلح و معلّم تھے، اتنا جان لینے کے لئے اِتنی مراسلت بھی بس تھی۔

(۳)

اِس دُوسرے مکتُوب گرامی کے بعد مراسلت جاری رکھنا ذرا ہمّت کا کام تھا، سلسلہ بند ہو گیا، اور ایک عرصہ تک بند رہا، ۱۹۲۸ء کی فروری تھی کہ پنجاب کے ایک روز نامہ میں ایک ہزارؔی بزُرگ کی روایت سے یہ مضمون شائع ہُوا کہ مولانا رشید احمد گنگوہی حج کے لئے گئے، تو اپنے مُرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی کے ہاں ٹھہرے، حاجی صاحب کے سامنے استفتاء پیش ہُوا کہ ترغیب و ترہیب کے موقع پر آیا موضوع حدیث سے استناد جائز ہے؟ حاجی صاحب نے فتوا ے جواز دیدیا، اور تائید کے لئے مولانا سے اصرار کیا، اور مولانا نے شدومد سے انکار کیا اور مُرشد کا گھر چھوڑ دیا۔ شب میں عالم رؤیا میں حاجی صاحب کو تنبیہ کی گئی اور صبح کو اُنھوں نے آ کر مُرید سے مُعافی مانگی — قصّہ طویل تھا، محض خلاصہ درج ہُوا —— اُس وقت دلچسپی کے موضوع، اِسی قسم کے قصّے تذکرے تھے، اور حاجی صاحب کی ذات سے تو بہت ہی گرویدگی تھی، مثنوی کے بہترین شارح تھے، اور حکیم الامّت کے مُرشد، جی میں آئی کہ روایت کی تحقیق مولانا سے کرا لئے، وہ دونوں بزُرگ اب زندہ نہیں، نہ سہی، یہ تیسرے تو موجُود ہی ہیں، ان دونوں کی یادگار دونوں کے عاشق زار، اور خود بھی ماشاء اللہ محقق نامدار،

خط اسی اخبار کے تراشے کے ساتھ روانہ کیا، جواب ۲۳ر فروری کو حسب ذیل موصول ہُوا:۔

"مکرّمی سلّمہٗ"، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مَیں مسرور ہُوا کہ آپ نے روایت میں احتیاط فرمائی، جو اس غرض ہے کہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ثابت ہے کہ جس خیال یا مقال کی کوئی دلیل صحیح بسند مُعتبر نہ ہو اُس کا اعتقاد، اور اُس پر عمل، اور اُس کی روایت سب ناجائز ہے۔ اور روایت ایسی ہی ہے، جس کی کوئی سند موثوق نہیں، لہٰذا اس کے ثبوت کا دعویٰ یا اعتقاد ناجائز ہے۔

علاوہ اِس کے، یہ روایت اصولِ محدثین پر معلول ہے، کیونکہ جن لوگوں کو حضرت حاجی صاحب کا مذاق معلوم ہے، وُہ قیامت تک بھی اِس کی تصدیق نہیں کر سکتے، حضرتؒ حد درجہ متبع سُنّت و متبع علماء اور ضروری اصولِ دین سے ماہر تھے، پس قصہ یا مخترع ہے، یا اِس میں کچھ خلط ہو گیا ہے،

اشرف علی"

تھانہ بھون کا خانقاہ نشین نرا صُوفی صافی نہیں، دماغ بیدار رکھنے والا، روایتوں کو جانچنے والا، پرکھنے والا، صاحب علم ہے، یہ سبق اس مُختصر خط سے ایک بار پھر تازہ ہُوا۔

"مُرشد کی تلاش" کے عنوان پر، قلم زرا تفصیل کے ساتھ، پیچھے کے صفحات میں چل چُکا تھا، اب دِل بے چین تھا کہ اِس تلاش میں حرکت قلم سے زیادہ قدم کو ہو، قدم متحرک پہلے ہی سے تھا، تقاضا یہ پیدا ہُوا کہ حرکت تیز سے تیز تر کی جائے، نام ذہن میں گھوم پھر کر، وہی دیوبند کے دونوں بزرگوں کے آرہے تھے، مئی میں دلّی جانا ہُوا، محمد علیؒ ہر چیز کے راز دار اور بہترین و مُخلص ترین مشیر تھے، ذکر اُن سے آیا تو اُنھوں نے بلا تامّل ووٹ، مولانا حسین احمد صاحب کے حق میں دیدیا —— مولانا انور شاہ کی بزرگی اور علم و فضل کے وہ بھی قائل تھے، لیکن رائے وہی رکھتے تھے، جو بعض اکابر حنفیہ نے، ابن تیمیہ سے متعلق ظاہر کی ہے کہ اُن کا علم و فضل اُن کی فہم سے بڑھا ہُوا ہے۔ بہرحال اس ترجیحی (preference) ووٹ نے تذبذب کی صُورت ختم کردی، دِل پہلے سے بھی اُسی طرف جھک رہا تھا، شروع جُون ۱۹۲۸ء میں بڑے تیز قسم کا بُخار آیا، اُس زمانہ میں

قوالی سُنا کرتا تھا، شدّت کے وقت قوال سے، مثنوی کے اِس شعر کی فرمائش کی ؎

چُوں خلیل آمد خیالِ یارِ من — صورتش بُت معنیِ او بُت شکن

اور عالم تصوّر میں خیال ان ہی جانشین شیخ الہند کا جما یا، خوب رقّت طاری ہوئی، اور طبیعت نسبتہً ہلکی ہو گئی۔

دوستوں سے رفیقوں سے گفتگو گھنٹوں اِسی موضوع پر رہا کرتی، لڑکپن کے ایک رفیق (اور اب مولانا حاجی، شاہ) عبد الباری ندوی تھے (اُنھیں، اُن کے ہم نام فرنگی محلی عالم اور لیڈر سے خلط نہ کر دیجئے گا) اُن سے برابر چرچے، تذکرے ہی ہوتے رہتے، عقیدت اُس وقت سب سے زیادہ مولانا تھانوی ہی سے تھی، بزرگی سب سے بڑھ کر اُن ہی کی مسلّم تھی، دِل سب سے زیادہ اُن ہی کی طرف کھنچ رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اختلافات کی بھی ایک خلیج اپنے اور اُن کے درمیان حائل پا رہا تھا۔ اُن میں سب سے بڑھ کر سیاسی اختلاف تھا، دِل اِس پر آمادہ نہ ہو سکا کہ آنکھ بند کر کے اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا جائے، مولانا حسین احمد صاحب سے عقیدت اِس درجہ کی نہ تھی، لیکن ساتھ ہی کوئی اختلاف کسی بھی شدید قسم کا نہ تھا اور سیاسیات میں تو بالکل ہمرنگی تھی، پھر نفس نے یہ بھی سُجھایا ——— شعور کے ساتھ ساتھ تحت الشعور بھی تو اپنا کام کرتا رہتا ہے، اور کیا حرج ہے، اگر آپ طبیعت کی حذاقت کے کارناموں کی داستان کے ساتھ ساتھ، مریض کی تحلیل نفسی کی سرگذشت بھی مریض ہی کی زبان سے سُنتے چلیں ——— کہ حضرت تھانوی پیچ حاذق ترین طبیب سہی، اُن کا معالجہ موثر ترین و کامیاب ترین سہی، لیکن اُن کے باقاعدہ علاج منضبط پرہیز کی پابندیاں کس سے برداشت ہوں گی؟ طبیب کی حذاقت سے قطع نظر، مریض کی ہمّت و برداشت بھی تو آخر ایک چیز ہوتی ہے، مولانائے دیوبندی کے مزاج کی سادگی، تواضع، فروتنی دیکھ، خیال یہ پیدا ہوا کہ یہاں کوئی پابندی کسی شدید قسم کی نہ ہوگی، بس ہاتھ ان ہی کے ہاتھ میں دیدیا جائے ——— نفع کامل میں کچھ دیر سہی، لیکن دوا کی تلخیوں سے تو جان بچی رہے گی؛ مریض کے لئے یہ لالچ کچھ کم ہوتا ہے؟

رفیق قدیم مولوی عبد الباری صاحب ندوی کے ساتھ دیوبند چلنے کی ٹھہر گئی، اور جون

۱۹۲۵ء کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ صبح کے وقت ہم دونوں لکھنؤ سے لمبا سفر کر کے دیوبند اسٹیشن پہنچ گئے، یہاں کی حاضری کا یہ بالکل پہلا موقع تھا۔ اسٹیشن پر دیکھا تو مولانا خود استقبال کے لئے موجود۔ مولانا کی بزرگی کے قائل، خوش عقیدہ حضرات جس بنا پر بھی ہوں، اپنی نظر میں تو اُن کی بڑی کرامت اُن کا ایثار، انکسار، تواضع، بےنفسی ہی ہے۔ علم و فضل، فقر و درویشی کی بحثوں کو چھوڑیئے لیکن جہاں تک ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت!

کا تعلق ہے، مولانا ۱۹۲۵ء ہی میں نہیں ۱۹۴۳ء بلکہ عین اس وقت یعنی ۱۹۴۵ء میں بھی، اس دیکھنے والے کی نظر میں، اپنی نظیر بس آپ ہی ہیں، اور محمد علیؒ جوہر نے یہ شعر کہا تو اپنے شیخ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے حق میں ہے، لیکن صادق مولانا دیوبندیؒ پر بھی لفظ بہ لفظ آ رہا ہے ؎

اُن کا کرم ہی اُن کی کرامت ہے ورنہ یاں — کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مُرید کی

دُوسروں کو شاید کام لینے میں وہ لُطف نہ آتا ہو، جو ان مولانا کو دُوسروں کا کام کر دینے میں آتا ہے، گھر پر آ کر ملیئے تو آپ کے لئے کھانا اپنے ہاتھ سے جا کر لائیں، آپ کے لئے بستر بچھاویں، سفر میں ساتھ ہو جائیے، تو دوڑ کر آپ کے لئے ٹکٹ لے آئیں، قبل اس کے کہ آپ ٹکٹ گھر کے قریب بھی پہنچ سکیں، تانگے کا کرایہ آپ کی طرف سے ادا کر دیں، اور آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسہ ٹٹولتا ہی رہ جائے، ریل پر آپ کا بستر کھول کر بچھائیں، آپ کے لوٹے میں پانی لے آئیں، آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اُٹھانے لگیں —— تین دن کے قیام دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر رہیں، اور شنیدہ، دیدہ میں تبدیل ہو کر تکلفات اور خاطریں، اور مہانداریاں، کھانے پر کھانا، اور چائے پر چائے، بیعت کے سوال پر ارشاد ہُوا کہ یہاں کیا رکھا ہے، ذرا تھانہ بھون تو چلیئے، یہاں تو نیت ہی یہی تھی، ایک روز سہ پہر کو یہ مختصر سا قافلہ چل کھڑا ہُوا۔ گویا

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

البتہ یہاں اپنے ساتھ پارسا ایک نہیں دو تھے، اور سفر کعبہ کا نہیں، کعبۂ مقصود کا تھا ——

ایسی منزل کے لئے رہبر بھی، اِس سے بہتر اور کون مل سکتا تھا! اللہ اللہ! ایسے سفر کی سعادت ہی کب نصیب میں معلوم ہوتی تھی۔

ہئے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھئے　　　اِس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے

(۴)

"آمدم بر سرِ مطلب" ـــــ کیا ہرج ہے، اگر یہ پُرانا، بہت پُرانا فرسودہ فقرہ، ایک بار پھر نئی زبانوں پر چڑھ جائے ـــــ جملۂ معترضہ بڑا طویل، لیکن لاطائل نہیں، تین قسطوں میں کہیں جاکر ختم ہُوا، اب ناظرینِ کرام تکلیف اُٹھا کر، ایک بار پھر تھانہ بھون اسٹیشن پہنچیں، تاریخ ۳۰ جون ۱۹۲۸ء وقت کوئی ۹½ بجے شب

قافلہ مختصر سا تین آدمیوں کا اسٹیشن پر اُترا، تین میں سے ایک خود ہی نامور لیڈر اور شیخ الحدیث، باقی دو میں سے ایک عالم دُوسرا عامی اسٹیشن اُس وقت تک ٹاؤن کا کھُلا نہ تھا، وہی پُرانا اسٹیشن تھا، جو اب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام سے مشہور ہے، یہاں سے قصبۂ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کا ہوگا، تانگہ کرایہ پر کیا اور سُنسان راستوں سے گذرتے کوئی آدھ گھنٹہ میں قصبہ کے اندر پہنچ گئے ـــــ جذبات میں جب بجائے جزر کے مد ہو، اور خیالات میں تلاطم تو یہی آدھ گھنٹہ کئی گھنٹوں کا معلوم ہونے لگتا ہے، عقیدت تازہ بھی تھی، اور تیز بھی، تخیّل خوب خوب نقشے پیش کرتا رہا، تانگہ خانقاہ امدادیہ کے دروازہ پر رُکا، اور کرایہ مولانا حسین احمد صاحب نے دیا، سہارنپور اسٹیشن پر کھانا بھی تو اُن ہی نے مُسلم ہوٹل میں لے جاکر کھلایا تھا، اور دیوبند اسٹیشن پر ٹکٹ بھی تو وہی جھپٹ کر لے آئے تھے، اور ہم دونوں، سن میں اُن سے کہیں چھوٹے، مُنہ دیکھتے ہی رہ گئے تھے، جس سفر میں وُہ ساتھ ہوں، چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی خدمت گذاری میں کون اُن سے پیش پا سکتا ہے؟

"امدادیہ"، کو یہاں کوئی صاحب انگریزی لفظ "کوآپریٹو" (co.operative) کا ترجمہ نہ سمجھ لیں۔ (جیسا کہ "گرہ" کے ایک مشہور شاعر چند سال ہوئے یہی سمجھے تھے) حکیم الامت کے

مُرشد حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکّی کا وطن بھی یہی قصبہ تھا، یہیں اُن کا حُجرہ اور مسکن تھا، حُجرہ اب تک اِسی حالت پر قائم ہے، اور صحن، مسجد، عمارت اور خانقاہ میں بہت زیادہ اضافہ کر کے، مجموعہ کا نام ان ہی کے اِسم مُبارک پر خانقاہ امدادیہ رکھ دیا گیا ہے، رات زیادہ جا چکی تھی، خانقاہ کا پھاٹک قُدرتاً بند ملا، مولانا حبیب احمد صاحب کی رفاقت پھر کام آئی، چند منٹ کی تلاش کے بعد حکیم الامت کے ایک خادم کو ڈھونڈ نکالا، وُہ بیچارے سوتے سے اُٹھے، آئے، اور ایک پڑوس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں، تین چار پائیوں کا اِنتظام کر دیا مُستعدّی کے باوجود وقت اچھا خاصا لگا، اب بقیہ رات کسی طرح گذارنا تھی، یکم جولائی کی مختصر سی رات، اُس کے گھنٹے ہی اب کئے باقی رہ گئے تھے، عقیدت کا وفور جوش اتنے گھنٹے بھی کب سونے دیتا ہے —— حکیم الامت ولیِ کامل ہیں، ساری رات جاگتے ہوں گے، اولیاءاللہ بھی کہیں سوتے ہیں؟ اِس وقت بھی قطعاً جاگ رہے ہوں گے، صاحبِ کشف بھی یقیناً ہوں گے، اِس وقت کے مُسافروں کی آمد کا حال، اُن پر بالکل روشن ہو گیا ہو گا، آمد کیا معنی دِلوں کے اندر تک کے بھید اُن سے کون چھُپا سکتا ہے، ضرور اُن پر سب کچھ روشن ہو گا، یہ اللہ والے بھی اللہ ہی کی طرح دانا بینا ہوتے ہیں، اور یہ اینٹ چُونے کی دیواریں اور مسافتیں اُن کی غیب بیں نگاہ کی راہ میں حائل تھوڑے ہی ہو سکتی ہیں —— خوش عقیدگی کے خیالات اِسی طرح کے کچھ صحیح اور زیادہ تر غلط و مہمل، دماغ پر اور دِل پر مسلّط رہے، اس وقت عقیدے تھے ہی ایسے، ساتھ ہی جسم بھی خوب تھکا ہُوا تھا، کچھ سوتے، کچھ جاگتے، باقی رات بھی کٹ گئی، اور نمازِ فجر کا ابھی بالکل اوّل ہی وقت تھا کہ ہم لوگ دیدار "اشرف" کے لئے تیار ہو گئے، مولانا تو خیر، اُن کے بڑے پُرانے ملنے والے اور رفیق ہی تھے، دُوسرے ساتھی، مولوی عبدالباری ندوی بھی، چند سال قبل، زیارت سے مشرف ہو چکے تھے، نادیدہ مُشتاق بالکل اکیلا، ع

اے اسیرانِ قفس، مَیں تو گرفتاروں میں ہوں

کی تسبیح پڑھنے والا، بس یہی ایک نامہ سیاہ تھا!

جس مکان میں حکیم الامت اُس وقت قیام فرماتے تھے، اُس سے خانقاہ و مسجد، مسجد کو خانقاہ

حلقہ میں لئے ہوئے ہے) کوئی تین گز کے فاصلہ پر ہوگی، اور جہاں ہم لوگ رات کو ٹھہرائے گئے تھے وُہ حضرت کے کاشانہ سے کوئی دس ہی گز کے فاصلہ پر تھا، اور حضرت کا راستہ، اُسی طرف سے تھا، مَیں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل، عین راستہ پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ زیارت جمال پہلے یہیں ہو جائے، چند ہی منٹ گذرے ہوں گے کہ آرزو پُوری ہوئی، ایک بزرگ اُدھر سے گذرے، مسن لیکن خوش رُو، نظریں نیچی، چال متین، نُورانی چہرہ، نُورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ، اور شاید اُسی نُورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید براق، سر پر نازک سی گول اکہری ٹوپی، جسم پر لمبا کرتا، نازک و نفیس غالباً تنزیب کا، تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا، نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا، اور کہنا چاہیئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی، اِس پر بھی دلکشی، رعنائی، زیبائی، بحیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی، دِل تو بے اختیار آواز دے ہی اُٹھا، ع

قُربان یک نگاہ تو عُمر دراز ما!

کم و بیش ۱۵ سال اِس منظر پر گذر چکے، اور معلوم ہو رہا ہے کہ بات کل کی ہے، دماغ پر نقش اتنا گہرا اور دِل پر تاثر اتنا زبردست کم ہی ہوتا ہے،

نماز ہوئی، حضرت ہی نے پڑھائی، خود ہی پڑھانے کا معمول تھا، فرمایا کرتے تھے کہ بار بار امام بدلتے رہنے سے جماعت کے نظم میں فرق آ جاتا ہے، اکثر عادت فجر کے وقت کسی قدر طویل قرأت کی تھی، مثلاً سورۂ الدہر یا سورۃ المنافقون، صورت کی دلکشی کا تجربہ ابھی ہو چکا تھا صَوت کی دلکشی کا اندازہ اب ہُوا، اور غالبؔ کے دیوان سے ندا آئی، ع

وُہ جنّتِ نگاہ یہ فردوسِ گوش ہے!

تجوید خود ایک مُستقل فن ہے، اِس کے معیار سے اظہارِ رائے صرف ماہرین فن کا کام ہے، یہاں ذکر آواز کی صرف دِلکشی و تاثیر کا ہے، راس عاصی محض کو اپنی عُمر میں باتفاق ہندوستان کے علاوہ عرب و مصر سے بھی آئے ہوئے اچھے اچھے قاریوں کے سُننے کا ہُوا ہے، مشہور و غیر مشہور دونوں

قسم کے بعض باکمالوں کی داد بھی دِل کھول کر دی ہے۔ بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے، لیکن اِس درجہ مؤثر لہجہ، اتنے خوبصورت بول، شاید ہی کبھی کسی کے سُننے میں آئے ہوں، ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے، اور پھر بالکل ہی سادہ و بے تکلف، کہیں سے شبہہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے، صاف یہی معلوم ہوتا تھا، کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے، نماز کے طویل قیام میں میں بڑا کچا اور بودا ہوں، یہ قرأت اشرفی کا اعجاز تھا کہ طویل قرأت سے بھی جی اکتا نا کیسا، جی یہی چاہے گیا کہ ابھی اور سُنتے جائیے، اُدھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی، اور ادھر حسرت باقی رہی جاتی تھی۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، اور شاخ میں شاخ کیسی نکل آئی، ذکر اُس خاص نماز اور پہلی نماز کا تھا، اور چھڑ گئی مولاناؒ کی عام خوشنوائی کی داستان۔ نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دُعا مانگ کر جوں ہی حضرت اُٹھے ہیں، نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی، اُن کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے، اور بڑے التفات سے ملے —— لوگ تو کہتے تھے، بڑے خشک مزاج ہیں، خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا بشرہ، کسی خشک مزاج کا ہو سکتا ہے —— لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اِن کے اور اُن کے بے لُطفی ہے، ناچاقی ہے، کانوں نے بیشک یہی سُنا تھا، لیکن اِس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست گلے مِل رہے ہیں، تعظیم و تکریم، مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے تو خیر ہوتی ہی، عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی، لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ اُدھر سے بھی آداب و رسمِ تکریم میں کوئی کمی نہ تھی —— لاحول ولا قوۃ، لوگ بھی کیسی کیسی بے پر کی اُڑایا کرتے ہیں، اور لوگ بھی کون؟ عوام کالانعام نہیں، اچھے اچھے پڑھے لکھے، خاصے ثقہ راوی، بجز ان ہی دونوں حضرات کے خُدّام و مُریدین! بعض راوی زبان قال سے، اور بعضے راوی زبان حال سے۔ الحمدللہ کہ دونوں روایتیں آج غلط نکلیں، مولانا نے تعارف ہم دونوں کا کرایا، ہم دونوں سے بھی شگفتہ اخلاق و التفات سے پیش آئے۔ میں اتّفاق سے چند ہفتے قبل ٹائیفائڈ (میعادی بُخار) میں مُبتلا ہوا تھا۔

حضرت نے کمال شفقت سے اُس کا حوالہ دے کر خیریت دریافت فرمائی، ہیں دنگ کہ اس کی اُنہیں کیونکر خبر ہوئی۔ علالت کی اطلاعیں تو بس ہمدرد (دہلی) ہمدم (لکھنؤ) یا خود میرے سچ میں نکلتی رہی تھیں، اِن اخباروں کا، یا ایسے اخباری لوگوں کا یہاں کہاں گذر۔ دیکھئے نہ! لوگوں کی چلائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی روایت اس باب میں بھی غلط یا کم سے کم بہت مبالغہ آمیز نکلی، مجھے تو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ میرا نام بھی، کبھی حضرت کے کان میں پڑا ہوگا، رہی دو ایک بار کی خط و کتابت تو ایسے خط تو خدا معلوم کتنے روز ہی آتے رہتے ہوں گے۔ کس کس کے نام ذہن میں رہ سکتے ہیں، لیکن نہیں، نا واقفیت کیسی، یہاں تو میری تازہ علالت تک سے واقفیت و باخبری نکلی!

خانقاہ میں آپ داخل ہو چکے ہیں، اور نماز سے بھی اب فراغت ہو چکی ہے، تو ایک نظر اس عمارت پر بھی کرتے چلیئے، خانقاہ کی عمارت قصبہ کی بالکل مغربی سرحد پر ہے، اُس کے بعد اس لین میں کوئی آبادی نہیں۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے اسٹیشن ہے، قصبہ کی اکثر پرانی شان دار عمارتوں کی طرح، سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے[1]، عین خانقاہ کے دروازہ تک آئی ہے۔ پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ یا ٹین کا سائبان، اس سلیقہ مندی کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگالے نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض، زیادہ حصہ پٹا ہوا، ایک لمبا حصہ کھلا ہوا، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے، چھوٹے لیکن ضرورت کے لئے کافی، جاڑے میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود، اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں، بڑھ کر دو ٹہالے کر کے آپ اندرونی دروازہ میں داخل ہوئے، جوتے اُتارے کہ صحن مسجد شروع ہو گیا، جوتا رکھنے کے لئے ایک چیڑ کا بڑا بکس کھلا ہوا رکھا ہوا، اب آپ مشرق سے اپنے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مڑے، یہیں کنواں اُس کے آگے بیت الخلا جانے کا راستہ، اُس کے بعد مہمان خانہ کا زینہ،

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ ساری کیفیت ۱۹۴۳ء کو بیان ہو رہی ہے، اب ۱۹۶۴ء تک خدا معلوم نقشہ کتنا بدل چکا ہو گا۔

مہمانوں کے لئے کمرہ کوٹھے پر، سادہ مگر ہوا دار۔ گنجایش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں چارپائیوں پر آسانی سے لیٹ سکیں۔ زینہ سے چند ہی قدم اور آگے چلے کہ رُخ شمال میں چلتے چلتے اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب کرنا پڑا، اور ایک لمبا برآمدہ ملا، اِس برآمدہ میں دو سہ دریاں ہیں، پہلی سہ دری کے عقب میں کُتب خانہ کا کمرہ، دُوسری سہ دری خاص حضرتؒ کی نشست گاہ، ایک حجرہ اس کے عقب میں، دُوسرا حجرہ اُس کے مغربی کونے پر، یہی حجرہ حضرت حاجیؒ صاحب کا تھا، اور ایک کوٹھری اس کے جواب میں برآمدہ کے مشرقی کونے پر، اب دُوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آگئے، مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں، لیکن بڑی پُر رونق اور پُرانوار، اور بسا تھی گنجایشی اور آرام دہ، ختم مسجد کے بعد، اُسی مغربی لائن میں دالان، اور اُس کے عقب میں طالبین و سالکین کے لئے حجرے۔ دالان میں اِبتدائی تعلیم کے لئے لڑکوں کا مدرسۂ قرآنی، اس کے ختم پر زینہ اور کچھ اور حُجرے، اُوپر اور نیچے کے یہ سب حُجرے طالبوں کے لئے ہیں، اب آپ پھر اپنی دائیں طرف یعنی مشرق کی جانب مُڑیئے اور جنوبی برآمدہ میں آگئے، اِس کا نصف حصّہ مدرسہ اور مہمانوں کے لئے ہے، اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی گنجایش، برآمدہ کے دوسرے حصّہ میں مدرسہ کی اُونچی جماعتیں یعنی ہدایہ خوان طلبہ کی درسگاہ، اس کے عقب میں رسالۂ النور کا دفتر، حضرتؒ کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم و نگران مولوی شبّیر علی صاحب کا کتب خانۂ تجارتی، اُس کے بعد آپ شمال کی جانب ایک بار پھر مُڑے، اور مشرقی میں کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد، دروازہ پر واپس پہنچ گئے، حجروں کی قطار اِدھر بھی موجود، اور وضو کے لئے باقاعدہ نالیاں اِس مستطیل کے شرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئی —— لیجئے مکان کی ناپ جوکھ میں ہم آپ کچھ ایسے محو ہوئے کہ مکین ہی کی طرف سے غافل ہوگئے!

(۵)

"مکین کی خیر ہو یارب مکان رہے نہ رہے"

کہنے والا تو بیشک ایسا ہی کہہ گیا ہے، لیکن جہاں مکین اور مکان دونوں بابرکت ہوں، دونوں

برکت کے مجھتے ہوں، وہاں یہ شاعرانہ نفی واثبات کام نہیں دیتا، وہاں خیر تو دونوں ہی کی مانگنا پڑتی ہے ـــــ مکان کی یہ مستریوں کی اناڑی کی پیمائش کچھ ایسی بیکار نہ گئی!

حضرت ہم تینوں کو لئے ہوئے صحنِ مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے، سہ دری کے آگے نرالے سائبان کے نیچے، جہاں سُنتیں پڑھنے کا معمول تھا یعنی اِس مصلّے سے کوئی دو قدم ہٹ کر اب اخلاق والتفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہُوا، اشفاق والطاف کی تفصیل اب کہاں یاد، اتنا یاد ہے کہ بار بار فرماتے تھے، "اچھی طرح بیٹھئے" "کھُل کر بیٹھئے" یہاں ہیبت شروع ہی سے دِل میں بیٹھی ہوئی تھی، لُطف وکرم کا ہر فقرہ اِس کیفیت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جاتا تھا، از خود بولنے اور کسی بات کے شروع کرنے کی ہمّت بھلا کہاں ہوتی، غنیمت یہی تھا کہ سوال کا جواب کسی طرح دیئے جاتا، ہونٹ خشک، زبان میں کچھ لکنت سی، رُعب وہیبت کی اِس کیفیّت کا تجربہ، اپنی یاد میں دو ہی بار ہُوا ہے، ان دو میں، پہلی بار تو یہی، اور دوبارہ دوسرے سال مجاہدِ اعظم حضرت شیخ احمد سنوسیؒ کے مواجہہ میں مکّہ معظمہ میں! "ہیبتِ حق" کا لفظ مثنوی کے اِس شعر میں عمر فاروقؓ کی ذاتِ پاک کے سلسلہ میں نظر سے گذر چکا تھا ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست

"ہیبتِ حق" کے معنی جو کچھ تھوڑے بہت روشن ہوئے وہ اِن ہی دونوں موقعوں پر

خانقاہ میں طالبین وسالکین کا ایک گروہ ذکر وشغل میں مشغول ہمیشہ موجود رہا کرتا، حکیم الامتؒ کا معمول یہ تھا کہ بعد نماز فجر سب سے پہلے ان ہی کے کام کی طرف متوجہ ہوتے، یہ لوگ اپنے حالاتِ باطنی لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس (صندوق خطوط) میں ڈال دیتے، بعد فجر حضرت خود اپنے ہاتھ سے اُسے کھولتے، ایک ایک پرچہ کو پڑھ کر، ہر ایک کے مناسب حال اُسی پر جواب اور ہدایتیں لکھ پرچوں کو مسجد کے منبر پر رکھا دیتے، اِس سے فارغ ہو ہوا کلام مجید کی تلاوت کرتے، حافظ قرآن ہونے کے باوجود اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لئے سیر وہوا خوری کے لئے آبادی سے باہر نکل جاتے ــــــ آج یہ معمول کچھ دیر کے لئے مُلتوی رہا۔ حضرت

ہم لوگوں کی خاطر میں لگے رہے، چائے منگائی گئی، حالانکہ حضرت خود چائے نہیں پیتے تھے۔
اور مکالمت پُر شفقت مکالمت کا سلسلہ کوئی پون گھنٹہ تک جاری رہا، حضرت کے بدنام کرنے والوں نے مشہور کر رکھا ہے (اور اس بدنامی کی ذمہ داری سے خود حضرت کے مُریدین اور خُلفاء بھی بَری نہیں) کہ آپ بڑے خُشک مزاج اور متشدّد تھے۔ اس جھوٹ میں صرف سچ اتنا ہے کہ مُریدوں، طالبوں، منتسبوں پر، اُن ہی کی فلاح و اصلاح کے خاطر آپ قاعدوں کے نفاذ میں، ضابطوں کی پابندی میں یقیناً سخت تھے، لیکن خود ان قاعدوں اور ضابطوں کے بنانے میں ہرگز سخت نہ تھے، بلکہ وہ قاعدے، ضابطے تو ہوتے ہی ہر فریق کی راحت و سہولت کے لئے تھے، اور عام مہمانوں، دوستوں، ملنے جُلنے والوں کے حق میں تو آپ خُلق مجسم تھے، خشونت و تنگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی راحت و سہولت کے ایسے ایسے جزئیات تک کی رعایت رکھتے کہ خود ان مہمانوں کی نظر بھی وہاں تک نہ پہنچ سکتی۔ اِسی خصلت عام کا ظہور اِس وقت ہم لوگوں کے ساتھ ہو رہا تھا، مہمانوں کی خاطر داری اور ضیافت بھی تو اُسی طرح ایک عبادت ہے، جس طرح مُریدوں، سالکوں کی تربیت۔ یا قرآن مجید کی تلاوت۔ روز کا معمول وہ رہتا تھا، آج کا معمول یہ ہو گیا، جنّت کی راہ نہ جب چھوٹی نہ اب۔

کچھ دیر بعد، حضرت نے اپنے دُوسرے معمولات پورے کرنے کے لئے، ہم لوگوں سے رُخصت چاہی، اِس التجا اور لجاجت کے لہجہ میں کہ گویا وہ چھوٹے ہیں، اور ہم لوگ بڑے! اب وقت اشراق کا ہو چکا تھا، لیکن قبل اس کے کہ حضرت روانہ ہوں، مولانا دیوبندی نے دیوار کی آڑ میں رُک، گفتگو شروع کر دی، ہم دونوں نووارِدوں سے بہ طور راز کے۔ مولانا کا لہجہ تو سرگوشی کا تھا، البتہ حضرتؒ کی آواز نسبتہً بلند تھی اور میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، حضرتؒ کی تقریر کا خُلاصہ یہ تھا،

"اچھا تو آپ کے فرمانے سے یہ معلوم ہُوا کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے بیعت کرنا چاہتے ہیں، مَیں تو خیال کر رہا تھا کہ آپ ہی مناسب ہوں گے، باقی میرا معمول تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، مَیں

بہت سی مصلحتوں کی بنا پر عجلت اِس باب میں پسند نہیں کرتا، مَیں تو یہ چاہتا ہوں کہ جو صاحب اس کے خواہشمند ہوں، اُن کا اور میرا سابقہ، کم از کم چھ ماہ کا رہ لے، اور جانبین ایک دُوسرے کو خوب جانچ اور پرکھ لیں قیام اگر طویل مدّت تک نہ رہ سکے، تو کم از کم مراسلت ہی رہے، بغیر طویل سابقہ کے، ایک دُوسرے کی مناسبت کا علم نہیں ہو سکتا، اور اس طریق میں، اہم اور مقدّم شرط مناسبت ہی ہے، بغیر اس کے محض بزرگی یا حُسنِ اعتقاد بالکل ناکافی ہے آپ میرا یہی پیغام اُن حضرات کو پہنچا دیجئے گا۔"

یہ راز اب کھُلا! ہم دونوں نووارد ان ہوا سے بساط دل ایک دُوسرے کا مُنھ حیرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں، یہ مولانا دیوبندی، بہ ایں تقدس و تقوی "سازش" بھی کر سکتے ہیں، وہ سازش "مقدّس"، یہی تواضع و انکسار کی بنا پر سہی۔ اللہ بھلا کرے حضرت تھانوی کا اُنھوں نے بات بالکل صاف و بے لاگ کہی، اور دانستہ یا نادانستہ، سازش کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا۔

دُوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوئی، اور کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے، دوپہر کے وقت تک رہی، اس میں حضرت نے خوب کھُل کر باتیں کیں، مختلف بزرگوں کے واقعات، عام دینی ہدایات، اخلاقی و روحانی مذاکرات، سب بڑے دلچسپ، دلکش، مؤثر انداز میں واعظانہ خشکی کا نام و نشان نہیں، مولانا سے ارشاد ہُوا کہ "آپ نے میرا پیام اُن حضرات تک پہنچا دیا؟ پھر کیا رائے قرار پائی؟ جواب مولانا کیا دیتے، مَیں خود ہی ہمّت و جرأت کر کے بولا کہ

"حضرت معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمی ہو گئی، درخواست تو صرف اس قدر تھی، اور یہی مَیں کئی مہینے ہوئے خط کے ذریعہ سے بھی پیش کر چکا تھا کہ حضرت ہمیں انتخاب مُرشد میں، اپنے ارشاد و مشورہ سے مستفید فرمائیں، ہم لوگوں کی ناقص نظر میں جو چند بزرگ ہیں، اُن میں سے نمبر اوّل پر مولانا حسین احمد صاحب ہیں، اب آگے جناب کا جیسا ارشاد ہو، یہی مَیں نے اُس عریضہ میں بھی عرض کیا تھا، اور اسی لئے یہ سفر بھی تھا"

اب معاملہ بالکل صاف تھا، مقدّس سازش اس غیر مقدّس زبان کے آگے نہ چل سکی،

حضرتؒ نے تبسم کے ساتھ مولانا کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "پھر آپ نے یہ کیا فرما دیا تھا؟" اور ہم لوگوں سے ارشاد ہوا کہ "آپ کا انتخاب بالکل صحیح ہے، مَیں اس سے بالکل اتفاق کرتا ہوں، آپ مولانا ہی کے ہاتھ پر بیعت کیجئے۔"

"لیکن مجھ میں تو اس کی بالکل اہلیت نہیں، اور جناب کے ہوتے ہوئے کسی اَور کی طرف رُخ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔"

"مگر مجھ پر تو آپ کو اعتماد ہے، اور مَیں شہادت دیتا ہوں کہ آپ میں اہلیت ہے، آپ ہی ان حضرات کو لیجئے۔"

——— اس سوال و جواب کے بعد مزید مکالمت کی گنجائش ہی اب کہاں تھی، ——— یہ نشست حضرتؒ کی خاص سہ دری میں ہوئی، درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل، ڈسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما، ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے، ڈسک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی، دوسری بڑی گھڑی (دھوپ گھڑی کے حساب سے) دیوار میں لگی ہوئی، داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامۂ اوقات لگا ہوا، غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا، بائیں طرف مولانا بٹھائے گئے، اور اُس کے بعد ہم لوگ،

بیٹھنے بٹھانے، سب کے آداب قاعدے، حضرت کی مجلس میں مقرر تھے، ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ، ہر بات میں نظم اور آہنگ + یہ تو مجلس خاص اور خصوصی تھی، بعد ظہر مجلس عام میں بھی قاعدہ یہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو وسیع جگہ پڑی ہوئی تھی وُہ عام طالبین و واردین کے لئے تھی، ہر شخص جہاں جگہ پائے، بیٹھ جائے، کسی دُوسرے کو نہ اُٹھائے، نہ کھسکائے، بائیں طرف جگہ نسبتہً تنگ تھی، کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی، اِدھر مخصوصین بٹھائے جاتے تھے، دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے، ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں، بغیر دوسرے کے حق میں حجاب بنے ——— باتیں خوب ہوئیں، یاد کر لیجئے کہ ۱۹۲۵ء تھا، اور ایک مخاطب روزنامۂ ہمدرد کا ڈائرکٹر تھا، صبح اور دن بھر کی ملا کر طویل صحبت میں سیاسی

پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا، گفتگو آئی، حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کافور ہو کر رہیں، کون کہتا ہے حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں، لاحول ولا قوۃ، جس نے بھی ایسا کہا، جان کر یا بے جانے، بہرحال جھوٹ ہی کہا، یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی، مسلمان بھی ایسا، جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملّی میں کسی "خلافتی" سے ہرگز کم نہیں، پاکستان کا تخیّل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں، پہلے پہل اس قسم کی آوازیں، کان میں پڑی، بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا، لیکن یہ اختلاف تو کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں، نفس مقصد یعنی حکومت کافرانہ[1] سے گلوخلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت، ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے، عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں ـــــ گفتگو کا غالب حصّہ، قدرۃً دین و تصوّف ہی سے متعلّق تھا، بعض بزرگوں کے حالات حضرت نے اپنی زبان سے اس طرح ارشاد فرمائے کہ گویا "در حدیث دیگراں" بعینہ ہم لوگوں کے خیالات و جذبات کی ترجمانی ہو رہی ہے، دل نے کہا کہ "دیکھو روشن ضمیر ہیں نہ، سارے ہمارے مخفیات اُن پر آئینہ ہوتے جا رہے ہیں، صاحبِ کشف و کرامت ان سے بڑھ کر کون ہوگا" بعد کو، برسوں بعد کو، اور وہ بھی اسی صحبت بابرکت کے فیض سے کھلا کہ مومن کی بصیرت و فراست کے سامنے یہ کشفِ تکوینی، یہ جوگیوں اور مسمریزم والوں کا کشف بھی بھلا کوئی کرامت ہے! اُس علوی کے سامنے، اس سفلی کی حقیقت کیا ہے، اُس حقیقت کے آگے، اس ملمّع کی ہستی کیا ہے؟ خیر، اس وقت تو بڑا گہرا اثر اسی غیب دانی اور کشفِ صدور کا لے کر اُٹھا، مجلس برخاست ہوئی، کھانا اس کے قبل ہی ہو چکا تھا، ہم لوگوں کی واپسی کا وقت آگیا، تانگہ آیا، اور ہم لوگ خانقاہ سے رخصت ہوئے، حضرت کمال اخلاق سے رخصت کرتے پھاٹک تک تشریف لائے، عین رخصتی کے وقت، اس نامہ سیاہ نے سب کی آنکھ بچا، مصافحہ کے بہانے سے ایک گذارش کان میں کی، اور اُسی سکنڈ منظور بھی ہو گئی۔

---

[1] حضرت کی گفتگو میں یہ جُز بالکل صاف تھا، حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی، وہ اس کے "کافرانہ" ہونے کی بنا پر تھی نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔

''درخواست'' حضرت ایک ہی درخواست ہے، دُعاؤں میں یاد رکھئے گا''۔ یہ یاد آج اور یہاں تو بہر حال رہی، اور وہاں بھی انشاء اللہ ضرور رہے گی، دُعاؤں میں یاد کی درخواست اِسی عالم کے لئے محدود نہ تھی، اللہ کے ولی نے مسجد میں کھڑے ہوکر، اللہ کے فرشتوں کی گواہی میں قبول کی ہے، بے مایہ کو سرمایہ کتنا قیمتی کیسا انمول، بات کی بات میں ہاتھ آگیا!

(۶)

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

مصرعہ سُنا ہوا ہزار مرتبہ کا تھا، ''شنیدہ'' اور ''دیدہ'' کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا، رُعب و ہیبت کی کیفیات میں اب خاصہ فرق آگیا تھا، اور حاضری کے بعد معلوم ہوگیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے، اور تقدس کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے کرّو بیوں میں نہیں، آب و گل سے ترکیب پائے ہوئے، انسانی دِل، بشری جذبات رکھنے والے انسان ہیں، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کے سچے جانشین، ضرورت کے وقت اور مصلحت کے ماتحت چلنے بھی سخت اور سخت گیر ہو جائیں، لیکن اپنی عام طینت و خلقت کے لحاظ سے رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کے مصداق ــــــ ہوشیار سرجن رگوں کو چیرتا ہے، پٹھوں کو پھاڑتا ہے، جسم سے خُون پر خُون نکالا جاتا ہے، نشتر کو اندر سے اندر گہرائیوں میں اُتارتا جاتا ہے، بیدردی سے، شقاوت سے، قساوت سے نہیں، عین مریض کی ہمدردی میں، ہوا خواہی میں، دلسوزی میں! ــــــ حاضری ہوئی تھی، عظمت و عقیدت کے جذبۂ بے پناہ کے ساتھ، واپسی ہوئی، تو اس ذخیرہ میں ذرّہ بھر کمی کے بغیر، محبّت کے عنصر کی آمیزش کے ساتھ ــــــ بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ میں مِّثْلُکُمْ کی صراحت نوید رحمت سے کتنی لبریز اور جلوۂ شفقت کی کیسی آئینہ بردار ہے!

بہر حال اب مراسلت کی راہ نسبتہً آسان ہوگئی، اور جو ہراس اِس حاضری کے قبل خط و کتابت کے سلسلہ میں پیدا ہوگیا تھا، چند ہی ہفتوں کے بعد ٹوٹ کر رہا۔

پہلا عریضہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو لکھا، سب سے پہلے تو اس کا شکریہ کہ آپ ہی کے توجہ فرمائی سے

مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے سلسلہ میں داخل فرمانا قبول فرمایا، اِس پر یہ جواب آیا کہ:-

"مبارک، لیکن یہ محض آپ کا حُسنِ ظن ہے، آپ کا خلوص خود کافی شفیع تھا، مگر آپ کی بدولت سے مجھ کو بھی مُفت کا ثواب مِل گیا، اب ضرورت اِس کی ہے کہ جناب مولانا سے فیوض و برکات حاصل کیے جائیں اور مولانا سے انقیاد و تقلید کا تعلق رکھا جائے کہ اصل تحقیق کی تقلید ہے"

اسی عریضہ میں اپنا ایک خواب چند ماہ قبل کا درج کیا، کہ "جیسے بچپن کا زمانہ ہے، پلنگ کے وسط میں لیٹا ہوا ہوں، اور ایک طرف جناب والا لیٹے ہوئے ہیں اور دوسری طرف مولانا حسین احمد صاحب اور دونوں صاحب صورۃً بالکل میرے والد مرحوم سے مشابہ (جو خود ایک بیدار شخص تھے اور حج کے معاً بعد، ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ کو وقتِ صبح صادق مکہ معظمہ میں وفات پائی)۔۔۔

اِس جزو کا جواب:-

"تعبیر اب ظاہر ہوگئی، اصل تو مولانا ہی تھے، میں ایسا تھا جیسے حشو الفاظ برائے بیت ہوتے ہیں"

تصوف کی کتابوں کا مطالعہ ان دنوں جاری تھا، "صلوٰۃ معکوس" کا لفظ بار بار نظر سے گزرا، اوّل تو یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ "اُلٹی نماز" آخر عملاً ادا کس طرح ہوتی ہوگی، دوسرے اِس کا ثبوت حدیث دوسری کتابوں میں کہیں نظر سے نہ گزرا، خط میں ایک سوال اس سے متعلق بھی، فوائد الفواد (ملفوظات حضرت محبوب الٰہیؒ مرتبہ امیر حسن علاء سنجری) اور قول الجمیل (شاہ ولی اللہؒ دہلوی) کے حوالہ سے کر دیا کہ حضرت کی اِس بارہ میں کیا تحقیق ہے؟ جواب ملا؟

"میں اِن تحقیقات کی کیا لیاقت رکھتا ہوں، مگر بے تکلفی حاصل ہوئی کہ اپنے معلومات عرض کر دوں، اِس کو صلوٰۃ مجازاً کہدیا جاتا ہے، اصل میں یہ ایک مجاہدہ ہے، اور مجاہدہ ایک معالجہ ہے، اور معالجہ کے لئے منقول ہونا تو ضروری نہیں، ہاں منہی عنہ نہ ہونا ضروری ہے، سو یہ منہی عنہ نہیں، لیکن اِس وقت امزجہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے، لہٰذا مشائخ نے اِس کو ترک فرما دیا ہے"

"انقیاد و تقلید" کے متعلق ہدایت، اُوپر کے والا نامہ میں مِل چکی تھی، اور نہ ملتی جب بھی اِس کی ضرورت اپنے اندر کے اندر، بالکل واضح و عیاں تھی، لیکن یہاں ایک عجیب پیچیدگی حائل تھی،

مخدوم، خود خادم بنا ہوا تھا، اور جس کا منصب، آمر ہونے کا تھا، وہ فخر و مسرت اپنی ماموریت میں محسوس کر رہا تھا، دیوبند جائیے تو مولانا اسٹیشن پر پیشوائی کو موجود، چلنے لگئیے تو اسٹیشن تک مشایعت پر آمادہ، کھانا کھانے بیٹھیئے تو وہ لوٹا لئیے ہاتھ دھلانے کو کھڑے ہوئے، پانی مانگئے تو گلاس لئے خود حاضر، تانگہ کا کرایہ وہ اپنے پاس سے دیدیں، ریل کا ٹکٹ وہ دوڑ کر لے آئیں، ہوٹل میں کھانا کھائیے، تو بل وہ خود ادا کردیں، سفر میں ساتھ ہو تو بستر وہ کھول کر بچھا دیں، غرض یہ کہ مالی اور بدنی، چھوٹی بڑی خدمت کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی تھیں سب میں، مُرید تو مُراد کے درجہ پر پہنچ گیا، اور جو صاحب امر و ارشاد تھا، وہ چاکری اور حکم برداری میں لگا ہوا! ——
عقل نے سمجھایا کہ اس دیوبندی اشکال کا حل بھی، ان ہی تھانوی "مشکل کشا" سے کرائیے، دوسرا عریضہ باریک خط کے پورے دو صفحوں پر لکھا ہوا، ان ہی مشکلات کی تفصیلات سے لبریز، اسی ہفتہ کے اندر روانہ ہوگیا۔ اور اُدھر سے جواب بھی بلا تاخیر موصول ہوگیا۔

"آخر میں جواب مشورہ کا معروض ہے اور مشورہ کے قبل اجمالاً اتنا اور معروض ہے کہ مولانا کا یہ طرز ہم لوگوں کو مخالفین و معترضین کے روبرو افتخاراً پیش کرکے، موقع احتجاج کرنے کا ہے کہ تم لوگ علماء پر عموماً اعتراض کیا کرتے ہو، دیکھو حقیقی علماء کے یہ نمونے ہیں، جواب مشورہ، اس کی تدبیریں دو ہیں، ایک کثرتِ حاضری، کیونکہ طبعاً کثرت مخالطت سے تکلف کم ہوجاتا ہے، مگر اس تدبیر کا ثمرہ مدت دراز میں ظاہر ہوگا، دوسری چلتی ہوئی تدبیر یہ ہے کہ مولانا کی خدمت میں بے تکلف یہ عرض کردیا جائے کہ یہ صورت، حاضری سے مانع ہوجائے گی، اور حاضری کی ضرورت قابلِ انکار نہیں ہے، اس لئے درخواست کو منظور فرمایا جائے، مگر یہ سب جب ہے کہ مولانا کا یہ طرز طبعی نہ ہو، ورنہ تبدل مشکل ہے، اس صورت میں تیسری تدبیر یہ ہے کہ آپ ہی اس کو گوارا فرمالیں، آپ کا حرج ہی کیا ہے، کیونکہ مختلف طبائع کے مختلف مقتضیات ہوتے ہیں، چنانچہ اس احقر کا طرز طبعی یہ ہے، کہ جس امر میں شبہ بھی ہو کہ دوسرے پر گرانی ہوگی گو وہ خدمت اور تعظیم ہی کیوں نہ ہو، اُس امر کو اختیار نہیں کرتا، جناب نے مشاہدہ فرمایا ہوگا کہ کوئی امر جو

کسی کی آزادی میں مخل ہو نہیں کیا"۔

اِن ہدایتوں پر عمل کہاں تک ہُوا، اور پھر نتائج کہاں تک کامیاب رہے؟ اِس قسم کے سوالات ذہن میں جتنے پیدا ہوں، اُن کے جوابات کا انتظار، اِن اوراق میں نہ فرمائیے ——— "نقوش و تاثرات" کا تعلق، صرف حکیم الامّت رحؒ کے واقعاتِ زندگی سے ہے، دُوسرے سوالات کیسے ہی دلچسپ ہوں، اور دلچسپ ہی نہیں، بجائے خود بجد ضروری سہی لیکن بہرحال اِس موضوع سے بے تعلق ہیں،

یہ نقوش و تاثرات جن پر آج ۱۵-۱۶ سال کے بعد بھی کہنگی طاری نہیں ہوئی، تو عین اُس وقت تو ظاہر ہے کہ بالکل تر و تازہ تھے، تھانہ بھون سے واپسی کے بعد ہی، دوست احباب کے سوالات کا تانتا لگ گیا، کیا دیکھا؟ کیسا پایا؟ کیا دیکھ کر آئے؟ کیا لے کر آئے؟ یہاں جوابات میں کسی بُخل، کسی تکلّف، کسی اخفاء کی کیا ضرورت تھی، آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا، دل نے جو کچھ پایا تھا، سب اُلٹا رہا، کچا پکا، اُگل دیا، مولانا کے فضائل و کمالات کی تھاہ اِتنے عرصہ کے بعد اب کب مل پائی ہے، تو اُس وقت کیا مل سکتی تھی، بڑی "کرامت" سمجھ کر اپنا تجربہ و مشاہدہ یہ بیان کر رہا تھا کہ "وہ تو صاحبِ کشف ہیں، دورانِ گفتگو میں گویا دل کے بھید پڑھ لئے، اور اُن باتوں کا جواب دے دیا جو زبان پر آنے بھی نہیں پائی تھیں"، آج بحمد اللہ مولانا رحؒ ہی کی برکت اور صحبت سے یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ ایمان کی پختگی اور تقویٰ پر استقامت کے سامنے کشف تکوینی یا اشراقیت کی حقیقت ہی کیا ہے، لیکن اُس وقت اپنے خیال میں گویا یہی عین درویشی بلکہ معراجِ درویشی تھی،

غلطیہائے مضامین مت پوچھ!

شُدہ شُدہ یہ خبر حضرت کو بھی ہو گئی ——— لکھنؤ سے تھانہ بھون جانے والوں اور روایت پہنچانے والوں کی کوئی کمی نہ تھی ——— اور شفقت اِس طرف لائی کہ اپنے ایک خادم کو اِس جہل سے نکالا جائے، کسی نئے مضمون کو چھیڑ لینے کی عادت، مکتوباتِ گرامی میں عام طور سے نہ تھی، لیکن یہ صورت خاص تھی جس مکتوب کا طویل اقتباس اُوپر درج ہو چکا ہے، اسی میں ارشاد ہُوا ہے:۔

"میں نے دو واسطے کی سند سے سُنا کہ جناب کو مجھ پر صاحبِ کشف ہونے کا گمان ہے، سو اِس کی نسبت عرض ہے کہ مَیں ایسا بے تکلّف ہوں کہ اگر بات صحیح ہوتی تو فوراً اس کا اقرار، بلکہ دعویٰ کرنے میں بھی تکلّف نہ کرتا، اب بے تکلّف عرض کرتا ہوں کہ یہ امر بالکل خلافِ واقعہ ہے، اگر آپ اجازت دیں تو مَیں حلف کے لئے آمادہ ہوں، میرے پاس تو بڑا ذخیرہ اہلِ دل کی محبّت کا ہے، اور دونوں طرف سے"

جہل اور عقیدت میں غلو بھی کیا چیز ہوتی ہے! ذہن حضرت کے اِس انکارِ صریح سے بھی متاثر نہیں ہُوا، دل میں تو وہی جما ہوا تھا کہ کشف مرتبہ انتہائی عظمت کا ہے، اِس لئے اِس مقام سے انکار اور تبرّی حقیقت پر نہیں، صرف تواضع و انکساری پر محمول کی جا سکتی ہے! یہاں تک کہ حضرت کی صریح آمادگی حلف پر بھی نظر نہ گئی، بلکہ اور تو اور، خود اس اطلاع و خبر کو بجائے درمیانی واسطوں اور راویوں کی روایتوں کے، حضرت کے کشف ہی پر محمول کیا! "دل کس قدر روشن ہے، اپنی روشن ضمیری سے میرے اِس عقیدہ کو سیکڑوں میل کے فاصلہ سے دل کے اندر بھانپ لیا!" ——— انسان کا نفس جب تاویل کرنے پر تُل جائے تو کوئی دلیل نقلی یا عقلی، آج تک اُسے مطمئن کر سکی ہے؟

بے تمیزی کے ساتھ، اُسی ہفتہ ایک طویل خط میں حضرت کی اِس تبرّی کی پوری تردید لکھ ماری، خلاصہ یہ کہ "مَیں نے جو رائے قائم کی تھی وہ کسی دعویٰ اور بیان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے تجربہ و وجدان کی بنا پر، اور اس میں ضعف و تزلزل جبھی پیدا ہو سکتا ہے، جب اپنے تجربہ و وجدان کی غلطی ظاہر ہو جائے، کسی متقی نے آج تک کبھی اپنی زبان سے اپنے کو متقی کہا ہے، اور اپنے تقویٰ کے باب میں تو ضعیف ترین شہادت اُس متقی ہی کی رہے گی، اور پھر یہ مسئلہ تو مَیں نے جناب کی خدمت میں تصویب یا تغلیط کے لئے پیش بھی نہیں کیا تھا، مَیں بالفرض غلطی پر بھی ہوں، تو جناب تصحیح کی زحمت اپنے سر کیوں لیں؟"

(۷)

جہل و نادانی کا دَور بھی اللہ کی بڑی رحمت ہے، اپنے محل پر، اور بعض حالات میں چھوٹے بچے نادانی کی عمر میں کیسی کیسی گستاخیاں اپنے بڑوں سے کرتے رہتے ہیں، اور معاف ہوتے رہتے ہیں۔

حشر میں کتنوں کی شفیع اُن کی "نادانی" ہی بن جائے گی، ــــــ اسی نادانی نے ایسے خط کی جسارت پیدا کر دی تھی،

خط کا آغاز اُس مضمون سے تھا، خاتمہ اس سوال پر تھا، طُول طویل ڈھیلی ڈھالی عبارت میں "سلسلۂ چشتیہ کے دو ہمعصر اکابر نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور علاء الدین صابر کلیریؒ میں باہم نسبت تفاضل کیا ہے؟ اپنی کوشش تو حضرت دہلوی کی جانب ہوتی ہے، حالانکہ فضائل، حضرت صابر کے بھی بہت سے سننے میں آئے ہیں" سوال ایک خواب کی لپیٹ میں تھا، خط کے اوّل و آخر، دو مضمون یہ ہو گئے، درمیانی مضمون باقی رہا۔

عقیدت میں اب ایک صاحبہ بھی شریک ہو گئی تھیں، "صاحبہ" محض اُردو محاورہ میں نہیں، اصطلاح قرآن میں بھی عمر کی رفیق، ازدواجی زندگی کی شریک، ۱۲ سال کی مُشترک زندگی کا ثمرہ، دو لڑکیاں تھیں، کئی اولادیں "ذخر" اور "فرط" اور "شافع" "مشفع" بن کر وطن اصلی کو روانہ ہو چکی تھیں، سب سے آخری بچہ کا داغ بالکل تازہ تھا، ماں بلبلا اُٹھی کہ اتنا شدید صدمہ برداشت کس طرح ہوگا، اور کہیں طبعی محبت، ایمانی علاقوں پر غالب نہ آ جائے، مائیں اولاد کے حق میں بیتاب اور بے قرار سب ہی رہتی ہیں، بعضوں کے ہاں یہ تعلق اور بھی قوی تر و شدید تر ہوتا ہے، یہاں یہی کیفیت تھی، اور خیال دُرزۂ گذرا کہ کہیں یہ وفورِ تعلق معصیت نہ سہی، مقارب معصیت نہ بن جائے، خط کا درمیانی یا تیسرا مضمون یہی تھا، سوال اپنی طرف سے نہیں، ان ہی صاحبہ کی طرف سے تھا، اور درخواست دُعا در تدبیر دونوں کے لئے تھی ــــــ مولانا اب "ڈراؤنے" نہیں رہے تھے، ہیبت ایک خاصی حد تک اُنس ہی بدل چکی تھی، دیہاتی زبان میں "ہیاؤ" کُھل چکا تھا، کم سے کم تحریر کے حدود تک، اور مُرشد سے سوالات صرف اوراد و وظائف، اشغال و اذکار ہی کے نہیں، خانگی زندگی کے جُزئیات سے متعلق بھی آزادی اور بے تکلفی سے ہو چلے تھے،

عریضہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو روانہ ہوا تھا، جواب ۳۰ر اکتوبر کو ڈاک میں پڑ گیا، مدلّل، مکمل، مفصل۔ مدلل و مکمل تو معمول کے موافق، اور مفصل، معمول سے زائد ــــــ حضرت کی ڈاک میں خط بیماکی

تعداد ڈاکائیوں میں نہیں درجنوں میں روز ہوتی تھی، پھر نہ کوئی محرّر نہ منشی، نہ نظام اوقات میں اس مد کے لیئے کسی علیحدہ مخصوص وقت کی گنجائش، دوپہر کو ڈاک آئی، بعد ظہر، حضرت مجلس عام میں بیٹھے ہوئے ہیں، اچھا خاصا مجمع لگا ہُوا ہے، مُریدین و مُسترشدین کے علاوہ بے تکلّف احباب کی بھی ایک تعداد خاص، باتیں ہر قسم کی ہو رہی ہیں، سوالات جوابات کا سلسلہ قائم۔ تعویذ مانگنے والوں کو نقش، گنڈے، تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں کہ اسی عالم میں وُہ ڈاک کا انبار بھی کھُلتا ہے، ایک ایک خط خود پڑھتے ہیں، خود ہی جواب لکھتے ہیں، خود ہی لفافہ بند کرتے ہیں، کوئی کہے یا نہ کہے، مَیں تو اسے ایک قسم کی کرامت ہی کہوں گا، کرامت حاضر دماغی کی، جواب کافی و شافی، جامع مانع تو ہمیشہ ہوتے ہیں، البتہ مفصّل ذرا کم ہی ہوسکتے ہیں، اس عریضہ کا جواب خلاف معمول مفصّل بلکہ مطوّل، جواب ابھی آگے آرہا ہے، اقتباس و انتخاب نہیں، اصل جواب من وعن اوّل سے آخر تک:۔

"مشفقی مکرّم دام لُطفہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ معلوم نہیں کیوں آپ کئی روز سے یاد آرہے تھے، اور زیادہ یاد آرہے تھے، حتیٰ کہ جب ضبط نہ ہوتا تھا، تو زبان سے بھی دُوسروں کے سامنے تذکرہ کرنے لگتا تھا، اور عجب بات یہ ہے کہ وہ سب میرے ساتھ دِل سے موافقت کرتے تھے، اور دلچسپی لیتے تھے، مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کا سبب آپ کا یاد فرمانا ہے، جس کی علامت خط کا آنا ثابت ہُوا، خط سے بہت مسرّت ہوئی، اور بے اختیار یہ واقعہ بھی قلم پر آگیا اور آنے کے بعد ہی یہ کھٹک ہوئی کہ کہیں زبردستی اس کو بھی کشف کی ایک دلیل نہ بنا لیا جائے جس کے اثبات ونفی میں، میرا اور آپ کا اختلاف ہورہا ہے، مگر اب میں اپنے دعویٰ نفی پر اس لئے زور نہیں دیتا کہ مَیں نفی کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا ہوں، اب دعوے اثبات میں میرا کوئی ضرر نہیں، اگر خلاف واقعہ اعتقاد رکھنے کا کوئی ضرر ہو تو اعتقاد رکھنے والے اس کے ذمہ دار ہیں۔ میرا تو فائدہ ہی ہے ایک صاحب دِل کی محبّت کے برکات مجھ کو حاصل ہو رہے ہیں، اگر کوئی تاجر اپنے متاع کا عیب بتلا دے اور مُشتری اُس عیب کی نفی کرکے اُس کو خرید لے تو بائع معصیت سے بچ گیا، اور اس کو کھرے دام مِل گئے، یہی حالت بعینہٖ اس اختلاف کی بھی ہے، مجھ کو طبعاً مناظرہ سے

خصوص دوستیں کے ساتھ مناظرہ سے ابار رہا ہے، ورنہ میں تقوی پر قیاس کا جواب عرض کر سکتا تھا کہ تقوی تو ایک کمال ہے۔ اُس کا دعوی، خود ایک نقص ہے، اِس لئے وہ دعوی مسدوع نہیں ہو سکتا، بہ خلاف کشف کے کہ وہ کوئی کمال نہیں، اس کا دعوی ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ میرے سر پر بال نہیں، تو اس نفی کو تواضع پر محمول نہ کریں گے اور اس کی نفی کو قبول کرلیں گے یہ کشف ہے حقیقت کا، لیکن اس کی تسلیم پر آپ مجبور نہیں، بس یہ قصّہ تو ختم ہوا، اور مجھ کو اپنے حلفی دعوی پر پھر بھی، اور آپ کو اپنے خیال پر قائم رہنے کا حق حاصل ہے"

یہ ایک ٹکڑا مکتوب اشرف کا ہوا، ابھی دو ٹکڑے اور باقی ہیں، اور آپ کی نظر سے گذریں گے۔ ابھی اور فی الفور نہ سہی، کچھ تھوڑے سے انتظار، اشتیاق بڑھانے والے انتظار کے بعد سہی، لیکن ان تک پہنچنے سے قبل، ذرا اسی جزو پر مکرّر نظر کر لیجیئے۔ گھاٹے میں نہیں، نفع ہی میں رہیئے گا، غور کرنے سے لذّت و حلاوت کم نہیں ہوگی، بڑھ ہی جائے گی،

کیسے ظالم اور بیدرد تھے وُہ، جنھوں نے مولانا کو خشک اور عبوس مشہور کر رکھا تھا، اور کیسے بدنصیب تھے وُہ، جنھوں نے خشونت کی روایتیں اور حکایتیں سُن سُن کر، اپنے کو اس آیۂ رحمت تک پہنچانے سے محروم رکھا، دُنیا میں افسانہ بھی کیسا پھیلتا، اور کیسا پھُولتا ہے!

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

(۸)

یہ مکتوب گرامی کا ادھورا رہنا تو کھل گیا، طبیعتیں جھنجھلائیں، بھنائیں، دست بستہ معافیوں اور معذرتوں کے ساتھ اب دُوسرا جزو معاً اور بلا توقف حاضر خدمت ہے:۔

"گھر میں کی کیفیت قلبی تعلق بالا ولاد کی معلوم ہو کر سچے دل سے اور بصیرت سے اُن کو مومن کامل ہونے کی بشارت دینے کو جی چاہتا ہے، اوّل تو اولاد کی محبّت موافق سُنّت کے سبب موجب اجر ہے رہا درجہ افراط کا، وہ بھی خلافِ سُنّت جب ہے کہ اُس کے کسی مُقتضائے غیر مشروع پر اختیار سے عمل ہونے لگے، اور اگر کوئی مقتضا مشروع ہو یا غیر مشروع ہی ہو مگر اس کا بلا اختیار صدور نہ

ہو جائے، تو بالکل قابلِ ملامت نہیں، اور اس اقتضائے غیر مشروع کو اگر روک لیا تو مجاہدہ کا اجرِ عظیم مزید براں، اور انصاف بالسنت اور مجاہدہ دونوں کا علامات ایمان کامل سے ہونا ظاہر ہے،

اور اگر نفسِ محبّت کے مندون ہونے کی تحقیق ان کے جی کو نہ لگے تو کم از کم اتنا تو مان لینا ضروری ہوگا کہ ایسی محبت، بلکہ اگر اس سے بھی نا ئہ ہوتی تو مذموم نہیں، یعنی شریعت مطہرہ نے اِس پر کوئی عتاب نہیں فرمایا، اور ہم محتاجانِ نجات کے لئے یہی کافی ہے کہ عقاب وعتاب سے بچ جائیں، گو درجات نصیب نہ ہوں اور اس دعوے کی توضیح یہ ہے کہ شریعت میں مواخذہ امورِ اختیاریہ پر ہے، چنانچہ نصِّ قطعی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا اس پر شاہدِ بیّن ہے، اور یہ اختیاری نہیں اِس لئے قابلِ مواخذہ نہیں، البتہ طبعی کُلفت اور نفسانی تألّم اس میں ضرور ہے، تو اوّل تو شریعت نے ایسی کُلفتوں کی ذمّہ داری نہیں فرمائی، لیکن کس قدر رحمت ہے کہ باوجود ذمّہ داری نہ کرنے کے پھر بھی تبرعاً اس کی بھی تدبیر بتلادی وہ یہ کہ حق تعالیٰ سے تعلّق قوی کیا جائے، اس سے سب تعلّقات ضعیف ہو جائیں گے، اور کُلفت کا احتمال ہی نہ رہے گا، یعنی کُلفت موذیہ نہ رہے گی، گو ضعیف درجہ میں رہے، جو مضر نہیں، اور حق تعالیٰ کے ساتھ تعلّق بڑھانے کے طریق مشہور ومعلوم ہیں، یہ سب اُن کو سمجھا دیجئے، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ خود اس مضمون کو سمجھتے ہی، محبّت میں اعتدال پیدا ہو جائے گا، اور اگر تقویّت تعلّق مع الحق کی تدبیر میں لگ گئیں تو بالکل ہی غُبار رہٹ جائے گا۔"

یہ ایک نجی مکتوب تھا، یا ایک مُستقل درسِ معرفت وتصوّف؟ کتنی باتیں کام کی، اور کتنی گہری حقیقتیں مکتوب کے ان دونوں اجزاء کے اندر آگئیں، آج یہ صداقتیں، بالکل مُسلّم نظر آرہی ہیں، ان پر ایمان ہے، اُس وقت آج سے ۳۵ سال قبل، بالکل نئی اور انوکھی باتیں تھیں، کان پہلی بار ان اصولی حقائق سے آشنا ہو رہے تھے، خوش نصیب تھا وہ مکتوب الیہ، جو ان حقائق سے نوازا گیا، بدنصیب تھا وہ مخاطب، جسے اُس وقت اِن علوم کی قدر تو کیا ہوتی، اپنے جہل ونادانی سے معمولی شُکریہ ادا کرنے کی توفیق نہ ہوئی ——— علوم کی دولت جو گھر بیٹھے اور آسانی سے مِل جاتی ہے اُس کی قدر دُنیا میں، کب اور کس کو ہوئی ہے!

مکتوب مبارک کے دو جزو، دو سوالوں کے مستقل جوابات درج ہو چکے، اب تیسرا جزو، حاضر ہے، عریضہ کے تیسرے سوال کے جواب میں اصل سوالات اگر پیش نظر نہ ہوں، تو ٹھنڈا پانی بغیر پیاس کے، لذیذ کھانا بغیر بھوک کے رہے گا، اس لیے ورق اُلٹ کر نمبر (۷) کا پہلا پیراگراف پھر پڑھ لیجئے، اور اس کا یہ فقرہ بھی رہ نہ جانے پائے کہ "سوال ایک خواب کی لپیٹ میں تھا"

"خواب نہایت مبارک ہے، اور اثر ہے باہمی مناسبت کا، اور بدرجۂ رجا موثر ہے زیادت مناسبت میں، باقی تحقیق سوال کی دوسرے پرچہ پر معروض ہے" والسلام، اشرف علی از تھانہ بھون، ار ج ۱۳۴۲ھ

خط کا کاغذ دونوں طرف بھر چکا تھا، اس لئے ضرورت دوسرے پرچہ کی پیش آئی، نقل مطابق اصل اس کی بھی ملاحظہ ہو:-

"(بقیۂ مضمون خط) اصل یہ ہے کہ ہر گُل را رنگ و بوئے دیگر است، اور ہر گُل اپنی جگہ محبوب ہے، اور اُس کی خوشبو بھی اپنی جگہ مرغوب۔

به گوشِ گُل چه سُخن گفتۂ که خندان ست　　　به عندلیب چه فرمودۂ که نالان ست

حضرت مخدوم صاحبؒ پر سُکر غالب تھا، اور اُن کے لئے یہی مناسب تھا، اور سُکر کے یہی آثار ہیں جو اُن کے نقد وقت تھے، اور حضرت سلطان الاولیاءؒ پر صحو غالب تھا، اور اُن کے لئے یہی مناسب تھا، اور صحو کے لئے یہی آثار ہیں جو اُن کے نصیب حال تھے، اب رہ گیا مسئلہ تفاضل کا، سو جب حدیث میں ہے، لَا تفاضلوا بین انبیاء اللہ، اسی طرح اِس حدیث کی ایک فرع ہے لا تفاضلوا بین اولیاء اللہ، مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء میں تو دلائلِ وحی کی بنا پر تفاضل کی اجازت ہے، رائے سے تفاضل ناجائز ہے، اور اولیاء میں جب ہوگا رائے سے ہوگا، اِس لئے علی الاطلاق ناجائز ہے اور یہ سب تحقیق متعلق اعتقاد اختیاری کے ہے۔ باقی محبّت، وہ غیر اختیاری ہے، وہ اگر فرضاً مفضول کے ساتھ زیادہ ہو، افضل کے ساتھ کم ہو، تب بھی جائز ہے"

سن کے اضافہ کے ساتھ سنہ و سال کے انقلابات کے ساتھ دِل و دماغ پر کیسے کیسے دور گذرتے رہتے ہیں، اور جگ بیتی تو جگ پر چھوڑیئے، کم از کم آپ بیتی تو یہی ہے ایک سِن الحاد

عقلیت، لا مذہبیت کے زور کا تھا، پھر تصوف نے مذہب کی راہ دکھائی، بات کچھ سمجھ میں آئی، کچھ نہ آئی، ٹھنڈی، نُبک، خوشگوار، جان بخش ہوا اپنے ساتھ کچھ خس و خاشاک کوڑا کرکٹ بھی لگا لائی، تصوف آیا تو بدعاتِ تصوف لئے ہوئے، نور دھوئیں کے پھندے میں! لطیف کثیف کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ہوئے! عقلیت گئی تو "خوش عقیدگی" یا ضعیف الاعتقادی آئی، دل دین سے زیادہ "بزرگانِ دین" سے اٹکا ہوا، اور اہل حال کے ذوق و وجدان کی اہمیت دماغ پر، دین کے حقائق اور اصول سے کچھ زیادہ ہی بیٹھی ہوئی ——— زندگی کے عین اسی دَور میں توفیق الٰہی نے رسائی آستانۂ اشرفی پر کرادی قدرۃً سوال و جواب زیادہ تر ان ہی مباحث پر رہے، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی تاریکیاں اسی واسطہ سے دُور ہوئیں اور کتنی اُلجھنیں، اسی ذریعہ سے سُلجھیں ——— دریاآباد سے سہارنپور کا سفر کچھ ایسا آسان اور مختصر نہیں، اکسپریس سے بھی، ۱۲-۱۴ گھنٹے لگ جاتے تھے، اور کرایہ بھی اسی مناسبت سے۔ ساڑھے تین سو میل کی مسافت کچھ تھوڑی ہوتی ہے؟ اور پھر تھانہ بھون تو سہارنپور سے بھی کوئی ۳۰-۳۵ میل اور آگے اور اتنا راستہ بڑی لائن سے نہیں، چھوٹی سے بھی چھوٹی لائن (لائٹ ریلوے) سے طے کرنا! جولائی کے اُس پہلے سفر کے بعد دوبارہ جانا ہمت مُشکل ہی سے ہو رہی تھی، حالانکہ شوق روز افزوں تھا اور جی میں یہ تھا کہ اب کی سفر تنہا نہ ہو، بلکہ جو رفیق زندگی ہے، وہ رفیق سفر بھی ہو، تائیدِ غیبی دیکھئے کہ عین اسی وقت بھائی صاحب کا تبادلہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر، یوپی کے مشرقی ضلعوں سے یک بیک سہارنپور کا ہو گیا، اور اس نے سفر اور قیام کے مرحلہ کو کچھ نہ کچھ آسان تو ضرور ہی بنا دیا ——— پست ہمتوں کی دستگیریاں کن کن حکمتوں اور لطیف تدبیروں سے کی جاتی ہیں! اور بزدلوں کی ہمت افزائیاں، کس کس لطف و مرحمت سے ہوتی رہتی ہیں!

نومبر کا مہینہ تھا، چند ہفتے بعد سفر کی ٹھن گئی، ۱۴ر نومبر کے عریضہ میں چند باتیں عرض کیں حسب معمول طوالت بیانی کے ساتھ پہلی تو یہ کہ پچھلا افتخار نامہ پا کر دل آب آب ہو گیا، دُوسرے جوار کے ایک اسم بامسمّی بزرگ مولانا عابد حسین فتحپوری مرحوم کی عنایتوں اور شفقتوں کا ذکر، تیسرے یہ ڈر کہ کہیں

اہل اللہ کی یہ خواہ مخواہ کی شفقت و توجہ، اپنی ناقدر شناسی کی بنا پر وجہ عتاب نہ بن جائے، چوتھے مزار حضرت محبوب الٰہیؒ دہلوی پر حاضری کے سلسلہ میں خود اُن کے مزار اور پھر امیر خسروؒ سے تاثر خاص، پانچویں اس تاثر خاص کے موقع پر مفاد ملت و فلاح اُمت کی دُعاؤں کے ساتھ ساتھ چند مخصوص اشخاص کے لئے بھی دُعائیں بشمول حضرت مولانا۔ چھٹے مخدوم صابر کلیریؒ کے مزار پر حاضری کے وقت اس تاثر میں بہت کمی، شاید اس لئے کہ عین اُس وقت بعض شریعت شکن حرکتوں پر نظر پڑ گئی تھی، ساتویں چند روز بعد میاں بیوی دونوں کا قصد تھانہ بھون، اور قیام کے لئے حضرت کے حفظ اوقات کے خیال سے، اُن ہی کے ایک عزیز کا انتخاب، جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے اور ایک مکان اُن کا تھانہ بھون میں بھی تھا، جواب ہر بات کا نمبر وار پڑھیئے کہ اسی لئے تو اپنی ہر بات کو یہاں گن گن کر لکھا ہے:۔

"مجبی و محبوبی دام لطفہم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

کل جمعہ کے سبب جواب کا وقت نہ ملا، معاف فرمائیے گا۔

۱۔ یہ سب آپ کی محبت ہے جس کی میرے دل میں خاص قدر ہے اور آپ سے خاص محبت ہے ایک تو آپ کی محبت کے سبب، دوسرے آپ کی بے تکلفی، انکسار و توافق ظاہر و باطن کے سبب، میں اس مذاق کو ڈھونڈتا ہوں اور کم ملتا ہے، آپ میں پایا اور محبت ہوگئی، آپ پر کوئی احسان نہیں۔

۲۔ میں نے گو اُن کی زیارت نہیں کی، مگر میں اُن کو اپنے زمانۂ قیام کا نہیں سے جانتا ہوں۔

۳۔ ایسا خوف تو لوازم ایمان سے ہے اور ماشاء اللہ آپ نفع بھی اُٹھا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ترقی فرما دے اور جب آپ کا یہ خیال ہے انشاء اللہ تعالیٰ عمل میں بھی ترقی ہوگی۔

۴۔ (الف) مناسبت کا بھی اثر ہے، اور خیال کو بھی دخل ہوتا ہے، مگر ایسا خیال بھی مطلوب ہے۔

(ب) میرے خیال میں یہ بھی حضرت محبوبؒ الٰہی کا اثر ہے کہ امیر خسروؒ اُن کے محبوب اور محب تھے۔

۵ اداے حق محبت عنایت ست ز دوست
دگرنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خرسند است

۶۔ توبہ توبہ۔ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کی اصلاح فرمائے، یہ بھی سبب محتمل ہے، اور فطری مناسبت سے بھی کمی وبیشی ہوتی ہے۔

۷۔ (الف) دوہری مسرّت ہوئی، اللہ تعالیٰ بخیر لائے۔

(ب) اگر آپ میں صرف محبّت ہی کی صفت ہوتی تو مَیں بھی اِس تجویز سے موافقت کرتا، لیکن جب خُدا تعالیٰ نے دوسری صفت بھی عطا کی ہے، یعنی بے تکلّفی، تو اب یہ توافق سے مانع ہے، آپ ایسا پُوچھتے ہیں، مَیں تصریح کرتا ہوں کہ آپ اور آپ کی رفیقِ زندگی آئیں، اور میرے اور میری اہلِ خانہ کے مہمان بنیئے، اِن کو اُن سے ملنے کا اشتیاق ہے، باقی اوقات کا قصّہ تو میرے بزرگوں کی تعلیم ہے کہ بعد مشغولی فرائض کے، سب سے اچھا وہ وقت ہے جو احباب کے پاس گذرے، اور فرائض میں مَیں اور آپ دونوں شریک ہوں گے، پھر حرج اوقات کیسا اور ڈپٹی صاحب خود ہی مہمان ہوں گے، اُن کو میزبان کون ہونے دے گا،

ع ۔ بیا بیا و فرود آکہ خانہ خانۂ تُست

دُوسرے مصرعہ کا شاید غایت تواضع سے آپ تحمّل نہ کرسکتے۔ والسلام۔ اشرف علی"

(۹)

دِن اور تاریخ تو بھلا اب کہاں یاد، آخر نومبر یا شروع دسمبر تھا، سنہ وہی ۱۹۲۸ عیسوی کہ ہم میاں اور بیوی معہ ایک خادم نما رفیق کے، تین آدمیوں کا مختصر سا قافلہ بنائے ہوئے، دِن میں کوئی ۱۰ بجے کے قریب، تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اُترے، اسٹیشن اب کی تھانہ بھون نہیں، تھانہ بھون ٹاؤن تھا، اسٹیشن نہیں، اسٹیشن کا دھوکا! نہ پلیٹ فارم اُونچا یا نیچا کسی قسم کا نہ بڑی چھوٹی، پکّی کچّی کسی قسم کی عمارت یا سائبان، ایک چٹیل میدان، گاڑی چلتے چلتے بس وہاں دم کے دم رُک جاتی، اسے دھوکا نہیں تو آخر حقیقت کیسے کہیئے، بات ذرا قصہ طلب آگئی، سمجھ لیجیئے تو آگے بڑھیئے، (تھانہ بھون سے جو ریل (لائٹ ریلوے) گذری ہے، اپنی چال ڈھال میں اپنی مثال آپ! ع

اے ہم نفس نزاکتِ رفتار دیکھنا

لیکن بہرحال جیسی کچھ ہے ریل تو ہے، مولاناؒ کی بڑی تمنا ایک زمانہ میں تھی کہ ریل اُن کے قصبہ سے گذرے تمنا پوری ہوئی، اور ریل جاری ہوئی، لیکن تھانہ بھون کے نام سے جو اسٹیشن بنا، وہ اصل قصبہ جہاں سے شروع ہوتا ہے، اُس سے کوئی دو میل اُدھر ہی، حالانکہ لائن جو گذری وہ مولانا کی خانقاہ اور مسجد سے کُل دو فرلانگ پر! عجب پُرحسرت منظر تھا کہ دہلی کی طرف سے آنے والے پاس سے گذرتے چلے جاتے، اور اُترتے کہیں دو میل دُور جانے کے بعد، اور وہاں سے جنگل طے کرتے ہوئے خراب خستہ آستانِ اشرفی پر حاضر ہو پاتے، اسی طرح سہارنپور کی طرف سے آنے والوں کو دو میل قبل ہی اُتر پڑنا پڑتا!

مولانا کو بڑی فکر اب اس کی ہوئی کہ اسٹیشن کاش قریب بنتا، یعنی اسٹیشن تو تھانہ بھون کے نام کا تھا، لیکن تکلیف پھر بھی قائم رہی ——— چاند ہو گیا اور عید ہے کہ پھر بھی فوراً نہ آئی ——— دُعا اور کوشش دونوں اس پر صرف ہونے لگیں کہ دُوسرا اسٹیشن، چھوٹے سے چھوٹا سہی، خانقاہ کے محاذ میں بن جائے ——— دُعا قبول ہوئی، اور کیوں نہ قبول ہوتی، اللہ نے وہی چاہا، جو اُس کے ایک مقبول بندہ نے چاہا تھا،

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مُرادِ مُتقین

یا یُوں کہہ لیجئے کہ مقبول اور اطاعت شعار بندہ بھی وہی چاہنے لگتا ہے، جو اُس کے مالک و مولیٰ کا چاہا ہوا ہوتا ہے، بہرحال قبولیتِ دُعا کا پہلا ثمرہ یہ ہُوا، گاڑی اُسی مقام پر رُکنے لگی، اور اُسی کا نام عارضی اسٹیشن پڑ گیا، حضرت کو اس میں اس درجہ دلچسپی تھی کہ اس عارضی اسٹیشن کو مُستقل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں اُن میں برابر حصّہ لیا، خود دُعا کی، خانقاہ کے ذاکرین و شاغلین سے باضابطہ دُعائیں کرائیں، اور ٹریفک منیجر کے نام خطوط بھیجنے کی جو تحریک خانقاہ ہی سے جاری ہوئی، اُس پر اپنے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے ——— دُنیا والوں کی راحت رسانی کی کوشش کرنا، دینداری کے منافی نہیں، یہ تو عین دین ہے، لیکن دُنیا ہے کہ درویشی و طریقت کو "جوگ" یا زیادہ سے زیادہ

استغراق کے مُرادف سمجھنے پر مُصر ہے!

۱۸ر نومبر ۱۹۲۸ء کو یہ عارضی اسٹیشن کھلا، ایک گنہگار نے مولانا کی مجلس میں بیٹھ کر اُس کا نام "تھانہ بھون شریف" تجویز اتھا، لیکن حضرت نے تبسّم کے ساتھ اُس سے اختلاف کیا، اور "تھانہ بھون ٹاؤن" سے اتّفاق کیا، اور چند ہی روز گذرے تھے کہ میاں بیوی کا یہ قافلہ اِسی اسٹیشن پر وارد ہوا ـــــ کم ہمتّوں کی ہمتّیں کیسی کیسی بندھائی جاتی ہیں، اور آرام طلبوں کے لئے راحت کے کیسے کیسے سامان غیب سے بہم پہونچا دیئے جاتے ہیں ـــــ سواری کا انتظام، ایک خادمِ خاص کی نگرانی میں، مولانا کی طرف سے اسٹیشن پر موجود، کہ آنے والے مُسافر کو زحمت کسی قسم کی بھی نہ ہونے پائے، لیکن وہ مُسافر کم نصیب اپنے ضُعف قلب وضُعفِ ہمّت کو کیا کرے، راستہ بھر دھڑکا یہی لگا رہا کہ دیکھئے اب کیا صورت پیش آتی ہے، آنا گو ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا، لیکن اُس وقت مولانا حسین احمد صاحب کی معیّت میں تھا، اور صرف چند گھنٹوں کے لئے تھا اب کی ساری ذمّہ داری، اپنے ہی اُوپر تھی، ذمہ داری اپنی ہی نہیں، ساتھ والی صاحبہ کی بھی، اور پھر قیام کی مدّت بھی اب کی بجائے چند گھنٹوں کے دو چار دن کی تھی، یا اللہ یہ دن خیریت سے کٹ جائیں، ایسا نہ ہو کہ اپنی کسی بے تمیزی سے حضرت کو ناراض کر دیا جائے، دُعائیں کیں بھی خوب اور پڑھیں بھی خوب راستہ دُعائیں کرنے اور پڑھنے میں کٹ گیا ریل سے قدم جب اُترے ہیں تو کچھ عجب نہیں کہ جاڑے کے موسم کے باوجود، پیشانی پر پسینے کے قطرے بھی رہے ہوں۔

زنانہ کو حضرت کے زنانہ مکان سے بالکل متصل ایک مختصر سے علیحدہ گھر میں اُتار، حاضری مولانا کی خدمت میں دی، نشست حسب معمول خانقاہ کی سہ دری میں تھی، (کسی پچھلے نمبر میں دیا ہوا جغرافیہ ایسے ہی موقعوں پر کام آنے کا ہے) معمولی مزاج پرسی کے بعد پہلا سوال یہ ہوا کہ قیام کا طریقہ کیا رہے گا؟ آپ یہاں مردانہ مہمان خانہ میں رہیں گے، اور آپ کے گھر میں اُسی الگ مکان میں، یا دونوں یکجا؟ سوال ظاہر ہے کہ بالکل صاف اور مناسب تھا، لیکن جواب دینے میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ پتھر کو پہاڑ پر چڑھانا ہے، لڑکپن کا وہ سماں یاد آ گیا، جب اسکول کے نیچے درجوں میں "انسپکٹر صاحب"

معائنہ کے لئے آتے تھے اور لڑکے تو لڑکے، ماسٹر بلکہ ہیڈ ماسٹر تک تھرّائے ہوتے تھے، کس مشکل سے سارے کھوئے ہوئے حواس جمع کرکے عرض کیا کہ "جیسا ارشاد عالی ہو"۔ جواب معاً لیکن خشونت کے ساتھ نہیں یکسر لطف و شفقت کے ساتھ ملا کہ "ارشاد یہی ہے کہ آپ اپنی زبان سے ارشاد فرمائیں"۔۔۔۔ لیجئے اُمیدوں کا آخری قلعہ بھی مسمار ہوگیا، یا اللہ! اب کیا جواب دیا جائے ۔۔۔۔ آپ ان سطور کو پڑھتے جاتے ہیں اور زیر لب مسکراتے جاتے ہیں، خدا نہ کرے کہ آپ کو ایسی بے بسی اور گھبراہٹ کا تجربہ کبھی ہوا ہو یا آئندہ کبھی ہو، اللہ کا کرنا دیکھئے کہ عین اُسی گاڑی سے سہارنپور سے مولانا عبداللطیف صاحب (صدر مدرسہ مظاہر علوم) اور مولانا محمد ذکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث بھی وارد ہوئے تھے، اور دونوں صاحب، وہیں مجلس میں پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، نووارد کو اس مصیبت میں دیکھ نرم دل شیخ الحدیث کو رحم آگیا، اور حضرت سے مخاطب ہو کر بولے کہ "حضرت یہ تو ظاہر ہے کہ دونوں کو ساتھ رہنے میں سہولت زیادہ رہے گی"، مشکل آسان ہوگئی، اور بات بات کی بات میں ختم ہوگئی، راقم نامہ سیاہ کا ضعف ہمّت تو ظاہر ہی ہے، لیکن بڑی شخصیت کا رُعب اور ہیبت دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے، ہنس جتنا بھی لیا جائے لیکن یاد اس کام کی بات کو بھی رکھا جائے ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبت ایں مردِ صاحب دلق نیست

قیام تین دن رہا، کچھ کم یا زائد، واپسی غالباً چوتھے دن ہوئی، مکان کچھ معمولی ہی سا تھا، مادّی راحت کے سامان کچھ زیادہ نہ تھے، اس پر بھی وہ لطف و سرور کہ الفاظ سے اس کا اظہار دشوار، قناعت کی مطمئن زندگی کا کوئی اندازہ ہی اُونچی حویلیوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے اہل ہوس کو نہیں ہو سکتا، مولانا کی مرتب و منظم زندگی کا نظارہ پہلی بار رہا، حاضری کے اوقات معیّن و مقرر تھے، چاشت سے لے کر قریب دوپہر تک، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے مخصوصین کی حاضری، پھر بعد ظہر سے لے کر عصر تک کوئی دو گھنٹے کے لئے عام نشست، ایک دن قیام گاہ پر قبل عشاء خود بدولت کی تشریف آوری بھی ہوئی، یہ بالکل مخصوص عزت افزائی و کرم فرمائی تھی کہ شاید باہر سے آنے والے کو

کوئی بات رنج ہی کہنے کی ہو اور اس کا موقع عام مجلسوں میں نہ مل رہا ہو + مہمان داری حضرت ہی کے ذمہ رہی، عام وارد وصادر خانقاہ میں مقیم ہو کر اپنا خود ہی کوئی انتظام کھانے کا کرتے تھے، یہاں یہ صورت خاص رہی کہ مولانا نے اپنا مہمان بنائے رکھا۔

گفتگوئیں کن کن مبحثوں پر ہوئیں، مقالات وملفوظات کیسے کیسے سننے میں آئے، اب سولہ برس کے بعد بھلا کسے یاد لیکن ایک سوال وجواب کا نقش دل میں بیٹھا ہوا، حافظہ میں ایسا تازہ کہ گویا کل ہی کا واقعہ ہے، شب کی تنہائی میں، پوچھنے والے نے اپنی سادہ دلی بلکہ سادہ لوحی سے پوچھ لیا کہ "حضرت کوئی ایسا بھی طریقہ ہے، جس سے زندگی میں اپنا مقام بعد موت منکشف ہو جائے؟ سنا ہے کہ بعض بزرگ اپنے مریدوں کو ان کے مقام کا مشاہدہ کرا دیتے ہیں"۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ "ایسا ہی سوال ایک بار میں نے، اپنی کم عمری میں، اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے کر دیا تھا، مولانا نے فرمایا کہ "اجی توبہ کرو، توبہ ایمان چھوڑ کر، کفر کی طلب کر رہے ہو، ایمان کے تو یہی معنی ہیں کہ حالت امید وبیم کے درمیان قائم رہے، انجام کی طرف سے یکسوئی کیسی"؟ اور پھر دو سیکنڈ کے وقفہ کے بعد فرمایا یہ مشاہدہ، کا طریقہ بھی محض ظنی وتخمینی ہے اعتماد کے قابل ذرا بھی نہیں"۔ ——— ارشاداتِ عالی سے زبان نے سکوت تو اسی وقت اختیار کر لیا تھا، دل کو سکون بھی بحمد اللہ ایک عرصہ کے بعد ہو گیا۔

بچہ کی ولادت، کئی بچیوں کے بعد، اسی ۲۸ء کے مارچ (مطابق ماہ رمضان) میں ہوئی تھی، اور قدرۃً ماں، دادی وغیرہ کے دلوں کی کلیاں خوب کھل گئی تھیں، لیکن امانت چند ہی ہفتوں میں واپس لے لی گئی تھی، باپ قسی القلب کو تو خیر، لیکن ماں جس کی گود اولاد نرینہ سے بڑی تمناؤں، آرزوؤں کے بعد بھرنے میں آئی تھی، اور یوں آناً فاناً خالی کرالی گئی تھی، ہک دھک رہ گئی، صدمہ بہت زائد ہوا، اور غم کا بوجھ مہینوں گذر جانے پر بھی ہلکا نہ ہوا ——— سفر تھانہ بھون کے محرکات میں سے ایک چیز یہ بھی تھی۔

حاضری کا دوسرا یا شاید تیسرا دن تھا کہ حضرت نے اعلان فرما دیا کہ کل مسجد میں وعظ ہے، وعظ عموماً اب بہت کم ہو گئے تھے، اور سفر پر باہر جانا تو اب بند ہی ہو چکا تھا، وعظ کا یہ اعلان سن کر

لوگ خوش بہت ہوئے، ساتھ ہی کچھ متعجب بھی، وعظ ہوا، دیر تک ہُوا، حسب معمول خوب ہوا، موضوع اور عنوان تو اب یاد نہیں (چھپ کر شائع ہو چکا ہے) یہ اچھی طرح یاد ہے طبعی غم اور صدموں کا ذکر بار بار آتا تھا، اور طریقے تسکین و تسلّی کے ارشاد ہو رہے تھے ——— وعظ کی غایت سُننے کے بعد یہ کھُلی کہ ایک زخمی دل کی تسکین و دلدہی تھی، اللہ اکبر! اپنے مُخلصوں کے جذبات کی کیسی رعایت اور کیا دلداری تھی۔

واپسی ہوئی تو دل گویا نشہ سے چُور، طبیعت فرحت ونشاط سے معمور، معلوم ہوتا تھا کوئی خزانہ ہاتھ آگیا ہے، کولمبس کو امریکہ دریافت ہو گیا ہے، میاں بیوی کا ساتھ زندگی بھر کا ہوتا ہے، چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن ایسا ساتھ کم ہی نصیب ہوتا ہے، ایسی رفاقت نصیب ہی سے ہاتھ آتی ہے، دونوں اپنے اپنے ظرف وبساط کے لحاظ سے شاد و بامُراد، دونوں اپنی اپنی جگہ مست و مسرور۔ ع

پی کے ہم تم جو چلے جھُومتے میخانے سے!

یہ لفظ بہ لفظ حسب حال! مصرعہ، اس پر نہ جائیے کہ کس بدنام شاعر کا کہا ہوا، کس بدنام گلے سے نکلا ہوا یا کس بدنام گلی میں سُنا ہوا ہے، حسب حال اتنا کہ اجازت مکرّر عرض کرنے کی دیجئے۔

پی کے ہم تم جو چلے جھُومتے میخانے سے!

(۱۰)

اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَتَّخِذُ عِنْدَکَ عَھْدًا لَّنْ تُخْلِفَنِیْہِ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ فَاَیُّ مُؤْمِنٍ اٰذَیْتُہٗ اَوْ شَتَمْتُہٗ اَوْ جَلَدْتُّہٗ اَوْ لَعَنْتُہٗ فَاجْعَلْھَا لَہٗ صَلٰوۃً وَّ زَکٰوۃً وَّ قُرْبَۃً تُقَرِّبُہٗ بِھَا اِلَیْکَ

. . . .

. . . .

. . . .

اے اللہ میں تجھ سے ایک عہد لیتا ہوں کہ تُو ہرگز اس کے خلاف نہ کرے گا، وہ یہ کہ میں بھی بشر ہی ہوں، تو جو کوئی مُسلمان ایسا ہو کہ میں اُسے تکلیف دوں یا اُسے بُرا بھلا کہوں یا اُسے ماروں پیٹوں یا اُسے بد دُعا دوں تو تُو اس سب کو اُس کے حق میں ذریعہ بنادے رحمت اور پاکیزگی اور اپنی طرف قُربت کا کہ اس سے اُسے اپنا مقرّب بنالے!

یہ دُعا اور جناب باری میں استدعا محض "بشر" کی نہیں سیّد البشرؐ کی زبان سے نکلی ہوئی ہے، عرض یہ ہو رہی ہے کہ میں بھی آخر بشر ہی ہوں، غصّہ میں کسی کو مار سکتا ہوں، پیٹ سکتا ہوں، سخت سُست، بُرا بھلا کہہ سکتا ہوں، بہرحال جب کبھی بھی میری زبان یا ہاتھ سے اس طرح کی لغزش ہو جائے، تو آپ تو ہر طرح صاحب اختیار ہیں، اپنی رحیمی اور کریمی کے طفیل میں بس اتنا کر دیا کیجئے کہ میری ہر زیادتی کو اس مظلوم مُسلمان کے حق میں ایک رحمت بنا دیجئے، اس کے گناہوں کو دھو دیجئے، اس کے مراتب قُرب بڑھا دیجئے، غرض یہ کہ ایسا کچھ کر دیجئے کہ وہ بیچارہ نقصان میں نہیں، نفع میں رہے، کچھ کھوئے نہیں، کچھ پا ہی جائے، ضایع نہ کرے حاصل ہی کرے! ؏

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے،

قُربان رحمت عالمؐ کی اس شانِ رحمت کے۔ ؏

لُطف و قہر او سراپا رحمتے!

اب کی جو تھانہ بھون پہنچا اور تین دن کا رہنا ہوا تو ہاتھوں میں چھپا ہوا ایک دو ورقہ نظر آیا، دُوسرے کے ہاتھوں میں چلتا ہُوا، دست بدست گشت کرتا ہُوا، پہلا عنوان "معذرت از اشرف بخدمت اہل حقوق"، دُوسرا عنوان اس سے جلّی تر "العذر والنذر"—— یہ کیا؟ عام طور سے تو پیروں مُرشدوں مشائخ کے ہاں مضمون تعلّی کے چھپتے رہتے ہیں، کرامتیں اور بزرگیاں ہی پیر صاحب کی بیان ہوتی رہتی ہیں، اشتہار اس قسم کے نکلتے رہتے ہیں کہ آؤ، اور ہمارے پیر صاحب کا دامن پکڑ لو کہ وہ سب گناہ تمہارے بخشوا دیں گے یہاں اِس کے برعکس پیر صاحب اُلٹے خود اپنی تقصیروں کو کوتاہیوں کو گنا رہے ہیں اور ایک ایک سے لجاجت کے ساتھ اپنے ہی قصور معاف کرا رہے ہیں! اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مُجرموں، قصور واروں، ظالموں کو یہ بشارت سُناتے جاتے ہیں:-

"یہ اُمیدِ عفوِ خداوندی میں اپنے حقوق غیر مالیہ جو کسی کے ذمّہ ہوں بلا استثناء سب کو معاف کرتا ہوں، اور حقوق مالیہ میں غیر مستطیع کو اجازت دیتا ہوں کہ مجھ سے خاص طور پر گفتگو کرے، انشاء اللہ کوئی سبیل سہل نکال دوں گا، خواہ معافی، خواہ تخفیف، خواہ مہلت یا کچھ اور"

یا اللہ! بزرگوں سے بھی خطاؤں کا امکان ہے؟ سید البشر کی دعا و مناجات، جواب اسی وسوسہ کا ہے، جب زیادتی و عصیان کا امکان، اُس معصوم نے اپنے لئے تسلیم کرلیا تو پھر غیر معصوم بیچارے کس شمار و قطار میں ہیں؟ کیسی بزرگی، اور کہاں کا تقدس، خاک کے پُتلے کا اصل کمال صرف اس قدر ہے کہ نظر اپنی بے کمالی پر رہے، اور ہزار ہنر کا ایک ہنر یہ ہے کہ نگاہ اپنی بے ہنری پر جائے!

"میرا حقر افقر، اذل ارذل کام کا الثف، تام کا اشرف، تمام اُن حضرات کی خدمت میں جن کا کوئی حق میرے ذمہ ہو، خواہ وہ حق مالی ہو (جس کا احتمال ضعیف و قلیل ہے)۔ ۔ ۔ ۔ اور خواہ وہ حق غیر مالی ہو جیسے کسی کو ناحق کچھ کہہ لیا ہو یا انتقام میں حد مساوات سے متجاوز ہو گیا ہو، یا کسی کو ناحق بدنی ایذاء پہنچائی ہو (اور ایسے غیر مالی حقوق کا احتمال قوی اور کثیر ہے) اُن سب اہل حقوق کی خدمت میں، دست بستہ نہایت لجاجت و سماجت سے درخواست کرتا ہے کہ ان حقوق کا خواہ مجھ سے عوض لے لیں (بشرطیکہ مدعی کا صدق میرے دل کو لگ جائے) اور خواہ حسبۃً للہ معاف فرما دیں، میں ان دو حالتوں میں اُن کا شکر گذار رہوں گا کہ مجھ کو محاسبۂ آخرت سے بری فرمایا، اور معافی کی صورت میں دعا بھی کرتا رہوں گا کہ میرے ساتھ مزید احسان فرمایا"

اقتباس اس دو ورقہ صفحہ ۳ کے شروع سے وسط تک کا تھا، دوسرا اقتباس صفحہ ۴ کے آخر کا ملاحظہ ہو، اور اس کا بیشتر حصہ جلی قلم سے چھپا ہوا تھا:۔

"خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے واسطے، اہل حقوق میری حیات تک خواہ اپنے گذشتہ اور آئندہ حقوق معاف فرما دیں، خواہ شرعی طریق اور شرائط پر اُس کا عوض بالمثل لے لیں، اور حیات کے بعد معاف ہی فرما دیں۔ ۔ ۔ ۔ اب آخر میں ناظرین سے اس دُعا کی درخواست کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ، قبل سفر آخرت تمام حقوق و مظالم سے اداءً یا ابراءً سبکدوش فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرما دے، اور آخرت میں ہر قسم کے مواخذہ سے محفوظ فرما دے۔ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا"

خطاب کے بعد ہی، یہ التماس بھی چھپی ہوئی تھی:۔

خود بھی ملاحظہ فرمائیے، اور جہاں تک ممکن ہو دوسروں کو بھی دکھلا کر ثواب لیجئے، میری حیات

میں بھی اور بعد حیات بھی"

پورے چوصفحے کی نقل کرنے کی گنجایش کہاں، لب لباب آگیا، عنوان پر تاریخ ۲۰ رمضان ۱۳۴۴ھ پڑی ہوئی ہے، انگریزی حساب سے، ۳ر اپریل ۱۹۲۶ء ہوتی ہے، حضرت کی عمر، ہجری حساب سے اُس وقت ۶۴-۶۵ کی تھی، اور سنہ عیسوی سے کوئی ۶۲-۶۳ کی، وفات کوئی سترہ سال بعد، جولائی ۱۹۴۳ء میں ہوئی، کیسا مبارک ہے وہ بندہ جو اتنے روز قبل ہی اپنے کو مولیٰ کے دربار میں حاضری کے لئے یوں تیار کرلے۔

حضرت کی مالی و معاشی حالت اگر کچھ زیادہ اچھی نہ تھی، تو بُری بھی نہیں کہی جاسکتی تھی، بہتوں سے بہتر تھی، متوسط درجہ کے شرفاء کا جو طرز معاشرت ہے، خصوصاً قصبات میں اور شیخ زادوں کے ہاں، حضرت اُسی معیار پر فراغت آسایش سے گو یقیناً بغیر اُس معیار کے اسراف و آرائش کے بسر فرماتے تھے، اولاد کوئی نہ تھی، لیکن محل دو تھے ــــــ جی ہاں بزرگ ہوکر دو، دو محل! معاندین، خوب خوش ہوکر نوٹ کرلیں، طنز و تعریض کے لئے کتنا زبردست حربہ ہاتھ آگیا! ــــــ دونوں کے لئے الگ مکان ایک دوسرے سے فاصلہ پر، ملازم بھی دو تھے، دونوں ایک ایک ڈیوڑھی پر۔ دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابل دید تھا، بجائے خود ایک درس ہدایت، کام کو جب فرماتے تھے تو خوب ٹھہر ٹھہر کر، سمجھا کر۔ اکثر تکرار کے ساتھ فرماتے کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے، ملازمین جب آتے تو حکم تھا کہ زبان سے السلام علیکم کہہ کر (ہاتھ سے سلام کرنے کے عجمی دستور کی گنجایش اس عربی سادگی ماحول میں کہاں تھی؟) قریب آکر بیٹھ جائیں، بات چیت بیٹھ کر کریں، بلا ضرورت کھڑے نہ رہیں، کام کی مشقت کبھی بہت زائد نہ ڈالتے، کام بگاڑتے تو حضرت غصہ بھی فرماتے، اور غصہ کرنا ایسے موقع پر تو امر طبعی ہے، لیکن اس میں بھی حدود کے اندر ہی رہتے، مسجد سے چھوٹے زنانہ مکان کا فاصلہ، اچھا خاصا ہے، لیکن شب میں بعد عشا جب گھر تشریف لے جاتے تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لئے رہتے، کسی ملازم کو اس کے لئے نہ بلاتے، کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی اُن سے فرمادیتے، جس سے اُن کا دل کھل جاتا، برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے، اُن کے کپڑوں، اُن کے بیوی بچوں سب کا

لحاظ رکھتے بلکہ وہ جو ایک بہت قدیم مُلازم، میاں نیاز نامی، بڑے مخلص اور سادہ دل تھے، اُن کا ذکر تو کبھی کبھی نیم مزاحی انداز میں وعظ میں بھی کر دیا کرتے، اور "دہقان" کی "کلاہِ افتخار" آفتاب تک پہنچا دیتے![1]

بزرگوں کی زیارت کا اتفاق اِس سے قبل بھی ہو چکا تھا، لکھنؤ میں مولانا عین القضاۃ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے تارک، زاہد، مرتاض بزرگ تھے، صفی پور (ضلع اناؤ) کے شاہ عزیز اللہ بھی اپنے رنگ میں فرد تھے، وقس علیٰ ہذا، لیکن یہاں کا مضمون ہی کچھ اور تھا، ع

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی، نہ فقر و فاقہ نہ تجرّد، نہ بیوی بچوں کا ترک، اور نہ شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشیخت کے کوئی سے بھی آداب و رسوم۔ بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دُنیا داری ہی کا موجود، اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان، نوکر چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے، لباس خاصہ اُجلا شفاف۔ بڑی زبردست ڈاک کی آمد و رفت، غرض بہ ظاہر ہر طرف دُنیا ہی دُنیا، لیکن وہ دُنیا ایسی کہ اُس کے ہر جُزو پر دین کی حکومت غالب! طبیعت و بشریت کی پُوری پُوری آزادیاں لیکن وہی شریعت کی پابندی میں۔ تین دِن کے قیام میں اِن مادّی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، اور دل کی بصیرت نے اپنی بساط کے لائق کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیا ـــــــ اور سب سے بڑھ کر قابل وہ چھپا ہوا معذرت نامہ! بزرگی کے دعوے نہیں، درویشی کی تعلّیاں نہیں، مشیخت کی شیخیاں نہیں، جذب کی شوخیاں نہیں، بلکہ اُلٹا تقصیروں کا اعلان، لغزشوں کا اشتہار! ہائے! ہائے! کوئی اِس عبدیت کی دلآویزی لا کہاں سے سکتا ہے!

لاکھوں لگاؤ، اِک چُرانا نگاہ کا!

---

[1] سعدیؒ نے۔

زقدر و شوکتِ سُلطان نگشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ دہقان بہ آفتاب رسید

عبدیت کا مرتبہ اور انابت کا جو درجہ ہے، کون سا حال اور کون سا مقام اُسے پا سکا ہے؟ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کی آہ وزاری نے ابوالبشرؑ کے جو مرتبے بڑھائے، کس بشر کی مجال ہے کہ اُنھیں بھلائے؟ بڑی سے بڑی ریاضتیں بڑے سے بڑے مجاہدے بھی، اِس ایک شکستگی، اِس ایک اُفتادگی، اِس ایک بیچارگی کے مقابلہ پر لائے جا سکتے ہیں؟

اک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

۱۹۲۹ء

(۱۱)
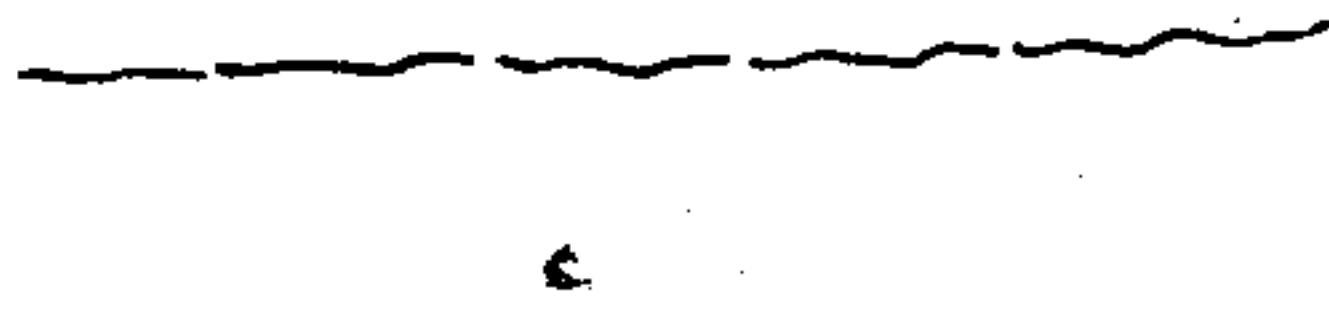
انگریزی کالجی تعلیم سے طبیعت میں جو ڈھٹائی پیدا ہو جاتی ہے وہ پوری طرح مشکل ہی سے جاتی ہے، اور پھر بعض میں طبعاً وہ عدم اطاعت یا بے انقیادی ہوتی بھی معمول سے کچھ زائد ہی تی ہے، اپنا اپنا حال ایسا ہی تھا، تھانہ بھون سے واپسی پر دل وہاں کے قیام کی مسرتوں اور مولانا کی عنایتوں دونوں سے لبریز تھا، (معروضۂ یکم جنوری ۱۹۲۹ء) اور چنانچہ یہ بھی اُسی وقت ٹھہر گئی تھی کہ آئندہ حاضری کم از کم ایک ماہ کے لئے رہے گی (ایضاً) تربیت السالک کے بھی متعدد حصے اور مطالعہ کر لئے تھے، اور اُن کے لفظ لفظ سے استفادہ کیا تھا (ایضاً) تاہم اپنے اسی عریضہ مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۹ء میں یہ عرض بھی گذرا:-

"امداد الفتاوی کی چاروں جلدوں کا بڑا حصہ (یعنی بجز اُن اجزاء کے جن کی ضرورت مجھے نہیں پڑتی) دیکھ گیا، سلوک، اصلاحِ نفس سے متعلق جو کچھ قلم مبارک سے نکلا ہے میرے حق میں آبِ حیات ہے، البتہ بعض دوسرے مسائل مثلاً حیات خضرؑ وغیرہ سے متعلق جناب کی تحقیقات سے بھی قلب کو اطمینان نہیں ہوا۔"

۱۶ برس کی مدت کے بعد اب کسے یاد کہ مولانا کی تحقیق اِس باب میں کیا پڑھی تھی، اور اس کے کس جزو سے کس بنا پر اطمینان نہیں ہوا تھا، سُننے کے قابل تو حضرت کا جواب ہے، بہت سے طلبۂ مسترشدین کے کام کے قابل:-

"حیات خضر میں تو اہل کشف خود مختلف ہیں، ہر شق میں گنجائش ہے، اگر دوسرے مسائل بھی

ایسے ہی مختلف فیہ ہیں تو اختلاف کا مضائقہ نہیں۔"

اسی عریضہ میں ایک سوال اپنے ایک دوست کی طرف سے اُن کی تجدید بیعت کے متعلق بھی درج تھا:۔

"میرے ایک دوست ہیں اپنی کم عمری میں جب وہ بیعت کے مفہوم سے بھی ناآشنا تھے، ایک ایسے صاحب سے اُنھوں نے بیعت کر لی تھی، جن میں اب وہ ایک مرد متقی کی صفات تو خیر کیا، معمولی درجہ کے مُسلمان کی صفات بھی نہیں پاتے اور مُرشد صاحب ابھی زندہ ہیں، اب یہ مُرید صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کروں، آیا اُن شیخ کے زندہ ہوتے ہوئے، اُنھیں چھوڑ کر، کسی دوسرے سے بیعت کر لوں؟"

جواب ایک ہی ہو سکتا تھا، اور وہی وہاں سے آیا:۔

"ضرور واجب ہے، تاکہ پہلی بیعت کی غلطی کا تدارک ہو"

بات اب معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اُس وقت یہی بحث بڑے معرکہ کی تھی کہ زندہ مُرشد کو کسی حال میں کیسے ہی تجربات و مشاہدات کے باوجود بھی چھوڑا جا سکتا ہے؟ خدا کی پناہ، شرک نے کیسی باریک راہ اہل توحید کے یہاں پیر پرستی کے نام سے نکال چھوڑی ہے!

یاروں نے بُت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا!

تحریک خلافت کا زمانہ بھی، ہندی اسلام کی تاریخ میں ایک یادرہ جانے والا دور گذرا ہے، اور جس نے اُسے دیکھا نہیں ہے، اُس کے سامنے اُس دور کا نقشہ کھینچنا بھی دُشوار ہے، ایک بے پناہ ہیجان تھا طوفان تھا، جوش میں آکر بھائی بھائی سے جُدا ہو رہے تھے، باپ بیٹوں سے، بیٹے باپ سے، اللہ اکبر کے نعرے، اور "محمد علی شوکت علی کی جے" کی آوازیں گھر گھر سے بلند ہو رہی تھیں علمائے حق کی اکثریت کا فتویٰ حکومت سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید میں تھا، حضرتؒ کا مسلک اس سے مختلف تھا، مسلک اجتہاد میں اختلاف تو اسلام کی تاریخ میں شروع ہی سے داخل رہا ہے، اور عامہ صحابہ کیا معنی، خلفائے راشدین تک کا دور اس سے مستثنیٰ نہ رہا، اور اگر اختلاف کی بُنیاد محض حق و اخلاص ہے، تو یہ ذرہ بھر بھی عیب نہیں بلکہ عین رحمت ہے، لیکن محققین کے مُقلد و پیرو خود سب کب محقق ہوتے ہیں،

زیادہ سے زیادہ یہ کہ محقق ہوتے ہیں، اور محقق اور مُحِق کے حدود میں اکثر وہی فرق ہوتا ہے، جو دانا اور نادان میں ہوا کرتا ہے، ع

زین انا تا آں انا فرقے ست ژرف!

مُحِق اہل حق میں سے کسی ایک سردار یا شیخ کی پیروی اندھا دُھند کرنے لگتا ہے، اور اس ایک راہ کے سوا سب کچھ باطل سمجھتا ہے محقق اہل حق کے اختلافات باہمی کے سبب و منشا پر نظر رکھتا ہے۔ تحریکِ خلافت کا شباب آخر ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک رہا، اور پھر رفتہ رفتہ وہی سرد مہری جو بدنصیبی سے مسلمانوں کی قومی خصوصیت بن گئی ہے، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں جب اودھ کی صوبہ خلافت کمیٹی کی صدارت کا بارِ اس نااہل کے سر آپڑا تو تحریک کی سرد بازاری کو دیکھ کر ایک خانگی نیاز نامہ میں سردار قافلہ محمد علی کے نام لکھنا پڑا تھا[°]

ہر کس خمے کشیدہ در مجلس صالش   چوں دورِ خسرو آمد جام و سبو نماند

اور جواب یہ ملا تھا کہ "کام کرنے کا لطف تو اسی دورِ خسروی ہی میں ہے" ——— لیجئے بات کہاں سے کہاں پہنچنے لگی، عین اسی تحریک خلافت کے زمانہ میں دہلی سے متصل علاقہ پنجاب کے ایک قومی کارکن کو بھی اپنے مرشد سے قطع تعلق کرنا پڑا، اچھے خاصے عالم، قاری، حافظ اور بڑے مُخلص، اخباری مُلاقاتیں مدت سے ہو رہی تھیں، دہلی میں اُن کی صوری زیارت بھی ہوگئی، اور اُن کا کام بھی خوب دیکھنے میں آیا، پھر شروع ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں خلافت کانفرنس کے سلسلہ میں، اُن کی جانفشانی کی داد، دل کھول کر دینی پڑی تھی۔

[°] اب ۱۹۲۹ء ہے اور جنوری میں اپنی خانگی ضرورتوں سے حیدرآباد آیا ہوا ہوں، مارچ میں ارادہ حج و زیارت پر روانہ ہونے کا ہے، زیادہ تر عزیز دل دوستوں سے ملنے، رخصت ہونے آیا ہوا ہوں، یہاں پھر ان ہی خلافتی بزرگ کی زیارت ہوتی ہے اور اب کی زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اس لئے اب کی اُن کا زہد و تقوی اور زیادہ نظر کے سامنے آجاتا ہے، کثرتِ صوم، کثرتِ تلاوت، کثرتِ اوراد وغیرہ وہ تمام خصوصیات جو صوفیہ صافیہ میں ہوتی ہیں، ایک روز آخر سوال کر ہی گذرا کہ حضرت کسی سے بیعت بھی ہے؟ بولے اب اس قصہ کو نہ چھیڑیئے، بڑی پُر درد داستان ہے، پوچھنے والے کا

اشتیاق اور بڑھا، آخر مجبور ہو کر یہ لکھے کہ "میں بھی حکیم الامت ہی سے نسبتِ غلامی رکھتا ہوں، تحریک خلافت کے زمانہ میں کچھ ایسی کوتاہیاں اور حماقتیں مجھ سے ہوئیں، یا یوں کہیئے کہ اُن کی اطلاعیں اس رنگ میں وہاں پہنچائی گئیں کہ اب میں وہاں کی حاضری اور مجالست، مراسلت سب سے محروم کر دیا گیا ہوں، برسیں ہو گئے ہیں اور یہ سزا بُھگت رہا ہوں، دیکھیئے معافی کب نصیب ہوتی ہے، اور میری قسمت کبھی اس کی نوبت آنے دیتی ہے یا نہیں۔"

یہ خلاصہ تقریر درج ہُوا، اصل گفتگو بہت مؤثر الفاظ میں مؤثر انداز سے تھی، دِل بہت کڑھا[1]، اور حیدر آباد کی ہمہ وقتی مشغولیت میں تو بھلا وقت کیا ملتا، لیکن وطن پہنچتے ہی، ۹ر فروری کو ایک عریضہ تھانہ بھون کو روانہ کیا، نقل تو نہیں، خلاصہ حاضر ہے:۔

"مرشد و مسترشد کے باہمی معاملات میں دخل دینا ہے تو بڑی بے تمیزی[1] لیکن آپ ہی کے الطاف و عنایات پر تکیہ کر کے گستاخ[2] بن کر یہ صد ادب کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں[3]، مولوی..... صاحب سے میری ملاقات ۴-۵ سال کی ہے صالح و دیندار تو انھیں ہمیشہ ہی پایا تھا[4] اب کی حیدر آباد میں ان کی کثرت عبادت دیکھ کر براہ راست سوال کر بیٹھا، بیعت سے متعلق، پہلے تو ٹالا، پھر آخر کو کھلا، بڑی پُر درد روئداد تھی، اُن کے اور ان کے شیخ کے موجودہ تعلقات کی نوعیت کو بجز اُن کی حرماں نصیبی کے اور کس چیز سے تعبیر کروں، اللہ سے دُعا ہے کہ اب اُن کے حال پر رحم ہو، اور جس چشمۂ فیض تک اُن کی رسائی ہو چکی تھی، اُس سے وہ پھر سیراب ہونے لگیں[5]"

یہ دُعا تو اُس سے تھی جو معصیوں اور سیہ کاروں دونوں کی سُنتا ہے۔ باقی جناب والا کی خدمت میں گذارش صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو جناب کی ذات خلوص و عقیدت اب تک جُوں کی تُوں ہے اور اپنی معتُوبی و مہجوری کا ذکر اس

---

[1] یہ بزرگ اب بھی (جون ۱۹۶۷ء میں) ماشاء اللہ بہ قید حیات ہیں اور اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اُن کے نام نامی کے اظہار میں بھی کوئی امر مانع نہیں۔ یہ حضرت مولانا شیخ بقاء اللہ عثمانی پانی پتی ہیں،

حسرت کے ساتھ کرتے تھے کہ دِل اُن کی ہمدردی میں بے اختیار ہو جاتا تھا،(۶) اِس امر

واقعہ سے زیادہ کچھ عرض کرنا ہرگز مقصود نہیں کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری دانند(۷)

اگر اتنی گذارش میں بھی کوئی پہلو سوء ادب کا ہو تو التجاء عفو ہے(۸)

جواب آیا اور حسبِ معمول پہلی ڈاک سے، مضمون جواب کے سمجھنے کے لئے مکتوب پر نمبر ڈال دیئے

ہیں، اُن سے مقابلہ کرکے پڑھا جائے:۔

(۱) بعض بے تمیزی جب اس کا منشا صحیح ہو، تمیز سے محبوب ہوتی ہے،

(۲) یہ گستاخی نہیں بے تکلفی ہے،

(۳) ضرور، ہمیشہ کے لئے اجازت ہے،

(۴) مَیں خود اُن کو صالح سمجھتا ہوں، مگر صالح کے چند اقسام ہیں، اعتقاد تو سب اقسام سے

ہے، مگر مناسبت بعض ہی اقسام سے ہے،

(۵) آپ کی خیر خواہی و رحم دلی میں تو شبہ نہیں، لیکن اس میں کچھ کام اُن کے کرنے کا بھی ہے

انھوں نے نہیں کیا، اور نہ مجھ سے کبھی پوچھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیئے، اب غور فرمائیے، اِس حالت میں میرے

ذمہ کیا ہے،

(۶) کیا وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اپنے مرض پر صرف حسرت کافی ہے یا معالجہ بھی ضروری ہے؟

(۷) آپ نے تو اتنا بھی فرمایا، اُنھوں نے تو اتنا بھی نہ کیا،

(۸) مسلمان کو نفع پہنچانا تو عین ثواب ہے،

(۱۲)

بڑی عمر کو پہنچ کر بچپن کی باتیں ایک ایک کرکے کیسی یاد آتی ہیں اور ہر یاد میں ایک لذّت،

چاہے، وہ باتیں بجائے خود کیسی ہی غیر اہم، حقیر اور معمولی ہی کیوں نہ ہوں، اور جی بے اختیار یہ چاہتا ہے

کہ وہی سِن، وہی دن پھر لَوٹ آئیں، چاہے اُن ہی حماقتوں، اُن ہی شرارتوں، اُن ہی جہالتوں کے ساتھ،

بزرگوں سے تعلّق پر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی، کچھ ایسی ہی کیفیت دِل کو پیش آتی ہے، ابتداءِ تعلّق میں

جو جو اقتیں اپنے سے سرزد ہوتی ہیں، اُن میں بھی ایک لذت ملنے لگتی ہے، اور دل یہ کہتا ہے کہ اُن ہی کو دہرائے جائیے، خارج میں تو ممکن نہیں عالمِ خیال ہی میں سہی، مولانا کی خدمت میں جیسے عریضے لکھے اُن کا ایک خاصا انبار آج اپنے سامنے ہے، اور جی میں آتا ہے کہ اپنے ہر سوال، طفلانہ سوال کو دہرایا جائے اور بات کوئی چھوٹی سے چھوٹی بھی نہ چھوٹنے پائے، چاہے نوبت اپنی سب کی، اور کسی کی ناگواری اور کسی کی رُسوائی ہی کی آجائے، نازک مزاج، حسّاس سُننے والے، صبر کے ساتھ اور دل پر تھوڑے سے جبر کے ساتھ سُنتے جائیں، اور داستان گو کی ہرزہ سرائیاں معاف کرتے جائیں!

ذکر ۹ فروری ۱۹۲۹ء کے مکتوب کا تھا، اِس کے آخر کے دو فقرے باقی رہ گئے تھے، ایک تو یہ تھا کہ "شروع شوال (وسط مارچ) میں انشاءاللہ مع اہل خانہ، قصد حج بیت اللہ ہے، دُعائے خیر سے فراموش نہ فرمائیں" جواب ملا کہ "بہت مسرت ہوئی، جوش سے دُعائے کامیابی کی" اور دُوسرا یہ تھا کہ، اب کی حیدرآباد میں ایک اہل دل بزرگ سے بہت دیر تک صحبت رہی، کئی گھنٹے تک مسئلہ توحید پر تقریر فرماتے رہے، اُن کا تیار کیا ہوا مقامات سلوک کا ایک شجرہ یا نقشہ خدمت والا میں حاضر کر رہا ہوں" اس کا جواب ملا کہ "زیارت کر لی مگر کوئی برکت محسوس نہیں ہوئی، دونوں جانب کمی کا احتمال ہے" —— اِس کے قبل نو عمری اور کالجی طالب علمی کے دور میں، لکھنؤ میں اکثر شام کو حاضری، مولانا شبلی کے ہاں رہتی تھی، اور معمول یہ تھا کہ نیا سُنا ہوا اور اپنا پسند کیا ہوا اشعار انھیں کسی نہ کسی حیلہ سے سُنا دیتا، اگر اُنھوں نے بھی پسند فرما لیا، تو گویا شعر پر مُہر استناد لگ گئی، اور اب وہ دُوسری جگہوں پر فخر سے پڑھنے کے قابل ہو گیا، اور اگر انھوں نے داد نہ دی، یا اسے پست کہہ دیا، تو بس اپنی نظر سے بھی وہ شعر اسی وقت گر جاتا، اسی نوعیت کا تعلق، اب برسوں بعد، حضرت مولانا سے قائم ہو چلا تھا، شعر و ادب سے متعلق نہیں، مسائل شریعت اور اس سے زیادہ مسائل سلوک و طریقت سے متعلق۔ جسے انھوں نے پاس کر دیا، بس وہی "پاس شدہ" رہے، باقی سب، ہیچ

این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

کا مصداق عمل ہمیشہ اس پر یقیناً نہیں رہا، لیکن کوشش عمل میں معیار کے طور پر تو یہی رہا۔

سفرِ حج کے سلسلہ میں راستے میں تلاوت کے لئے ایک مترجم حمائل کی فکر ہوئی، بازار میں ایک مترجم حمائل "معجز نما حمائل شریف" کے نام سے ملی، دہلی کی چھپی ہوئی، نور محمد نامی کسی تاجر صاحب کی چھاپی ہوئی، ترجمہ مولانا کی جانب منسوب۔ پڑھا تو معلوم ہوا کہ ترجمہ ہے کسی دوسرے صاحب کا اور نام مولاناؒ کا، سُبحان اللہ! قرآن تک سے یہ حضرت نہ چُوکے، متن قرآن نہ سہی، ترجمہ قرآن سہی۔ "چہ کُفر از کعبہ" کی مثال!

۱۱ر رمضان (غالباً ۲۳ر فروری) کے خط میں پُوچھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے؟ جواب میں ارشاد ہُوا کہ

"بیشک، مدّت سے یہ خبریں سُننے میں آ رہی ہیں، کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا، بجز اس کے کہ کوئی مجھ سے سوال کرے، اور میرا جواب شائع کر دے۔"

"قُطب ارشاد" کی اصطلاح، تصوّف کی کتابوں میں بارہا پڑھی تھی، علامتیں بھی پڑھ لی تھیں، دل نے کہا کہ اِس دَور کے "قُطب ارشاد" تو یہی معلوم ہوتے ہیں، اس کی تحقیق خود اُن ہی سے کیوں نہ کر لی جائے، اِستفسار اِن الفاظ میں کیا:-

"..... میرا اپنا ظن و قیاس اِس وقت کے قُطب ارشاد ہونے کے متعلّق ان ہی بزرگ کی جانب ہے، جن کی خدمت میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں، اگر یہ گمان غلط ہے تو اس کی تردید فرما دی جائے، اور یہ بھی ارشاد فرما دیا جائے کہ کن علامات سے، اُسے شناخت کیا جا سکتا ہے۔"

جواب سُننے کے قابل ہے، احتیاط میں ڈوبا ہوا:-

"قُطب ارشاد کو بھی اپنے قُطب ارشاد ہونے کا عِلم ضروری نہیں، اس لئے میں اس سوال کا جازم جواب نہیں دے سکتا، علامات تو ہیں، مگر ان علامات کا تحقق خود ظنّی ہے۔"

اسی عریضہ میں، نماز میں جی نہ لگنے کا اپنا پُرانا مرض عرض کیا تھا، اور پھر ایک عطائیوں کا سا علاج بھی درج کر دیا تھا۔

"نماز میں جی نہ لگنے کا مرض بہت پُرانا ہے، لیکن کبھی یہ تجربہ ہوا ہے کہ عین حالتِ نماز میں، جب کبھی بجائے اپنے جناب کو یا..... کو نماز پڑھتے فرض کر لیا، تو اتنی دیر تک نماز میں دِل لگ گیا، لیکن

مصیبت یہ ہے کہ خود یہ تصوّر بھی عرصہ تک قائم نہیں رہتا، بہرحال اگر یہ عمل محمود ہو تو تصویب فرمائی جائے، ورنہ آئندہ احتیاط رکھوں"

جواب ملا "محمود ہے جب دوسروں کو اطلاع نہ ہو، ورنہ سمّ قاتل ہے"

آخری گذارش سرپرست مدرسۂ دیوبند سے مدرسہ کی تازہ عالیشان عمارتوں سے متعلق تھی کہ "یہ پرشکوہ عمارتیں علی گڈھ کے مناسب ہوں تو ہوں، یادگار قاسمی[1] کے لئے تو وہی کچے، حجرے بھلے معلوم ہوتے ہیں" جواب آیا:۔

"خیال صحیح ہے، مگر ایک دوسرا خیال بھی صحیح ہے، وہ یہ کہ اگر اس میں کوئی مصلحت ہو تو مضائقہ نہیں اور حُسنِ ظن مُقتضی ہے کہ مصلحت کا احتمال رکھا جائے گو اُس کی تعیّن نہ کر سکیں"

"مُعجز نما حمائل" کے "نئے اعجاز" کا ذکر ابھی آچکا ہے کہ ترجمہ کسی کا، اور منسُوب کسی کی جانب ایسا ہو چکا تھا کہ اُس کی بابت تصریح سے استفتاء کیا جائے تعمیل معاً کی گئی، اور سورۂ فاتحہ، اور سورۂ بقر کے رکوع اوّل کے ترجمہ کی نقل بجنسہ ارسال خدمت کر کے سوال کیا کہ کیا اِس ترجمہ کی نسبت جناب والا کی جانب درست ہے؟ جواب آیا:۔

"مکرّمی دام لُطفہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مَیں نے آپ کے نقل کئے ہوئے ترجمہ کو اپنے ترجمہ سے ملایا، خواہ میرے ترجمہ سے اچھا ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ میرا ترجمہ نہیں، نہ اصلی، اور نہ بدلا ہوا، کیونکہ بدلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ تو بالکل ہی مغائر ہے، مجھ کو یاد آتا ہے، کہ اس کے متعلق پہلے بھی تحقیق کی گئی ہے، اور ناشر سے درخواست کی گئی ہے کہ تم اپنی غلطی کو شائع کردو، اور میری رائے اب بھی یہی ہے کہ اگر خود وہ اِس واقعہ کو شائع کردیں تو غالباً اس میں خفت ہو جائے ورنہ کسی کی طرف ایسی غلط نسبت کرنا بُہتان صریح اور کذب قبیح ہے اللہ تعالےٰ اصلاح فرماوے۔ والسلام۔ اشرف علی ۲۳ رمضان ۱۳۴۶ھ

اِس داستان کو تو چھوڑیئے کہ سچ (پرانے صدق) نے اس پر کیا کارروائی کی، اور ناشر

---

[1] یعنی مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند۔

صاحب کو آخر کیا کرتے بن پڑی - یہ خط مارچ ۱۹۲۹ء کے پہلے ہفتہ کا تھا۔ دوسرے ہفتہ روانگی سفر حج پر ہوگئی۔ کھنؤ سے گاڑی رات میں چلی، صبح تڑکے جھانسی سے دوسری گاڑی ملی۔ اِدھر دن نکلا، اُدھر ایک رفیق سفر کے ہاتھ میں مولانا ہی کا وعظ "الحج المبرور" نظر پڑا، خوشی کا کیا پوچھنا، اپنی خوش نصیبی پر آپ رشک آگیا، گویا بالطریق حج و رفیقِ حج دونوں میسر! دو کتابیں حضرتؒ کی، مسائل السلوک (قرآنی تصوف) اور التشرف (حدیثی تصوف) پہلے ہی ساتھ تھیں، یہ تیسری بہت خوب مل گئی، فعززنا بثالث کی مصداق!

بمبئی پہنچ کر ٹھہرنا کئی دن پڑ گیا، اندازہ سے کہیں زائد۔ اللہ کی یاد تو دل میں کیا آتی، اتنا ظرف ہی کس کا تھا، البتہ اس اللہ والے کے تذکرے وہاں بھی خاصے رہے، آخری دن ایک رفیق قافلہ خط تھانہ بھون لکھ رہے تھے، چلتے چلاتے اسی میں سلام، اور التماس دعا، میں نے بھی ڈال دی ——— حج میں زاد راہ لینے کا حکم تو نصوص میں موجود ہے "زاد راہ" نئے قسم کا سہی، ایک بے مایہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایک مقبول کی دعائیں، سفر بھر ساتھ رہیں۔

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست　　　　تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

پرانے شعر میں، نئی ضرورت ضمیر کی ترمیم کی تھی، حاضر کی جگہ متکلم کی۔

(۱۳)

جون ۱۹۲۹ء کی چھٹی تھی کہ واپسی کا جہاز ساحل بمبئی پر آ لگا اور جو اگلی کل تک صرف عبدالماجد تھا اب دنیا والوں کی نظر میں حج و زیارت سے مشرف، حاجی عبدالماجد تھا۔ آہ نہ پوچھئے کہ حج کس بے ترتیبی سے ادا ہو پایا تھا، اعمال کی کوتاہی اور بخت کی تیرگی کے لئے، ہند و حجاز سب یکساں ہیں، آسمان کی گردش سے کوئی بھی مستثنیٰ و محفوظ نہیں، آتے ہی لمبا چوڑا عریضہ حکیم الامت کی خدمت میں لکھا، گھر پہنچنے سے قبل، بہت قبل، ساحل بمبئی پر قدم رکھتے ہی ——— مریض بار بار پرہیزیوں کی بلے تدبیریوں کی اطلاع۔ طبیب کو دینے میں جتنی بھی عجلت کر سکے بہتر ہے۔

خط پورا سن کر کیا کیجئے گا ——— مریض کے گھناؤنے حالات کی تفصیل سے دوسروں کو دلچسپی ہی کیا ہو سکتی ہے ——— اور بڑی بات یہ ہے کہ پورا سنانے کی ہمت بھی یہاں کس کو ہے؟ اس

عریضہ کے تو صرف مختصر خلاصے سُنتے جائیے، باقی مولانا کے جوابات پُورے کے پُورے حاضر ہیں، نُسخہ لکھا جاتا ہے کسی ایک مریض کے لئے، اور اُس کے چھپ جانے کے بعد فیضیاب اِس سے سیکڑوں، ہزاروں دوسرے مریض بھی ہوتے ہیں، فقروں پر نمبر، سہولت تفہیم کے لئے ڈال دیئے گئے ہیں:۔

"کل ساحل بمبئی پر واپس پہنچا ہوں[1]۔ آج وطن انشاءاللہ روانہ ہوں گا۔۔۔۔۔ کے ساتھ ہی جناب والا کی خدمت میں بھی یہ عریضہ ارسال کر رہا ہوں[2]۔۔۔۔۔۔۔ مدینہ منوّرہ میں قیام ایک مہینہ سے کچھ زیادہ نصیب رہا[3]۔۔۔۔۔ ایک رفیق سفر کے پاس جناب کا رسالہ الحج المبرور[4] نکل آیا، اُسے ریل ہی پر پڑھ ڈالا جناب کی دو اور کتابیں۔۔۔ بھی رفیق سفر رہیں[5]۔ خیر اللہ کے فضل و کرم، اور آپ حضرات کی دُعا و توجّہ سے حج تو جُوں توں نصیب ہو گیا[6]۔ لیکن للہ دُعا فرمائیے[7] کہ اِن سب بیہودگیوں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ اِس نمائشی حج کو قبول فرمائے[8]، محجوب و نادم کہ تحفہ تحائف کے قسم میں کوئی شے خدمت والا کے لائق نہ لا سکا[9]۔۔۔۔۔ مدینہ منوّرہ میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ناجائز خواہش پر کسی نے مُہر لگا دی[10]، واپسی میں جہاز پر جناب کے ایک خلیفۂ مجاز نے انتقال فرمایا۔ لوگ اُنھیں صُوفی صاحب کہتے تھے، مدینہ منوّرہ میں مسجد نبوی میں اُنھیں اکثر صفِ اوّل میں دیکھا تھا[11]۔

جواب:۔

(۱) الحمد للہ (۲) بہت ضروری تھا (۳) مبارک (۴) مجھ کو اِس نام کا کوئی رسالہ اپنا یاد نہیں آیا، مگر مجھ کو اپنے رسائل کے نام یاد بھی نہیں[1] (۵) آپ کی قدر دانی ہے (۶) مُبارک ہو (۷) دِل سے دُعا ہے (۸) اِن حالات کو آپ بے سروپا اور موجب تاسّف فرما رہے ہیں، اور میں ان پر مسرور ہوں، اِس لئے کہ ان ہی حالات سے یہ حج عاشقانہ ہو گیا، ورنہ عاقلانہ ہوتا۔ عاشق کے حصّہ میں تو مایوسی اور

[1] حضرت کی یاد صحیح تھی کوئی تصنیف حضرت کی اِس نام کی بیشک نہیں ہے، یہ ایک وعظ تھا، اور حضرت کے مواعظ مطبوعہ کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہنچ چکی تھی۔

حسرت اور ناکامی اور نامُرادی ہی ہے، عاشق کو کبھی سیری اور تسلی نہیں ہوتی۔ پریشانی اور پشیمانی کبھی مُقارن نہیں ہوتی۔ حج کرکے اگر یہ سمجھا جاتا کہ حج کیا تو عُجب تھا، اور اب یہ سمجھنا کہ کیا حج کیا، یہی تو عبدیت اور فنا ہے اور اگر بالفرض کوتاہی ہے بھی تو اس کا تدارک استغفار سے سہل ہے اور عُجب کا کوئی تدارک ہی نہیں کرتا، اِس کا تو پتہ ہی نہیں لگتا۔ مولانا کی شہادت سُن لیجئے ؎

گر مرادت را مذاقِ شکر است ۔۔۔ بے مُرادی بامُرادِ اکبر ست

اور مدینہ منورہ میں فنا کی شان خود ہی محسوس ہوگئی حتّٰی کہ شوق بھی فنا ہوگیا، ہیبت افضل ہے شوق سے[9]۔

ادائے حق محبت عنایت ست ز دوست

اللہ اللہ۔ کیا وہ تحفہ تحائف، قُربانی اور دُعا سے زیادہ قیمتی ہوتا، اس وقت تو اس احسان کا بدلہ میرے ذمہ ہے کہ میں کوئی تحفہ پیش کروں، اور نا داری ہی نہیں، کم ہمتی ہے اِس لئے دُعا پر اکتفا کرتا ہوں (۱۰) برکت ظاہر ہے اب اِس برکت کو یاد رکھ کر اس کو باقی رکھا جائے (۱۱) دہلی خط لکھا ہے، غالباً یہ صُوفی رحیم بخش تھے۔

اِنسان کی زندگی نشیب و فراز کا مجموعہ ہے، ابھی ذکر و عبادت میں مشغول دیکھئے تو شاید فرشتے بھی رشک کرنے لگیں، ابھی نفس کو، نفس کے پنجہ میں گرفتار مُلاحظہ کیجئے تو عجب نہیں کہ شیطان بھی پناہ مانگ جائے، اِس نشیب و فراز سے بڑے بڑے زور آوروں کو مفر نہیں، اچھے اچھے تن رستوں اور پہلوانوں کو چارہ نہیں، بجز انبیاء معصوم کے، تو پھر غریب مسکین ناتوانوں کا کیا ذکر ہے، پستیاں روز مرّہ کا معمول ہیں، بلندیاں اتفاق ہی سے کبھی نصیب میں آجاتی ہیں حکیم الامّت کے مطب میں نسخے بڑے سے بڑے بدحال مریض کو ملتے تھے، یہ نہ تھا کہ اِس دربار میں صرف ابرار و اتقیاء آئیں اور محض ذکر و شغل کی تعلیم لے کر چلے جائیں یا فقط شب بیدار اور تہجد گذار حاضر ہوں اور اوراد و وظائف کی تسبیحات میں اضافہ کر کرا کے واپس ہوجائیں، یہاں گنجائش اُسی وسعتِ قلب، اُسی خلق و تلطف کے ساتھ اشقیاء و اشرار کی بھی تھی ۔۔۔۔ دھوبی کا کام محض اُجلے کپڑوں کی غلاظتوں اور گندا فتوں کو دُور کرنا اور ناپاک کو از سرِ نو پاک بنانا ہے۔

حج سے آئے ہوئے ابھی وہ ہی ڈھائی مہینے ہوئے تھے کہ مکان میں اپنے کمرہ سے کچھ چوریاں ہونی شروع ہوئیں، کبھی میز سے کچھ پیسے اُٹھ گئے، کبھی دوّنی چوّنی۔ گھر کے پروردہ دو۲ چھوٹے لڑکے، شبہہ ہر پھر کر اُن ہی پر ہوتا رہا، زبانی فہمائشیں اور دھمکیاں دونوں بے اثر رہیں، آخر ایک روز صبح سویرے بہ کی رقم اُٹھ گئی، غصّہ بہت ہی زاید آیا، اور کچھ موقع اور مُہلت دینے کے بعد اُن لڑکوں کو مارنا شروع کر دیا، کمرہ زنان خانے کے کوٹھے پر تھا، خیال بھی نہیں گذرا کہ باہر کے زینہ سے کوئی بیرونی شخص اس میں آ بھی سکتا ہے لڑکے بے تحاشہ پٹنا شروع ہوئے کہ عین اُسی حالت میں اصل مجرم معہ رقم کے گرفتار ہو کر آ گیا، محلہ کا ایک لڑکا تھا، تاک کر ایسے وقت جب میں نماز فجر کے لئے مسجد جاتا سب کی آنکھ بچا کر کمرہ میں داخل ہو جاتا تھا! اب سخت ندامت شروع ہوئی کہ گھر کے ان دو بیچارے لڑکوں پر ناحق ہی اتنی مار پڑی، مار تو واپس آ سکتی نہیں، اب بجز توبہ و استغفار کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ندامت اس لئے اور زیادہ کہ آخر میں وہ دونوں بالکل بے قصور نکلے تھے، سارا کچّا چٹھا اُسی دن، اُسی وقت ریکم تمبر کو مولانا کی خدمت میں لکھ بھیجا کہ اب تلافی و کفارہ کی کیا صورت ہے،

جواب آیا، اور بالکل حکیم الامّت کے شایانِ شان:۔

"اگر وہ بالغ ہیں تو اُن سے معاف کرانا ضرور ہے اور اگر نابالغ ہیں تو کم از کم اُن سے اعترافِ غلطی اور اظہارِ ندامت اور ایک مدّت معتدبہ تک اُن کی دلجوئی اور ان سے فرمائشیں پُوچھ پُوچھ کر پُورا کرنا مناسب ہے، اور اُن کا قصوروار ہونا اگر اخیر میں ثابت بھی ہو جاتا تب بھی سیاست کے وقت میں تو یہ فعل بلا دلیل شرعی ہی ہوتا"

جواب کا یہ آخری جزو خاص مولاناؒ ہی کا حصّہ تھا۔ توبہ و استغفار کی حد تک تو اور بزرگ بھی جاتے، لیکن تدارک کی عملی تدبیریں اور پھر اُن میں یہ باریک بینی اور ژرف نگاہی، مولانا پر ختم ہو گئی! ؎

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اسی عریضہ میں کچھ اور معروضات بھی تھے، ایک یہ کہ مولانا کے اُستاد مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی کے مکتوبات اور مولانا کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکّی کے ملفوظات امداد المشتاق پڑھ کر بہت ہی

نفع حاصل ہوا، ذکر و شغل و آدابِ صوفیہ سے متعلق بہت شبہات از خود دُور ہو گئے، اس کا جواب:۔

"میرا دل خوش ہوا کہ اپنے بزرگوں کے کلام کا نافع ہونا ایک دانشمند کی شہادت سے ثابت ہوا، اب اِس سطر کے ایک جزو سے رجوع کرتا ہوں، وہ جزو بالکل شروع کا ہے، کیونکہ وہ بزرگ ان شاہر کے بھی ہیں"

دوسرا معروضہ یہ تھا کہ صبح آنکھ دیر میں کھلنے لگی ہے، معمولات رہ جاتے ہیں، اس سے بڑھ کر بدنصیبی کیا ہوگی، جواب باصواب :۔

حدیث میں ہے "لا تفریط فی النوم، سعدی کا ارشاد ہے ؎

ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

کیا اس سے اس قدر دلگیر ہونا، زیادت علی المصطفےٰ نہیں،

تیسری گذارش یہ تھی کہ جتنا دل تفسیروں، خصوصاً تفسیری نکتوں میں لگتا ہے اتنا خود قرآن مجید کی تلاوت میں نہیں لگتا، یہ دل کے اندر کا چھپا ہوا چور ہے، اس پر ارشاد ہوا:۔

"اگر طاعات میں نفس کو بھی لذت ہو تو یہ خوشی کی بات ہے یا فکر کی، رہا کمی بیشی، تو یہ امر طبعی ہے اِس پر کوئی ملامت نہیں"

ہر خط، خط کیا ہوتا تھا، ایک مستقل ہدایت نامہ ہوتا تھا، مفید بھی اور لذیذ بھی۔ ہر خط جب تک نہ آلیتا، برابر اُس میں دل لگا رہتا، خطوں میں دلکشی ہوتی ہی اس بلا کی تھی۔

دو معروضے ابھی اس عریضہ کے باقی رہ گئے ہیں، ایک یہ تھا کہ بھائی صاحب سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر ہیں، وہ جناب سے مل کر حُسنِ اخلاق کے گرویدہ ہو کر واپس آئے، سرکاری عہدہ دار کے لئے، کسی اہل اللہ سے اتنا تعلق بھی بڑی نعمت ہے اب انشاء اللہ آپ کے مواعظ و رسائل کا بھی مطالعہ کریں گے، جواب:۔

"یہ اُن کا حُسنِ ظن ہے کہ ایک ناکارہ سے محبت رکھتے ہیں، میں خود اُن کی سادگی اور صفائی کی تعریف کرتا ہوں"

آخری اور ایک لحاظ سے بہت اہم گذارش یہ تھی کہ "اب کی بار تھانہ بھون ذرا طویل حاضری اور لمبے قیام کا قصد ہے، کوئی مہینہ سوا مہینہ کے لیئے، میاں بیوی دونوں کا، مکان وغیرہ کا انتظام بھی، از راہ مسافر نوازی ہم پردیسیوں کے لئے فرما دیا جائے" —— اللہ ری سادہ لوحی اور اُف ری کمال بے امتیازی! شیخ وقت کی قدر اچھی کی، ارشاد و ہدایت، وعظ و تلقین کے ساتھ ساتھ گھر کی نیجری کے بکھیڑوں کی بھی فرمائش!

جواب آیا:-

اس مضمون سے بہت ہی مسرت ہوئی، دیر جواب میں مکان تجویز کرنے میں ہوئی بعضے مکان میں نے خود دیکھے، میری رائے یہ قرار پائی کہ اس وقت ایک چھوٹا سا مکان جو مدرسہ کا ہے اس میں فروکش ہو جئے پھر دوسرے مکانات ملاحظہ کر لیجئے، جو موافق طبیعت کے ہو اس کا انتظام ہو جائے گا، سامان ضروری اپنے گھروں سے فراہم ہو جائے گا صرف ایک فہرست دیدیجئے"

میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں کہ بڑا ظلم کیا اُن دوستوں اور دشمنوں دونوں نے جو مولانا کو ایک خشک، آدم بیزار اور تارک الدنیا قسم کا بزرگ اور درویش سمجھے، مولانا بزرگ اور درویش اور زاہد سب کچھ تھے، لیکن اِن سب سے پہلے، اور اُن سب سے بڑھ کر، انسان تھے، حقیقی انسانیت کا ایک نمونہ، بزرگی اور درویشی کے کمالات کا مرقع۔

(۱۴)

اجازت حاضری اور طویل حاضری کی مل گئی، اِس سے بڑھ کر مسرت کا موقع اور کیا ہو سکتا تھا، لیکن پھر بھی یہ خیال آیا، اور آتا ہی تھا کہ یہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی مدت، وہاں کٹے گی کیونکہ عام مریدین، مسترشدین، معتقدین، خانقاہ میں جب حاضر ہوتے ہیں، تو بعض تو خانقاہ میں جاروب کشی کرتے ہیں، اور باقی یہ نہ سہی، تو ذکر و شغل کرنے، نفی و اثبات کی ضربیں لگانے، اللہ اللہ کرنے، اوراد و وظائف پڑھنے پڑھانے میں رات اور دن کاٹ دیتے ہیں، یہاں اِن شغلوں سے کیا

سروکار تھا، اِس آنے والے کی دُنیا ہی دوسری دُنیا تھی، تیج ایک حد تک دینی اخبار سہی بہرحال ہفتہ وار اخبار تھا، اور اُس کا نکالنے والا بہرصورت ایڈیٹر، اس کا کام ہی اخبار کے لئے لکھنا ہو، اخبار کے لئے پڑھنا، دِن رات میں خُدا معلوم کتنے اخبارات پڑھ ڈالتا اُردو کے بھی، انگریزی کے بھی (اور کبھی کبھی عربی اور فارسی کے بھی) بھلا ایسے "اخبار چی" کو ان خانقاہی مشاغل سے واسطہ کیا تھا ــــــ دِل میں بات آئی، ہمت کے پیر ذرا لڑکھڑائے، لیکن بات کو نِبھا جانے کی، چھپا ڈالنے کی ترکیب جس طرح آج ۱۹۶۸ئہ میں نہیں بن پڑتی، ۱۹۲۹ئہ میں نہ بن پڑی، دِل کڑا کر کے ہار سٹیر کو خود مولانا ہی کو لکھ بھیجا، کہ وہاں کا نظام اوقات کیا رہے گا؟ اب تک کا تو معمول روزانہ کئی گھنٹے کے لئے اخبار نویسی اور اخبار خوانی کا ہے، اگر یہ وہاں کے مشاغل کے منافی ہو تو اپنے اخبار کے لئے کسی نئے انتظام کی فکر کر کے آئیں، جواب آیا مختصر لیکن بالکل کافی :-

"مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

طبعاً کسی جانب شرح صدر نہیں ہوا، لیکن عقلاً ترجیح ہوئی کہ اخبار کا انتظام نہ بدلا جائے،

میں برکت کی دُعا بھی کرتا ہوں	اشرف علی"

یہ جواب اُن کا آیا، جو اپنی سختی اور خشکی کے لئے مشہور تھے، اور یقیناً اِس بدنامی کے پھیلانے میں معتقدین کا بھی حصّہ مخالفین سے کچھ کم نہ تھا! حقیقۃً مولانا کے ہاں بڑا توسّع تھا، بہ حیثیت عالم شریعت کے بھی، اور بہ حیثیت مُرشد طریقت کے بھی،

اکتوبر کی کوئی تاریخ ۲۰ کے بعد کی تھی، جب تھانہ بھون پہنچنا طے پایا تھا، درمیانی وقفہ اچھا خاصا تھا، جی میں آیا کہ اِس اثناء میں اپنا تعارف مولانا سے کچھ اور زیادہ کرا لیا جائے، اور ہو سکے تو مولانا کے علوم سے کچھ استفادہ اپنی کتابوں کے سلسلہ میں کر لیا جائے ــــــ مصنّف کی اصلاح سے قبل، اگر تصانیف ہی کی اصلاح ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے ــــــ اپنی شائع کی ہوئی دو کتابیں ڈاک سے روانہ کر دیں، ایک تو فیہ ما فیہ، یعنی مولانائے رومیؒ کے ملفوظات فارسی زبان میں، اپنے اُردو دیباچہ ومقدمہ کے ساتھ، دوسرے اپنا رسالہ تصوّف اسلام (طبع ثانی) اور ایک عریضہ بھی لکھ دیا کہ دو حقیر

ہدیئے ڈرتے ڈرتے ارسال خدمت ہیں، اور اس کے بعد ہی ایک جوابی کارڈ بھی، وسط اکتوبر میں ڈال دیا کہ فلاں تاریخ کو حاضر خدمت ہو جاؤں گا، جواب اُسی کارڈ پر، ۱۸ اکتوبر کا لکھا ہوا حسب ذیل موصول ہوا :-

"مکرمی سلمہ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کے دو ہدیئے بشکل نافع کتابوں کے[1] و محبت نامہ معہ کارڈ پہنچ کر منت بخش و مسرت افزا ہوئے،

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے، اگر ہمت و فرصت ہوئی تو اسٹیشن جدید پر ملوں گا، ورنہ آدمی حاضر ہوگا، کارڈ محض اس مصلحت سے بھیج دیا کہ خط پہنچنے کا اطمینان ہو جائے۔

دونوں رسالے وقتاً فوقتاً، بہ نظر استفادہ، متفرق طور پر دیکھتا رہتا ہوں، دل خوش ہوتا ہے، دوسری کتاب[1] میں اتفاقاً دو مقام قابل نظر ثانی نظر پڑے، ایک مقام اول میں، ایک مقام آخر میں۔

صفحہ ۶ پر خانقاہ امدادیہ کا ذکر اکابر کے ساتھ فرمایا ہے اگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہوتے تو یہ ذکر برجا تھا، اب تو وہ شالہ میں ٹاٹ کا حاشیہ ہے۔ صفحہ ۸۰ پر حدیث مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً الْجَاهِلِيَّةِ کے صحاح میں ہونے کی نفی ہوئی ہے، مشکوٰۃ میں مسلم سے اس حدیث کو نقل کیا ہے، اصل مسلم میں بھی آسانی سے نکل آئے گی، اگر نظر ثانی فرما کر، اب کی بار اشاعت کے موقع پر ان دونوں مقاموں کی تصحیح ہو جائے تو مفید ہو۔ باقی خیریت ہے، والسلام، اشرف علی از تھانہ بھون بھائی صاحب سے سلام فرما دیجئے۔"

اس مکتوب پر صرف تین حاشیئے اور ملاحظہ فرما لیجئے :-

(۱) تصوف اسلام صفحہ ۶ کی جس عبارت کا ذکر ہے، وہاں دیباچہ میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ قدیم محققین صوفیہ کے صحیح اسلامی تصوف کا اعلیٰ نمونہ اب بھی خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں نظر آسکتا ہے، ظاہر ہے کہ مولانا اس "ذکر اشرف"، کو کیسے گوارا فرماتے۔

---

[1] یعنی تصوف اسلام (طبع ثانی)

(۲) یہ ضروری اصلاح بالکل صحیح و مناسب ارشاد ہوئی۔

(۳) بھائی صاحب سہارنپور میں تھے، اور مولانا کا مکتوب اُن ہی کے پتہ پر موصول ہُوا تھا، مولانا کی ذات، خود دینی حیثیت سے عجب ذات تھی، کوئی صرف فقیہ ہوتا ہے، اور طریقت سے کورا، کوئی محض صُوفی ہوتا ہے، اور کلام کے مباحث سے ناآشنا۔ یہ حضرت ایک ہی وقت میں صُوفی محقق بھی تھے، اور متکلم بے بدل بھی، رومیٔ عصر بھی، اور رازیٔ وقت بھی۔ فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث و تصوف کے علاوہ، کلام قدیم و جدید کے بھی خُدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں، وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہتے، اور ہم جیسے کتنے بے مایہ و کم مایہ، یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے، اپنی دُکان چمکاتے،

ایک نوجوان عزیز، کالجی تعلیم پائے ہوئے، اور انگریزی صحبتیں اُٹھائے ہوئے، مدت سے یہ سوال کر رہے تھے کہ "دُنیا میں بدی کے وجود کی علّت کیا ہے؟" گویا تخلیق کائنات کا راز، اور فعلیت خالق کی مصلحت جاننے کے درپے تھے اور اس کو اکثر نوجوانوں کی طرح "عین روشن خیالی" کا مطالبہ سمجھ رہے تھے، اُن کے مکتوب کی نقل بجنسہٖ حضرت کی خدمت میں روانہ کردی، اپنے اِس عریضہ کے ساتھ کہ:۔

"حضرت جواب تو اُلٹا سیدھا اُنھیں دے ہی لوں گا، لیکن حصول تبرک اور خود اپنی ہی مزید تشفی کے لئے خدمت والا میں عرض کر رہا ہوں، اگر کچھ مختصر اشارات عنایت ہو جائیں تو تفصیل اپنی عبارت میں انشاء اللہ کر لوں گا"

جواب آیا اور حسب معمول واپسی کی پہلی ہی ڈاک سے آیا، کاغذ کے دونوں رُخوں پر لکھا ہوا، پہلے پہلا صفحہ مُلاحظہ ہو:۔

"الجواب، غالباً علّت سے مُراد حکمت ہے، ورنہ علّت جو سب حوادث کی ہے، اِس کی بھی ہے، پس اگر واقعی مراد اِس سے حکمت ہے، تو اس سوال میں ایک دعویٰ ہے، وہ یہ کہ تمام حوادث کی حکمت معلوم ہونا ضروری ہے، کیا اِس دعویٰ پر کوئی

دلیل ہے، خصوص جاہل غلام اگر عالم آقا کے افعال کی حکمتیں پوچھے، کیا سائل صاحب کو عقلاً و طبعاً گوارا ہے کہ اُن کے تمام افعال کی مصلحتیں اُن کا ایک نوکر اُن سے پوچھے؛ اور جس فعل کی حکمت اُس کو نہ بتلائی جائے اُس کی حکمت کا انکار کر دے، کیا آقا کا یہ جواب دینا غیر معقول ہوگا، کہ نامعقول تجھ کو ہمارے افعال سے کیا بحث، جو کام تجھ کو بتلا دیا، اور وہ تیرے بس کا بھی ہے، تو اُسے کئے جا، اور فرق کیا ہے، اشرف علی''

اب دوسرا رُخ پڑھئے :۔

''مکرمی، السلام علیکم۔ پُشت پر جو درج ہے وہ ضابطہ کا جواب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نہ سائل کو حکمت پوچھنے کا حق ہے، نہ ہم پر حکمت بتلانا واجب ہے، اب میں تبرع کے درجہ میں حکمت بتلاتا ہوں، اہل ظاہر نے، حکمت، ابتلا، کو بتلایا ہے، جیسے کبھی نوکر کی دیانت داری آزمانے کے لئے، یا اگر خود باعلم ہو تو دوسروں پر بغرض اتمام حجت ظاہر کرنے کے لئے طاقوں میں روپیے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس سے بچنا یا نہ بچنا ظاہر یا معلوم ہو جائے، اور اہل باطن نے، حکمت ظہور اسماء الٰہیہ کو بتایا ہے، اگر بدی پیدا نہ کی جاتی، اور کوئی اس کا مرتکب نہ ہوتا، تو نہ بعض کو سزا ہوتی جس سے قاہر و منتقم کا ظہور ہوتا، اور نہ بعض کو معاف کر دیا جاتا جس سے عفو و غفور و رحیم کا ظہور ہوتا، مگر دونوں جوابوں پر پھر سوال ہوتا ہے کہ تخلیق شر میں تو یہ حکمت ہوگئی، مگر خود اس حکمت، یعنی ابتلاء و ظہور اسماء میں کیا حکمت ہے، پھر اخیر جواب یہی ہوگا کہ حکمت معلوم ہونا ضروری نہیں، تو اس جواب تبرع کے بعد بھی جواب ضابطہ کی ضرورت ہوگی اسی واسطے عارفین کا فیصلہ ہے۔ ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

اور فرمایا ہے۔ ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو　　　　نینگیختن علّت از کار تو

وامثالہا من الوصایا د الحکم۔ اشرف علی"

درخواست، صرف مختصر اشارات کے لئے کی گئی تھی، جواب میں اشارات نہیں، تصریحات ارشاد ہوئیں، اور وہ بھی مختصر نہیں، ضرورت کی حد تک مفصّل۔

مدّت کے بعد اس متن کی مطول شرح، تیج (مرحوم) کے کئی صفحات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک مستقل مقالہ کی حیثیت سے، تلاشِ راز کے عنوان سے شایع ہوئی، مضمون بحمد للہ مقبول ہوا، انگریزی خوان حلقوں میں خوب پھیلا، خوب چلا، بہتوں کو نفع حاصل ہوا، داد، مُفت میں، تیج نگار کو ملتی رہی داد دینے والے بھی معذور رہتے ——— چمکتے ہوئے، جگمگاتے ہوئے بلّوری برقی قمقمے کو سب دیکھتے ہیں، کسی کو کیا خبر، کہ اندر یہی اندر برقی رو (کرنٹ) کہاں سے آرہا ہے!

وہ مقالہ بصورت ضمیمہ بھی ملاحظہ ہو۔

---

(۱۴)

ضمیمہ

تلاشِ راز[1]

سائنس اور ٹریکل سائنس دونوں کے گریجویٹ، ایک نوجوان عزیز کا مکتوب ذیل مدت ہوئی موصول ہوا تھا:-

"دُنیا میں بدی کے وجود کی علت کیا ہے؟ اُس کے قطعاً نامحبوب ہونے میں تو کسی کو کلام ہو نہیں سکتا...... کلام الٰہی میں مسلسل اس سے بچنے کی تاکید ہے، اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہر شے کا وجود اُسی مختارِ کُل کے علم و مرضی سے ہے، جب بدی کا وجود بھی اُسی کے علم و مرضی سے ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے پیدا کرنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ ایسی ایمان شکن چیز جب خود ہی پیدا کی تو پھر اس میں مبتلا ہونے پر ہم کیوں موردِ الزام ٹھہریں...... مذہبی نقطۂ نظر سے ہمیشہ سوالات کا حل یہی ہوتا ہے کہ خُدا کی باتیں خدا ہی جانے، اور عقلاً ذاتِ باری کے اسرار و مصالح سمجھنے پر اکبر مرحوم یہ یاس انگیز سبق دیتے ہیں ؎

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا ذہن میں جو گھر گیا، لا انتہا کیونکر ہوا

ہر چند کہ یہ مضمون پامال ہے لیکن مسکن جواب کے لئے فطرتِ انسانی ہنوز تشنہ ہے امید ہے کہ آپ سچ میں اس کا جواب مذہبی نقطۂ نظر سے بھی دیں گے اور عقلی دلائل سے بھی ثابت فرمائیں گے۔"

---

[1] از سچ لکھنؤ ۱۵ر جولائی ۱۹۳۹ء بہ نظرِ ثانی۔

مکتوب کو موصول ہوئے مدتیں گذر گئیں، ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے اور مہینوں سے بڑھتے ہوتے برسوں کی نوبت آگئی، سب سے پہلے عزیز موصوف سے اُن کے اس صبر آزما زحمت انتظار پر معذرت کرنی ہے، امید ہے کہ وہ معاف فرمائیں گے۔

مکتوب کے پہلے فقرہ میں لفظ "علّت" آیا ہے، لیکن یہ یقینی ہے کہ "علّت" سے مُراد مصلحت، غایت یا حکمت رکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے چل کر مکتوب ہی میں لفظ "مصلحت" صراحتہً درج ہے، بدی کی علّت فاعلی کوئی پُوچھنے والی چیز نہیں ذہن میں سوال یقیناً یہ پیدا ہوا ہوگا کہ قادرِ مطلق نے بدی آخر پیدا ہی کیوں کی؟ اب ایک شے سے تمام تر رد کرنا ہی مقصود تھا، تو اُسے سرے سے پیدا ہی کیوں کیا گیا؟ آئندہ جو کچھ گفتگو ہوگی، وہ سوال کے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر ہوگی،

اشکال جو پیش کیا گیا ہے، نیا نہیں ہے، خُدا معلوم اب تک کتنوں کو پیش آچکا ہے، اور آج سے پیشتر خدا معلوم کتنے قلم اس کے سُلجھانے پر اُٹھ چکے ہیں، مراسلہ نگار مُستحق شکریہ ہیں، کہ انگریزی خوان نو جوانوں کی ایک بڑی جماعت کی ترجمانی کر کے انھوں نے مسئلہ کی توضیح کے لئے ایک نیا موقع بہم پہنچا دیا، لیکن کسی شُبہہ کے محض شیوع عام کی بنا پر یہ لازم نہیں آتا کہ اُس سوال کی تشنگی فطری بھی ہے، غیر طبعی فضا اگر کسی مرض کو عام و عالمگیر بنا دے، تو یہ نہ ہوگا کہ مرض کو مرض کے بجائے صحت کہنے لگیں، مرض مرض ہی رہے گا، خواہ مریضوں کی تعداد کتنی ہی زائد ہو جائے۔ بے غوری اکثر ذہن کے سامنے رائی کا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیتی ہے، اور التفات تام کے فقدان کے باعث بار ہا یہ ہوتا رہتا ہے، کہ جو مسئلے گھنٹوں اور منٹوں میں طے ہو جانے کے ہیں، اُن کے سُلجھانے کے لیے حُسن نیّت کے باوجود ہفتوں اور مہینوں کی مدّت بھی کافی نہیں ہوتی۔

جواب کا مرحلہ بعد کا ہے پہلے بقول ایک زندہ عالم و عارف کے، ایک سوال خود سائل پر عائد ہوتا ہے، سوال حکمت و مصلحت سے متعلق کیا گیا ہے، لیکن عرض یہ ہے، کہ خود اس سوال کی کیا مصلحت ہے؟ یہ سوال پیش کس غرض سے کیا گیا؟ سوال سے سائل کا مقصود کیا ہے؟ جواب میں کہا جائے گا کہ "تشفیِ قلب" تو اب غور اس پر کرنا ہے کہ آیا جواب سے یہ مقصود حاصل ہو بھی سکتا ہے؟

بدی کے وجود کی کوئی سی بھی مصلحت عقلی بالفرض بتا بھی دی گئی، تو آیا ذہن کی تشفی اس سے ہوجائے گی؟ کیا عقل اس مصلحتِ عقلی کا نام سُن کر خاموش ہوجائے گی؟ اور کیا بعینہٖ یہی سوال خود اُس مصلحتِ عقلی پر بھی عائد نہ ہوگا؟ کیا اسی تیزی و مستعدی کے ساتھ، ذہن یہ سوال نہ کر بیٹھے گا کہ مانا، فلاں حکمت، وجودِ بدی کی محرک ہوئی، لیکن خود اس حکمت کی کیا حکمت ہے؟ خالقِ کائنات نے جو بھی مقصود پیشِ نظر رکھا؟ کیوں رکھا، جو بھی مصلحت ملحوظ رکھی، کیوں رکھی؟ خوب غور کرکے، دل کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھئے، کہ آیا "کیوں" اور "کس لئے"، کا یہ سوال، بعینہٖ ہر جواب پر عائد ہوکر نہیں رہتا؟ اور جو طبائع آج بدی کی حکمت کے درپے ہیں، کل کیا وہ ٹھیک اسی طرح اس حکمت کی حکمت اور غایت کی غایت کے کھوج میں نہ لگ جائیں گی؟ اور اگر سوالات کا تسلسل یوں ہی برابر اور یکساں قائم رہا، تو تشفی کیا حاصل ہوئی؟ اور جب تشفی کا امکان نہیں، تو بات وہیں رہی، جہاں پہلے تھی۔

لیکن بالفرض کوئی ایسی صورت ہے، جس سے وجودِ بدی کی مصلحت معلوم ہوجانے پر ذہن کی تشفی ہوجائے، اور آئندہ سوالات کا سلسلہ رُک جائے، تو اس صورت کو ابھی کیوں نہیں اختیار کرلیا جاتا؟ ذہن اگر وہ ایک قدم آگے چل کر سکوت وسکون اختیار کرسکتا ہے، تو اس سے ایک منزل قبل، اس سے پہلے ہی سوال کے وقت یہ کام کیوں نہیں لیا جاتا؟ اور دل کو یہ کہہ کر کیوں نہیں سمجھا لیا جاتا، کہ جہاں روزمرّہ کی زندگی میں چھوٹے بڑے صدہا ہزار جزئی واقعات، صانعِ فطرت کے پیدا کئے ہوئے بھی، اور انسانی ہاتھوں کے پیدا کئے ہوئے بھی ایسے نظر سے گزرتے رہتے ہیں، جن کی علّتِ غائی، حیثیتِ افادی، مصلحتِ وجودی مطلق سمجھ میں نہیں آتی، وہاں اُس طویل فہرست میں ایک عنوان کا اضافہ اور سہی۔

غرض مقصودِ سوال سے متعلق جو پہلو بھی اختیار کیا جائے، اور جواب سے تشفی ہونے نہ ہونے کی جو شق بھی قبول کی جائے، ہر صورت میں وہ سوال نتیجہ خیز معلوم ہوتا ہے اور نہ جواب عقلی کے لئے فکر وکاوش کا کوئی حاصل نکلتا ہے۔

اب اس طرف آیئے کہ سوال پیش کس کی طرف سے ہورہا ہے، کسی مذہبی شخص کی طرف سے، یا لامذہب کی طرف سے؟ دو حال سے خالی نہیں، پہلے کی طرف سے ہوگا یا دوسرے کی طرف سے۔ اگر لامذہب کی زبان سے

ہے تو وہ ابھی حکیمانہ نظم کائنات ہی کا کب قائل ہے؟ وہ ابھی اسی کا معتقد کہاں ہے کہ عالم اور ما فی العالم، با معنی، با مقصد اور با مفہوم بھی ہے؟ اُس کے نزدیک تو عالم نام ہے، منتشر ذرات کے غیر ارادی اجتماع کا، اور ضرور نہیں کہ اس اجتماع کے عقب میں کوئی غایت، کوئی مقصد، کوئی مصلحت بھی ہو (اگر سائل غایت و مصلحت کا وجود ضروری قرار دے رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ مُلحد نہ رہا، بلکہ ایک حکیم صناع کے وجود کا قائل ہوگیا) لامذہب و دہری کی طرف سے سوال حکمت کا پیش ہونا ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص فنِ طب کی حقیقت ہی کا سرے سے مُنکر ہو، اور لگے کسی خاص طریقِ علاج کے منافع و مصالح پر بحث کرنے، جُزئیات پر گفتگو جب ہی ہوسکتی ہے، جب پہلے اصول تسلیم کرلئے جائیں۔

لیکن سائل اگر مومن و مُسلم ہے، تو ایک بار پھر اُسے سوچنا چاہیئے کہ سوال سے نتیجہ اور فکر جواب سے حاصل کیا؟ مُسلم کا کام احکام کی تعمیل ہے، نہ کہ اُن کی توجیہہ و تعلیل کی ادھیڑ بن بالفرض، مصالح و حِکَم، عقلی حیثیت سے سمجھ میں بھی آگئے، تو اس سے نفع کیا ہوا؟ دین کا یا دُنیا کا، آخر کون سا نفع اِس سوال کے حل ہونے اور رازِ حکمت کے مُنکشف ہوجانے پر معلّق و موقوف ہے؟ انسانی دماغ کے لحاظ سے بجا ہو یا بیجا، بشری عقل کے معیار سے معقول ہو یا غیر معقول، بہرحال و بہرصورت، بدی کا وجود تو ہو ہی چکا، اب نفع کی چیز اور کام کی بات کون سی ہے، بدی سے بچنا یا اِس بحث میں اُلجھنا کہ بدی کا وجود ہوا کیوں؟ مُسلم مامور کس چیز پر ہے؟ مُسلم کی ترقّی مراتب موقوف کس امر پر ہے؟ آیا بدی سے بچنے یا نیکی و بدی کا فلسفہ سمجھنے پر؟ ڈاکٹر کا کام یہ ہے کہ انسان جس ہئیت کذائی کے ساتھ جن اعضاء اور جن قوتوں کے ساتھ وجود میں آیا ہے، اُن میں اگر کوئی خرابی یا بے اعتدالی نظر آئے تو اُس کی اصلاح میں لگ جائے نہ یہ کہ ان سوالات میں اپنے کو مشغول کردے کہ اس کی ترکیب یُوں کیوں رکھی گئی ہے، اس کی ہیئت و ساخت اِس قسم کی کیوں واقع ہوئی ہے، اِس کے جسم کی ترکیب میں فلاں فلاں اجزاء کیوں رکھے گئے ہیں۔ وقس علی ھٰذا کوئی ڈاکٹر اگر ان مسائل پر توجہ نہیں کرتا، یا بعد توجہ اُن کے کسی حل پر نہیں پہنچتا تو اُس سے اس کی طبّی حذاقت یا فنّی قابلیّت پر کیا حرف آسکتا ہے؟

غرض سائل جو سا مسلک بھی اختیار کرے، سوالات جس طرح اپنی غایت و مقصد کے لحاظ سے

بے نتیجہ رہا تھا سائل کے مسلک کے لحاظ سے بھی لاحاصل ہی نظر آتا ہے۔

سوال محض سوال ہی نہیں ہے، بعض اہم دعووں کا بھی پردہ پوش ہے، جواب محض دینی اور اعتقادی حیثیت سے نہیں "عقلی" و "استدلالی" حیثیت سے بھی چاہا گیا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سائل کے خیال میں عقل، ہر مسئلہ کی عُقدہ کُشائی کے لئے کافی ہے، اور عقل بشری، ہر مصلحت ربانی اور حکمت الٰہی کا بے تکلف احاطہ کر سکتی ہے، لیکن خود یہ مفروضہ کہاں سے ثابت ہے؟ عقل کی اس ہمہ گیری پر کون سی دلیل، عقلی یا نقلی قائم ہے؟

یہ صحیح، کہ بدی کے وجود میں حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ انھیں سمجھا بھی عقل ہی کی مدد سے جائے، یہ کہاں سے لازم آگیا کہ ہر مسئلہ کی کُنہ یہاں تک کہ جو مسائل اہم الاہمات (ultimate prolems) کا درجہ رکھتے ہیں، اُن کی بھی کنہ، عقل ہی کی ساطت سے دریافت ہو سکتی ہے؟ انکار عقل کی قوت سے نہیں، انکار عقل کی اس ہمہ گیری سے ہے، جو سوال میں فرض کر لی گئی ہے عقل کی فضیلت مسلّم، فضیلت ہی نہیں، افضلیت بھی مسلّم، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر گتھی عقل ہی کے ناخن سے کھل سکتی ہے عقل بھی آخر دوسری انسانی قوتوں کی طرح، محض ایک طبعی قوت ہے، اور ایک محدود دائرہ کے اندر کارفرما۔ اُس محدود دائرہ کے باہر اس سے کام کیوں کر لیا جا سکتا ہے؟ آنکھ کا کام دیکھنا ہے، اور کان کا سُننا، معدہ کا کام ہضم کرنا، اور دماغ کا سوچنا، آنکھ سُن نہیں سکتی، اور کان، آنکھ کا کام نہیں دے سکتا، معدہ کیسا ہی تندرست ہو، سوچ نہیں سکتا، اور دماغ کتنا ہی توانا ہو، غذا ہضم نہیں کر سکتا، عقل سے بھی کام وہی لینا چاہئیں جو اُس کے کرنے کے ہیں، جو اُس کے حدود کے اندر ہیں، چھُونے اور چلنے، سانس لینے اور کھانا ہضم کرنے کا بار اگر ہاتھ پیر، پھیپھڑے اور معدے کے بجائے عقل پر ڈال دیا جائے، تو کون عقلمند اسے روا رکھے گا؟

عقل کا کام، فلاسفۂ قدیم اور نفسیئین بعدید، دونوں کی تحقیق میں، محسوسات کی ترتیب اور مدرکات کی تنظیم ہے، اب جو علوم، محسوسات سے بلند، اور جو حقائق، مدرکات سے ماوراء ہیں،

انھیں عقل کی گرفت میں کیونکر لایا جا سکتا ہے؟ اور کوئی انھیں زبردستی لانا چاہے بھی، تو عقل اپنے حدود سے باہر قدم نکال کر اُن کا احاطہ کیونکر کر سکتی ہے؟ حافظ شیراز نرے شاعر نہ تھے، صاحب نظر حکیم، اور صاحب معرفت صُوفی بھی تھے، اسی مقام کی شرح اپنے مشہور شعر

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا را

میں کرتے ہیں، اور جو لوگ سن و سال یا فہم و بصیرت کے لحاظ سے ابھی بچپن کی منزل میں ہیں، انھیں مشورہ دیتے ہیں، کہ عقل و استدلال کی راہ سے راز دہر کی طلسم کُشائی کی کوشش عبث و لاحاصل ہے، ہمیشہ ناکام .... رہے گی، حافظ یہ نہیں کہتے کہ یہ عُقدہ سرے سے لاینحل ہے بلکہ یہ "حکمت" کی قید لگا کر کہتے ہیں، کہ عقل و استدلال کی راہ سے اِس معمّے کا حل ہونا ممکن نہیں۔

قاصر النظر مادی کا قدم عقل کی منزل تک پہنچ کر رُک جاتا ہے، عقل اس کا سدرۃ المنتہیٰ ہے، وسیع النظر روحانی اس سے آگے بڑھتا ہے، وہ مانتا بھی ہے اور اپنے تجربہ سے جانتا بھی۔ کہ عقل سے ماوراء کچھ اور باطنی قوتیں بھی انسان کو عطا ہوئی ہیں، اِس ناسوتی زندگی کے خاتمہ پر وہ باطنی قوتیں سب کی سب روشن ہو کر رہیں گی، اِس وقت نیک و بد، مومن و ملحد، سب کے لئے کشف حقائق ہو کر رہے گا، آیۂ کریمہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ اسی منزلِ وجود کی خبر دے رہی ہے[1] یہ قوتیں بد پرہیزیوں سے بچنے، ریاضتوں میں لگے رہنے، مجاہدات میں مشغول رہنے سے اِسی زندگی میں بھی ایک حد تک، بیدار ہو جاتی ہیں،

---

[1] اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے حکمت و معرفت کے پیچیدہ مسائل باتوں باتوں میں حل کر دیئے ہیں ایک جگہ کیا خوب کہہ گئے ہیں

ہنگامۂ شکر و شکوہ دُنیا میں ہے گرم
لیکن مرے ذہن میں یہ بات آتی ہے

کُھلتا نہیں راز دہر "شکوہ" ہے تو یہ
اور "شکر" یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

"راز دہر" حواس مادی کی مدد سے نہیں کھل سکتا۔ البتہ موت کے طاری ہوتے ہی، قویٰ میں اتنی پختگی آجاتی ہے کہ کشف حقائق از خود ہو جاتا ہے، ایک دوسری جگہ کہا ہے ؎

درجہ تحیر کا ہے بجُز وسے فزوں تر
ہے رُوح کو امید ترقی کی اجل سے

اور "کل" کا مستقبل ایک معتد بہ درجہ میں "آج" کے حال میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور اُس وقت بغیر کسی دلیل و بُرہان کے، بغیر اصولِ قیاس اور قواعدِ استقراء کی مدد کے، بغیر زبان سے بولے ہوئے، لفظ اور قلم سے نکلی ہوئی عبارت کے، قلب کی تشفی اور ذہن کی تسلّی ہو جاتی ہے، اور سوال کا حل ہونا الگ رہا، سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، اِن بلند تر قوتوں سے بغیر اُن شرائط کے پُورا کئے ہوئے، جو ان کے بروز و ظہور کے لئے لازمی ہیں انکار کر بیٹھنا ایسا ہی ہے، کہ کوئی کمسن بچّہ اُن قوتوں کے وجود سے سِرے سے انکار کر دے، جو ابھی اس کے اندر مخفی ہیں، اور جوان ہونے پر نمایاں، روشن اور ظاہر ہو کر رہیں گی۔

جو کیفیات اور جو قوی، اپنی نوعیت میں بلند ہیں، اُنھیں پست تر کیفیات اور ادنیٰ قوی میں منتقل کرنا اور علویات کی تشریح و توضیح سفلیات کی اصطلاح میں کرنا، نہ ممکن العمل ہے نہ کسی طرح یہ مطالبہ معقول و صحیح کہا جا سکتا ہے، ایک چھوٹا بچّہ، جو ابھی لذّت کے معنی صرف مٹھائی کھانے، اور راحت و مسرّت کے معنی صرف کھلونے کھیلنے کے جانتا ہے، وہ اگر اس پر ضد کرے کہ فلسفی کو جو لُطف مسائل کے حل کرنے میں آتا ہے، عابد کو جو راحت رات رات بھر نماز پڑھنے میں حاصل ہوتی ہے، ڈاکٹر کو جو مسرّت مریضوں کی خدمت گزاری اور تیمار داری میں آتی ہے، یہ سب کیفیتیں اُسے مٹھائیوں کی بولی اور کھلونوں کی زبان میں سمجھا دی جائیں، تو کون اُس پر قادر ہو سکتا ہے؟ اور کون اس کے مطالبہ کو واجبی قرار دے گا؟ یہ ایک بہت موٹی اور کھُلی ہوئی بات ہے، لیکن آہ کہ اکثر ایسی روشن اور پیش پا اُفتادہ حقیقتیں بھی، بحث و گفتگو کے وقت نظر سے رہ جاتی ہیں! عارف رومؒ عاجز آ کر کہتے ہیں کہ "خام" کے اندر "پختہ" کا حال کوئی کیونکر بھر دے، بس سکوت ہی مناسب ہے،

در نیابد حال پختہ ہیچ خام ۔۔۔ پس سخن کوتاہ باید والسّلام

سوال، اُس ذات کی ایک فعلیت سے متعلّق کیا گیا ہے، جو ذات مطلق ہے، وہ ہستی غیر محدود ہے۔ غیر محدود کی پیمایش کوئی محدود آج تک کر سکا ہے؟ مطلق کو ادراک کی گرفت میں لانا کسی مقیّد کے لئے ممکن ہے؟ یعنی وہ ذات مطلق ہمہ خیر و ہمہ قُدرت ہے، لیکن ساتھ ہی ہمہ حکمت بھی ہے۔ وہ خیر مطلق و قادر مطلق ہونے کے ساتھ ہی حکیم مطلق بھی ہے، اور نہ صرف وہ خود، بلکہ جو فعل بھی اُس سے

صادر ہوتا ہے، ہمہ حکمت ہوتا ہے، لیکن آج تک کوئی اُس کے علم کا، اُس کی قدرت کا، اُس کی رحمت کا، اُس کی ربوبیت کا، کسی صفت کا احاطہ کر سکتا ہے؟ پھر تنہا اُس کی حکمت ہی کا احاطہ کیوں ممکن سمجھا جائے؟ جزئی حکمتوں کا سوال، جزئی قدرتی اور جزئی رحمتوں کی طرح علیحدہ ہے، یہاں جو مسئلہ زیرِ نظر ہے، وہ حکمت کاملہ کا ہے،

مطالبہ توجیہ عقلی کا کیا گیا ہے، لیکن پہلے خود توجیہ عقلی کے معنی ومفہوم کو سمجھ لینا چاہیئے۔ انسان کا ذہن ہر نامانوس شے سے بھڑکتا ہے، گھبراتا ہے۔ دفع وحشت کے لئے وہ صرف مانوس ومالوف اشیاء کو چاہتا ہے، توجیہ اُس کی اسی طلب کی تسکین کا نام ہے، اس میں اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوتا کہ ایک اجنبی جزئیہ کو ایک مسلّم ومتعارف کلیہ کے تحت، یا ایک اجنبی کلیہ کو ایک عام تر ووسیع تر ومتعارف کلیہ کے تحت میں لے آیا جاتا ہے، یہی توجیہ ہے اور اسی کا نام انگریزی میں explanation ہے، اس تعریف سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ہر علم وفن میں، ایک نقطہ ایسا آجاتا ہے، جس کے آگے توجیہ چل نہیں سکتی، اور وہاں پہنچ کر ہر صاحبِ فن کو خاموش ہو جانا پڑتا ہے۔ ایک طبیعی، درخت سے پھل کو ٹوٹ کر زمین پر گرتا دیکھ کر اُس کی توجیہ، قوت کشش کے وسیع کلیہ سے کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال ہو کہ قوت ہی میں یہ قوت کیسے اور کہاں سے آئی، تو طبیعی کے پاس کچھ جواب نہ رہے گا۔ ایک مریض علاج کے لئے، طبیب کے پاس جاتا ہے طبیب اس کی توجیہ یہی کہہ سکتا ہے کہ حصول صحت ایک نوع کی راحت ہے، اور راحت ہر انسان کو مطلوب لیکن اگر اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ راحت مطلوب ہی کیوں ہے، تو طبیب خاموشی پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ حال ہر علم وفن، اور ہر صنف واقعات سے متعلق ہے۔

مذہب کی اصطلاح میں خدا، سب سے آخری چیز ہے، اس کے بعد نہ کوئی اور وجود ہے اور نہ اُس سے وسیع تر کوئی ہستی، بقول اکبر،

آخر "کیوں" کا جواب تو ہے

اس وسیع ترین وجود کو اصول عقل وقوانین منطق کے مطابق، کس وجود کے ماتحت، اور اس کے

افعال کو جو اعم الاعمات کا مرتبہ رکھتے ہیں، کس کلّیہ کے تابع رکھا جا سکتا ہے؟ جس پر ہر سوال ختم ہوتا ہے، جس کا ارادہ ہر مصلحت اور ہر حکمت کا منتہیٰ ہے، اور جس کی مشیت غایۃ الغایات ہے، اس کی کسی فعلیت کی غایت تلاش کرنا، قواعدِ عقلی ہی کے لحاظ سے، اُسی طرح بے معنی ہے جیسے یہ سوال چھیڑا جائے کہ سب کا پیدا کرنے والا خُدا ہے، تو خُدا کو کس نے پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ خُدا اگر کسی اور سے پیدا ہُوا ہے، تو اُسے خُدا کہا ہی کیوں جائے گا؟ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ مصلحت خداوندی اگر کسی اور مصلحت کی تابع، اور ارادۂ ایزدی کسی دوسری غرض و غایت کا پابند ہے، تو اُس پر مصلحت خداوندی، اور ارادۂ ایزدی کا اطلاق ہی نہ ہو سکے گا۔ کوئی اگر ذات حق کے متعلق سوال کرے کہ اُسے کس نے اور کیوں پیدا کیا، تو سب کو ہنسی آجائے، لیکن ہنسی اُس وقت کیوں نہیں آجاتی، جب سوال صفات حق و افعال حق سے متعلق کیا جاتا ہے، اور ان کی توجیہ و تعلیل کے لئے کوئی اور سہارا ڈھونڈھا جانے لگتا ہے؟

سوال کے عقب میں تخیّل یہ معلوم ہوتا ہے، کہ گویا بدی بھی ایک مُستقل ایجابی وجود رکھتی ہے، اور جس طرح انسان و حیوان، شجر و حجر، آفتاب و ماہتاب، چرند و پرند، مُستقل و قائم بالذّات اصناف موجودات یا باصطلاح منطق "جوہر" ہیں، اسی طرح ایک مُستقل جوہر بدی بھی ہے، جو بھوت کی طرح کبھی اُسے لپٹ جاتی ہے، اور کبھی اِس پر مسلّط ہوتی ہے، مگر کیا حقیقۃً بدی ایسی ہی کسی مادّی چیز کا نام ہے؟ کیا مذہبوں نے بُدی کی یہی حقیقت بیان کی ہے۔

قرآن و حدیث سے اِس تخیّل کی تائید نکلنا الگ رہا، جتنی بھی تصریحات ہیں، سب سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ بدی "جوہر" نہیں، عرض ہے، کوئی مادی مخلوق نہیں، محض ایک کیفیت، ایک روش، ایک طریق عمل کا نام ہے، کلام مجید کی بکثرت آیات سے یہی ظاہر ہوتا ہے، مثلاً

فَهَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (البلد)	ہم نے انسان کو (نیکی و بدی) دونوں راستے دکھا دیئے،
اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ	ہم نے انسان کو راہ عمل بتادی، پھر کوئی سیدھی راہ پکڑ

إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا — پڑ لیا اور کوئی ٹیڑھی پر،

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا — اللہ نے انسان کو گمراہی اور ہدایت دونوں کے

(والشمس) — راستے القا کر دیئے،

وقس علیٰ ہذا۔ مفاد سب کا یہ ہے، کہ بدی نام ہے انسان کی غلط روی کا، خود لفظ "گمرہی" اس معنی کی جانب رہنمائی کر رہا ہے، اس کے بالمقابل نیکی نام ہے، راست روی کا، سیدھی راہ پر چلتے رہنے کا، یعنی انسان جب تک اپنی قوتوں کو، اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو صحیح طور پر رضائے الٰہی کے مطابق استعمال کر رہا ہے، اعمال حسنہ میں مشغول ہے، اور جس وقت وہ ان ہی خدا داد قوتوں کو، اپنی فطری صلاحیتوں کو بجا طور پر استعمال کرنے لگا، بدی، بدکاری، بدعملی کا مرتکب ہو گیا، گویا بدی نام ہے راہ اعتدال و توسط کو چھوڑ کر افراط و تفریط اختیار کر لینے، یا صراط مستقیم سے منحرف ہو جانے کا۔ دوسرے مذاہب کی بابت تحقیق نہیں، لیکن اسلام میں تو بدی کا مفہوم بس یہی اور اسی قدر ہے۔

بدی کے اس صحیح مفہوم کو پیش نظر رکھنے کے بعد، کیا اس پر مراسلہ نگار کا سوال عائد بھی ہو سکتا ہے؟ اب سوال کے یہ معنی ہوئے، کہ انسان میں غلط روی کی صلاحیت کیوں رکھی گئی؟ انسان کی خلقت ایسی کیوں رکھی گئی، کہ وہ سیدھی راہ چلتے چلتے کبھی ٹیڑھی راہ پر بھی پڑ سکے، اوپر یہ تصریحات آ چکی ہیں، کہ عقل کی محدود قوت، آخری مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے ناقابل ہے، لیکن بہرحال جتنی بھی قوت عقل سلیم کو حاصل ہے، اس کے لحاظ سے غور کیا جائے، کہ بجز اس کے، اور کیا صورت تکوین انسانی ممکن تھی؟ کیا یہ ہونا چاہیئے تھا، کہ انسان سرے سے مسلوب الاختیار، مشین کی طرح قصد و ارادہ سے محروم پیدا کیا جاتا، یا قصد و ارادہ تو اُسے دیا جاتا، لیکن ایسا ارادہ دیا جاتا جو ہمیشہ نیکی ہی کو اختیار کرتا، اور بدی کا امکان ہی باقی نہ رہتا؟ اوّل تو یہ ارادہ و اختیار کی بالکل انوکھی تعریف ہوئی، کہ بجائے دو شقوں میں سے ایک کے انتخاب کے، انسان ہمیشہ ایک ہی شق کے قبول کرنے پر مجبور رہا، اور پھر اس صورت میں، یعنی احتمال بدی کے مرتفع ہو جانے کی صورت میں خود نیکی کے بھی کوئی معنی باقی رہ جاتے ہیں؟ کوئی ایسی نیکی ممکن بھی ہے؟ حلم کا وجود ممکن کیونکر ہے، جب تک دوسری طرف سے اشتعال نہ

پیدا کرایا جائے؟ صفت "عادل" کے ظہور کا موقع جب ہی آسکتا ہے، جب ایک طرف ظالم، دوسری طرف مظلوم، اِدھر مُستغیث، اُدھر مجرم کا وجود ہو۔ "صبر" کس چیز پر کیا جائے گا، اگر مصائب شدائد کا وجود نہ ہو؟ صفات عفو و کرم جُود و شجاعت بروئے کار اُسی وقت آسکتے ہیں، جب بالمقابل خطائیں، لغزشیں، حاجت مندیاں اور خطرات موجود ہوں۔ ماں کی مامتا اُسی وقت جوش میں آتی ہے جب سامنے بچہ، بیکسی اور بے بسی کی تصویر بنا پڑا ہو۔ یہ حال ہر نیکی کا ہے اور جس عقل سلیم سے مدد چاہی گئی تھی، اُسی کا فیصلہ یہ ہے، کہ بغیر بدی کے وجود کے محض نیکی کی تمنا دُنیا میں رکھنا، ایسا ہی بے معنی ہے، جیسے کوئی یہ آرزو کرے کہ زمین پر بلندیاں ہی بلندیاں ہوں، کوئی پستی نہ ہو! لفظ بلندی کے معنی و مفہوم جب ہی پیدا ہو سکتے ہیں جب مقابل میں کوئی "پستی" ہو۔

سوال میں جزم و وثوق کے ساتھ کہا گیا ہے کہ بدی کا وجود خالق کائنات کے "علم و مرضی" سے ہے۔ "علم" سے یقیناً ہے، لیکن "مرضی" سے قطعاً نہیں۔ یہ غلط فہمی بہت عام ہے۔ اچھے اچھے پڑھے لکھے اور ذی فہم اس میں مُبتلا ہیں، یہ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) پہلے تو خُدا آپ ہی بندوں کو بُرائی میں مُبتلا کرتا ہے، اور پھر آپ ہی سزا دیتا ہے۔

یہ خیال خُدا معلوم کہاں سے گڑھ لیا گیا ہے، قرآن تو قدم قدم پر اس کی مخالفت کرتا ہے، "علم" اور "رضا" دو بالکل مختلف چیزیں ہیں، ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ کسی چیز کو جاننا اور ہے اور اُسے پسند کرنا اور، طبیب جانتا ہے، اپنے تجربہ و واقفیت کی بنا پر پورا یقین رکھتا ہے کہ مریض کے لئے فلاں فلاں بدپرہیزیاں مُہلک ہیں، اُن سے مریض کی ہلاکت یقینی ہے، اپنے اس علم کا اظہار وہ مریض کے سامنے بار بار کر بھی دیتا ہے، اور اُسے صاف اور کھلے لفظوں میں ڈرا دیتا ہے، یہاں تک کہ بعض صورتوں میں تعیین مدّت کے ساتھ مریض کی ہلاکت کی پیشگوئی بھی کر دیتا ہے، یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر کیا وہ اِن واقعات کا حُکم دیتا ہے؟ کیا وہ اِن واقعات کے وقوع کو کسی درجہ میں پسند بھی کرتا ہے؟ نامی گرامی وکیل مقدمات کے نتائج کا اندازہ قطعیت کے ساتھ لگا لیتے ہیں، کیا اِن نتائج سے وہ متفق بھی ہوتے ہیں؟ حیرت ہے کہ لوگ ایسے بیّن فرق کو

نظرانداز کر جاتے ہیں اور جبر و قدر کی بحث میں آ کر علم الٰہی و رضائے الٰہی کو غلط مبحث کر کے ایک کر دیتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہر شے میں ایک طبعی خاصیت رکھ دی ہے، آگ جلاتی ہے، گرماتی ہے، پانی ڈبوتا ہے، بھگوتا ہے، زہر ہلاک کرتا ہے، تریاق صحت دیتا ہے، ہوا اڑاتی ہے، آفتاب روشن کرتا ہے، وقس علیٰ ہذا۔

یہ سارا نظام تکوینی، جس قانون کے ماتحت چل رہا ہے، اُس کا نام مذہب کی زبان میں مشیّت الٰہی ہے، اِسی قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ انسان کو ارادہ یا اختیار دیدیا گیا ہے، وہ اپنی عقل و تمیز سے مختلف راستوں میں سے ایک راستہ اپنے لئے انتخاب کر سکتا ہے، چند شقوں میں سے ایک شق اپنے لئے پسند کر سکتا ہے، چند طریقوں میں سے ایک طریق عمل اپنے لئے متعین کر سکتا ہے اس پر جو کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اسی قوت اِنتخاب و اختیار کی بنا پر، چنانچہ جن کی یہ قوت مختل ہو جاتی ہے (مثلاً مجنون کی) یا جن کی یہ قوت پُختگی تک نہیں پہنچی ہوتی ہے (مثلاً بچوں کی) یا جن حالات میں یہ قوت معطّل ہو جاتی ہے (مثلاً حالتِ خواب میں) اُن پر سے ان حالات میں ذمہ داری بھی ساقط ہو جاتی ہے، ان حدود کے اندر انسان آزاد ہے، ہر طریق عمل کے نتائج اُسے بتلائیے گئے ہیں، زیست و فلاح، موت و ہلاکت کی ساری راہیں اُسے دکھا دی گئی ہیں اور وہ پُوری طرح خود مختار ہے کہ جو سا عمل چاہے کرے، جو سی راہ چاہے اختیار کرے، اِس میں اُس پر مطلق کوئی جبر نہیں، فمن شآء فلیومن ومن شآء فلیکفر (کہف) قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ (بنی اسرائیل) وغیرہا متعدّد آیات کریمہ اسی مضمون پر ناطق ہیں اور یہ سارا نظام تکوینی قانون مشیّت کی ماتحتی میں چل رہا ہے۔

اِسی قانون کے متوازی ایک دوسرا قانون بھی کار فرما ہے، اِس کا تعلق نظام تکوینی Physical Plan سے نہیں نظام تشریعی Moral Plan سے ہے "کیا ہے" سے نہیں "کیا ہونا چاہئے" What ought To be سے ہے، افعال کی جواب دہی اور

اعمال کی ذمہ داری اسی عالم سے متعلق ہیں، جزا و سزا کا معیار اسی قانون سے وابستہ ہے، اللہ نے جن طریقوں کو پسندیدہ فرما دیا ہے، (اور حقیقۃً وہ سارے طریقے بندوں کے فوز و فلاح کے ہیں) اُن پر چلنے سے مرضیاتِ الٰہی حاصل ہوتی ہیں۔ اور اُنھیں کے آخری اور انتہائی مقام کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنّت ہے (یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ) اور اس کے برعکس اللہ کے ناپسند کئے ہوئے طریقوں پر چلنا، اپنی ہلاکت وخسارہ کی راہ اختیار کرنا، اپنے مذہب کی زبان میں، اللہ کے سخت عذاب کی طرف لے جانا ہے، جس کی آخری منزل کا نام جہنم ہے۔

ایک شفیق باپ اپنے بیٹے سے کہتا ہے، کہ "بیٹا دیکھو، فضول خرچی نہ کرنا، تباہ و برباد ہو جاؤ گے بُری صحبتوں میں نہ بیٹھنا، ہلاک ہو جاؤ گے، مجھے اگر خوش رکھنا ہے تو اس کے فلاں فلاں طریقے ہیں، اور اس کے لئے یہ انعام ہیں، اگر کہا نہ سُنو گے تو خود ہی اپنے کئے کو بُھگتو گے، میرا کام سمجھا دینا ہے، اپنا نفع و نقصان خود ہی دیکھو، سمجھ سکتے ہو"، لڑکا ان روشن ہدایتوں کے بعد سعید ثابت ہوا تو خیر، ورنہ اگر نالائق نکلا، تو باپ پر اس کی کیا ذمہ داری؟ اور باپ کے متعلق یہ الزام لینا کر کوئی شائبۂ معقولیت رکھ سکتا ہے، کہ اُس نے آپ ہی تو بیٹے کو گمراہ کیا، اور آپ ہی سزا دے رہا ہے؟ یہ مغالطہ نہ ہو، کہ اس مثال میں باپ تو خود مجبور ہے، اور اللہ مجبور نہیں، مختارِ مطلق ہے، وہ قادرِ مطلق بیشک ہے، لیکن اُسی قدرتِ مطلقہ کا ایک ظہور یہ بھی ہے، کہ اس نے قدرت کا ایک جزو، یعنی قدرتِ تمیز اور اعمال میں قدرتِ انتخاب بندوں کی طرف منتقل کر دیا ہے، اور اس لئے وہ اس باب میں آزاد و خود مختار ہیں، اب اس سوال پر کیا باقی رہا؟

یہ ساری گفتگو، بدی کے وجود کو مسلّم مان کر تھی، لیکن دقّتِ نظر ایک قدم اور آگے بڑھا کر سوال کرتی ہے، کہ دُنیا جسے نقص، عیب، بدی، کہہ اور سمجھ رہی ہے، اس کا وجود فی الواقع کہیں ہے بھی جو اُس کی توجیہ و تعلیل پر قیل و قال کی ضرورت پیش آئے؟ یہ مسلّم ہے کہ انسان کا علم ناقص ہے اور اس کی نظر محدود، وہی درمیانی آلات و وسائط، جن پر کم نظری سطح بینی اوّل اوّل ٹھوکر کھاتی ہے،

وُسعتِ نظر و ازدیادِ علم کے ساتھ برابر آلام سے لذّات میں، ناگواریوں سے خوشگواریوں میں، انقباض سے انبساط میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، مدرسہ کی پابندی، کم سمجھ بچّہ کو قید و بند سے کم دُشوار نہیں معلوم ہوتی اور ماں باپ ہیں کہ اس کی تعلیمی ترقیاں دیکھ دیکھ کر باغ باغ ہوئے جاتے ہیں! مریض آپریشن کے نام سے گھبرا رہا ہے، اور اُس کے تصوّر سے خوف کھا رہا ہے، اور شفیق ڈاکٹر ہے، کہ خوشی خوشی اپنے اوزار سنبھال رہا ہے، کہ ابھی ابھی مریض کی تڑپ، راحت و آسایش سے بدل جائے گی + بچّہ اور مریض کی نظریں کوتاہ ہیں، وسائط کو مقاصد سمجھے ہوئے ہیں، گذرگاہ پر منزلِ مقصود کا دھوکا کھا رہے ہیں + والدین اور ڈاکٹر کی نظریں دوررس ہیں، اُن کا علم کامل تر ہے، عاجل اور آجل کا فرق نگاہ میں ہے، اور اُنھیں واسطہ اور مقصود کی شناخت میں دھوکا نہیں۔

اِس وسیع اور لق و دق کارخانۂ کائنات کا ذرّہ ذرّہ، ایک دوسرے سے مربوط، متعلّق و وابستہ ہے، ہر واقعہ دوسرے سے مرتبط، ہر شئے کی ہستی، دوسرے کی زندگی سے دست و گریبان، ہر ہر تار دُوسرے سے جکڑا اور گُندھا ہُوا + بچّے اور ناداں، قدم قدم پر اُلجھتے ہیں، حکیم و دانا دُور دُور کی حکمتوں کی خبر لاتے ہیں، اور بڑی بڑی گہرائیوں تک اُتر جاتے ہیں، یہ فرقِ مراتب جب معمولی معمولی انسانوں کے درمیان نظر آتا ہے، تو جو ہستی علیم کُل ہے، ہمہ علم و خبر ہے، کیسے مانا جائے کہ اُس کی نظر میں، کوئی بھی شے بدی، کے حکم میں داخل ہو گی؟ دُنیا میں جن چیزوں کو بدی، مصیبت، نقص سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ خود اپنے قصورِ نظر کا نتیجہ ہے، اگر حجابات دُور ہو جائیں، اگر ہر شے سارے سلسلۂ وجود میں منظم و مرتب، ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوستہ و مربوط، پوری طرح اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے، تو کس کی نگاہ میں یہ "نقائص"، نقائص باقی رہ جائیں؟ اُس وقت ہر شے اپنی اپنی جگہ پر کسی اعلیٰ مقصد کی تکمیل ہی میں سرگرم نظر آئے گی، اور جو کوتہ نظری کو بدنمائی کے دھبّے معلوم ہو رہے تھے، وہی چشم دُوربین میں حُسن و زیبائی کے خط و خال بن جائیں گے + جو اللہ کے فضل و کرم سے اِس منزل پر پہنچ گیا، اس کے سامنے یہ سوال باقی ہی نہیں رہتا کہ دُنیا میں بدی کا وجود کیوں ہے، وہ حیرت کے ساتھ یہ دریافت کرتا ہے کہ دُنیا میں بدی کا وجود کہیں ہے بھی؟

مذہبی تحقیق اور طلبِ حقیقت کی راہ، خودی و انانیت، ضد اور سخن پروری کی راہ نہیں، شکستگی و فروتنی، غور و فکر، سنجیدگی و تدبّر کی راہ ہے، مبارک ہیں وہ جو صدق و طلب کی راہ پر سچّے رہرووں کی طرح چلیں، معروضاتِ بالا کا مطالعہ اگر خلوصِ ذہن کے ساتھ کیا گیا، تو کریم کی کریمی سے کیا بعید ہے کہ دلوں کو تسکین و تسلّی کا سہارا، کسی نہ کسی درجہ میں ہاتھ آجائے، اور جو سوال اوّل نظر میں بڑے معرکہ کا اور مہتم بالشان نظر آرہا تھا، عجب نہیں کہ غور و تامّل کے بعد معنی کی تحلیل اور اطراف و جوانب کی دیکھ بھال کے بعد قابلِ التفات بھی نہ رہ جائے، اور اس کی بےحقیقتی روشن و عیاں ہو کر رہے، واللہ اعلم و علمہ احکم،
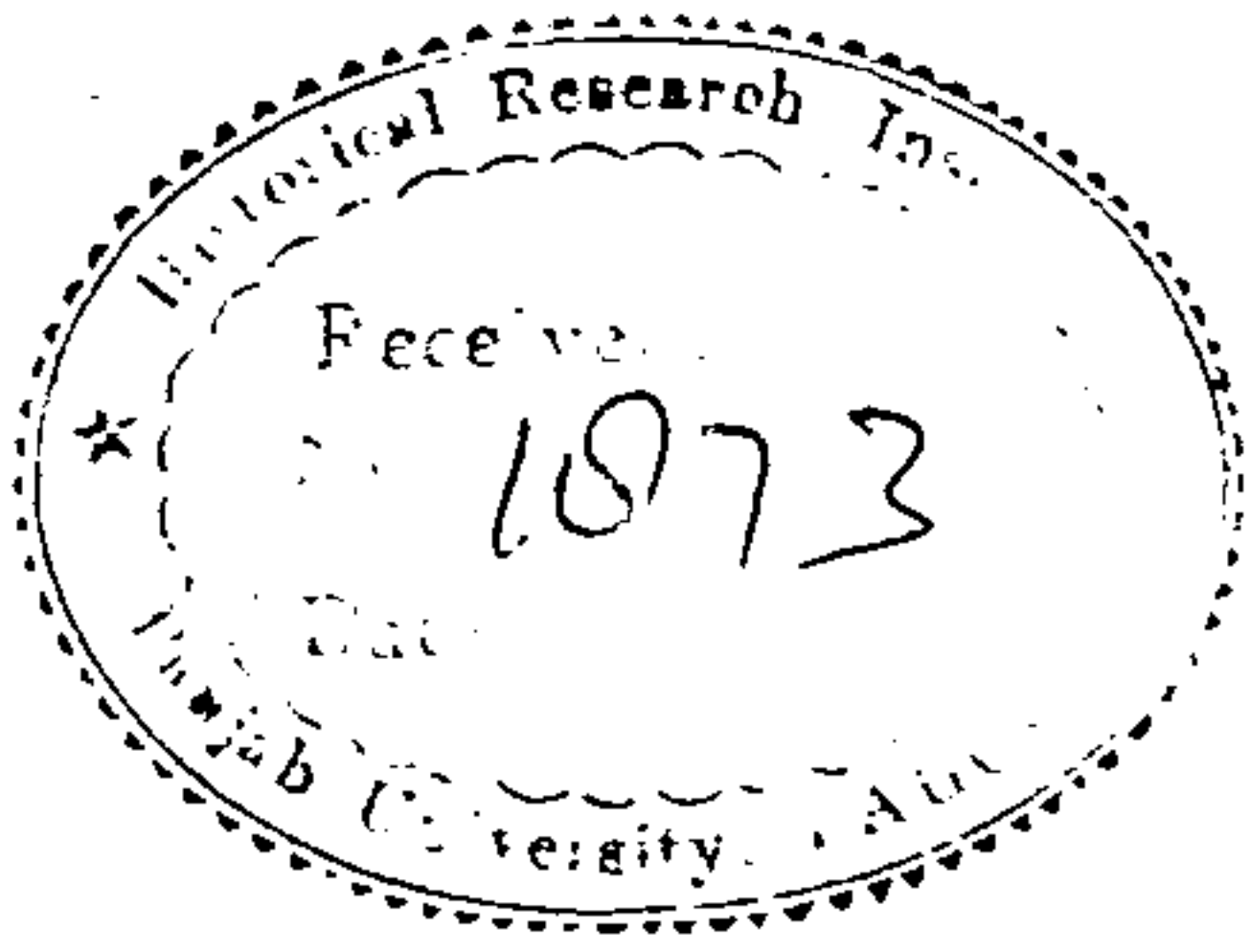
دن اور تاریخ تو اب کسے یاد، اتنا یاد ہے کہ وسط اکتوبر کے بعد کا زمانہ تھا، (اور سنہ تو بار ہی ہوگا کہ عیسوی ۱۹۲۹ء اور ہجری ۱۳۴۸ تھا) کہ یہ نامہ سیاہ ایک دن دوپہر کی گاڑی سے تھانہ بھون پہونچا، حاضری دوبار اس سے قبل ہوچکی تھی، اب کی البتہ کوئی سوا مہینہ، ڈیڑھ مہینہ کا پروگرام تھا، یا حافظہ پر زیادہ زور دوں تو خیال ایسا پڑتا ہے کہ اب کی قصد چالیس دن کے قیام کا تھا ——
چلہ کے عدد میں برکت آج سے نہیں، ہزاروں سال قبل سے چلی آتی ہے' وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً
—— مہمان خانۂ خانقاہ کے بجائے، ایک مُستقل مکان کا انتظام ضروری تھا، قصبہ میں مکان اُس وقت بہت ارزاں، برائے نام کرایہ پر مل جاتے تھے، اسٹیشن سے حاضری تو سیدھے مولانا ہی کی خدمت میں ہوئی اور دو ایک روز تک حضرت ہی کا کھایا، مکان کی تلاش جاری رہی، حضرت نے خود اس میں بڑی دلچسپی لی، دوسروں سے تلاش کی تاکید کی، مکانات قصبہ میں بڑے بڑے موجود ہیں، اچھی اُونچی پُختہ حویلیاں کرایہ کے لئے خالی، لیکن تلاش ایسے مکان کی تھی، جو خانقاہ سے قریب سے قریب ہو، آخر ایک مکان مل گیا، بڑا تو ایسا نہ تھا، مگر ضرورت بھر کا تھا، اور بڑی بات یہ تھی کہ خانقاہ سے کُل چند قدم کے فاصلہ پر تھا مسجد اشرفی کے بالکل سامنے، گویا اب

یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خُدا تھا!

چند روز میں گھر والوں کو بھی بُلا لیا، پکانے والا پہلے سے ساتھ تھا، اب اپنا گھر، اپنا دانا پانی، پردیس میں دیس، سفر میں وطن کا لُطف۔

خانہ داری کا سامان، دو ہی چار آدمیوں کے لئے سہی، بہرحال مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے لئے اچھا خاصا چاہئے تھا، پلنگ، چوکی، میز، کرسی، پکانے ریندھنے کے برتن، کھانا کھانے کے برتن وغیرہ، سارے کھڑاگ کا انتظام بڑی حد تک مولانا نے گھروں سے خود ہی کر دیا، اور جو خادم بننے کے لئے آیا تھا، اُسے ایک حد تک مخدوم بنا دیا ——— یہ تھے "خشک" اور "درشت" مولانا اشرف علی!

خیال یہ تھا کہ مدّت قیام کے لئے، دستور العمل کوئی ریاضتی قسم کا تجویز ہوگا، معمولات عابدوں، زاہدوں کے سے مقرر کئے جائیں گے، تہجد و شب بیداری کی تاکید ہوگی، اور دن رات میں بڑی تعداد ذکر وغیرہ کی بتادی جائے گی — واقعۃً یہ کچھ بھی نہ ہوا، ایک روز ڈرتے ڈرتے گذارش بھی کی کہ کچھ پڑھنے کو بتادیا جائے، تو اُس کی تعمیل کی جائے، جواب میں ارشاد ہوا کہ کوئی خاص ضرورت تو اس کی نہیں ہے اگر کوئی بات خیال میں آگئی تو کہہ دوں گا" ——— اب معمول یہ تھا کہ کوئی سوا نو ساڑھے نو بجے، کوئی خادم صاحب آتے اور حضرت کی طرف سے بُلاوا ہرگز نہ دیتے، بلکہ صرف اتنا کہہ جاتے کہ "مولانا نے فرمایا ہے کہ مَیں اس وقت خالی ہوں، اگر آپ کو بھی فرصت ہو، اور جی چاہے تو آجائیے" قربان جائیے ان حکیمانہ احتیاطوں کے — خوب جانتے تھے کہ اس شرفِ حضوری ہی کے لئے تو وطن سے چل کر آیا ہوں، اتنے دنوں کے لئے وطن کی ضرورتوں کو چھوڑ آیا ہوں، ہر طرح نیاز مند ہوں، اس پر یہ کبھی نہ کرتے کہ مخدومانہ، حاکمانہ، افسرانہ لہجہ میں کہلا بھیجتے کہ آجاؤ، بلکہ ہمیشہ لحاظ اس نیاز مند ہی کی فرصت کا اور طبیعت کی بشاشت و آمادگی کا رکھ لیتے، کہ بار کسی طرح کا بھی نیاز مند کی طبیعت پر نہ پڑے، اور نہ کسی طرح اُس کا ہرج ہو، اللہ اللہ! اتنی احتیاط اور کون کرے گا، چھوٹوں کے لئے نہ سہی، اپنے برابر والوں کے لئے بھی کون جذبات کی اتنی رعایت رکھتا ہے ——— کاش حضرت کے ہزار ہا مریدوں، اور بیسیوں خلفاء میں سے، سب نے نہ سہی، اکثر نے بھی، درسگاہ اشرفی کا یہ ابتدائی سبق حاصل کر لیا ہوتا! اسے کوئی اہم اور قیمتی شے سمجھ کر، اس پر توجہ ہی کی ہوتی!

پہلی بار جو خادم صاحب بُلانے کو آئے وہ بجائے زبانی پیام کے، ذیل کا پرچہ لائے:۔

مکرّمی السلام علیکم۔ مَیں اِس وقت فارغ ہوں، اگر جی چاہے، تشریف لائیے،

لیکن اگر اس وقت کوئی شغل ایسا ہو، جس کا انقطاع تشویش کا سبب ہو، تو تکلیف نہ کیجئے، دوسرا وقت مل جائے گا۔ اشرف علی"۔

ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا شغل، اس حضوری کے مقابلہ میں اور کیا ہو سکتا تھا؟ عارضی تھانہ بھون، اور عارضی مہاجرت کی غرض ہی اس کے سوا اور کیا تھی، اُس پر بھی یہ اہتمام دوسرے کی طبیعت پر بار پڑنے، دوسرے کے مشاغل میں حارج ہونے کے باب میں تھا + یہ احتیاط دوسرے پر تفوق و بالا دستی جتلانے کے باب میں تھی، کہ اپنے کسی قول و عمل میں امکان بھر اس کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، ـــــ کوئی اور مولانا کے زہد و تقویٰ پر گرویدہ ہوا ہو گا، کوئی اُن کے علوم و معارف سے مسخر ہو گیا ہو گا، اس نامہ سیاہ کے دل کو گھائل کرنے والی تو، مولانا کی یہی ادائیں ذرہ نوازی اور بندہ پروری کی تھیں، ـــــ عبدِ کامل کے سچے جانشینوں میں جھلک ہونی بھی اسی رحمۃ للعالمین کی چاہیئے۔

ہاں تو معمول ہو گیا کہ وہی کوئی سوا نو، ساڑھے نو پر خانقاہ پہنچ جاتا، گھر سے دو قدم پر تو تھی ہی حضرت سہ دری میں تشریف فرما ہوتے، ہاتھ میں تسبیح کبھی ہوتی، کبھی نہ ہوتی + بائیں طرف دیوار میں، دھوپ کے حساب سے وقت بتانے والی بڑی گھڑی لگی ہوئی، اُس کے نیچے بیٹھنے کا ایما فرمایا جاتا + ایک جیبی گھڑی کھلے ہوئے کیس میں حضرت کے سامنے ڈیسک پر رکھی رہتی، دو چار لوگ اور آجاتے، عموماً اہلِ تخصیص ہی ہوتے، بڑا مجمع کبھی نہ ہوتا، نشست کوئی ڈیڑھ گھنٹہ رہتی، باتیں ہر قسم کی ہوتی رہتیں، گفتگو کا بیشتر حصہ، مولانا خود فرماتے، لیکن ہم لوگوں کو بھی، بے تکلف بولنے چالنے، پوچھنے، سوال و جواب کرنے کی اجازت تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر، یا خود ہی، مولانا کسی فقہی، کلامی، تفسیری، سلوکی مسئلہ پر کوئی مستقل و مسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرما دیتے، جسے حاضرین بڑے انشراحِ قلب کے ساتھ سنتے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا، عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دو دوستوں کے درمیان جیسے گفتگو ہوا کرتی ہے، یہی رہتی، اور بغیر اس کے سننے والوں کے دماغ پر کسی قسم کا بار پڑے، اور بغیر اس کے کہ وہ اسے محسوس بھی کرنے پائیں کہ اُنھیں کوئی خاص تعلیم دی جا رہی ہے،

خُدا جانے کتنے مسائل، کتنی کام کی باتیں، باتوں باتوں میں اُن کے کان میں پڑجاتیں ——— معمّر اور بزرگ صحابیوں کو بھی، تعلیم کیا اصطلاحی قسم کی، کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ ملا کرتی؟ ثقہ راویوں سے بعد کو سُننے میں آیا کہ اس مجلس چاشت کا دستور اس سے قبل نہ تھا، اور اس بدعتِ حسنہ کی بُنیاد، اسی تباہ کار کی حاضری کے وقت سے پڑی، یہ اگر صحیح ہے تو حضرت نے حد کردی' ذرہ نوازی اور ایک خاکسار کی سرفرازی کی!

کوئی ۱۱ بجے سہارنپور کی طرف سے گاڑی آتی، اور بڑی ڈاک اُسی سے آتی[1]، ریل کی آواز سُن (اسٹیشن وہی فرلانگ پر تو تھا) اور کبھی گھڑی دیکھ، چند منٹ بعد حضرت اُٹھنے کا قصد فرماتے، اور بڑے ہی ملتجیانہ لہجہ میں (جیسے کوئی چھوٹا، اپنے بڑے کے سامنے درخواست پیش کر رہا ہے) حاضرین سے کہتے "ذرا گھر ہو آؤں" اور کبھی تصریح کے ساتھ لفظ اجازت بڑھا دیتے، "اجازت ہو تو ذرا گھر ہو آؤں" یہ کہہ کر، حضرت، ڈاک دیکھنے، کھانا کھانے اور ذرا کی ذرا استراحت فرمانے کے لئے، دو فرلانگ کے فاصلہ پر، گرمی کی کڑی دوپہر، اور برسات کی شدید بارش میں، زنانہ مکان تشریف لے جاتے، دو ڈیڑھ دو گھنٹہ کے بعد ظہر کی اذان ہوتی، اور حضرت پھر تشریف لے آتے۔ (کسی پچھلے نمبر کی اس تصریح کو یاد کر لیجئے کہ مسجد اور خانقاہ کی عمارت باہم متصل اور گویا ایک ہی تھی) بعد ظہر اسی سہ دری میں نشست عام ہوتی، اور مجمع اچھا خاصا ہو جاتا، ڈاک کثرت سے ہوتی، روزانہ اوسط، ۳۰۔۴۰ خطوط کا تھا، یہ وقت جواب لکھنے کا ہوتا، حضرت خطوط کے جوابات لکھتے جاتے (کبھی کوئی خط اہل تخصیص کو مع اپنے جواب کے سُنا بھی دیتے) لوگوں سے گفتگو بھی کرتے جاتے، اور جو اہل حاجت تعویذ و نقش کے طالب ہو کر آتے، اُن کی حاجت روائی بھی کرتے جاتے ——— حاضر دماغی کی ایسی مثال بھی کمتر دیکھنے میں آئی ہے، عصر کی اذان پر یہ محفل برخاست ہوتی، حضرت نماز عصر پڑھا کر، پھر مکان تشریف لے جاتے، مغرب کے بعد اگر کسی کو کوئی خاص بات کرنی ہوتی، تو اُسے وقت دیتے، کسی کو بیعت کرنا ہوتا تو اُسی وقت کرتے ——— ذکر صبح کی مجلس کے لئے طلبی، بلکہ اطلاع وہی کا شروع ہوا تھا،

[1] دوسری ڈاک دِلّی کی طرف سے آنے والی سہ پہر کو قبل اذان عصر آتی، وہ نسبتہً ہلکی ہوتی۔

اور اُسی پر بہر روزانہ پروگرام کا قصہ چھڑ گیا، جو ایک بار اجمالاً پہلے بھی آچکا ہے، ایک روز صبح میری حاضری پر ارشاد ہُوا کہ "آپ ہر روز جو میری اطلاع پر آجاتے ہیں، اس سے مجھے شُبہہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں آپ اِسے طلبی سمجھ کر، اپنا ہرج کرکے تو نہیں آجاتے ہیں، ایسا کیجئے کہ کبھی میری اطلاع پر نہ بھی آئیے، کم از کم ایک ہی دفعہ سہی، تو میرے دل کو اطمینان ہو جائے اور مَیں یہ سمجھوں کہ آپ اُسی روز آتے ہیں، جس روز بالکل بلا تکلف آسانی سے آسکتے ہیں، ورنہ مجھے شُبہہ یہی رہے گا کہ آپ اپنی طبیعت پر بار ڈال کر، اپنا ہرج کرکے چلے آتے ہیں۔"

جی میں آیا کہ ایک آدھ بار اِس ارشاد کی تعمیل میں ناغہ کر ہی دیا جائے لیکن عملاً کبھی ہمّت نہ ہوئی، پہلے سے ارادہ بار بار کرتا، لیکن جب وقت آتا تو، دل کبھی گوارا نہ کرتا کہ آج کی محرومی پر صبر کر لیا جائے۔

(۱۶)

مدینہ منورہ ہر سال ہزاروں حاجی حاضر ہوتے رہتے ہیں اور اپنے ظرف وبساط کے لائق وہاں کے انوار وبرکات سے مستفید ہو کر آتے ہیں + اپنی کم نصیبی کہ جب اسی سال ۱۹۲۹ء میں، قبل حج حاضری ہوئی تو بجائے کسی ایجابی نفع اور فرحت وانبساط کے ایک سلبی کیفیت محسوس ہوئی، یعنی اپنے ڈھکے چھُپے عیوب سب اپنے پر کھُلنے لگے، اور دل بے اختیار اپنے کو نفرین وملامت کرنا چاہنے لگا، اور اپنی بے عملی بلکہ بدعملی قدم قدم پر محسوس ومشاہد ہونے لگی ——— چھ مہینہ بعد، اِسی کیفیت کا اعادہ، تھانہ بھون کے قیام میں ہوا، معتقدین یہاں کے طرح طرح کے فضائل وعجائب بیان کرتے تھے + خواجہ عزیز الحسنؒ مجذوب تو یہاں تک فرماتے تھے کہ "مجھے یہاں کی ہوا میں خوشبو محسوس ہوتی ہے" ہوتی اور ضرور ہوتی ہوگی، اپنا تجربہ سب سے مختلف، اپنی یافت سب سے الگ رہی، اپنے کو نہ انوار نظر آئے، نہ اسرار وعجائب کا انکشاف ہوا، ہفتوں کے طویل قیام میں، بات ایک ہاتھ آئی، چاہے جتنے مختلف عنوانوں سے اُسے بیان کیا جائے، اور وہ تھی اپنے نفس کی کدورت، اپنے اندر کی خباثت کہ جسے خود دیکھئے، اور آپ اپنے سے شرمائیے! فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ

روزمرّہ کی بےتکلّف مجلسوں میں سُننے میں آتے رہے، اُن کی بات ہی کچھ اور تھی، گہری سے گہری باتیں، دلچسپ رنگ میں، ادبی لطیفے، مزاحی چٹکلے، لفظی مناسبتوں کے مظاہرے اِس پر مستزاد ——— بڑا ہی ظالم بلکہ مُفتری تھا وہ جس نے ایسے پیارے من موہنے مولاناؒ کو "خشک" مشہور کیا۔

ناقص قسم کے مشائخ و صُوفیہ کی تعلیمات جو دماغ میں بھری ہوئی تھیں، وہ تو تھیں ہی، اِس سے بڑھ کر زہریلا مواد، دِل میں فقہ و فقہاء کے خلاف جمع تھا، اللہ بخشے مولانا شبلی مرحوم کو، وُہ اَور بہت سی خوبیوں اور اوصاف کے آدمی تھے، اُن کے کمالات کی قدر نہ کرنا ناانصافی ہے، لیکن اِس خاص آگ کو اُن کی تصانیف اور پھر طویل صحبت نے اور بھڑکا دیا تھا، اور جی میں یہ بات جم گئی تھی کہ جیسے یہ پُوری جماعت کی جماعت احمقوں، کم فہموں، خُشک مزاج لکیر کے فقیر کٹھ ملاؤں کا ایک گروہ ہے ——— یہ رنگ بھی مجالسِ اشرفی سے دُور ہوا، مولانا ہی نے بار بار معقول، مدلّل، گفتگوئیں کر کر کے، کثرت سے مثالیں دے دے کر سمجھایا کہ شریعت کے نظام میں فقہ کا مقام کتنا بلند ہے، اور یہ فقہاء درحقیقت، اُمّت کے عقلاء اور ملّت کے حکماء ہوتے ہیں، نظمِ ملّت اِنہی کے دم سے وابستہ ہے، انہوں نے اگر کتاب و سُنّت کی روشنی میں، عقلی، منطقی قاعدوں کے ماتحت، اور فطرت بشری کے روزانہ تجربوں کی مدد سے اتنے جزئیات ہر شعبۂ زندگی سے متعلق نہ مرتب کر دیئے ہوتے تو آج ہم لوگ خُدا معلوم کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے ہوتے، اور اُمّت منتشر ہو کر کیسی کیسی گمراہیوں میں بٹ چکی ہوتی، فقہاء و صُوفیہ، دونوں درحقیقت اِسلام کی فوج کے اہم بازو ہیں، رہے اُن کے "بدنام کنندۂ نکونامے چند" نمونے، تو ظاہر ہے کہ یہ کِس گروہ میں نہیں ہوتے، یا نہیں ہو سکتے؟ رائے ہر گروہ کے بہترین ہی نمایندوں سے قائم کرنا چاہیئے، نہ کہ اُن کے بدترین نمایندوں کو دیکھ کر۔

بڑے گاؤں (ضلع بارہ بنکی) کے ایک چھوٹے سے رئیس تھے شیخ حسن الرحمٰن قدوائی (گھریلو نام محسن میاں) متّقی و متشرّع، خانم و صاحب بھی تھے، مولاناؒ کے شاگرد بھی زمانۂ قیام کانپور میں رہ چکے تھے، اور ایک زمانہ میں لکھنؤ کے شیخ وقت، مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ سے بیعت بھی ہو چکے تھے، اُن کی

وفات کے بعد سے بڑی تمنا رکھتے تھے کہ اب تجدید بیعت مولانا کے ہاتھ پر کریں، گھر سے نکلنے اور اتنا بڑا سفر کرتے ہچکچا رہے تھے، میں نے ہمت دلائی کہ میرے زمانۂ قیام میں آئیے اور میرے ہی یہاں اُترئیے۔ آئے، دوپہر کا وقت تھا، اُسی شام کو بعد مغرب دیکھا کہ مولاناؒ اپنے ہاتھ پر ہنسی خوشی بیعت کر رہے ہیں، نہ کوئی جرح نہ سوال و جواب —— مولاناؒ نے اب بیعت لینا بہت کم کر دی تھی، جس کسی کو مُرید کرتے بھی تو بڑی قیل و قال اور بہت سی شرطوں کے پورا کرنے کے بعد، اِن کے لئے یہ کوئی بھی صورت پیش نہ آئی، آئے اور کھٹ سے مُرید ہو گئے، اِس لئے کہ صلاحیت پوری طرح موجود تھی، شیخ نے اوّل نظر میں بھانپ لیا، اور کسی مزید جرح کی ضرورت ہی نہ تھی، دُوسروں کے مذاق فاسد کی بنا پر ضرورت ردّ و قدح کی ہوتی ہے —— مولاناؒ قواعد و ضوابط کے محکوم نہ تھے، قاعدے اور ضابطے سب ضرورۃً اور سہولت کے لئے بنا لئے تھے، یہ نہ تھا کہ اپنے اور دُوسروں کے ہاتھ باندھ دینے کے لئے، خواہ مخواہ کچھ ضابطے عائد کر لئے ہوں، یہ واقعہ، خاص اِسی غرض سے درج کیا جاتا ہے، مولاناؒ کو ایک گروہ ضابطہ پرستی میں بدنام کر چکا ہے، بدنامی تمام تر بیجا —— ایسے لوگوں نے قرب سے حضرت کو دیکھا ہی نہیں۔

یاد ہوگا کہ جولائی ۱۹۲۸ء میں، میری بیعت ضابطہ سے حضرت ہی کے حسب مشورہ وایماء مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ کے ہاتھ پر ہوئی تھی، تفصیل سب گذر چکی ہے، تھانہ بھون کے قیام کو اب کی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ مولانا کا مکتوب ذیل، دیوبند سے موصول ہوا:۔

”محترم المقام زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ،

والانامہ محررہ ۱۶؍ اکتوبر باعثِ سرفرازی ہوا تھا، اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہوں گے، خداوند کریم وہاں کی حاضری باعثِ برکاتِ متناہیہ کرے، آمین۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر محبّانِ بادہ پیما را

مجھ کو قوی امید ہے کہ آنجناب وہاں پر اپنے اوقات کو مشاغلِ حقیقیہ میں صرف فرمائیں گے، جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرض محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں، اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر محل پر حمل نہ فرمائیں، میں نے حسب الارشاد حضرت مولانا دامت برکاتہم، اور آپ حضرات کے اصرار پر اُس وقت بیعت کرلیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی، رُوسیاہی، ناکامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے، اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے اُنس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے، وللہ الحمد، اللھم زد فزد، اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بیعت بھی کرلیں، مجھے قوی امید ہے کہ مولانا دامت برکاتہم آپ کو نہ ٹالیں گے، میں نے خود اُن دنوں جب حاضر ہوا تھا، یہی عرض کیا تھا کہ آپ جب تشریف لائیں، اور درخواست کریں، تو جناب اِن کو ضرور بیعت کرلیں، قواعدِ طریقت کے اصول پر بیعت کرلینا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے، اِسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے۔

مجھ رُوسیاہ کو بھی کبھی کبھی دعواتِ صالحہ سے یاد فرمالیا کریں، نیز مولانا دامت برکاتہم سے بھی دُعا کی التجا کردیا کریں۔

ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ دیوبند، ۲۰ رجمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ"

مکتوب آپ نے (کاتب کی اجازت کے بغیر) پڑھ لیا تو دو لفظ، مکتوب الیہ کی زبان سے کاتب سے متعلق بھی سُننے چاہئیے اور اس کے لئے ذرا صبر و انتظار سے کام لیجئے کہ اِس ارشاد کی تعمیل ہوئی یا نہیں، اور حکیم الامت نے اس سے کیا اثر لیا،

مولانائے دیوبندی کے سیاسی خیالات جو کچھ بھی ہوں، اور اجتہادی غلطیاں تو صحابۂ کرام تک سے ہوئیں، اور بار بار ہوئیں، بلکہ مذہب اہلِ سنّت کا دار و مدار ہی کہنا چاہئیے کہ غیر نبی کے غیر معصوم ہونے کے عقیدہ پر ہے، لیکن جہاں تک تواضع، ضبطِ نفس، ایثار و انکسار اور جذبۂ خدمتِ خلق کا تعلق ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب کی ذات، اپنی جگہ بے نظیر ہے، ہاں خود اُن کے اُستاد شیخ الہند کی نظیر ہو تو ہو، یا پھر اُن ہی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی مہاجر

مرتی تھے ——— قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے، کسی سے خوش ہوئے تو اُسے پوجنے لگے، خفا ہوئے تو گالیاں دینے اور لعنت برسانے لگے، گویا اُن کا لیڈر یا امیر فرشتہ ہو، اور اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے ادھر کوئی درجہ نہیں، توازن و اعتدال کا گویا قحط پڑ گیا ہے، اور اشخاص و رجال کو، ان کو صحیح مقام پر رکھنا، ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں شیعیت اور خارجیت، دونوں بلا اعتدالی کی پیداوار ہیں، اور اہلِ سنت کا مذہب، جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان، ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا، افسوس ہے کہ وہ خود، اب اسی بدنحتی کا شکار ہوا جارہا ہے!

(۱۷)

مشورہ یا ارشاد بزرگانہ، مخلصانہ، مشفقانہ، سب کچھ سہی، بہرحال ناقابل عمل تھا، اکتوبر ۱۹۲۹ء میں بھی اسی طرح ناقابلِ عمل، جس طرح جولائی ۱۹۲۸ء میں تھا، وہ گرامی نامہ بجنسہٖ حکیم الامت کی خدمت میں پیش کر دیا گیا، ارشاد ہوا کہ "اس کا جواب میں لکھ دوں گا، آپ کو لکھنے میں شاید دقت ہو" اس سے بڑھ کر اور کیا چاہئے تھا، یہی مقصود بھی تھا ——— اصل مکتوب پڑھ لینے کے بعد اب اس جواب سے مشرف ہولیں!

"مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب دامت فیضہم۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

مولوی عبد الماجد صاحب کے نام جو گرامی نامہ آیا اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا، گو اس وجہ سے کہ میں اس کا مخاطب نہیں، مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں، لیکن چونکہ اخیر تعلق مجھ سے ہی ہے، نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے، اس لئے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مجملاً تو وہی عذر ہے جو زبانی عرض کیا تھا، اور قدرے مفصلاً یہ عرض ہے کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر ہے، اس لئے امید ہے کہ اس مشورہ سے رجوع فرمائیں گے، وہ ضرر یہ ہے کہ

میری خشونت و سوءِ خلق تو مشہور رہے، مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو صمیم قلب سے ہے، وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبّب ہے، کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیئے جائیں، دوسرے گو اُن کو مجھ سے موانست کافی ہے، لیکن نفع کا مدار اعظم مناسبت ہے، اس کو میں پہلی مُلاقات میں طے کر چکا تھا، اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا جس کا میں شکر گذار ہوں، اور اگر ان بنائوں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی اُن کی تقویت پر زور نہیں دیتا، لیکن جب اوّل بار میں، بہ قولِ خود، میری خاطر منظور تھی، سو اب بھی میری خاطر منظور فرمائی جائے، اور جس طرح سے کام چل رہا ہے، چلنے دیا جائے، کہ آپ اُن کے مخدوم رہیئے اور مجھ کو خادم رہنے دیجیئے، اس جدید تبدّل میں میری اور اُن کی دونوں کی پریشانی مضمر ہے، جس کا گوارا کرنا اخلاق سامی سے بعید اور بہت بعید ہے، اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حُکم فرمانا جو اُن کی قدرت سے خارج ہے تکلیف لایطاق ہے، جو ہر پہلو سے منفی ہے، والسلام

ناکارہ ننگ انام، اشرف برائے نام - از تھانہ بھون۔
جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ"

انگریزی تاریخ ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۲۹ء تھی، اس سے ضمناً یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ کم از کم اس تاریخ تک دونوں حضرات کے تعلّقات شدید سیاسی و اجتہادی اختلافات کے باوجود آپس میں کتنے شگفتہ اور مُخلصانہ تھے، اور مضمون جواب کی جامعیت تو قابلِ دید ہے، ہر گوشہ کو گھیرے ہوئے اور ہر پہلو کو سمیٹے ہوئے ——— یہ جواب، ایک لفافہ میں رکھا ہوا میرے پاس آیا اور اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ میرے نام بھی :-

"مکرمی سلمۂ السلام علیکم، میں نے ایک مضمون مولانا کے جواب میں لکھ دیا ہے، ہر چند بہ وجہ اپنے مخاطب نہ ہونے کے مجھ کو استحقاق خطاب کرنے کا نہ تھا مگر چونکہ آپ آزادی سے شاید اُن کی خدمت میں عرض نہ کر سکتے میں نے بطور اعانت کے یہ خطاب کیا ہے، اب میری استدعا یہ ہے کہ

آپ آزادی سے اس پر نظر فرماویں، اگر کسی ترمیم کی حاجت نہ ہو تو اس کو معہ اپنے تائیدی مضمون کے روانہ فرماویں، اور اگر ترمیم مصلحت ہو، تو اس کو بعینہ روانہ فرمائیں، اور ترمیم کا لحاظ اپنی تحریر میں فرمالیں، مگر میرے آیندہ معروضات کے لئے، مجھ کو ترمیم کی اطلاع فرماویں تاکہ آیندہ اُسی لحاظ سے عرض معروض کیا کروں،

والسلام۔ اشرف علیؒ"

ترمیم کی، ظاہر ہے کہ بھلا کیا گنجایش تھی، بڑے شکریہ کے ساتھ بجنسہ اس خط کو، اپنے عریضہ کے ساتھ روانہ کردیا ـــــــ "بزرگی" کا جو عام تخیّل دلوں میں بیٹھ گیا ہے کہ "بزرگ" اور اہل اللہ وہ ہے جو بجز تسبیح پڑھتے رہنے کے اور کچھ نہ جانتا ہو، نہ اُس کا کوئی مشغلہ ہو، نہ وہ کسی معاملہ میں کوئی مشورہ یا رائے دے سکے، محض بھولے بھالے قسم کا زاہد خشک ہو۔ مولاناؒ کی بزرگی، اس سے کتنی مختلف تھی! اور اِن ہی پہلوؤں کی تھوڑی بہت نقش کشی، اِن "نقوش و تاثرات" کی علّت غائی ہے۔

دن گذرتے گئے، اور ہفتوں پر ہفتے بیت گئے، سفر حج کو مستثنیٰ کرکے، وطن سے باہر اتنے روز رہنے کا یہ اتفاق مدّتوں کے بعد ہوا تھا، اپنی کیفیت عاشقانہ نہ تھی، نہ یہ تھا کہ وطن یاد نہ آتا ہو، وہاں کی ضرورتوں اور کاموں کی طرف خیال نہ جاتا ہو، یاد برابر ایک ایک چیز آرہی تھی، ہر ہر ضرورت کا احساس تازہ تھا، لیکن طبعاً نہیں عقلاً یہاں کے قیام کو سب پر ترجیح تھی، فطرت بشری عجب متضاد عنصروں کا مجموعہ ہے، انسان ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں سے کشاکش میں رہتا ہے، عُمر ہی اس کش مکش میں تمام ہو جاتی ہے، مبارک اور خوش نصیب ہے وہ، جو کسی درجہ میں عقل کو حاکم، اور طبیعت کو مغلوب رکھے، اکبر کے حکیمانہ مصرعہ

غافل نے اِدھر دیکھا، عاقل نے اُدھر دیکھا

میں یہ "اِدھر" اور "اُدھر" سے اشارہ اِسی طبیعت اور عقل کی کش مکش کی جانب ہے ـــــــ اور پھر تھانہ بھون کی سی پُرسکون فضا اور کہاں نصیب ہو سکتی تھی، راحت قلب اور تسکین خاطر کا ہر سامان موجود، پانچوں وقت مولانا کی اقتداء میں نماز، یہ نعمت خود کچھ تھوڑی سی تھی، آہ وہ جہری نمازوں کی

نعمت، فن تجوید میں کمال کا حال تو فن والے جانیں، لیکن آواز کی دلکشی اور تاثیر کو تو ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے، غضب کی دلکشی تھی، فجر کی قرأت خاصی طویل ہوتی، مگر جی یہی کہتا کہ بس

نہ پڑھیں اور سُنا کرے کوئی!

عتاب کے منظر بھی اِس مدت میں بارہا دیکھے، مولانا کے ہاں کوئی چیز راز کی پوشیدہ نہ تھی یہ منظر اکثر وہی بعد دوپہر والی مجلس عام میں پیش آتے، مولانا بڑے ہی لطیف الحس اور ذکی الحس تھے، کسی بے ڈھنگی اور بے قاعدہ بات کی برداشت نہ تھی، لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے کہ موردِ عتاب ہو جاتے، تکلّف اور مصنوعی ادب تعظیم تو گویا حضرت کی چڑھ تھی، لوگ عموماً اسی کے عادی ہیں جس پر جو گذرنا ہوتی گذر جاتی، لیکن اتنا فائدہ بہرحال ہوتا کہ خود اُس کو بھی آئندہ کے لئے سبق مل جاتا، اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت و بصیرت ہو جاتی، مجذوب کے اِس مصرعہ میں کہ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

شاعری نہیں واقعہ بیانی ہے، مجلس میں سب سے زیادہ ڈھیٹ اور بے لحاظ یہی نامہ سیاہ تھا، بارہا عین عتاب کے وقت، مُجرم کی طرف سے کچھ عرض و معروض کی جرأت کر گذرتا، حضرتؒ کا کمال حلم تھا کہ تبسّم کے ساتھ نرم لہجہ میں کچھ جواب ارشاد فرما دیتے ——— برکتوں کے دن، فیض کی راتیں گذرتی گئیں، آغاز انجام کو پہنچا، مدت قیام ختم ہو گئی، اور نومبر کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ یہ مُسافر اِس آستانہ سے رخصت ہو گیا، نوازشوں اور عنایتوں سے مالا مال، پھر بھی حسرت نصیب گرانبار

ع   بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہت کچھ پوچھ ڈالا، بہت کچھ بے پُوچھے پاچھے سُن لیا، لیکن جو پُوچھنا اور سُننا اور سیکھنا باقی رہ گیا، اس کی میزان اس سے بھی کہیں زاید!

گھر پہنچا، تو اپنے نامور ہم نام اور مخلص کرم فرما، مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کا دعوت نامہ حضرت مولاناؒ کے نام جلسۂ مخالف شاردا ایکٹ میں شرکت کے لئے اپنی ڈاک میں پایا، بات اب

معمولی معلوم ہوتی ہو، اُس وقت معمولی نہ تھی، یہ شاردا ایکٹ کیا؟ اس کی مخالفت میں جلسہ کیا اور کہاں؟ اور مولانا کی شرکت کی اُس میں کیا اہمیت؟ ہر سوال ایک مستقل جواب چاہتا ہے ——— ماضی کی فنا شدہ موجوں کو حال کی فضا میں کوئی کیسے لوٹا لائے!

مرکزی اسمبلی میں، ایک ہندو ممبر، آنریبل مسٹر ہربلاس شاردا نے، مسودۂ قانون یہ پیش کیا کہ ہندوؤں میں کم سنی کی شادی بہت نقصان پہنچا رہی ہے، اِس کی قانونی ممانعت ہونی چاہیئے، لڑکی اور لڑکے کی شادی، فلاں سن سے قبل، جرم قرار دے دینی چاہیئے، ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق تمام تر ہندوؤں سے تھا بعض نافہم مسلمان ممبروں نے خواہ مخواہ اس کا دائرہ مسلمانوں کے لئے بھی وسیع کرا دیا، اب مسلمان چونکے، اور اس صحیح احساس کے ساتھ کہ یہ عمر ازدواج کی قید تو شریعت کی آزادی میں صریح دست اندازی ہے، لگے اِس کی مخالفت میں جلسے کرنے، اور رزولیوشن پاس کرنے، خوش قسمتی سے تحریک کی رہنمائی کی باگ مولانا محمد علیؒ کے ہاتھ میں آگئی، جو مذہب وسیاست کے صحیح امتزاج کا ایک مکمل نمونہ تھے، اور مولانا شاہ عبدالماجد بدایونی مرحوم بھی وقت کی دوسری مفید اور ملی تحریکوں کی طرح اِس میں بھی پیش پیش تھے، ۲۲ر دسمبر کو کانپور میں مولانا محمد علیؒ کے زیرِ صدارت ایک عظیم الشان مرکزی جلسہ اِسی مقصد کے لئے قرار پایا اور مولانا بدایونی کی طرف سے، علاوہ عام مطبوعہ دعوت نامہ کے ذیل کا ذاتی اور خصوصی دعوت نامہ، حضرت مولاناؒ کے نام، اِس حقیر کے توسط سے موصول ہوا:۔

اللّٰہ ولا یمؤ

ذوالمجد والکرم عظیم القدر جناب مولانا شاہ اشرف علی صاحب۔

السلام علیکم، فقیر عبدالماجد القادری البدایونی عارض مدعا ہے۔

ضروریات مذہب وحالات اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ میں جناب سے گذارش کروں کہ ۲۲ر دسمبر کو کانپور تشریف لاکر قانون خلاف شریعت کے انسداد و احکام کی مجلس میں، اپنے مذہبی اور عالی خیالات سے ہماری امداد فرمائیے۔

میں سُنتا ہوں کہ جناب سفر کے کم عادی ہیں اور موسم بھی تلخ ہے، اور شاید مسافت بھی زیادہ، اور جناب کے حالات و اوقات بھی مشغول اور گھرے ہوئے ہیں، مگر باوجود اس کے جو امر داعی باعثِ زحمت دہی بنا رہا ہے وہ ایک اور فقط ایک ہے، یعنی خدمتِ تحفظ شریعت، اور اس کے لئے ہر طبقہ کے مسلمانوں کا ایک مرکزِ ثقل و شرف پر مجتمع ہو جانا۔

یقین ہے اِس امر کی اہمیت کا ممتاز لحاظ فرما کر، اور فقیر کی تحریک کو درجۂ اختصاص قبول دے کر، محض دین و مذہب کے لئے، باوجود مشاغل کثیرہ یا اعذار واقعیہ، تکلیفِ سفر گوارا فرمائی جائے گی، اور نوید تشریف آوری سے اطلاع بخشی جائے گی۔

میرا مسلک و عمل، اِس مقصد و جہاد کے لئے، ہر محافظ و خادم شریعت اور مخالف قانون زیرِ نظر (شاردا ایکٹ) کو وسعتِ قلب کے ساتھ شریک کار و رفیق عمل و مشیر تدابیر بنانا ہے، اس کی اہمیت آپ کے ذہن و فکر میں بھی مجھ سے کم نہ ہوگی۔

اور یقین ہے کہ اِس بار آپ غیر معمولی ہمت سے کام لے کر، اپنے عزم صمیم، اور شرکت کے وعدہ سے مطلع فرمائیں گے۔

مطبوعہ دعوت نامہ بھی حاضر کیا جائے گا، مگر یہ عریضہ فقیر کے خصوصی جذبات کا ترجمان ہے۔

فقیر عبد الماجد القادری البدایونی

دارِ کانپور، بانس منڈی، دفتر جماعت استقبالی

معرفت مولانا عبد الکافی صاحب"

بدایونی مرحوم جس طرح ایک بڑے خوش بیان مقرر اور نامور خطیب تھے، اُسی طرح بڑے خوش مزاج اور مخلص نواز تھے، اور میرے تو خصوصی کرم فرما تھے، لیکن حضرت مولاناؒ سے بالکل منافرت تھی، اوّل تو عقائد میں دیوبندی و بریلوی اختلاف مدّتوں سے پُشتوں سے، ستر راہ بنا ہوا تھا، نوبت تکفیر تک کی آچکی تھی، پھر ذاتی طور پر سیاسی اختلافات بھی شدید قسم کے حائل رہ چکے تھے، اِس موقع پر مولاناؒ کو مدعو کرنا ہمت و عالی ظرفی کا کام تھا، مولانا ئے بدایونی کر گذرے۔

اِدھر حضرت مولاناؒ بھی، خیر نیم سیاسی مجلسوں میں تو کیا جا کر شریک ہوتے، یُوں بھی وعظ و تلقین یا اور کسی غرض سے سفر کرنا اب کئی سال سے ترک کر چکے تھے، اور آنت اُتر آنے کے عذر سے اب وطن سے کہیں باہر نہ نکلتے تھے، بلکہ ایک مطبوعہ معذرت اِس باب میں شائع و تقسیم بھی فرما چکے تھے ———— مولانا ئے بدایونی نے مجھ سے محض پوسٹ مین ہی کی خدمت نہیں لینا چاہی، بلکہ یہ بھی ارشاد ہوا کہ اس دعوت نامہ کو اپنی سفارش کے ساتھ حضرت تک پہنچا دو۔

(۱۸)

جواب آیا، اور حضرتؒ کی عام عادت کے مطابق فوراً آیا، آپ بھی فوراً ملاحظہ میں لائیں:-

"از ناکارہ و آوارہ اشرف علی غفرلہٗ

بگرامی خدمت عالی درجت، مخدومنا معظمنا ادام اللہ تعالیٰ افاداتہم و افاضاتہم،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

باوجود میرے ناقابلِ خطاب ہونے کے مجھ کو خطاب سے سرفراز فرمانا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اِس کا کیا اور کس طرح شکریہ ادا کروں، بجز اس کے کہ

جُز آنکہ بصدقِ دل دُعائے بکند   از دست گدائے بینوا ناید ہیچ

جس خدمت کے لئے مجھ کو ارشاد ہوا ہے، اوّل تو اُس کا دینی خدمت ہونا، پھر مزید برآں جناب کا حکم ہونا، فی نفسہٖ کسی عذر کا متحمل نہیں، لیکن اگر کوئی عذر، حدِ عذر سے متجاوز ہو کر، حدِّ عجز تک پہنچ گیا ہو، غالباً اس کا پیش کر دینا نقص امر نہ ہو گا۔

اسی غرض سے چھپا ہوا عذر نامہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں، اور بجائے شرکت جسمانی کے شرکت رُوحانی پر جس کا ظہور بصورت دُعا ہو رہا ہے، اکتفا کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اور علاوہ دُعا کے اور خدمات محتملہ کے متعلق شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو اپنے کچے چٹھے کا کاشف اور شفیع بناتا ہوں ؎

خوش گفت پردہ دار کسے در سرائے نیست   آں را کہ عقل و ہمت و تدبیر و رائے نیست

والسلام، از تھانہ بھون - ۱۴ر رجب ۱۳۴۵ھ

یہ ہے "خشک مزاج و درشت مزاج" مولانا تھانوی کا جواب، اپنے سے ایک کہیں کم عمر اور اعتقادی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ایک مخالف کیمپ کے مولوی صاحب کے نام! ——

"خشک و درشت مزاج"

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

وطن پہنچ کر سفر پر تبصرہ اور میزبان کا شکریہ ناگزیر تھے پہنچتے ہی جو عریضہ لکھا، وقت کے تازہ تاثرات کا ترجمان ہے، لیکن دل ہچکچا رہا ہے کہ جو باتیں صرف سرگوشیوں میں کہنے کی ہیں، انھیں نغمۂ محفل کیسے بنا دیا جائے؟ —— دوسری طرف مولانا کے افادات کے منافع و مصالح ہیں، انھیں چھپا بھی کس طرح ڈالا جائے؟

اچھا تو فیصلہ یوں سہی کہ مولانا کے ارشادات تو جوں کے توں نقل کر دیئے جائیں، رہے اپنے معروضات تو وہ کہیں نقل اور کہیں اُن کی محض تلخیص —— ایک کے لئے روایت باللفظ کا اہتمام، دوسرے کے لئے روایت بالمعنی کی گنجایش —— معروضاتِ ماجدی کے لئے "م" اور ارشاداتِ اشرفی کے لئے "ا" کی علامت ذہن میں رکھ لیجئے، اور آگے چلئے:۔

م۔ سیدی و مطاعی، السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ا۔ مُشفقی محترمی دام کما رضی اللہ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

م۔ وطن پہنچا۔

ا۔ الحمد للہ۔

م۔ لکھنؤ سے خواجہ صاحب[1] سے دو مُلاقاتیں ہوئیں، اور دونوں بہت پُرلُطف۔

ا۔ ماشاءاللہ۔ زادکم اللہ لُطفکم علیٰ لُطفٍ۔

م۔ آپ کی طویل حاضری میں آنکھوں نے اور دِل کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، کاش اُسے دوسر دِل کو بھی دکھا سکتا۔

---

[1] یعنی خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب،

ا۔ کوئی چیز نہیں ہے، جس کو کوئی واقعی دیکھے، یہ تمنّا درحقیقت اہل نظر کے' اہل وہم ہونے کی تمنّا ہے مگر جو مجھ میں اِس وہم میں مُبتلا ہیں، میرے لئے تو وہ وہم حُسن ظن ہے، جو میرے لئے ہر حال میں مبارک ہے۔

م۔ کتنے اعزّہ و احباب غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے ہیں' اُن کے لئے دِل بے اختیار کُڑھتا ہے'

ا۔ یہ غلبہ ہے محبّت کا ادراک پر، اور چونکہ میرا ادراک غالب ہے محبّت پر مَیں اس سے مسرور ہوں کہ اُن کے خلاف واقعہ اعتقاد سے مَیں محفوظ رہا۔

م۔ مجھے جو نعمتیں حاصل ہوئیں، اُن کا اظہار الفاظ میں کیونکر کروں۔

ا۔ یہ عدم اظہار، اظہار سے ابلغ ہے۔

م۔ بڑی نعمت وہی حاصل ہوئی، جو مدینہ منوّرہ کی حاضری میں حاصل ہوئی تھی، یعنی قدم قدم پر اپنی پستی، اپنی نالائقی کا احساس، اور بجائے وہاں کی برکات و انوار سے مُستفید ہونے کے، اُلٹا یہ دھڑکا کہ کہیں یہ وجود نجس یہاں کی فضائے پاک کو گندہ نہ کردے۔

ا۔ حقیقت میں بڑی نعمت ہے، جس پر مبارکباد دیتا ہوں، یہ نیستی تو ہستی ہے۔

م۔ بس اسی قسم کا سبق تھانہ بھون کی حاضری میں ملا،

ا۔ مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں بہ واسطۂ محل کے ملا، یہاں بلا واسطۂ محل کے، گو آپ کو محل کا گمان ہوا ہو، جو باوجود خلاف واقعہ ہونے کے مُضر نہیں۔

م۔ جتنی دیر حاضر خدمت رہتا تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب کے سامنے ایک ٹمٹماتا سا چراغ ہے، دِل بار بار ندامت و خجالت سے گڑا جاتا تھا۔

ا۔ ماشاءاللہ، یہی تو بڑی دولت ہے کہ چھوٹوں سے بھی اپنے کو چھوٹا سمجھا جائے۔

م۔ تفسیر، حدیث، فقہ سے متعلق بھی بہت سے اُمور میں آنکھیں کُھلیں، لیکن تصوّف و اخلاق سے متعلق جو بیش بہا درس ملے، زبان اُن کے بیان سے عاجز ہے۔

ا۔ وہی بات پھر کہنے کو دِل چاہتا ہے کہ یہ سب غیر محل سے ملا۔

م - اِن فیوضِ معنوی کے علاوہ، مادّی حیثیت سے بھی بڑی راحت ملی، گویا اپنے گھر میں تھا، اپنے اوقات و مشاغل میں پوری طرح آزاد۔

ا - اس جزو میں تو یہیں بھی، بلا کسی تفصیل و تاویل کے موافق ہوں، بلکہ اس کو خود بھی بار بار بطور تحدیث بالنعمۃ کے کہا کرتا ہوں کہ یہاں کسی پر کوئی گرانی نہیں ڈالی جاتی، نہ خیالی نہ واقعی۔

م - کاش ہمارے مولانا۔۔۔۔ بھی اسی طرح اپنے خادموں کو آزاد چھوڑ دیتے۔

ا - تو لطیف مجاہدہ جواب ہے کیسے ہوتا۔

م - وہاں چند گھنٹوں کی حاضری میں بار بار کھانے اور چائے پر مجبور ہونا پڑا۔

ا - یہی مجبوری تو روح ہے فنا کی۔

ایک خواب تھانہ بھون کے زمانۂ قیام ہی میں دیکھا تھا، آج عرض کرتا ہوں، دیکھا کہ ایک بڑا سا مکان ہے، جیسے کسی طبیب کا مطب، جناب وہاں کھڑے ہیں اور پاس ہی ڈولی کے اندر چھوٹی محل صاحبہ تشریف فرما ہیں، اتنے میں وہ باہر نکل آئیں، اور تخت پر تشریف فرما ہو کر، میری طرف پشت کئے، کچھ خانگی معاملات کا ذکر فرمانے لگیں ہیں مسرور بھی کہ مجھ پر اتنا اعتماد فرما لیا گیا، ساتھ ہی دنگ و متحیر بھی کہ جناب جیسے مجسمۂ شریعت کے ہاں نامحرم سے مخاطبت کی اجازت کیسی؟

ا - بی بی چونکہ طبعاً محجوب ہوتی ہے، میری نسبت محجوبیت اس شکل میں ظاہر ہوئی، اور نسبت محجوبیت سے یہ مراد نہیں کہ میں محجوب ہوں، بلکہ مراد یہ ہے کہ میرے قلب میں، طالبین کی جو محبوبیت ہے، غرض صفت اس شکل میں ظاہر ہوئی، اور اس صفت کا آپ کی طرف متوجہ ہونا اشارہ ہے، خاص نفع حاصل ہونے کی طرف انشاء اللہ۔

م - وہاں کے دوسرے حضرات میں مولوی شبیر علی صاحب سب سے بہتر نظر آئے، اللہ اُنہیں برکات دارین عطا فرمائے۔

ا - اللہ تعالیٰ آپ کی دُعا قبول فرما دیں۔

م۔ میرے ہم نام مولانا بدایونی ایک عریضہ خدمتِ والا میں، خدا معلوم میرے توسط سے کیوں ارسال کر رہے ہیں، ملفوف ہے۔

ا۔ غالباً توسط کو موثر سمجھا، میں بھی اسی مصلحت سے اسی توسط کو اختیار کرتا ہوں کہ میرا عذر مؤثر ہو۔"

ذکر یہ تو ذہن میں ہے نہ، کہ دسمبر ۲۹ء کا چل رہا ہے، صدق کا نقش اول سچ (ہفتہ وار) اِس وقت اللہ کے فضل سے زور شور سے نکل رہا تھا۔ دو بزرگ ایسے بھی تھے جن کی خدمت میں انتہائی تعلق کے باوجود پرچہ نہیں بھیجا جاتا تھا، ایک اپنے سب سے بڑے محبوب مولانا محمد علیؒ۔ دوسرے اپنے سب سے بڑے مقتدا مولانا تھانویؒ، دونوں کا رعب، ادب اور لحاظ اتنا غالب تھا، کہ پرچہ نذر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، خدا معلوم کس وقت، کس مضمون پر، کیا اعتراض کر بیٹھیں، اس وقت کچھ کرتے دھرتے نہ بنے گی، نہ اپنے ضمیر و بصیرت کے خلاف چلنے پر عقل آمادہ ہوگی، اور نہ اِن حضرات کے ارشادات کی عدم تعمیل کو دل قبول کرے گا ——— لیکن اب سچ کے سلسلہ میں ایسی صورت آئی کہ حکیم الامت سے رجوع کرنا ناگزیر ہو گیا، صورت یہ ہوئی کہ سچ میں ایک مسلسل مضمون، ظہورِ مسیح و دجال اور خروج یاجوج و ماجوج پر، یورپ اور اسلام، اور دوسرے عنوانات سے کوئی ڈیڑھ سال سے نکل رہا تھا، لکھنے والے حیدرآباد دکن کے ایک صاحبِ علم صوفی اور خانقاہ جیلانیہ مستعد پورہ کے شیخ مولوی محمد شاہ صاحب قادری تھے، جنھوں نے کسی مصلحت سے اپنا اخباری نام "عبداللہ شاہ قادری" رکھا تھا، احادیث متعلقہ کی، ایک نئے انداز پر تفسیر کرکے، موصوف دکھا رہے تھے کہ پیشگوئی ہمیشہ تمثیل و مجاز کے پردہ میں ہوتی ہے، چنانچہ حدیث نبوی میں دجال اور یاجوج ماجوج سے مراد اقوام فرنگ ہیں، عام علماء کو اس تعبیر سے شدید اختلاف تھا مضمون کے شروع میں، ایڈیٹوریل نوٹ میں اگرچہ یہ لکھ دیا گیا تھا، کہ ایڈیٹر کو نہ اس کے مطالب سے لفظ بہ لفظ اتفاق ہے نہ یہ انداز تحریر ہی زیادہ پسند ہے، اِس پر بھی جب مضمون کے بیسیوں نمبر نکل چکے، تو اپنی ذمہ داری کا احساس ذرا زیادہ ہوا، اور اگست ۱۹۲۹ء سے دسمبر ۱۹۲۹ء تک پورے

ڈیڑھ سال کے کُل پرچے، مولانا کی خدمت میں تنقید کے لئے ارسال کئے ——— خط تنہا اِس پبلک معاملہ کے لئے کیوں جاتا، دو تین باتیں ذاتی بھی اس میں عرض کر دیں۔

جوابی ارشادات (علامت "ا") معہ میرے ملخص معروضات (علامت "م" کے ملاحظہ ہوں: -

"م - سچ میں مدت سے ایک مضمون، احادیث دجّال پر نکل رہا ہے، کُل پرچے یکجا کر کے ارسالِ خدمت ہیں، اگر حسبِ فرصت ان پر ایک نظر کر لی جائے تو مجھے استفادہ کا بہت موقع مل جائے۔

ا - مشکل سے آج کچھ وقت ملا۔ خیال تھا کہ آج ہی روانہ کر دوں، مگر ایک صاحب بیچ میں آ گئے اس لئے کامیاب نہ ہو سکا، اُن کے جانے کے بعد ذرا کھانا کا وقت نہ رہا۔"

[یہ واقعی حماقت تھی کہ اتنا بڑا پلندا، مولانا کی نہایت درجہ مشغولی کا خیال کئے بغیر روانہ کر دیا تھا، مولانا آج کا کام کل پر رکھنا جانتے ہی نہ تھے، فرطِ اخلاق سے ضروری کاموں کا ہرج کر کے اِدھر متوجہ ہو گئے، یہ جملۂ معترضہ تھا، اب آگے اصل ارشادات پھر نقل ہو رہے ہیں]

"ا - مفصّل دیکھنا تو مشکل تھا، لیکن مجمل مطالعہ بھی غالباً مفصّل مطالعہ کی طرح کافی ہوگا، میں نے مختصر اصولی جواب لکھ دیا ہے، اب ضرورت اِس کی ہے کہ کوئی صاحبِ علم اصل مضمون کو مطالعہ کریں، اور میری مختصر عرضداشت ذہن میں رکھیں تو امید ہے کہ کوئی جُزو بلا جواب نہ رہا ہو گا،

اِس کا ضرور قلق ہے کہ اخبار سچ کے عموماً لوگ معتقد ہیں، اِس میں شائع ہونے سے مضمون کو سچ ہی سمجھتے ہوں گے، اور باطل میں مبتلا ہو گئے ہوں گے، اِسی لئے میں نے پہلی یا دوسری ملاقات میں زبانی یا تحریراً عرض کیا تھا کہ کوئی مضمون دینی، بدوں ملاحظہ مولانا حسین احمد صاحب کے شائع نہ کیا جائے، معلوم نہیں کب تک اِس سے قلق رہے گا، اصل سبب اِس توسع کا مذموم نہیں، یعنی حسنِ ظن لیکن ہر شئے کے حدود ہوتے ہیں، حسنِ ظن کی بھی ایک حد ہے، اِس سے تجاوز ایسا ہے جیسے غذائے لطیف و مقوی کی مقدارِ معقول سے تجاوز کر کے تخمہ کا سبب بن جاتی ہے چنانچہ شیخ شیرازی نے جہاں گلستاں میں حسنِ ظن کی تعلیم فرمائی ہے ؎

ہر کرا جامہ پارسا بینی   پارسا دان و نیک مرد انگار

وہاں بوستاں میں اس کی حد تبلانے کو یہ بھی فرمایا ہے ؂

نگہدار آں شوخ درکیسہ دُر | کہ داند ہمہ خلق را کیسہ بُر

یعنی قبل تجربہ و امتحان سب کے ساتھ معاملہ احتیاط کا کرے، اِسی طرح ہر صالح صُورت عالم نام کا اَدب وعظمت تو ضروری ہے، مگر اس کی تحریر و تقریر کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرنا جس کا اثر اپنے نفس پر یا دوسروں کے نفس پر ایسے رنگ میں ہو جو بڑی خطرناک ہے، یہ حد سے تجاوز ہے اِلّا ان یتھل بعجتہ من کان مو تضاء بہ دلیل صحیح۔

میرا یہ معروضہ اگر موجب ثقل ہو، معافی کے بعد مطلع فرما دیا جائے، تاکہ آئندہ صرف دینی کا علاقہ رکھوں اور حد مشورہ میں قدم نہ رکھوں۔ والسلام۔ اشرف علی۔ اور کاٹکٹ لگا کر پرچے خدمت میں مرسل ہیں۔"

مولانا کی اصل تنقید تو آگے چل کر آئے گی، سر دست داد، مکتوب کی جامعیت بلاغت کی دے لینے دیجئے، تبلیغ کی تبلیغ اور پھر اتنی نرم و شیریں زبان میں ——— حق، کون کہتا ہے کہ ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے؟ ——— تنقید مضمون نگار کے اصل مضمون پر جو ہوئی وہ تو ہوئی، باقی خود ایڈیٹر کی تنبیہ بھی بہت برمحل رہی، اسے بتایا گیا کہ ایڈیٹر کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے، ہر رطب یابس کو چھاپ دینا اس کا کام نہیں۔ مضامین اگر گمراہ کن ہیں تو اشاعت باطل کی ذمہ داری سے وہ بچ نہیں سکتا، اور دلالت علی الخیر پر جب اجر و صلہ موجود ہے تو "دلالت علی الشر" پر کیوں نہ وعید موجود ہو؟ مولانا کو اپنے اس نیازمند کی خاطر بہت عزیز تھی، اور یقیناً وہ اس کے معاملات میں بڑی رعایت اور مروّت کو دخل دیتے تھے، اِس سے بہت ہی رواداری برتتے تھے، تاہم اصلاحی شان سب پر غالب تھی اور اپنے مخلصوں، نیازمندوں، خادموں کو، وہ ضرورت کے موقع پر، اور ضرر دینی سے بچانے کے لئے نہ ٹوکنا، تدین و آئین صداقت کے خلاف، اور بجا طور پر خلاف سمجھتے تھے ——— طبیب کی دوستی اور خیراندیشی یہی ہے کہ وہ مریض کی مرضی پر نہیں، مریض کے مرض پر نظر رکھے۔

خط میں دو باتیں اور بھی عرض کی گئی تھیں، اور وہ تمام تر ذاتی تھیں، ایک سوال یہ تھا کہ

جہری نماز پڑھانے میں بڑا تکلف ہوتا ہے، سہو کثرت سے ہونے لگتا ہے، خصوصاً جب یہ علم ہو کہ نمازیوں میں کوئی حافظ یا نیم حافظ موجود ہے، اس کا کیا علاج ہے؟ جواب آیا:۔

"ضعف قلب و ضعف دماغ اس کا سبب ہے، اس کے دو علاج ہیں، ایک قرأت طویل نہ پڑھنا، دوسرا علاج حق تعالیٰ کی طرف، یا خانۂ کعبہ کی طرف توجہ رکھنا"

پہلا علاج، یعنی اختصار قرأت پر عمل تو پہلے ہی سے تھا، دوسرے علاج میں جو شق ثانی ارشاد ہوئی یعنی خانہ کعبہ کی طرف مرکزیت توجہ، یہ حکیم الامت کے مخصوصات میں سے ہے، اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہم ایسے ناموں کے حق میں یہی مشورہ بہترین ہے، خاص کر ان لوگوں کے لئے جو زیارت بیت اللہ سے مشرف بھی ہو چکے ہیں ــــــ ایک مادی صورت یعنی صورت خانۂ کعبہ کا تصور رجمالینا کہیں زیادہ آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ ایک غیر مادی، اور منزہ، اور وراء الوراء ہستی کو تصور کی گرفت میں لایا جائے۔

صحبت بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیاں، اپنے عیوب، اپنے گناہ، مشاہدہ میں آجاتے تھے، اور بغیر اس کے کہ مولانا خطاب خاص سے مخاطب فرمائیں یا صراحۃً کسی کو اس کے کسی عیب پر توجہ دلائیں، معلوم ایسا ہوتا کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے از خود ہٹتے جاتے ہیں اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی تھیں ــــــ ہم روز قیام نے ایک خیال پیدا دیا کہ اپنے گھر میں بڑا اچھا کارخانہ چل رہا ہے، زمینداری وغیرہ تو بحمد اللہ تقسیم شدہ ہے، لیکن گھر کا اثاثہ تو بھائیوں میں مشترک ہے ایک کے اٹھ جانے کے بعد ترکہ کی تقسیم شرعی کی کیا صورت ہوگی یہی کیونکر متعین ہوگا کہ اٹھ جانے والے کی جائداد تھی کتنی؟ خط میں تیسرا سوال یہی تھا، اس کا جواب حسب ذیل ملا:۔

"جائداد سے مراد غالباً اثاث البیت ہے، اگر یہی مراد ہے تو جواب یہ ہے کہ دونوں کو مساوی شریک سمجھا جائے گا، پس نصف اثاث کا اس کو مالک قرار دے کر میراث جاری کی جائے گی"

مشائخ اور بزرگوں کی صحبت کا حاصل لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کچھ وظیفے سیکھ لیے یا بہت سے بہت یہ کہ کچھ ذکر و شغل کی مشقیں کر لیں، خانقاہ اشرفیہ سے متعلق دوسروں کا تجربہ جو کچھ بھی ہو، اپنا تجربہ تو یہ ہوا کہ مریض کو مرض کا احساس جلد ہی ہو جاتا، اور جہل خواہ باقی رہ جائے، لیکن جہل مرکب سے نجات بہرحال مل جاتی۔ مریض کو اپنے تندرست ہونے کا گھمنڈ باقی نہ رہ جاتا، اور جہاں تک ذاتی زندگی کا تعلق ہے، دین اور دین داری کا ہر شعبہ بیدار ہو جاتا ——— "ملکۂ یادداشت" صوفیہ کی اصطلاح میں جو معنی بھی رکھتا ہو، اس کی اصلی اور صحیح تعبیر یہیں ملتی تھی، اور دین سے مراد دین ہی ہے، شریعت کا بتلایا ہوا اور صاحب شریعت کا لایا ہوا دین، کوئی بعد کا اختراعی نظام یا آئین مراد نہیں۔

لیجئے باتوں میں شاخیں نکلتی آئیں، اور اصل موضوع یعنی مقالاتِ دجال پر حضرت مولانا کی تنقید چھٹی چلی گئی ——— اب وقت آگیا کہ اسے بجنسہٖ مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ کیا جائے۔

(۲۰)

از حکیم الامت

(خوب خیال کر کے پڑھیئے کہ "حکیم الامت" کی یہ سطریں قلم بند تو شاید نہیں، بقلم حکیم الامت ہیں)

۱۔ نصوص کا اپنے ظاہر پر محمول کیا جانا، اجماعی منقولی مسئلہ ہے اور معقولی بھی، ورنہ تمام نصوص اور تمام قوانین سے امن مرتفع ہو جاتا ہے، البتہ اگر کوئی عقلی یا نقلی صارف ہو تو بہ ضرورت غیر ظاہر پر محمول کر لیا جائے گا، مگر صارف کا محض خیالی یا ذوقی ہونا کافی نہیں، ورنہ ہر فقرہ قرآن و حدیث کا تحریف کرنے والا ایسے خیال یا ذوق کا مدعی ہو سکتا ہے، اور صوفیہ کی تاویل اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ ان معانی کے مدلول نص ہونے کے مدعی نہیں، بلکہ اصلی مدلولات کو قبول کر کے، ان مدلولات کے مشابہ کو بہ طور اعتبار کے ظاہر کرتے ہیں۔

۲۔ احادیث متضمنہ خروج دجال و یاجوج و ماجوج کو جو صحیحین میں بھی مذکور ہیں، جو شخص خلوِ ذہن کے ساتھ پڑھے گا، اس کے ذہن میں بے تکلف جو معانی آویں گے وہی ان احادیث کے

مشہور اور صحیح محمل ہیں۔

۳۔ اِن معانی کا امتناع، نہ کسی دلیل عقلی سے ثابت ہے اور نہ کسی دلیل نقلی سے، مثلاً کسی دوسری ایسی ہی صحیح حدیث میں اس کے خلاف آیا ہو یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خروج کا کوئی زمانہ متعین فرمایا ہو، اور وہ زمانہ گذر گیا ہو، مگر ایسا بھی نہیں ہوا، بلکہ ایک حدیث صحیح میں تصریح ہے کہ آپ، کو دجال کے متعلق یہ بھی احتمال تھا کہ شاید میرے ہی زمانہ میں ظاہر ہو جائے، تو ایسی صورت میں حقیقت کو چھوڑ کر مجاز مراد لینا کیسے صحیح ہوگا۔

۴۔ پھر وہ مجاز بھی بعض قلیل عبارات میں جاری کیا گیا ہے، اور جو عبارات اس مجاز سے بھی خالی چھوڑ دی گئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں، چنانچہ مضمون مذکور کی تاویلات کو احادیث پر منطبق کرنے سے واضح ہو سکتا ہے، چنانچہ نمونہ کے طور پر ایک عبارت بالمعنی پیش کرتا ہوں، کہ ان دونوں واقعات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف رکھتے ہوں گے، جس میں ایک واقعہ ختم ہوگا اور دوسرا شروع بھی اور ختم بھی ہوگا، اور حدیثوں میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ لفظ نبی اللہ بھی آیا ہے، اس لئے اس میں کوئی صحیح تاویل بھی نہیں ہو سکتی، اگر کسی کا دل چاہے مشکوٰۃ کے یہ ابواب، اُن مدعی صاحب کے سامنے لے کر بیٹھ جاوے، معلوم ہو جائے گا کہ کتنی جگہ گاڑی اٹکے گی۔

۵۔ اسی لئے علمائے امت میں سے خصوص سلف خیر القرون میں سے کسی کو ایسے معانی کا احتمال بھی نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وقوع سے پہلے حقیقت سمجھ میں نہیں آتی، اوّل تو یہ بات غلط ہے، جب حقیقت واضح ہے، سمجھ میں نہ آنے کی کوئی وجہ نہیں، پھر اس میں کلام ہے کہ جس کو وقوع کہا گیا ہے، یہ وقوع ہے یا نہیں، ممکن ہے وقوع اسی طور پر ہو جیسا مدلول متبادر ہے۔

۶۔ پھر اگر علماء یا صحابہ نہ سمجھے ہوں، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں تو یہ احتمال نہیں، پھر جب بعض صحابہ کا متبادر معنی پر محمول کرنا آپ کو معلوم ہوا تھا، آپ نے اس کی نفی کیوں نہ فرمائی، اس معنی کی تقریر کیوں نہ فرمائی، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ کو ابن صیاد پر دجال ہونے کا

شبہ ہوا، تو حضورؐ سے اُس کے قتل کی اجازت چاہی، آپؐ نے فرمایا، اگر یہ وہی ہے تو تم اُس پر مسلّط نہیں ہو سکتے، اگر وہ نہیں ہے تو اُس کا قتل کرنا اچھی بات نہیں، آپؐ نے یہ کیوں نہ فرمایا کہ یہ دجّال ہو سکتا ہی نہیں، کیونکہ دجّال "شخص واحد کا نام نہیں" خاص قوم کا نام ہے، اِس لئے یہ دجّال نہیں ہو سکتا، خصوص جب کہ وہ اِس قوم میں بھی نہ تھا۔

ع۷ پھر اگر ایسی ہی تاویلات کا باب مفتوح ہو تو اس کی کیا دلیل ہے کہ جو اِس وقت سمجھا گیا وہی مراد ہے، ممکن ہے دوسری قوم اور دوسرے واقعات مراد ہوں، جو واقع ہو چکے ہوں، یا آیندہ واقع ہوں، اور اِس حالت میں مرزا کی تاویل پر بھی حتیٰ کہ دعویٰ نبوّت میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، حالانکہ اُس پر اعتراض کیا گیا ہے، اِس تحریر میں اُس نے بھی ایسی ہی تطبیق کی کوشش کی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ دونوں تطبیقوں میں، تعدادِ احادیث کی کمی بیشی کا تفاوت ہو۔

ع۸ کسی مدّعا کے اثبات میں زیادہ کوشش کرنا کوئی حقانیت کی دلیل نہیں ہے، اہل باطل نے، اپنے آراء و اہواء کے اثبات میں اِس سے زیادہ کوشش کی ہے، مگر اُن کے باب میں ارشاد ہوا ہے، اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اور ارشاد ہوا ہے، لَا يَاْتُوْنَكُمْ خَبَالًا

ع۹ اسی طرح دعا کے بعد رائے نہ بدلنا کوئی شرعی دلیل نہیں، مرزا نے بھی ایسے دعوے کئے ہیں، شرعی ادلہ متعین ہیں، یہ اُن میں سے نہیں، اور راز اُس کا یہ ہے کہ بعض دعا شرائط سے خالی ہوتی ہے، اِس لئے قبول نہیں ہوتی۔

ع۱۰ پھر غضب پر غضب یہ ہے کہ بلا دلیل اپنے دعویٰ پر اتنا جمود ہے کہ مخالف پر جس کے پاس شرعی دلیل بھی ہے طعن و استہزاء و استخفاف، بلکہ سبّ و شتم بھی کیا گیا ہے؟ کیا یہ مجاز ایسا قوی و راجح ہو گیا کہ حقیقت کا قائل مسخر و البطال کے قابل ہو گیا۔

ع۱۱ مدیر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ قبل تحقیق اِس کو شایع کر دیا، خُدا جانے کتنی اُمّت محمدؐیہ غلطی میں مُبتلا ہو گئی ہو گی، اور جو عذر اشاعت کا لکھا گیا ہے، محقق علماء سے استفتاء کر لیا جائے

کہ وہ عنداللہ معذور ہو سکتا ہے یا نہیں، تاوقتیکہ اِس مضمون کے بُطلان کی، اور اشاعت کے خطا ہونے کی تصریح شایع نہ کی جاوے۔

سچ - اپنا ذاتی خیال اُس وقت بھی تھا، اور اب تو اور زیادہ جزم و وثوق کے ساتھ ہے کہ جس طرح حقیقی دجّال کا اطلاق آخر زمانہ کے کسی ایک متعیّن شخصیت پر ہوگا، اسی طرح مجازی وصفاتی دجّال خدا معلوم کس کثرت سے پیدا ہو چکیں گے، افراد بھی اور اقوام بھی، چنانچہ اسی خیال کی وضاحت کے لئے، ذیل کا نوٹ بھی مولانا کے مضمون کے نیچے شایع ہوا:-

سچ - حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلّہٗ اس وقت علمائے اُمّت کے اُن گنے چُنے افراد میں سے ہیں، جن کی رائے ہر مسئلہ دین میں پوری طرح سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بہرحال پورے عزّت و احترام، توجہ والتفات کی مستحق ہوتی ہے، مضمون "یورپ اور اسلام" اور اسی سلسلہ کے دوسرے مضامین کے بہت سے نمبر، پچھلے ماہ دسمبر میں، مولانا موصوف کی خدمت میں بغرض اظہار رائے گرامی بھیج دیئے گئے تھے، مولانا نے کمال عنایت وقت نکال کر انھیں مُلاحظہ کیا، اور ان کے تدیّن وتحقیق نے اِس پر جو کچھ ارشاد فرمایا، بجنسہٖ اُوپر درج کر دیا گیا، امید ہے کہ ہمارے مکرّم جناب مولوی عبداللہ شاہ صاحب قادری حیدر آبادی اِس انتقاد کی روشنی میں اپنے نقاطِ بحث کو آیندہ اور زیادہ مضبوط اور مدلّل بنانے کی کوشش کریں گے، انتقاد، اگر تحقیق و حُسنِ نیّت کے ساتھ کیا گیا ہے تو بہرصورت مفید ہی ہوتا ہے۔

جہاں تک، سچ، یا مدیر سچ کے ذاتی عقیدہ کا تعلق ہے، جیسا کہ اِن صفحات میں بارہا اِس سے پیشتر بھی عرض کیا جا چکا ہے، دجّال کے ظہور ذاتی اور ظہور صفاتی میں اسے کوئی تناقض نہیں نظر آتا، بلکہ اُس کے فہم ناقص میں یہ دونوں عقیدے ایک دوسرے کے، اور ایک دوسرے کے مکمّل ومتمم ہیں - اور سچے رسولؐ کی پیشگوئیوں کی پوری عظمت بھی درحقیقت یُوں ہی ظاہر ہوتی ہے، کہ مجازی اور حقیقی، لفظی اور معنوی، ذاتی اور صفاتی، ہر رنگ سے پوری ہو کر رہیں آگر آج اِن صفحات میں موجودہ فرنگی تمدّن کو شیطانی تمدّن سے یا موجودہ فرنگی حکومتوں کو فرعونی حکومتوں سے

تعبیر کیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ابلیس کے کسی شخصی وجود یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے فرعون کی تاریخی شخصیت سے انکار ہے، ٹھیک اسی طرح موجودہ تمدن یا فرنگی قوموں کو دجّال قرار دینا، اس کا مستلزم نہیں کہ آیندہ کسی شخصی دجّال کے ظہور سے انکار ہے، آج صفاتی حیثیت سے بے شمار دجّال اور بے شمار مہدی موجود ہیں، آیندہ کیا عجب ہے کہ کسی شخصیت کے اندر دجّال کامل اور کسی ایک شخصیت کے اندر مہدی کامل کا ظہور ہو جائے، غرض صحیح تو اپنے نزدیک علمائے سنت کے عام مسلّم عقیدہ اور مولوی عبداللہ شاہ صاحب کے عقیدے کے درمیان، کوئی تناقض اور تعارض نہیں پاتا ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کی تعبیر کی بھی گنجایش سمجھ لے ۔

۱۹۳۰ء

(۲۰)

مولانا کا یہ افادۂ قلم سچ جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۰ء میں، مع میرے معروضات کے نکلا، (وہی معروضات جو ابھی بطور ضمیمہ گذر چکے) لیکن اس کے طبع و اشاعت کا پس منظر بھی کچھ کم سبق آموز و دلچسپ نہیں —— اشاعت سے قبل مولانا کی اجازت ضروری معلوم ہوئی، لیکن اداراتی تجربہ نے یہ اندیشہ بھی سامنے لا کھڑا کیا، کہ ایسا نہ ہو جواب میں لوگ مولانا پر شخصی طنز و ذاتی تعریض شروع کردیں، دل اس کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا۔ اس لئے رائے یہ ٹھہری کہ تحریر بغیر مولانا کے نام کی تصریح کے دی جائے، اور بجائے نام کے صرف "ایک نامور متدین عالم کے قلم سے" لکھ دیا جائے۔ اجازت طلبی کا خط ۱۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لکھا، اور یہ بھی عرض کردیا، کہ ارشادات گرامی سے شرح صدر پوری طرح تو نہ ہوسکا، تاہم ان کی اشاعت، صاحب مضمون کی شخصیت کے اخفاء کے ساتھ کردینا چاہتا ہوں، —— جواب آیا، اور حسب معمول اصولی تعلیم لئے ہوئے جواب آیا:۔

"یہ آپ کی سلامتی صدر اور صفائے طبیعت ہے، لیکن میں اصولاً بدون شرح صدر کے اشاعت کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ بدون شرح صدر کے بھی، اشاعت مضمون کی جائز ہے، حالانکہ یہی تو بنا ہے میرے قلق کی، پھر اس میں اُس میں فرق ہی کیا ہوگا، چونکہ مجھ کو شرح صدر ہے اس لئے میں النور[1] ذخیرہ میں شائع کرادوں گا، میرے پاس نقل موجود ہے

[1] مولانا ہی کی سرپرستی میں یہ ماہنامہ، تھانہ بھون سے نکلا تھا،

اور اشاعت میں اپنا نام ظاہر کردوں گا، اور بے تمیزی[۱] پر میں آمادہ و راضی ہوں، البتہ آپ کی فراغت پر نظر کرکے (چنانچہ اس محبت نامہ میں بھی مجھ کو مشورہ عرض کرنے کی اجازت دی ہے) یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ شرح صدر کی کوشش تو ضروری ہے، عقائد کا معاملہ ہے، یا اگر باوجود صحیح کوشش کے کامیابی نہ ہو، تو اہل اختلاف میں باجماع جس کی حقانیت مظنون ہو اس کی تقلید ضروری ہے، اب صرف اس کا تصفیہ رہا کہ شرح صدر کا طریق کیا ہوگا، اس میں آپ کا کیا خیال ہے"؟

شرح صدر کی یہ ضرورت بجائے خود شرح صدر کی محتاج تھی، جو بدنصیبی سے نہ اُس وقت حاصل ہوا، نہ اب ہے، مقصود یہاں اپنے کسی عقیدہ کی تبلیغ و رعایت نہیں، مقصود صرف حکیم الامت کی تعلیم و طریق کار کی شرح و ترجمانی ہے، اور فی الجملہ اس پر ان سطور سے روشنی پڑ گئی ——— عقاید و مسائل کے جزئیات میں شرح صدر ہو یا نہ ہو، اس کا کوئی اثر جذبۂ محبت و تعلق عقیدت پر نہیں پڑ سکتا تھا، پچھلے گرامی نامہ میں، جہاں تیج کی روش پر گرفت تھی، وہاں یاد کر لیجئے کہ آخر میں یہ فقرہ بھی تو تھا کہ :-

"میرا یہ معروضہ اگر موجب ثقل ہو تو معافی کے بعد بے تکلف فرما دیا جائے تا کہ آئندہ عرض دوستی کا علاقہ رکھوں، اور حد مشورہ میں قدم نہ رکھوں"

اِس فقرہ کے جواب میں اسی ۱۹ر دسمبر والے معروضہ میں عرض کیا گیا :-

"والا نامہ کے آخر میں یہ عبارت کہ میرا معروضہ اگر الخ پڑھ کر حیران رہ گیا، اور اس کے جواب میں بہ ادب تمام عرض کرتا ہوں کہ والا نامہ تو موجب ثقل مطلق نہ تھا، البتہ اس کے آخر کا یہی ٹکڑا ایک حد تک موجب ثقل ہوا، ظاہر ہے کہ اگر اس قسم کے ارشادات اپنے لئے کسی درجہ میں موجب گرانی سمجھتا، تو اپنی طرف سے ایسی درخواست ہی کیوں پیش کرتا"

اِس جزء کے جواب میں ارشاد ہوا :-

---

[۱] یہ میرا ہی لفظ تھا، جسے مولانا نے دہرایا ہے،

"میں اِس عنایت و محبّت کا ممنون ہوں، احتمال تو مجھ کو معتد بہ نہ تھا، لیکن میں وہمی طبع واقع ہوا ہوں، احتیاطاً لکھ دیا تھا، اِس کا یہ نفع ہوا کہ صراحتہً مجھ کو اجازت حاصل ہوگئی، اِس اجازت صریحہ کی بنا پر مکرّر عرض ہے کہ ایسے مضامین مولانا حسین احمد صاحب کے ملاحظہ میں ضرور گذار دینا چاہئے۔"

گرامی نامہ ختم ہونے پر ہے، دو تین باتیں ضرور نوٹ کر لیجئے:-

(۱) مولانا کو اپنے چھوٹوں تک کی رعایت کس درجہ مدِنظر رہتی ہے، کیسے کیسے شفقت آمیز انداز خطاب کے اختیار کرتے رہتے ہیں۔

(۲) لیکن حق کی رعایت اِس پر بھی مقدم رہتی ہے، جس مسئلہ کو حق سمجھ رہے ہیں اس کے بیان کرنے سے مخاطب کی مروّت میں خاموش نہیں ہوجاتے، دیکھتے ہیں کہ مخاطب بے توجہی کے کان سے سُن رہا ہے، اس پر بھی اپنا فرض تبلیغ برابر جاری رکھے ہوئے ہیں —— حق گوئی اور نرم خوئی کی جامعیت کے لحاظ سے مثنوی مولانائے روم کے مصرعہ

نرم گو لیکن مگو غیر از صواب

کی زندہ تفسیر ہے۔

(۳) سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد صاحب سے اُس وقت بھی تھے، اِس پر بھی اس وقت تک اُن کا پُورا لحاظ و احترام قائم تھا۔

دجّال اور مسیح موعود، اور یاجُوج و ماجُوج و مسائل متعلقہ سے صحیح عقائد، بیشک وہی ہیں، جن کی جانب مولانا کے تنقیدی مضمون میں اشارہ موجود ہے، اکابر اہل سُنّت کا اِن ہی پر اتفاق ہے، لیکن گنجائش کبھی نہ کسی حد تک اِن تعبیروں کی بھی نکل سکتی ہے جو حیدر آبادی مولوی صاحب، سچ کے مضمون نگار نے اختیار فرمائی تھیں، اور اس لئے بطور ایک کمزور مذہب کے اس کی اشاعت میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن ان تعبیرات کی کمزوری کی تصریح افسوس ہے کہ اُس وقت نہ کردی گئی، اور کی کیسے جاتی، جب خود ہی اُس وقت ان کی اِس حد تک کمزوری کا احساس نہ تھا، اور ادارتی

خاموشی سے سیج خوان طبقہ قدرۃً اور بالکل صحیح طور پر یہ سمجھتا رہا کہ اِس نہایت درجہ طویل مضمون کو ادارتی تائید بھی حاصل ہے ـــــــ اِس طرح کی کوتاہیاں اور لغزشیں، فرائضِ ادارت میں خُدا معلوم کتنی اَور بھی ہو چکی ہیں۔

خطوط میں علمی، دینی، سلوکی مسائل کے ساتھ کچھ خانگی باتیں بھی برابر رہا کرتی تھیں، چُنانچہ اِس خط میں بھی جو ۱۹ر دسمبر کا، یعنی آدھے جاڑے گذر جانے پر لکھا ہوا تھا، یہ عبارت بھی درج تھی کہ "بھائی صاحب بیچارے ہر سال موسم سرما میں ضیق النفس کے دوروں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں، اور شدید اذیتیں اُٹھاتے ہیں، اب کی سال اب تک اللہ نے اپنے فضل سے محفوظ رکھا ہے، مَیں تو اُسے جناب والا کی توجہ اور اہلِ خانقاہ کی دُعاؤں کا ثمرہ سمجھتا ہوں" اِس پر ارشاد ہوا کہ:۔

"نہایت مسرت ہوئی، مبارک باد عرض کرتا ہوں، اور ان آثار کو دیکھ کر تجدیدِ دُعا کی ہمت بڑھتی ہے، اِس لئے مکرر دُعائے صحت و حفاظت کرتا ہوں۔"

مولانا، عالم بے بدل اور درویش کامل تو خیر تھے ہی، لیکن سب سے پہلے انسان تھے، اور جس نے اُن کے اِس جوہر کو نہ پہچانا، اس نے ان کو ذرا بھی نہ پہچانا۔

ایک بار عجب اتفاق ہوا، ایک ہی شب میں ہم میاں بیوی دونوں نے مولانا کو خواب میں دیکھا، حالانکہ دونوں، مکان کے الگ الگ حصّوں میں سو رہے تھے، یہ جنوری ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا، اپنا خواب بڑا طویل تھا، خلاصہ یہ کہ آبادی اور غانہ آبادی چھوڑ، عبادت و ریاضت کے لئے جنگل میں نکل جانا چاہتا ہوں، اعزہ سخت پریشان ہو کر مولانا کو چُپکے سے اطلاع کر دیتے ہیں، اور حضرت دفعۃً بلا اطلاع آ جاتے ہیں، اور جہاں میری جانماز بچھی رہتی ہے، وہیں بیٹھ جاتے ہیں، اور مجھے افہام و تفہیم کر میرا ارادہ بدل دیتے ہیں۔ مَیں بے انتہا خوش ہو رہا ہوں، کہ کہاں غریب خانہ، اور کہاں مولانا کا ورود، اور سفر تو حضرت اب کرتے ہی نہیں، میرے لئے اپنا مُستقل قانون تک توڑ دیا، یک بیک حضرت واپس بھی تشریف لے گئے، اور میرے دِل کی دِل ہی میں رہ گئی، کہ چند اسٹیشن ساتھ جاؤں گا، اور نذرانۂ مصارف پیش کروں گا ـــــــ دِل جاگنے کے بعد بھی مسرت سے ایسا لبریز رہا کہ جیسے

واقعۃً حضرت تشریف لے آئے ہوں، خیر صبح ۹ر جنوری کو یہ خواب لکھ بھیجا، بزرگوں کو لوگ خواب لکھ بھی بھیجتے ہیں، بلکہ بعض مشائخ تو کھود کھود کر خوابوں کو پوچھا کرتے ہیں، مولانا کے ہاں خوابوں کو یہ درجہ حاصل نہ تھا، بہرحال میرے اس عریضہ پر یہ لکھ کر آیا کہ:-

"تعبیر میں تو مجھ کو اصلاً مہارت نہیں، لیکن اجمالاً اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ نہایت مبارک خواب ہے، آپ کے لئے بھی، اور میرے لئے بھی، کیونکہ متحابین فی اللہ کا اجتماع دونوں کے لئے مبارک اجتماع ہے، نیز آپ کے لئے اشارہ ہو سکتا ہے کہ علوم و اعمال میں اپنی رائے پر وثوق نہ فرمائیں بلکہ کسی دوسرے کو بھی شریک مشورہ کر لیا کریں"

بیوی کا خواب تو رہا ہی جاتا ہے، انھوں نے یہ دیکھا کہ انھیں اپنی عملی مذہبی زندگی میں کچھ بڑی دشواریاں پیش آرہی ہیں، اور وہ حضرت کو لکھ رہی ہیں کہ "آپ تو فرمایا کرتے ہیں کہ دین میں کوئی خاص مشقت نہیں پھر یہ میرے لئے کیا ہے"، اتنے میں حضرت خود ہی موجود ہوگئے، اور انھیں زبانی تسلی دے رہے ہیں کہ فی الحقیقت دین کی راہ میں کوئی ایسی دشواری ہی نہیں ——— اس پر ارشاد ہوا کہ:-

"یہ تو واقعہ ہے، ان کی ہمت بڑھائی گئی ہے کہ دشواری کو پیش کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ کچھ دشوار نہیں، ان کو بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنی اصلاح میں رجوع کیا کریں"

خیر یہ خواب اور تعبیر خواب وغیرہ تو کبھی کبھار کی چیزیں ہیں، وقتاً فوقتاً یہ تذکرے بھی آتے رہیں گے، دوسرے مشائخ کی طرح یہاں یہ نہ تھا کہ یہ گفتگوئیں مولانا کی عظمت کے اہم (یا غیر اہم بھی) اجزاء ہوں، مولانا کے مذاق کی اصل چیزیں تو مسائل و علوم تھے، فقہ، تفسیر، کلام، سلوک، غرض دین کے ہر شعبہ سے متعلق، اور یہی تذکرے آپ کو ان اوراق میں کثرت سے ملیں گے۔

(۲۱)

خیر اور چیزیں تو بعد کو آتی رہیں گی، ابھی تو سلسلہ دہی صحیح میں مضمون دجال و یاجوج ماجوج کے اندراج کا چل رہا ہے، ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو معروضۂ ذیل پیش کیا گیا، (نقل کسی قدر تلخیص کے ساتھ ہے):-

"والا نامہ کے جواب میں بادب گذارش ہے کہ سچ تو مولانا کی نظر سے برابر گذرتا ہی رہتا ہے، اور میں اپنی جگہ سمجھتا رہتا ہوں کہ کوئی مضمون اگر خاص طور پر قابل گرفت ہوا، تو مولانا ضرور تنبیہ فرما دیں گے[1] چنانچہ ایک موقع پر جب مولانا کا ذکر زیادہ مداحی کے ساتھ آگیا تھا، تو مجھے فہمایش ہوئی بھی تھی[2] پھر یہ مضمون تو اور بھی ایسے متعدد حضرات کی نظر سے گذرتا رہا جو آپ ہی حضرات کے صحبت یافتہ اور آپ ہی جیسے بزرگوں کے حلقۂ درس کے تربیت یافتہ ہیں، اُن میں سے کسی نے بھی مضمون کو گمراہ کن یا نا قابل اشاعت نہیں فرمایا، اگرچہ اس کے مطالب سے پورا اتفاق بھی نہیں کیا[3]

میں خود بھی اس کا قائل نہیں کہ مضمون تمام تر حق ہی ہے، البتہ یہ سمجھتا رہا کہ اس میں بہت سی باتیں آگئی ہیں، جو لگتی ہوئی اور بہ ظاہر چسپاں ہیں[4]، اور جہاں کہیں اس میں غلو اور تجاوز عن الحدود ہوگیا ہو، اُن مقامات کی کوئی صاحب تصحیح کر دیں[5]، چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کا انتخاب بھی اِس غرض سے کر چکا ہوں[6]، موصوف کے نزدیک مضمون میں جا بجا بہت زائد غلو ہے، اگرچہ مضمون کو سرے سے بے محل انھوں نے بھی نہیں قرار دیا[7]، اِسی لئے گذارش تھی کہ جناب والا اپنے اِس مختصر مضمون کی اشاعت کی اجازت سچ میں دیدیں، تاکہ جن کے پاس زہر پہنچ چکا ہے، تریاق بھی پہنچ جائے[8]، الندیر یا کسی اور پرچہ میں طبع ہونے سے یہ مقصود حاصل نہ ہوگا، درخواست اجازت آج مکرر پیش ہے[9]

اپنے ذاتی شرح صدر کی صورت سوا اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جناب کی تحریروں کو پڑھتا، اور اپنی بساط کے موافق ان پر غور کرتا رہوں، یا اس کے علاوہ اور جو صورت ارشاد ہو؟[10]

یہ عریضہ بہت ڈر ڈر کر لکھ رہا ہوں، کوئی امر نامناسب اگر اس میں قلم سے نکل گیا ہو تو اس کا بھی ایما فرما دیا جائے، ان مضمون نگار کے مضمون کی تازہ قسط مرسل خدمت ہے[12]

جواب ایک ایک فقرہ کا، حسب دستور نمبروار پڑھئے۔

(۱) "بعض اوقات نظر فرمانے کا اتفاق نہیں ہوتا، یا ہوتا ہے مگر کچھ فرمانے سے کوئی امر مانع ہو جاتا ہے خواہ مانع ضعیف ہو یا قوی، چنانچہ مجھ سے بھی اگر پوچھا نہ جاتا تو غالباً کچھ عرض نہ کرتا، اِسی لئے محض نظر فرمانے پر اکتفا مناسب نہیں، میرے نزدیک ضرورت اس کی ہے کہ قبل اشاعت

ملاحظہ میں لایا جاوے، اور ملاحظہ کرانے کی غرض ظاہر فرما دی جاوے کہ تحقیق رائے مقصود ہے۔

(۲) اِس پر قیاس نہ فرمایا جاوے۔ اپنی مدح کو رد کرنا تو ایسے متواضع بزرگوں کے لئے مثل امر طبعی کے ہے، دوسرے مضامین کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور بہت سہل ہے اب دکھا کر پوچھ لیا جائے۔

(۳) اِس میں اکثر کا معمول یہی ہے (خواہ مناسب ہو یا نامناسب) کہ بدوں پوچھے کچھ نہیں فرماتے، اِس لئے سکوت حجّت نہیں، اگر دِل چاہے، اِس سکوت کے معنی اُن سے پوچھ لئے جائیں، فیصلہ ہو جائے گا۔

(۴) دلچسپی حجّت نہیں، البتّہ اگر دونوں جانب دلیل صحیح ہو، اُس میں دلچسپی ایک جانب مرجح ہو سکتی ہے، اور جہاں صحیح اور فاسد کا مقابلہ ہو وہاں دلچسپی مرجح نہیں۔

(۵) اور اگر تمام جہان ہی اغلاط سے پُر ہو تو وہاں کیا کیا جائے گا،

تن ہمہ داغ داغ شُد پنبہ کجا کجا نہم

(۶) اِس اِنتخاب سے کام لینے کا وقت قبل اشاعت تھا کہ مولوی صاحب کو وہ مضمون دکھلایا جاتا۔

(۷) سہ مخلوط تو مضر ہوا۔

(۸) اہل علم کے لئے تو کافی ہے، مگر ان کو چنداں حاجت نہیں، اور جن کو حاجت نہیں اُن کے لئے یہ مختصر تحریر کافی نہیں۔

(۹) میرا پہلا عذر تو ہلکا ہو گیا، مگر اب ایک دوسرا عذر اور ہے، خواہ اخبار سچ کی شان اِس سے گھٹتی ہے کہ ۵۰ صفحہ کا یہ جواب[۱] البتّہ اگر کسی کی شرح صدر ہو جائے، پھر وہ عبارت میں مبسوط کر کے لکھے تو مفید ہو سکتا ہے۔

(۱۰) ایک بار اصل حدیثیں جو بہ قدر ضرورت مشکوٰۃ میں ملیں گی، ایک کو بھی ان بزرگ کے

---

[۱] یعنی اصل مضمون کی ضخامت تو ۵۰ صفحہ تک پہنچ چکی، اور اس پر تنقید اتنی مختصر!

مضمون کو اس پر منطبق کیا جائے تو بہ قدر ضرورت کشف حقیقت ہو جائے گا۔

(۱۱) توبہ توبہ نیاز مندوں سے ڈر کیسا، آپ کو حق ہے کہ ناز کے ساتھ خوب لکھئے۔

(۱۲) دیکھ لیا، پہلے بھی دیکھا تھا، اس کا جواب میرے اُسی پرچہ میں موجود ہے، خلاصہ یہ کہ ظاہر معنی سے جب تک کوئی صارف نہ ہو، خلاف ظاہر پر عمل ناجائز ہے، خواہ اس کا تاویل نام رکھا جائے۔"

گفتگو اس نقطہ پر پہنچنے کے بعد بھی ختم کہاں ہوئی۔ اپنے لئے بار بار کہنا پڑتا ہے کہ حضرت مولانا کی زیادہ سے زیادہ عظمت و احترام کے باوجود بھی طبیعت تقلید محض پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی اور جب تک دل میں کچھ بھی خلش باقی رہے، جی یہی چاہتا کہ طالب علمانہ سوالات کھود کرید کر کئے ہی جائیے، چنانچہ یہ والا نامہ پا کر جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کے عریضہ میں جو کچھ عرض کیا، اُسے کچھ بجنسہ اور کچھ خلاصتہً آج آپ بھی ملاحظہ میں لے آئیے:-

"جناب والا کا یہ ارشاد بالکل بجا کہ اصل احادیث کے سامنے رکھنے کے بعد صاحب مضمون کی تاویلات ان پر پوری طرح منطبق نہیں ہوتیں، چنانچہ اب نہیں، آج سے کئی مہینے قبل ہی صاحب مضمون کو لکھ بھی چکا ہوں کہ آپ پوری احادیث کے بجائے، ان کے صرف درمیان درمیان کے ٹکڑے لے لیتے ہیں، تو ارشاد گرامی تو بجائے خود بالکل صحیح ہے، البتہ شرح صدر اسی باب میں نہیں پاتا کہ جو مضمون صرف اس درجہ میں ناقص ہے وہ ناقابل اشاعت بھی ہے(۱)۔

دجال وغیرہ کی بابت جو کچھ حضور انور کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا ہے وہ یقیناً لفظاً حقیقۃً بھی پورا ہو کر رہے گا، اور مجازاً اور استعارۃً بھی، ہر اعتبار و ہر پہلو سے، چنانچہ جس طرح ایک اصلی حقیقی فرعون کے علاوہ اور اس سے قبل بہت سے اشخاص و اقوام پر صفاتی دجال کا اطلاق ہوگا، اپنے اس خیال کا جناب ہی کے متعدد صحبت یافتہ بزرگوں کے سامنے اظہار کیا، کسی صاحب نے انکار نہ فرمایا، بلکہ گویا تائید ہی کی(۲)، سچ میں بھی اُسے تفصیل سے لکھ چکا ہوں، بلکہ اُس پر ایک قادیانی پرچہ نے سوال بھی کیا تھا، کہ جب دجال کا ظاہر ہو چکنا مان لیا ہے تو اب ہمارے مرزا صاحب کے ماننے میں کیا تامل ہے، اس کے جواب میں میں نے لکھا تھا کہ جو دجال ظاہر ہو چکے ہیں، وہ تو محض صفاتی اعتبار سے ہیں،

نہ کہ وہ متعین فرد جو بالکل آخر زمانہ میں آئے گا، اور اس مجازی و صفاتی معنی میں تو مہدی بھی میں ہر بڑے عالم شریعت کو مانتا ہوں[3]، خواہش یہ تھی کہ پہلے جناب کا وہ مختصر مضمون نکل جائے، اس میں صاحب مضمون کی لغزشوں کا اجمالاً ذکر آ گیا ہے، پھر مولانا مناظر احسن گیلانی یا مولانا محمد شفیع دیوبندی یا مولانا ذکریا صاحب (شیخ الحدیث) یا اسی درجہ کے کوئی اور صاحب اُن پہلوؤں کی وضاحت کریں جو صاحب مضمون کی نظر سے غائب ہو گئے ہیں، اور اسی طرح ناظرین سچ کے سامنے مسئلہ کے سارے پہلوؤں کی تحقیق آ جائے گی[4]۔ اس لئے اگر اجازت مرحمت ہو تو سچ کے اگلے ہی نمبر میں گنجائش نکال کر جناب کی تحریر دیدوں[5]، مولانا (حسین احمد صاحب) کی خدمت میں بھی آج ہی کل میں عریضہ روانہ کر رہا ہوں، اس میں بصراحت عرض کر دوں گا کہ ہر نمبر میں جو شئے بھی قابل اصلاح معلوم ہو، اس سے مجھے ایماء فرما دیا جایا کرے، اور جناب کے ارشاد کا حوالہ بھی دیدوں گا[6]، البتہ قبل اشاعت ہر مضمون کا مسودہ مولانا کی خدمت میں بھیجتے رہنے سے تو اُن کے اوقات عزیز پر بڑا بار پڑ جائے گا[7]، وہ ہفتہ وار پرچہ کے خیال سے یہی چاہیں گے کہ اپنے اور کام کاج چھوڑ کر ہمارے پلندہ کو بروقت واپس کر دیا کریں، اور اپنا شدید ہرج کریں گے، پھر اگر مضامین وقت پر نہ پہنچے، تو مجھے وہاں ناظرین سے معذرت کرتی رہنی پڑے گی۔"

عریضہ (اور پورا عریضہ بھی کہاں، یوں کہئے اس کا ملخص) ابھی ختم نہیں ہوا، بعض بعض عریضے تو گویا پورے پورے مقالے یا مضمونچے ہوتے تھے، اُن کے جوابات فوراً دیتے رہنا، حضرت مولانا کی کرامت اگر نہیں، تو نظم و ضبط اعلیٰ کا ثمرہ اور حیرت انگیز عزم و ہمت کا کرشمہ تو ضرور تھا، اور بعض عریضے تو پوری کشکول ہوتے تھے، خانگی، فقہی، کلامی، سلوکی، ہر قسم کے موضوع ان میں چھڑے ہوئے، چُنانچہ یہ عریضہ بھی اسی قسم کا تھا، بیشتر حصہ تو نقل ہو چکا، تھوڑا سا اور رہ گیا، وہ بھی پڑھ لیجئے، اور نیاز نامہ کی رنگارنگی اور بوقلمونی پر جی چاہے تو مُسکراتے بھی جائیے:-

"ایک بڑی خوش خبری یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں، میرے چار عزیز مختلف شدید بیماریوں میں مُبتلا تھے، ذاکرین خانقاہ سے سب کے حق میں دُعا کرائی گئی، بحمداللہ چاروں کو شفا حاصل

ہوگئی اور علاج کوئی نیا نہیں کیا گیا، وہی پُرانے اور اُس وقت تک غیر نافع علاج، دُعاؤں کی برکت سے نافع بن گئے[8]"

وہ فقہی سوال بھی دریافت کرتے ہیں،

(۱) کسی صاحب کی ایک کتاب جو میری ملک نہیں، کئی سال سے میرے پاس موجود ہے اور یاد نہیں پڑتا کہ کس کی ملک ہے اور مجھ تک کیسے پہنچی، اب اس کے لئے کیا کیا جائے[9]؟

(۲) وارث اگر فاترالعقل ہے تو اس کی بابت ترکہ کے احکام کیا ہیں[10]؟

مولانا مناظر احسن گیلانی کا خط بھی جناب کے مُلاحظہ کے لئے ملفوف ہے، پنسل سے جس حصہ پر میں نے خط کھینچ دیا ہے، وہ جناب کے لئے قابلِ ملاحظہ ہے[11]، یاد تازہ کرنے کے لئے جناب کی وہ یادداشتیں بھی ملفوف ہیں"

جواب کے لئے اس قسط میں کہاں گنجائش، اس کے لئے تو ذرا انتظار ناگزیر ہے۔ البتہ ان آخری ٹکڑوں کو سمجھنے کے لئے، دو یا تین باتیں اپنے حافظہ میں ازسرِنو لے آئیے:۔

ایک یہ کہ خانقاہ اشرفی (جس کا نام حضرت کے شیخ حاجی امداد اللہ کے نام پر خانقاہ امدادیہ تھا) میں مقیم ذاکرین و شاغلین بعد نماز عصر ختم خواجگان کے لئے اکٹھے ہوتے تھے اور اس کے خاتمہ پر اہلِ حاجت کے لئے دُعائیں بہ آوازِ بلند کرتے تھے، اس طرح کہ ایک صاحب الفاظ دُعا کو پُکارتے جاتے اور دوسرے حضرات آمین کہتے جاتے۔

دُوسری بات یہ کہ مولانا گیلانی کا ایک مفصّل مقالہ ہندوستان میں جوازِ فے کے حق میں نکلا تھا (اور یہاں کے غیر مُسلموں سے سُودی منافع بھی فے کے حکم میں تھے) حضرت مولانا کو اس تحقیق سے سخت اختلاف تھا۔

(۲۲)

جوابات نمبروار پڑھیئے، اور اب تو آپ اس طریقہ پر پڑھنے کے خوب عادی ہو چکے ہیں:۔

(۱) اس کے متعلق آگے معروض ہے۔

(۲) بس عُرفی اخلاق کی یہی تو مضرت ہے کہ حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔

(۳) اِس کا کسی کو انکار نہیں کہ مجازی دجّال و یاجُوج بہت سے ہیں جیسے مجازی فرعون بہت سے ہیں، لیکن کیا اس کی بنا پر کسی کو یہ جائز ہے کہ قرآن مجید میں جو فرعون کا قصّہ وارد ہے، اِس کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ مُراد اس سے مجازی فرعون ہے، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون نہیں، البتہ صوفیہ کی طرح یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جس فرعون کا ذِکر ہے وہ تو وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا، مگر دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ مشابہ ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہیئے، جو موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ کیا تھا تو کیا حیدرآبادی صاحب نے یہ مضمون اسی طرح لکھا ہے، ؟ کیا اِس مضمون سے کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے، یا حقیقی دجّال کی نفی سمجھے گا، جب اس کا یہ مدلول ہے تو مضمون غلط ہوا یا نہیں، جب غلط ہوا تو دیکھنے والے غلطی میں پڑیں گے یا نہیں، اب غور فرمایا جاوے کہ وہ اس حد تک ناقص ہوا یا نہیں، کہ سرے سے ناقابلِ اشاعت ہے:-

(۴) کیا اتنا لکھنا کافی ہوگا، یا مضمون مطبوعہ کے غلط ہونے کی بھی تصریح ضروری ہوگی، میرے نزدیک تو یہ بھی ضروری ہے ورنہ وہ غلط فہمی دُور نہ ہوگی۔

(۵) مجھ کو اب بھی گوارا نہیں کہ نیچ کی وقعت، قلوب میں کم ہو کہ اس کے نامہ نگار ایسے ہیں کہ بچاس صفحے کے جواب میں دو صفحے لکھے ہیں، اگر ضرورت ہی ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ مضمون النور بابت شعبان میں نکلے گا، اگر دل چاہے، اس کے حوالہ سے نقل فرما دیجیئے، تاکہ کاتب کو نیچ کا نامہ نگار نہ سمجھا جائے۔

(۶) اِس خط کا مضمون بھی مولانا کی خدمت میں پیش کرنا ضروری ہے۔

(۷) اختصار کے ساتھ ہو تو فوراً جواب آسکتا ہے کہ اس قسم کا مضمون ہے، آیا وہ صحیح ہے یا غلط، اِس سے بعض مضامین قابل اشاعت ثابت نہ ہوں گے، دوسرے نیچ میں سب مضامین تو قابلِ مشورہ نہیں ہوتے، پھر مشورہ تو مجمل نظر سے بھی ہو سکتا ہے، اِس میں دیر ہی کیا لگتی۔

(۸) مبارک ہو آپ کو بھی اور اُن مریضوں کو بھی، اللہ تعالیٰ شفا کی تکمیل فرما دیں، بے تکلف عرض ہے کہ اس قسم کا تذکرہ بہ طور دعویٰ برکت کے نہ فرمایا جائے، اتفاقیات کو تحقیقات میں داخل کرنا گراں معلوم ہوتا ہے۔

(۹) جہاں جہاں گمان ہو، دریافت کیا جائے، خواہ بیچ میں بھی چھاپ دیا جائے، جب پاس ہو جاوے، یا تو کتاب ہی کسی مسکین کو دیدی جاوے، یا اگر اپنی ضرورت کی ہو، خود رکھ کر قیمت مساکین کو دیدی جائے۔

(۱۰) وارث تو وہی ہو گا، اس کا حصہ مثل اس کے دوسرے اموال کے کسی امین شخص کے حوالہ کیا جائے کہ اس کی حفاظت کرے اور اس کی ضروریات میں استعمال کرے۔

(۱۱) کچھ مختصر مختصر عرض کر دیا ہے، میرے خیال میں اب کسی ثالث کے فیصلہ کی ضرورت ہے، میں احباب کو مکدّر کرنا نہیں چاہتا،

مکتوب کا یہ آخری فقرہ دوبارہ پڑھ لیجئے گا ——— یہ وہی مولانا ئے تھانوی ہیں، جو بدنام اپنی خشک مزاجی اور خشونت کے لئے تھے!

خط ہمیشہ بڑی چیزوں یا دینی، علمی مسئلوں ہی کے متعلق نہیں ہوتے تھے، بیچ کی چیزوں اور بڑی چھوٹی ہر قسم کی خانگی باتوں پر بھی ہوا کرتے تھے، اِدھر گھر میں کوئی علیل ہوا، اور درخواست دعا لئے ہوئے جوابی کارڈ مولانا کی خدمتِ اقدس میں پہنچا، بارہا کا تجربہ یہ کہ اِدھر خط گیا، اور اُدھر افاقہ بھی شروع ہو گیا ——— بات عجب سی ضرور نظر آتی ہے، لیکن اپنے تجربوں کو کوئی جھٹلائے کیسے، اور مجھ سے کہیں بڑھ کر میری بیوی اِس معاملہ میں خوش عقیدہ تھیں۔

اسی جنوری میں ایک بچی ذرا زیادہ بیمار ہوئی، خط حسب معمول گیا، جواب شفقت سے لبریز، حسب ذیل موصول ہوا:-

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

بچّی کی حالت دریافت کر کے قلب پر خاص اثر ہے، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ

صحت بخشے، گھر میں بھی بعد سلام فرما دیجئے کہ میں نے کئی بار دُعا کی، اور کرتا رہوں گا، اشرف علی“

اکثر عریضے ملے جُلے ہوتے تھے، ذاتی اور خانگی باتوں کے علاوہ، سب کے کام آنے والے سوالات بھی ان میں خوب لگے لپٹے رہتے تھے، چنانچہ اس کے معاً بعد کا عریضہ مورخہ ۲۰ رجنوری ۱۹۳۰ء اسی قسم کا ہے۔

”سیّدی و مطاعی السلام علیکم و رحمۃ اللہ

دُعا کے لئے اُدھر خدمت والا میں کارڈ روانہ کیا، اور اِدھر شافی برحق کے فضل و کرم سے افاقہ شروع ہو گیا، چنانچہ جس وقت کارڈ جناب تحریر فرما رہے ہوں گے، بحمد اللہ طبیعت بالکل صاف ہو گئی تھی[۱]۔

دو سوالات۔ ۱۔ ایک شخص نے کوئی بیس سال گذرے، اپنے والد مرحوم کی ایک رقم بغیر اُن کے علم و اطلاع کے اُڑائی تھی، اُن بیچارہ کو شبہہ دوسروں پر رہا کیا، اب یہ شخص نادم و منفعل، تلافی کس طرح کرے؟ توبہ و استغفار اور مرحوم کے حق میں دُعائے خیر و ایصال ثواب تو ظاہر ہی ہیں[۲]۔

۲۔ ایک شخص نے ایک نکاحی عورت سے بدکاری کی، شوہر اور وہ عورت دونوں وفات پا چکے ہیں، اب یہ شخص علاوہ توبہ و استغفار کے، کفارہ کس طرح کرے[۳]؟“

جواب کے لئے پڑھنے والے بیقرار ہوں گے ——— بلا انتظار ملاحظہ ہو!

(۱) مبارک، مجھ کو اس وقت تین خوشیاں ہیں، بچّی کی صحت کی، آپ کی طمانیت کی، گھر میں کی جمعیت کی، اور اخیر کی خوشی سب سے بڑھ کر ہے، کیونکہ وہ ضعیف القلب ہیں، پریشانی کی متحمّل نہ ہو سکتیں۔

(۲) یہ بہت ہی ضروری ہے، اور وہ روپیہ شرعاً مرحوم کے ورثہ کا حق ہو گیا، سب کو ہر ایک کا حصّہ کسی بہانے سے پہنچا دیا جائے، جو لینے والے کا بھی اس میں حصّہ ہے وہ حصّہ منہا ہو جائے گا۔

(۳) توبہ و استغفار کافی ہے“

اِن جوابات میں، جواب نمبر ۲ جیسا کہ ظاہر ہے، حکیم الامت ہی کا حصّہ تھا، اوّل تو استحقاق

ورنہ یہی کی جانب کسی کا ذہن کم منتقل ہوتا، اور پھر کسی بہانے سے" کی حکیمانہ قید کوئی دُوسرا کہاں سے سوچ سکتا تھا۔

ماہ مبارک رمضان اِس سال فروری میں پڑا؟ عریضہ جو لکھا، حسب معمول کشکول نما، اور اس میں ایک آدھ چیز اپنے متعلق ایسی تھی، جسے آج چھپاتے اور منظر عام پر لاتے طبیعت کچھ ہچکچا سی رہی ہے، باقی خود مولانا سے کیا پردہ تھا، کچا چٹھا تو اُن کے آگے پیش ہی کرتے رہنا تھا، اور اُن سے تعلق جو قائم کیا تھا، وہ اس کے سوا اور تھا کاہے کے لئے؟ ——— اور ہاں یہ تو یاد ہی ہوگا، کہ سچ میں مضامین تاویل احادیث دجّال سے متعلق، حال ہی میں مولانا سے بڑی مفصّل خط و کتابت ہو چکی ہے، اب اصل عریضہ (حسب معمول تلخیص کے ساتھ) ملاحظہ ہو:۔

"معلوم نہیں ماہ مبارک میں حضرت کا نظام اوقات کیا رہتا ہے[1]؟ خُدا کرے میرا یہ عریضہ اِن معمولات میں کسی طرح مخل نہ ہو[2]۔ مولانا (حسین احمد صاحب) دیوبند سے سلہٹ تشریف لے جاتے وقت اسی طرف سے گذرے، لکھنؤ سے دریا باد تک معیّت رہی، جناب کا ارشاد مضامین سچ کے سلسلہ میں پہلے ہی عریضہ میں لکھ چکا تھا، اب زبانی بھی عرض کر دیا[3]۔ النور میں اِس مضمون، متعلق مضامین تاویل احادیث دجّال کا منتظر ہوں، اِس میں چھپ لے تو سچ میں نقل کر دوں[4]۔

یہ عریضہ خاص اس ضرورت سے ہے کہ پُورے عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی ہمّت تو کبھی بھی نہیں ہوئی، البتہ بالکل آخر کے ۴۔۵ دن مسجد میں بیٹھ جانے کا معمول ہے، لیکن کیا عرض کروں، ہر دفعہ ختم اعتکاف پر بجائے مسرت و اطمینان کے، دل کی ملامت ہی ہاتھ رہتی ہے، اور اسباب ایک نہیں متعدد۔ اوّل تو ایک یہ کہ اپنے کو پاک وصاف اور ہر وقت باوضو رکھنے کے جو آداب مسجد ہیں وہ بن نہیں پڑتے، برابر اُن کے خلاف ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک آدھ بار سوتے میں ناپاک ہونے کی بھی نوبت آ گئی[5]، دُوسرے یہ کہ جسم مسجد میں ہوتا ہے، لیکن دل گھر میں، اور روزمرّہ کے معمولات میں اٹکا رہتا ہے[6]، تیسری اور سب سے بڑی بدبختی یہ کہ مزاج پر قابو اس حالت میں بھی نہیں رہتا، کھانا لانے، پانی لانے، روشنی لانے والے مُلازم سے کوئی غلطی ہو گئی، (اور ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہے)، تو بس

نہیں برس پڑتا ہوں، اور لحاظ اعتکاف کا تو کجا، معمولی آدابِ مسجد بھی ملحوظ نہیں رہتا[7]۔ پھر اپنی اس جھنجھلاہٹ پر عین اسی حالت میں اور زیادہ جھنجھلاہٹ ہوتی رہتی ہے[8]۔ ایک بار کم سن ملازم لڑکے پر تو ہاتھ تک چلا بیٹھا تھا[9]۔ انھیں سب چیزوں کو یاد کرکے سوچتا ہوں کہ اب اعتکاف موجبِ قرار ہوا یا اور زیادہ بُعد کا باعث بن گیا[10]، اور اب کی سال کے تذبذب و تردد کی حالت میں ارشاد و ہدایت والا کا منتظر و متدعی ہوں[11]۔

التنویر میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شوق کے ساتھ تربیت السالک کے صفحات پڑھتا ہوں، اپنے کام کی باتیں سب سے زیادہ اسی حصہ میں ملتی ہیں، کہیں میں عقیدۂ تناسخ کا قائل ہوتا تو کہہ ڈالتا کہ امام غزالی دنیا میں دوبارہ تشریف لے آئے ہیں[12]!

جواب باصواب حسب معمول آیا، اور مفصّل، مکمّل و مدلّل آیا، کیا حرج ہے اگر آپ کے مطالعہ میں فوراً کے بجائے کچھ ٹھہر کر آئے، انتظار کا مجاہدہ بھی، آخر مجاہدہ ہی کا اجر رکھتا ہے ——

کاغذ کی جس سلپ پر یہ مسودہ تحریر ہو رہا ہے، وہ یہیں ختم ہو رہا ہے، اور اسی پر اس قسط کو بھی ختم ہو جانے دیجئے!

(۲۳)

(۱) کچھ بھی نہیں، جو پہلے سے ہوتا ہے وہی رہتا ہے، ایک آدھ پارہ کی تلاوت اکثر بڑھ جاتی ہے، لیکن مجلسِ عام اور ڈاک کا انتظام بالکل بحال رہتا ہے۔

(۲) مخل کیوں ہوتا اور اجر کا مکثر ہو گیا۔

(۳) خدا کرے مولانا متوجہ ہو جائیں۔

(۴) کتابت ہو گئی ہے، طباعت کے لئے گیا ہے، یہ پرچہ شعبان کا ہے۔

(۵) اس میں معتکف کا کیا دخل، اس سے ذرّہ بھر اعتکاف کے کمال میں خلل نہیں آتا،

(۶) رہنے کا تو کچھ ڈر نہیں، البتّہ رکھنا نہ چاہیئے، وہ بھی جب کہ بلا ضرورت ہو، اور ضرورت ہے تو نظم اوقات رکھنے کا حکم ہے، یعنی انتظام حقوق واجبہ یا مستحبہ کے لئے حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم نے تو معراج میں کہ اعلیٰ مقام ہے قُرب کا، اپنا دل اُمّت میں رکھا تھا، اور اس کے مصالح کا اہتمام فرمایا تھا۔

(۷) اور اگر اسی حالت کے ذریعہ سے، مربّی حقیقی کو تربیت پسند ہو کہ ایسی لغزشیں ہوں جن سے اپنے اعتکاف پر نظر ہی نہ ہو بلکہ بجائے ناز کے، اُن پر استغفار و ندامت ہو تو پھر یہ بھی عین رحمت ہے۔

(۸) یہی تو چیز ہے جس سے انسان انسان ہے، یہی تجربے ہیں جن سے تکمیل میں مدد ملتی ہے، اگر اُن سے کام لیا جائے۔

(۹) اگر اس کے بعد دوسری طرح بھی ہاتھ چلا دیا جا دے کہ اس کو کچھ دے کر خوش کر دیا جائے تو اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ کی فضیلت ہاتھ آگئی، خلاصہ یہ کہ کوتاہی کا مضائقہ نہیں، البتہ اِس کا تدارک ضروری ہے۔

(۱۰) کوتاہی کے تدارک کے بعد، بُعد کا احتمال ہی نہیں، حاصل یہ کہ نَفْعَلُ وَنَسْتَغْفِرُ کو ترجیح ہے، نَفْعَلُ وَنَفْتَخِرُ پر بھی اور نَفْعَلُ وَنَسْتَبْشِرُ پر بھی۔

(۱۱) ضرور کیجئے، اور کوتاہیوں سے بچنے کا اہتمام بھی کیجئے، پھر بھی کچھ ہو جائے تدارک کیجئے، بہر کیفے تو گلیمے را مسوز

(۱۲) مگر الحمد للہ، اِس عقیدہ کے جب قائل نہیں تو اب تو اس کہنے کا وقوع نہ ہوگا، اِس لئے جواب کی بھی ضرورت نہ رہی۔

اب میں ان مضامین کے حدود کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ برکات طالبین کے ہیں، ماں دُودھ سے خالی ہوتی ہے، بچّہ کی برکت سے دُودھ اُتر آتا ہے، اور اگر وہ پلانا چھوڑ دے تو سُوکھ جاتا ہے، پس ماں کی چھاتی ایک سڑک ہے کہ عالم فیض سے دُودھ چل کر اس سڑک سے گذرتا ہوا بچّہ کے معدہ پر منتہی ہوتا ہے، اِسی طرح میں صرف ایک سڑک ہوں، ان علوم کے واہب حضرت حق، موہوب لہٗ طالبین ہیں، اُن کے طفیل میں مجھ سے بھی وہ علوم مس کرتے ہوئے

چلے جاتے ہیں، اور اگر اس سے زیادہ کوئی حقیقت ہے تو میرا کیا نقصان ہے مگر میری جہاں تک رسائی ہے، اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے۔"

یقین ہے کہ مکتوب بالا کے بعض بعض فقرے ناظرین نے مکرر ضرور پڑھے ہوں گے، اور بعض کو عجب نہیں کہ دو بار سے بھی زائد، اللہ نے کیا دل اور کیا دماغ اور پھر ساتھ ہی کیا قلم دیا تھا، پورے پورے علوم چھوٹے چھوٹے فقروں کے اندر سمائے ہوئے ہوتے تھے، اور تسکین قلب کا تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہ رہا ہے، بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجئے، اور جواب میں تسکین و تسلی ہی حاصل کیجئے، مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے!

—— اس کے بعد کا جو کارڈ ہے وہ اگرچہ محض دعائے صحت و خیریت کا ہے، ایک سرسری نظر اُس پر بھی کرتے چلئے، حضرت کی شفقتِ بیکران کا تو اس سے کچھ اندازہ ہو ہی جائے گا، ڈاکخانہ کی مہر اس پر ۲۰ مارچ کی ہے:-

"مشفقی مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ، السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

گھر میں کی علالت سے قلق ہوا، دل سے دعائے صحت کرتا ہوں، اگر بعد صحت بھی مطلع فرمائیں تو رفع تشویش ہو، باقی خیریت ہے، والسلام، دعاگو و دعاجو اشرف علی"

حضرت کی حیثیت ہم لوگوں کے لئے محض ایک بزرگ کی نہ تھی، بزرگ خاندان کی سی ہو گئی تھی، اور معاملہ یہیں تک رہتا جب بھی مضائقہ نہ تھا، میں نے تو اپنی ڈھٹائی سے اس قسم کے کام حضرت سے لینے شروع کر دیئے تھے کہ جیسے وہ میرے ایجنٹ یا مختار ہیں، مکان ٹھہرا دیجئے، اس کے سامان کا بندوبست کر دیجئے، وغیرہا —— اور حضرت نے کمال حلم یا غایتِ شفقت سے، اپنے کو بنا بھی کچھ ایسا ہی لیا تھا —— آگے بڑھتے جائیے، اور ان لطائف کو سمجھتے جائیے۔

اپریل میں خیال آیا کہ حاضری کو کئی مہینے گزر گئے، اب پھر بیوی بچوں کو ساتھ لے ذرا طویل قیام کے ارادہ سے چلنا چاہیئے، مکان تھانہ بھون میں پرانے بنے ہوئے، اور مکینوں سے خالی، اچھے خاصے موجود تھے، اور برائے نام کرایہ پر مل جاتے تھے، نظریں اب کی ایک

خاص مکان تھا، پُختہ اور نیا، خوشنما اور صاف سُتھرا، آرام دہ اور بشری ضروریات کی ساری رعایتوں سے لیس، ایک تہ خانہ بھی موجود، اور کمروں کے اندر پانی نکلنے کی نالی سے متصل سلیقہ مندی سے ایک کشتی بنی ہوئی، یہ مادّی اور طبعی ترغیبات خود ہی کیا کم تھیں کہ یہ معلوم ہوا کہ مکان خود حضرت کا تعمیر کرایا ہوا، اور حضرت کا ذاتی مسکن ابھی چند روز قبل تک تھا۔ تفسیر بیان القرآن وغیرہ کی تصنیف اسی مکان میں ہوئی تھی[1]، مادّی و طبعی کشش پر عقلی و رُوحانی اشتیاق کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اب اس مکان میں حضرت کے ایک شاگرد و خلیفہ جلیل احمد خاں صاحب شیروانی علی گڈھی مقیم تھے، جو اس وقت سفر حج پر گئے ہوئے تھے، اور مکان سردست خالی تھا ــــــ سفر تھانہ بھون کے ساتھ ساتھ طبیعت میں تقاضہ اُسی مکان میں قیام کا بھی پیدا ہوا، اور نتیجہ ۲۷ راپریل کے عریضہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اب کی خط کے ساتھ ساتھ جواب خط بھی دیکھتے چلیئے۔ "م" سے مراد یہ خاکسار اور "ا" سے حضرت مولانا ہیں:۔

"م۔ بحمداللہ بخیریت ہوں۔

ا۔ الحمدللہ۔

م۔ اور مزاج والا کا عافیت خواہ۔

ا۔ بحمداللہ تعالیٰ مَیں بھی خیریت سے ہوں۔

م۔ انشاءاللہ یہاں سے ۱۱ ذی الحجہ کو روانہ ہوکر، سہارنپور ایک روز ٹھیرتا ہوا، ۱۳۔۱۴ ذی الحجہ تک حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

ا۔ خدا تعالیٰ خیریت سے ملادیں۔

م۔ مکان وُہ جو جناب والا کا ہے، وہی بہت پسند آیا تھا، امید ہے کہ اب کی بھی عنایت ہوگا،

ا۔ حاضر ہے، انشاءاللہ تعالیٰ عنقریب صفائی کرادی جائے گی۔

م۔ اگر اتّفاق سے میرے زمانۂ قیام ہی میں جلیل احمد صاحب واپس آگئے، تو اطلاع پاتے ہی

---

[1] مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ یہ اطلاع صحیح نہ تھی۔

خالی کردوں گا۔

ا۔ اگر وُہ آئے، اُن سے کہدیا جائے گا، پھر جو باہمی مشورہ قرار پائے۔

م۔ یہ بھی گذارش ہے کہ اُس مکان کے لئے کوئی رقم کرایہ کی تجویز کردی جائے، جو مدرسہ یا اور کسی مد میں دیدی جائے۔

ا۔ ہرچند کہ مکان وقف ہے مگر میں اس کا متولی ہوں اور اُس میں شرط ہے کہ واقف اپنی حیات تک اُس سے منتفع ہوسکتا ہے، اور دوسروں کو بلاعوض انتفاع کی اجازت دے سکتا ہے، اس لئے کرایہ کی ضرورت نہیں۔

م۔ اِس مکان کے اندر سامان بھی ضرورت اور بڑے سلیقہ کا دکھائی دیا، تخت، پلنگ وغیرہ یہ سب تو جلیل احمد صاحب کا ہوگا۔

ا۔ کچھ اُن کا ہے اور کچھ میرا، اور اُن کی طرف سے بھی استعمال کی اجازت ہے۔

م۔ اِس لئے ظاہر ہے کہ وہ تو ملنے سے رہا، باقی اگر اُسی قسم کا سامان کرایہ پر مل سکے تو بڑی سہولت ہو جائے۔

ا۔ اگر موجودہ سامان کے ہوتے ہوئے بھی ضرورت ہوئی انتظام ہو جائے گا"

سفر میں ابھی چند روز کی دیر تھی، حضرت کی تصانیف، ملفوظات، مواعظ کے مطالعہ کا برابر تیزی، سرگرمی و مستعدی سے جاری تھا، خوب خوب نکتے ملتے تھے، بڑی بڑی بصیرتیں حاصل ہوتی تھیں، برسوں کے جمے ہوئے عقائد و خیالات پر بار بار نظر ثانی کرنی پڑتی تھی، بعض بعض مسائل پر طبیعت پھڑک اُٹھتی تھی، زبان سے بے اختیار دادو دعا دونوں نکلتیں، دل کبھی کبھی انھیں غزالی وقت ٹھہراتا، اور کبھی چپکے چپکے اللہ سے اُن کی عمر اور صحت میں برکت طلب کرنے لگتا۔ غرض شہرت و عظمت کی ہر منزل گویا دِل میں گھر کئے ہوئے تھی، اِس پر بھی طبیعت کی کجی کہئے یا فہم کی کمی، یا شاعر کی زبان میں،

ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

سیاسیات تو پھر خیر دُور کی چیز تھی، فقہیات تک میں انقیادِ کامل اور سَو فیصدی انقیاد کا درجہ کسی طرح حاصل نہ ہوا۔ سیاسیات میں تو یہ "غیر مقلدی" خوب نمایاں تھی فقہیات میں بھی کچھ ایسی شاذ نہ تھی ——— ۴ رمئی کو حساب لگایا کہ ابھی حاضری کے تو کئی دن باقی ہیں، اور اتنا وقت ہے کہ خط کا جواب بہ آسانی آسکتا ہے، تو بقیہ اشتبہات ابھی کیوں نہ لکھ بھیجئے، اور دو ہفتہ تک کے لئے، دل پر بار ہی کیوں لئے رکھیئے، یہ سوچ ذیل کا عریضہ ڈاک میں ڈال دیا۔

"والا نامہ نے ممتاز فرمایا، مکان کے ساتھ ہی، سامان مکان کے استعمال کی بھی جو اجازت مرحمت ہوئی، یہ میری توقع سے بھی زائد ہے، شکریہ کس زبان سے ادا کیا جائے[1]، البتہ استعمال کی حالت میں سامان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ضرور ہے[2]۔

آجکل ملفوظات "حسن العزیز" زیر مطالعہ ہے، ایک جگہ پر ارشاد درج ہے کہ "اگر کسی کی یہ رائے ہو کہ گاؤکشی چھوڑ دیں تو چونکہ مبنی اس رائے کی ملت کفریہ کی رعایت ہے، یہ اس سے بھی اشد ہوگا" (جلد ۲ ص ۲۳۶ و ص ۲۳۷) تو اس کے متعلق عرض ہے کہ مبنی ہونے ہی میں کلام ہے یعنی ملّت کفریہ کی رعایت، میرے علم و یقین میں تو ترک ذبح گاؤ کا مشورہ دیتے وقت پیش نظر صرف مصلحت اُمّت تھی، یعنی ایک فعل مباح کے ترک کر دینے سے متعدد مہمات امور میں کامیابی کی توقع، اور شریعت کے اہم ترین احکام کا تحفظ، تو اس صورت میں اُن کی یہ رائے ملّت کفریہ کی رعایت پر مبنی کیسے کہی جائے گی؟[3]

اسی طرح ایک جگہ (جلد ۲ ص ۲۳۹) پر یہ عبارت نظر آئی کہ ایک شخص تھے اصحاب فقہ سے، انھوں نے اپنا پیام اصحاب حدیث میں کسی کے یہاں دیا، انھوں نے قید لگائی کہ تم کو رفع یدین وغیرہ کرنا ہوگا، انھوں نے منظور کر لیا، ایک بزرگ نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس کا ایمان نہ سلب ہو جائے، محض مُردار دُنیا کے لئے ایسی چیز کو بلا تحقیق ترک کر دیا جس کو دین سمجھتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ رفع یدین اُس شخص کے نزدیک معصیت تو نہ تھا، بس غیر افضل تھا، تو اگر

ایک مقصد مباح کے لئے اُس نے ایک سُنّت کے بجائے دوسری سُنّت پر عمل شروع کر دیا تو آخر یہ سلبِ ایمان کے اندیشہ کی کون سی بات ہو گئی؟[4]

ملفوظات کے صدہا صفحات میں صدہا جواہر پارے مجھے ملے، ایسی ایسی نادر و بیش بہا تعلیمات ملیں جو اور کہیں نہیں مل تھیں[5]، لیکن فقہی مسائل میں کہیں کہیں شبہات پیدا ہوئے، جن کا نمونہ اوپر کے دو سوالوں میں گذرا۔"[6]

(۲۴)

خط ختم ہو گیا، سوال دونوں اپنی اپنی جگہ پر اہم تھے، پہلا سوال تو اُس وقت کی مُلکی فضا کے لحاظ سے —— اور "اس وقت" کی قید کیوں، آج کی اور ہمیشہ کی مُلکی فضا کے اعتبار سے بھی —— اور دوسرا فقہی سوال بھی اہم، ایک تو اصولی اعتبار سے، اور پھر ذاتی اعتبار سے بھی، اس لئے کہ ان دنوں اپنا مشغلہ کچھ فقہ ہی کی کتابوں کی اُلٹ پلٹ کرتے رہنے کا ہو گیا تھا، جا ہے جتنا اور جیسا، جو کچھ بھی سمجھ میں آئے، کبھی ہدایہ، اور کبھی فتح القدیر، کبھی درمختار اور کبھی اُس کی فاضلانہ و محققانہ شرح ردّ المحتار، اور کبھی بدائع الصنائع اور کبھی السیر الکبیر، کبھی ان کے اصل متن اور کبھی ان کے اُردو ترجمے[1]، عربی شرحیں، اور یہ فیض بھی تمام تر اسی بارگاہ کا تھا، ورنہ فقہ اور فقہاء دونوں کے خلاف تو تعصب کا زنگ برسوں سے جما ہوا تھا، اور ہر فقیہ اپنے خیال میں نرا کٹھ ملا تھا، یہ علم مولانا ہی کی مجلس میں بیٹھ بیٹھ کر، اور اُن کی زبان سے مختلف فقہی مسائل کی توضیح و تشریح بار بار سُن کر، حاصل ہوا تھا کہ فقہاء کی جماعت حمقاء کی نہیں، درحقیقت حکماء کی جماعت ہوئی ہے، اور فقہ اٹکل پچّو باتوں کا نام نہیں، قرآن و سُنّت ہی کی حکیمانہ تشریح و استنباط کا نام ہے —— مجلس اشرفی کے بیشمار فیضوں میں سے ایک فیض یہ تھا کہ مشائخ صوفیہ کے ساتھ محبت اور علماء و فقہاء کے متعلق عظمت اہل مجلس کے دلوں میں پیدا ہی ہو جاتی تھی۔

بہرحال دونوں سوالوں کا جواب آیا، اور اب کی والا نامہ کیا آیا، ایک مُستقل ہدایت نامہ

---

[1] یعنی ان میں سے جن کے ترجمے اُردو میں ہو چکے ہیں۔

اور دستور العمل بن کر آیا، ــــــ انتظار کہاں تک کیجئے گا، اب معاً پڑھنا شروع کر دیجئے:۔

(۱) یہ آپ کی محبت ہے، ورنہ یہ تو منجملہ حقوق ہے،

(۲) چونکہ مالک موجود نہیں جن سے اس کا فیصلہ کرا سکیں، لہٰذا میں اس سے زیادہ اور عرض نہیں کر سکتا کہ جس استعمال میں اس کا اندیشہ ہو احتیاط فرمائی جائے۔

(۳) یہ اپنا اپنا تجربہ ہے، آپ کی نظر میں اور اشخاص کے خیالات ہیں، میری نظر میں اور اشخاص کے خیالات، اس لئے اس کا فیصلہ مشکل ہے، دونوں سوالوں کے متعلق یہی معروض ہے، اس لئے میں نے مدت ہوئی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جن احباب سے محض دوستی ہے اُن سے عقائد و احکام میں گفتگو نہ کروں گا، یا تو خیریت کی اطلاع و استطلاع کا تعلق رکھوں گا یا دُعا کا یا معالجہ نفسیات کی تحقیق کا، اور ایسے احباب کی فہرست میں جناب کا اور مولانا عبدالباری صاحب (ندوی) اور جناب سید سلیمان صاحب (ندوی) کا نام ذہن میں تجویز کیا ہے، ان دونوں صاحبوں کو بھی اس کی اطلاع دے چکا ہوں، ایسی تحقیقات کے لئے مولانا حسین احمد صاحب و مولانا انور شاہ صاحب کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اسی میں مصلحت ہے۔

جواب سوال اوّل۔ میرے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کے اس مشورہ کی بناء ہنود کے جذبات ہیں اور اُن جذبات کی بناء ان کی ملّتِ کفریہ، اور بناء کی بناء، بناء ہوتی ہے، پس اس مشورہ کی بناء ملّتِ کفریہ ہونا ثابت ہو گیا، باقی جو مصلحت سوال میں مذکور ہے، اگر وہ بھی بناء ہو تو غایت ما فی الباب، دو بنائیں ہوئیں، ایک محمود ایک مذموم اور محمود و مذموم کا مجموعہ مذموم ہوتا ہے، اور بناء محمود بھی اس وقت ہے جب یہ بناء واقعی ہو، ہنوز اسی میں کلام ہے۔

گائے کشی جاری رکھنے میں مہمات دینیہ محفوظ نہ رہیں گے، یہ محض خیالی بنا ہے، لیکن اگر اس کو قطعی بھی مان لیا جائے تو اس کا جواب اُوپر گذر چکا ہے، یہ تو تحقیقی جواب ہے۔ اور الزامی جواب یہ ہے کہ بہت سے امور دینیہ اذان سے بھی زیادہ اہم ہیں، اگر ترک اذان سے ان امور کا تحفظ ہوتا ہو تو کیا اذان بھی ترک کر دی جائے گی، اور اگر شعائر و غیر شعائر ہونے کا فرق بتلایا جائے تو جو شخص

ذبح بقر کو بھی شعائر میں سے کہتا ہو، گو بعارض ہی، جیسے مجدد صاحب ہندوستان میں اِس کو شعائر میں سے بتلاتے ہیں، اور ہنود کا اِس کو اِسلام کی علامت سمجھنا اس کی عقلی کافی دلیل ہے، اِس پر یہ فرق حُجت نہ ہوگا، رہا سوال تحفظ کا، اگر تحفظ بھی نہ رہا، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں، کیونکہ ہمارے اجتہاد کو اِس میں دخل نہیں، اور اگر بلا اکراہ ترک کر دیا تو اِس حُکم شرعی کے عدم تحفظ میں ہمارے اجتہاد کو دخل ہُوا، اِس لئے ہم اس کے ذمہ دار ٹھہرے، فافہم۔

(۴) جواب سوال ثانی، یہ قصہ ردّالمحتار شرح درمختار باب التعزیر قبیل باب السرقہ میں مذکور ہے، اور یہ بزرگ ابوبکر جوزجانی ہیں، جن کے قول کو خلاف تحقیق کہنے میں مبادرت نہیں ہو سکتی، اور وہ تحقیق انما الاعمال بالنیات سے ظاہر ہے، کیونکہ بناء اِس ترک سُنّت کی دُوسری سُنّت کا من حیث السنّت اختیار کرنا نہ تھا، بلکہ محض جیفۂ دُنیا کا دین پر ترجیح دینا تھا، جس کی حقیقت استخفاف دین اور استعظام دنیا ہے، اور اس کا وہی اثر ظاہر ہے جو ان بزرگ نے فرمایا ورنہ سوال کے سب مقدمات نماز بقصد ریاء میں بدرجۂ اولیٰ جاری ہیں، کیا ریاء بھی مباح ہو جائے گی۔

(۵) آپ کی قدردانی اور حُسن ظن ہے، ورنہ بزرگوں کے کلام میں جو کچھ ذخیرہ ہے اس کے سامنے یہ محض خذف پارہ سے زائد حیثیت نہیں رکھتے۔

(۶) اِس کے متعلق اوپر عرض کیا ہے، اور سادگی اور خلوص سے عرض کیا ہے، یہ مباحث بہت گُنجائش رکھتے ہیں، ان میں کلام کہیں ختم نہیں ہوتا، دوستوں میں ایسا کلام جو کبھی ختم نہ ہو کشاکش کی صُورت پیدا کرتا ہے، اِس لئے ایسے بزرگ سے تحقیق مناسب ہے، جس سے زیادہ کلام نہ کیا جا سکے، ان کا پتہ اُوپر عرض کیا ہے۔"

سفر تھانہ بھون میں اب بھی دو چار دن کی گنجائش باقی تھی، اور ۳۰ء میں "غلام" ہندوستان کی ڈاک کا نظام، بعد ۴۷ء و ۴۸ء کے "آزاد" ہندوستان کی سی ڈاک کا نہ تھا، دریاآباد کے خط کا جواب، تھانہ بھون سے چوتھے دن تو یقینی، اور اکثر تیسرے ہی دن آجاتا تھا، جواب اِس

سرفراز نامہ کا بھی معاً لکھ دیا ــــــ کسی بزرگ کو بزرگ و معظّم ماننے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اُس کی ساری ہی باتیں دِل میں اُتر جائیں، اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہو جائے، کم از کم اپنا عقیدہ تو یہی ہے۔ اور اطاعت مُطلق و غیر مشروط صرف رسُول معصُوم ہی کا حق خصوصی معلوم ہوتا ہے۔ اور عقیدہ و خیال کو بھی چھوڑیئے، طبعی طور پر بھی اپنے کو انقیاد و اطاعت کی یہ دولت کبھی ملی ہی نہیں، کہ اُدھر سے جو کچھ اور جس مسئلہ میں بھی ارشاد ہو، وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بہرحال اُسے بے چُون و چرا مان ہی لیا جائے۔ وقت کے بیسیوں مسئلے، اور پھر اُن کے جُزئیات تو سیکڑوں ایسے تھے، جن میں اِس نادان کو اُس دانائے عصر کے ساتھ موافقت نہ ہوئی، اور عقیدت و عظمت میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا ــــــ حضرت کی خدمت میں گستاخ اور ڈھیٹ اتنا تھا کہ جواب اُلٹا سیدھا جو کچھ بھی سمجھ میں آتا، بے تکلّف عرض کر گذرتا، چنانچہ اب کی بھی یہ لکھ ڈالا:۔

"گرامی نامہ نے دونوں سوالوں کے جواب سے مشرّف کیا، پہلے سوال (متعلق ترک ذبیحۂ گاؤ) سے متعلق تو خاصی بڑی حد تک شرح صدر ہو گیا، اور دوسرے سوال (متعلق انتقال از خیفت بعمل بالحدیث) کے جواب سے بھی کسی درجہ میں تسکین ضرور حاصل ہوئی[1]، اِس کا علم شاید جناب کو بھی نہ ہو کہ میں ہر تحریر گرامی کا کتنا مُشتاق بلکہ حریص رہتا ہوں[2]، اور جن مسائل میں پوری طرح شرح صدر نہیں ہو پاتا، اُن میں بھی ارشادات گرامی سے نفع بیّن تو بہرحال حاصل ہوتا ہے[3]، کم از کم کسی نئی حکمت، نئی بصیرت، نئی دلیل کا انکشاف تو ہر بار ہوتا ہی رہتا ہے، چنانچہ اب کی بھی خود اُسی جواب سے کہ آئندہ فلاں فلاں قسم کے سوالات کا جواب نہ ملے گا، خُدا گواہ ہے کہ قلب نے ایک کیف دلطف ہی محسُوس کیا[4]"

اور پھر یہ حال تو فقہ و سیاسیات کے اختلافی مسائل کے باب میں ہے، باقی جہاں تک سلوک و اصلاح نفس کے مسائل کا تعلق ہے، اِس میں تو عارف رومیؒ میرے ہی دِل کی ترجمانی صدیوں پیشتر کر گئے ہیں ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　　مُشکل از تو حل شود بے قیل و قال

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں اتنی برکت تو ضرور عطا فرمائے کہ جب تک ہم طالبین، مسترشدین کا جی چاہے ہمارے درمیان ارشاد و افادہ کے لئے سلامت باکرامت رہنے دے[۵]"

جواب حسب توقع بلا توقف آیا، اور آپ کے سامنے بھی بلا توقف پیش ہے :-

(۱) یہ اختلاف ذوق کا ہے، مجھ کو ذوقاً اپنے دوسرے جواب میں زیادہ سکون ہے بہ نسبت پہلے جواب کے،

(۲) مجھ کو علم ہے، اور اس علم سے آپ کا ممنون بھی ہوں، مگر ساتھ ہی اس کا بھی علم ہے کہ میری تحریرات اس قدر کے قابل نہیں، اور اس علم سے گونہ خجل ہی ہوں کہ باوجود میری تحریر کے غیر قابل ہونے کے اہل علم اس کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں۔

(۳) اس کا منشا محض حسن ظن ہے، نہ کہ میرا محقق ہونا۔

(۴) آپ کے اس لطف سے مجھ کو لطف ہوا، اور اس لطف میں یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس لطف کو باقی رکھے، اور اس بقا کی شرائط میں سے عدم سوال بھی ہے، اس میں علاوہ لطف کے تعب کی بھی کمی ہے متکلم کو بھی، مخاطب کو بھی۔

اب بے تکلفی کے سبب اپنی اس تجویز کا راز بتلاتا ہوں، وہ یہ کہ ہر فن میں اس شخص سے پوچھنا چاہیئے، جس میں اس شخص کے ماہر ہونے پر اعتماد ہو، سکون میں اس کو بڑا دخل ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو فقہیات میں ماہر نہیں سمجھا جاتا۔

(۵) یہ حد تو مخدوش ہے، شاید جلد ہی رائے بدل جاوے، مناسب یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے علم میں خیر ہو"

تحقیق مسائل وغیرہ کے پہلوؤں کو چھوڑ دیئے، مولانا کی لطیف و متین ظرافت کا بھی پورا نمونہ اس مکتوب کے اندر موجود ہے، اور ہلکی شوخ طبعی و ظرافت، نہ علم و فضل کے کمالات کے منافی ہے نہ درویشی و روحانیت کی کرامات کے ـــــــ خط و کتابت کی سیراب کافی سے زائد ہو چکی، یہ اور بات ہے کہ طبیعت اس سیر سے بھی سیر نہ ہوئی ہو، اب ایک جھلک پھر حاضری نہ بھون کی دیکھئے۔

مئی کے تیسرے ہفتہ کی کوئی گرما گرم رات تھی، غالباً ۱۸، ۱۹ کی درمیانی شب، کہ یہ فقیر ایک بار پھر حاضر ہوگیا، لمبا قیام مہینہ سوا مہینہ کے لئے جب ہوتا تو عموماً زنانہ بھی ہمراہ ہوتا، کبھی اول ہی سے اور کبھی چند روز بعد سہارنپور سے بُلا لیا جاتا۔ ایک مُستقل مکان اپنے لئے برائے نام کرایہ پر لے لیا جاتا، اور کھانے پینے کے سارے انتظامات اپنے ہی ہوتے، ایک آدھ مُلازم ضرور ہمراہ ہوتے لیکن پردیس میں یہ آبادکاری کوئی آسان چیز نہ تھی، پھر تھانہ بھون میں، جو کوئی شہر نہیں، محض ایک معمولی قصبہ تھا، اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے لئے، جو عادی تمامتر تن آسانیوں کا تھا، حضرت ہی کی شفقتیں ہر ممکن سہولت بہم پہنچا دیتیں، اور جس حد تک بن پڑتا سفر کو حضر اور پردیس کو دیس بنا دیتیں ——— مُسافر نوازی کے پُورے لوازم، مہمان کے مذاق طبیعت اور حیثیت عُرفی کی رعایت کے ساتھ انجام دیتے رہنا، اگر کسی صاحب کے خیال میں درویشی و مرتبۂ مشیخیت کے منافی ہے تو وُہ صاحب خوب سُن لیں کہ مولانا اُن کے معیار کے مطابق ہرگز نہ درویش تھے، نہ شیخ! ——— بزرگی کی حکایت کسی بزُرگ سے پوچھئے، اور ولایت کی تحقیق کسی ولی اللہ ہی سے کیجئے، یہ عامی تو اپنے تجربہ اور مسلسل تجربہ سے بس اتنا جانتا ہے کہ اشرف علی تھانوی نامے ایک انسان، بہترین دوست، بہترین میزبان، بہترین مخدوم، بہترین عزیز، بہترین ہمسایہ، غرض انسانی کمالات و اوصاف کے لحاظ سے ایک بہترین انسان ہوئے ہیں۔"

آمد سے قبل مکان و قیام سے متعلق اب کی جو خط و کتابت رہی تھی وہ ابھی چند ہی صفحے اُوپر نقل ہو چکی ہے، اور اس لئے یقین ہے کہ ذہن میں تازہ ہو گی، قیام اب کی اسی مکان میں ہوا، رقبہ کم، اور مکانیت بظاہر مُختصر، لیکن اچھے اچھے وسیع مکانوں سے زیادہ آرام دہ، اور قابل پسند بالاخانہ سے لے کر تہ خانہ تک، کمرہ سے لے کر صحن تک، دالان سے لے کر باورچی خانہ تک، ہر شے ضرورت کی، آرام کی، اپنی اپنی جگہ پر سلیقہ سے موجود۔ تکلّفات نہیں، نہ سہی، آسائش تو بہر حال، ہر آسائش پر اور راحت تو بہر صورت ہر نمائش پر مقدم ہے ——— کیسا انجینیر تھا یہ جس نے حقائق کو رسوم پر

ضروریات کو نمایش پر غالب رکھا! ـــــ قدرت کو جس سے دلوں کی تعمیر اور اخلاق و روحانیت کے استحکام کا کام لینا تھا، وہ اینٹ اور چونے کے کام میں کبھی اُستا د نکلا! "تعمیری پروگرام" کا لفظ گاندھی جی کی تحریکات کے سلسلہ میں بار ہا سُنا تھا، مولانا کی ذات، معلوم ہوا کہ اس کی بہترین جامع، لفظ کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی میں تھی!

آج اس گذرے ہوئے زمانہ کو کوئی ۱۰ سال ہو چکے، لکھتے وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی کل کی بات ہے، ماضی کی تو تلخیوں اور حسرتوں میں بھی فاطر کائنات نے ایک لذت رکھ دی ہے، چہ جائیکہ خوشگواریوں اور گذری ہوئی مسرتوں، لذتوں اور راحتوں کی یاد میں! کاش دُنیا میں اور کوئی ایجاد چاہے نہ ہوئی ہوتی، صرف یہ خوشگوار اور لذیذ ماضی کو پکڑ رکھنے اور جکڑ دینے کی کوئی تدبیر ایجاد ہو گئی ہوتی!

رات آدھی گذر چکی تھی، جب گاڑی تھانہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پر رُکی، سلیقہ شعار ملازم کو ایک ٹرین پہلے سے بھیج رکھا تھا، دہلی سے آئی ہوئی ڈاک، اسٹیٹسمین، اور، اور کئی پرچوں کو منتظر پایا، گھر پہنچتے ہی موم بتی کی روشنی میں جلدی جلدی، اُسے پڑھنا شروع کیا، ـــــ تھانہ بھون کا زائر بہرحال سچ کا ایڈیٹر بھی تو تھا! اخبارات پر فوراً گر پڑنے کی لت، جو وقت ناوقت کسی حال میں پیچھا نہیں چھوڑتی، اُسے کہاں رکھ آتا! مئی کی رات کی بساط ہی کیا، وہ بھی جب آدھی سے زائد جاگتے ہی گذر چکی، خیال یہی تھا کہ صبح آنکھ دیر میں کھُلے گی، لیکن شیخ خانقاہ کا فیض و تصرف یا دل کا دھڑکا، بہرحال آنکھ اپنے وقت پر بغیر کسی تکان کے محسوس کئے کھُل گئی، ـــــ اور آہ حضرت کی مسجد کے موذن کی اذان فجر! اکثر یہ حلاوت اور دلآویزی اور تاثیر کسی اذان میں ملے گی، بے نمازوں کے کان میں یہ آواز پڑ جائے، تو عجب نہیں کہ نمازی بن جائیں، ظہر، عشاء وغیرہ کے اوقات میں تو حضرت کے ہاں اذان ذرا ٹھہر کر ہوتی تھی، لیکن فجر میں اوّل ہی وقت ہوتی تھی کہ لوگوں کو وضو، غسل اور، اور ضرورتوں کے پورا کرنے کا وقت باطمینان مل جائے، موذن حافظ اعجاز اس وقت انشاء اللہ زندہ وسلامت ہوں گے[1] اللہ اُن کی عمر میں برکت دے، عجب نہیں جو نسبت بلالی رکھتے ہوں!

---

[1] طبع ثانی سے قبل مرحوم ہو چکے ہیں۔

معمول یہ تھا کہ طالبین و سالکین کا تانتا ہر زمانہ میں بندھا رہتا تھا، یہ لوگ آتے اور اپنے کھانے پینے کا انتظام خود کر کے خانقاہ میں ٹھہر جاتے، ان میں اچھے اچھے ذاکر و شاغل ہوتے، اور ان میں سے بعض بعض تو اپنے زہد و ریاضت کی بنا پر خود قابل زیارت ہوتے، لیکن یہ لوگ ملنے ملانے کے ڈھب کے زیادہ نہ ہوتے، دن تو دن، رات کے بھی اگلے اور پچھلے حصوں میں اپنے کام میں لگے رہتے، اور کام سے مراد محض نوافل و اوراد ہی نہیں، ہاتھ پیر سے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی ان حضرات کو تامل نہ ہوتا، سادگی، اخلاص، بے طمعی، بے نفسی کے بیسیوں سبق ان لوگوں کی زندگیوں کو دیکھ دیکھ کر سیکھے جا سکتے تھے ——— ان کے علاوہ ایک تعداد حضرت کے مخصوص خلفاء کی بھی تھی، یہ عموماً اہل علم و اہل وجاہت ہوتے، کوئی نہ کوئی ان میں سے بھی تھانہ بھون حاضر ہی ہوتا رہتا، خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (انسپکٹر آف اسکولس) مولانا محمد طیب صاحب ناظم دیوبند، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، طبیب حاذق مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری میرٹھی، اس وقت یہی نام خیال میں آ رہے ہیں، اس قسم کے حضرات سے بھی تھانہ بھون کے طویل قیام کے دوران میں ضرور ملاقات ہو جاتی ——— ایک تیسرا طبقہ مولانا کے ذاتی مہمانوں کا ہوا کرتا، اور ان میں سے اکثر علم و دین کے مشاہیر ہی ہوتے، آج شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی دہلی سے آمد ہے، کل مدرسہ مظاہر علوم کے مفتی عبد اللطیف صاحب اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سہارنپور سے آ رہے ہیں، اور پرسوں رائے پور کے مشہور بزرگ شیخ عبد القادر صاحب جنہیں پہنچانے کو مولانا خود اسٹیشن تک گئے، اور ان کے پیچھے ان کا ذکر خیر بار بار کرتے رہے ——— اس قسم کے نفع طویل قیام تھانہ بھون میں ضمناً لیکن عموماً ہی ہاتھ آ جایا کرتے تھے۔

یہ منظر تو روزمرہ کے تھے، ایک روز بعد ظہر والی مجلس میں گیا، اور ذرا دیر کر کے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تعلیم یافتہ مہذب صاحب مولانا کے قریب ہی داہنی طرف امتیازی جگہ پر بیٹھے ہوئے، اور مولانا ان سے بہ لطف و انبساط گفتگو میں مشغول ہیں، معلوم ہوا یہ صاحب میرٹھ کالج میں (غالباً تاریخ کے) پروفیسر ہیں، وہ صوفیۂ ہند کے حالات و تعلیمات دریافت کر رہے تھے، اور مولانا

ایک ایک سوال کا جواب بشاشتِ قلب سے دیتے رہتے تھے۔ مولانا کا تشدّد یا ظاہری تشدّد جو کچھ کبھی تھا، وُہ اصلاح کی غرض سے اور اُن ہی لوگوں کے لئے تھا، جو خود طالبِ اصلاح ہو کر آتے تھے، یہ نہ تھا کہ کوئی شخص محض مُلاقات یا کسی مخصوص علمی تحقیق کے لئے آئے، اور اُس پر بے تحاشا دار و گیر زجر و ملامت ہونے لگے ــــــ مہینہ ڈیڑھ مہینے کے مسلسل قیام میں مولانا کے معمولات کو بہ غور دیکھنے اور مزاج کے پہچاننے کا موقع خوب قریب سے ملا، اور مدّت قیام جتنی بڑھتی جاتی، عقیدت و عظمت چاہے نہ بڑھتی، لیکن محبّت و جاذبیت میں بہرحال ترقّی ہوتی رہتی۔

سنہ ۱۹۳۰ء کی دوسری سہ ماہی، ہندوستان کے طُول و عرض میں، ایک خاص ہیجان کی گھڑی تھی، گاندھی جی نے برطانیہ کے خلاف، مُسلمانوں کو ساتھ لئے بغیر، قانون شکنی شروع کر دی تھی، اور اب کی اس کے لئے انتخاب نمک سازی کا کیا تھا، اِس نمک سازی پر مُسلمانوں کے بعض مہربانوں کی نکتہ چینی مستزاد! سنہ ۱۹۱۹ء تا سنہ ۱۹۲۲ء کی تحریک خلافت و ترک موالات ہندو مُسلم اتّحاد کا ایک یادگار مظہر تھا، مُسلمان اگر "مہاتما گاندھی کی جے" میں شریک تھے، تو ہندوؤں کے گلے بھی گلی گلی "اللہ اکبر" کے نعرے لگا رہے تھے، اور گاندھی جی، علی برادران کے ساتھ گویا شیر و شکر تھے۔ سنہ ۱۹۳۰ء کا رنگ اِس سے بالکل الگ تھا، الگ اِس لئے کہ مُسلمانوں کا سب سے بڑا اور محبوب لیڈر محمد علی بڑے بڑے تلخ تجربوں اور بڑی بڑی مایوسیاں اُٹھانے کے بعد اب کانگریسی تحریک سے الگ تھا، جمعیتہ العلماء دہلی، بعض قیود و شرائط کے ساتھ کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی، لیکن خود اس کا بھی ایک بازو اس سے الگ ہو کر ایک دوسری جمعیتہ العلماء بنا رہا بلکہ بنا چکا تھا ــــــ میں خود اس وقت تک ایک گومگو اور حیص بیص کے عالم میں۔ ع

نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے!

یہ فتنا تھی کہ تھانہ بھون آنا ہوا، آتے ہی نظر مظفر نگر کے مطبوعہ ایک پوسٹر پر پڑی، عنوان "فرمان عُلمائے تھانہ بھون" نیچے حضرت کی تحریروں کے اقتباس کچھ اس طرح دیئے ہوئے، کہ گویا حضرت نے خاص اس تحریک کی مخالفت میں کوئی فتویٰ دیا ہے، خاکسار نے دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے؟ جواب

نفی میں ارشاد ہوا ـــــــ سچ کے ایڈیٹر کے لئے اتنا سہارا بہت تھا، پورا ایک مضمون ہاتھ آگیا، حضرت ہی کے ایماء سے ایک استفتاء مرتب کر[۵۱] اس پر حضرت کا جواب اور اپنی تمہید بڑھا، سچ اور الجمعیۃ دونوں میں شایع کر دیا، سچ کی وہ تحریر اپنی شارح و ترجمان آپ، اُس پر اب نہ کسی تبصرہ کی ضرورت نہ اضافہ کی گنجایش، آگے بجنسہ اُسی کو پڑھیئے،

(۲۶)

(منقول از سچ مورخہ ۳۰ مئی و ۶ جون ۱۹۳۰ء)

جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ نے کانگریس کی موجودہ تحریک قانون شکنی کی تائید اگرچہ بہت نپی تلی کر اور شرائط و قیود کے ساتھ مشروط و مقید کر کے کی، لیکن بہرحال کی، اِدھر اس تجویز کا بعض مُستند و متدین علمائے کرام کے نام سے شایع ہونا تھا کہ دوسری طرف سے ایک "فرمان" شایع ہوا، جس کے ذریعہ سے بتایا گیا، کہ حکیم الامّت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی، اِس تجویز کے قطعی مخالف ہیں، اور دہلی کے ایک اخبار نے تصریح کے ساتھ لکھ دیا کہ" ابھی جمعیۃ العلماء کی تجویز شایع ہوئے کچھ عرصہ نہیں گذرا کہ اس کے خلاف مسلمانوں کے جلسے ہندوستان میں شروع ہو گئے ہیں، اور اکثر مقامات سے خود علماء اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، یہاں تک کہ علمائے تھانہ بھون، بالخصوص حضرت مولانا اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند کا فرمان اِس کے خلاف شایع ہو چکا ہے" اور سخت افسوس ہے کہ خلافت کیٹی جیسی ذمہ دار مجلس کے ترجمان، روزنامہ خلافت نے بلا تامل اِس قسم کی تحریروں کو اپنے ہاں نقل کرنا شروع کر دیا، اس پروپیگنڈا میں حقیقت و واقعیت کا جزو کس حد تک شامل ہے، اِس کا جواب مراسلت ذیل کے پڑھنے کے بعد خود حضرت مولانا کی زبان سے مل جائے گا۔

"بخدمت گرامی حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب مدظلّہ العالی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، حال میں ایک تحریر" فرمانِ علمائے تھانہ بھون" کے عنوان سے

---

[۵۱] مسودہ استفتاء جس پر مولانا کے دست مبارک کی اصلاحیں اور اضافے ہیں، آج تک اپنے پاس محفوظ ہے۔

اتحاد پریس مظفر نگر سے منجانب محمد نبی بصورت اشتہار، نیز بعض اخبارات میں اس حیثیت سے شایع ہو رہی ہے کہ گویا موجودہ تحریک کے متعلق جناب والا نے اسی زمانہ میں مستقل طور پر بغرض اعلان تحریر فرمایا ہے" تحریر مذکور منسلک عریضہ ہذا ہے، اس کے متعلق بادب دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا تحریر مذکور جناب نے شائع کرائی ہے، یا جناب کی اجازت وایماء سے شایع کی گئی ہے؟ والسلام

خادم عبدالماجد"

الجواب: یہ مکرمی دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

جواباً اجزائے ذیل عرض کرتا ہوں:۔

(۱) یہ مضمون نہ میں نے شائع کرایا ہے اور نہ مجھ سے کسی نے اجازت لی ہے اور نہ قبل اشاعت اطلاع کی ہے۔

(۲) مجھ کو یقینی طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ مضمون میرا ہے بھی یا نہیں، گو بعض اجزاء کی نسبت احتمال ہوتا ہے، کہ میرا ہوگا، مگر تحریک موجودہ سے قبل کا۔

(۳) اور اگر میرا ہے تو معلوم نہیں کہ پوری اور مسلسل عبارت ہے، یا ناتمام اور متفرق۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں بعض اوقات مدلول اور مقصود بدل جاتا ہے۔

(۴) پھر جتنی عبارت لکھی ہے اس کا موجودہ تحریک سے کوئی تعلق بھی نہیں، اس کا حاصل تو صرف ان لوگوں کی شکایت ہے جو بانی تحریک کے اس درجہ معتقد ہیں کہ اس کی ہر تحریک کی قرآن وحدیث سے تائید کرنے لگتے ہیں اور یہ شکایت اب بھی ہے۔

(۵) میں نے جب اول اشتہار دیکھا، مالک پریس کو خط لکھا کہ شایع کنندہ سے دریافت کریں کہ مضمون میری کس تحریر سے لیا ہے اس کا حوالہ بتلادیں اور کس زمانہ کا ہے، اور بدوں اپنی کسی تمہید کے مستقل طور پر میری طرف منسوب کر کے کیوں شایع کیا ہے، جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ گویا میں نے مستقل اشاعت ہی کی غرض سے لکھا ہے۔ مگر کافی سے زیادہ مدت گذر گئی، جواب نہیں آیا، قبل استفسار مالک پریس نے اس قدر اطلاع دی تھی کہ یہ شایع کرنے والے مدرسہ مخزن العلوم سہارنپور کے کوئی ملازم ہیں"

اور اگر کسی کو مزید تحقیق کی ضرورت ہو، وہ پریس مذکور یا مشتہر مذکور سے تحقیق فرمالیں۔

نوٹ:۔ اس جواب سے مقصود صرف واقعہ اشتہار کی حقیقت بتلانا ہے نہ کہ اس تحریک کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنا کہ اس کا اس جواب سے کوئی تعلق نہیں۔

اشرف علی عفی عنہ، ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ

مولانا کے مکتوب میں جو عبارتیں زیرِ خط درج کر دی گئی ہیں وہ خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں، مولانا بہ تصریح ارشاد فرماتے ہیں، کہ وہ مضمون نہ انھوں نے شائع کرایا، نہ کسی کو شائع کرنے کی اجازت دی، نہ قبلِ اشاعت انھیں اس کا علم ہوا، اور نہ وہ مضمون ہرگز انھوں نے موجودہ تحریک کے متعلق تحریر فرمایا بلکہ مولانا کو تو اس میں شبہ ہے کہ آیا وہ مضمون اُن کا ہے بھی، اور اگر ہے تو آیا صحیح و بلا تحریف نقل بھی ہوا ہے! بانیٔ تحریک گاندھی جی کے ساتھ بعض مسلمانوں کو محبت و عقیدت میں جو غلو ہے اس کی اصلاح اور اس کا تدارک یقیناً ضروری ہے، اس مقصد میں علمائے جمعیۃ العلماء کا قدم حضرت مولانا سے ہرگز پیچھے نہیں، مگر ظاہر ہے کہ اس کو تحریک موجودہ کی موافقت و مخالفت سے کیا تعلق؟ کاش ہمارے اہلِ صحافت خلق و خالق کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے!

(۲۷)

عقیدت دینی، مذہبی، روحانی رنگ کی جس زور و قوت، جوش و ولولہ سے حضرت حکیم الامت کے ساتھ ہوئی، کسی دوسری زندہ ہستی کے ساتھ نہ تھی، لیکن عقیدت سے ذرا ہٹ کر ایک شے محبت بھی ہے، یہ محبت اسی جوش و قوت کے ساتھ محمد علی سے تھی، گویا ایک مقتدا تھے، تو دوسرے محبوب، اور ان دونوں کے درمیان آپس میں شدید سیاسی اختلافات کی گہری خلیج حائل ——— ملاقات کیا معنی، موالات ہر قسم کی ترک، غلط فہمیوں اور ان کے طبعی نتیجہ کے طور پر بدگمانیوں کے انبار دونوں طرف لگے ہوئے،

اس حلقہ میں "وہ" ایک بدعقیدہ نیچری اور ہندو پرست، اُس پارٹی میں "یہ" ایک مُلّا محض اور گورنمنٹ کے حمایتی! فرق صرف اتنا تھا کہ حکیم الامت بہرحال حکیم الامت تھے، گفتگو میں ہر طرح

زبان پر قابو، اور مخاطب کی دل شکنی کا لحاظ رکھتے، اُدھر محمد علیؒ کے ہاں زبان ضبط کے لفظ سے نا آشنا! ——

اِس نیازمند غریب و ناتواں کی جان عجب کش مکش میں۔ ع
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

—— کیا دو معاصر مخلصین و مومنین کے درمیان اتنا شدید و مدید اختلاف اور تنازع ممکن بھی ہے؟

ممکن ہی نہیں کثیر الوقوع بھی، اور یہیں پہنچ کر مذہب اہل سنت کی قدر ہوتی ہے امیر المومنین علی مرتضیٰؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے اور دوسرے دوسرے اکابر صحابہ کے مابین، اختلافات کی حکایت کس کے کانوں میں نہیں پہنچی ہے؟ دوسرے اختلافات اِس سے کم درجہ کے مشاہیر یا سہی پھر بھی مسلم مقبولین اور اہل اخلاص کے درمیان کیا نادر الوقوع رہے ہیں؟ شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ قطب الاقطابؒ اور محدث جلیل ابن جوزیؒ میں سے آپ کس کا شمار اہل باطل میں کریں گے؟ نظام اولیاء شیخ نظام الدین دہلویؒ اور قاضی شہر شیخ ضیاء الدین سناحیؒ کے درمیان آپ کس کے برسرناحق ہونے کا حکم لگائیں گے؟ غرض عہد صحابہ سے لے کر تا آخرین تک کون سا دور، اکابر ہی کی باہم تفسیق بلکہ تکفیر و مجادلے سے خالی رہا ہے؟ —— نفس کے لئے اور شیطان کی راہ میں نہیں، بلکہ حق کے لئے، اور اللہ کی راہ میں، اِس عالم ناسوت میں، محبت فہم و بصیرت رکھنے والے بندوں میں، حالات تکوینی کے محکوم و مسخر بندوں میں، جدال و خصومت کب اور کس دور میں نہیں رہی ہے؟ اور یہ بھی اسی راہ کی امتحان ہی کی ایک لطیف و صبر آزما سی صورت ہے۔

وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے ازل کے دن سے مرے یار ہوتی آئی ہے

اور ذرا آگے بڑھیے، تو دو معصوموں تک کے درمیان دینی حرارت سے وقتی آویزش اور ہنگامی عتاب نبی اللہ کی حکایت تو خود قرآن مجید نے سنائی ہے وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗ اِلَيْهِ

اعراف، آیت ۱۵۰) قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَأْسِیْ (طٰہٰ۔ آیت ۹۴)۔ اور پھر وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (حجر۔ آیت ۴۷) کی بشارت اہل جنت کو اگر ان ہی موقعوں کے لئے نہیں تو اور کس محل کے لئے ہے

بہرحال دل مضطرب رہتا تھا کہ وقت کے اِن دو بڑے مخلص بندوں اور دین و ملت کے ان دو زبردست خدمت گزاروں کے درمیان کوئی صورت مصالحت و مفاہمت کی نکال لئے، یا کم سے کم اتنا تو ہو ہی جائے کہ آپس میں اتنی بیگانگی اور اجنبیت باقی نہ رہے، اور اس کے لئے پہلا عملی قدم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ملاقات تو ہو جائے —— اب تک دونوں بزرگوں میں، باوجود اس کے کہ دہلی اور تھانہ بھون میں فاصلہ ہی کتنا تھا، کبھی ملاقات کی نوبت بھی نہیں آئی تھی، صرف ایک بار دہلی کی جامع مسجد میں سرسری روشناسی ہوئی تھی، اور اُس کو بھی اب کئی برس گذر چکے تھے —— آخر ایک روز موقع پا، اور ہمت کر، خدمت مبارک میں عرض ہی کر دیا کہ "حضرت ایک مرتبہ تو ملاقات حضرت کے اور مولانا محمد علی کے ہو ہی جانا چاہئیے، حضرت تو سفر کرنے سے رہے، اجازت ہو تو ان ہی کو کبھی اپنے ہمراہ یہاں لے آؤں، جیسا آپ کی خدمت میں گستاخ ہوں ویسے ہی انھوں نے بھی منھ لگا رکھا ہے، امید کیا بلکہ یقین ہے کہ عرض رائگاں نہ جائے گی، انشاءاللہ کچھ تو غلط فہمیاں دونوں طرف کی ملاقات ہی سے دُور ہو جائیں گی" —— ذکر پھر یاد کر لیجئے، آخر مئی یا شروع جون ۱۹۳۰ء کا ہو رہا ہے، قدرت نے خود ہی کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ مولانا محمد علی بھی متواتر تلخ تجربوں کے بعد اب کانگریس سے ہٹ چکے تھے اور جو مسلک و نقطۂ نظر حکیم الامت کا تھا، اس سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، دل اس تائید تکوینی کو اشارۂ غیبی سمجھا، اور اس سے تقویت حاصل کی۔

تواضع و انکسار تو حکیم الامت کا حصہ تھا، میرے معروضہ کے جواب میں ارشاد ہوا کہ "ارے نہیں، وہ بڑے آدمی ہیں، یہاں کہاں آئیں گے، یہاں آنے کی انھیں دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں، انھیں بڑی زحمت ہوگی"۔ میں اس جواب کے لئے تیار تھا، اور اس پر کب خاموش رہنے والا تھا،

عرض کی کہ "اِس سے حضرت کو کیا بحث، لانے والا اور بُلانے والا تو مَیں ہوں، اُن کے آنے کی ساری ذمہ داری میرے سر، مَیں صرف آپ کی اجازت چاہتا تھا۔ رہی اُن کی زحمت و تکلیف تو اِس سے کہیں بڑھ بڑھ کر تکلیف وہ مقامات اور ٹھیٹھ دیہات میں جانے اور ٹھہرنے کے عادی ہیں، اُن کی زحمت کا تو خیال بھی نہ فرمائیے۔" ذرا تامّل کے بعد فرمایا کہ "عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی اِس قسم کی تحریک کی تھی، پہلے تو مَیں نے اُن کو بھی یہی جواب دیا تھا کہ بڑے آدمی کو یہاں بُلانا مناسب نہیں، لیکن اُن صاحب کے اصرار پر مَیں نے جو کہا تھا، وہی آپ کے سامنے دُہرائے دیتا ہوں، میری تجویز ہے کہ اگر وہ تشریف لائیں تو اتنا وقت بہر حال دیں کہ درمیان میں ایک رات یہاں گذار سکیں، پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے، مَیں اُٹھ کر اُن کی تعظیم کروں گا، عزّت سے اپنے قریب ہی بٹھاؤں گا، لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ مسائل پر وُہ اُس روز خود گفتگو نہ فرمائیں، بلکہ میرے معروضات خاموشی کے ساتھ بلا قصدِ جواب سُن لیں، آدمی ذہین ہیں، اگر طبیعت فوراً جواب پر آمادہ ہوگئی، تو میری ہر بات کا کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی جائیں گے، اور میری کوئی بات بھی قبول نہ کریں گے، بس اُس وقت صبر و خاموشی سے سُن لیں، شب میں آرام کریں، اور طبیعت کو خلوئے ذہن کے ساتھ میرے معروضات پر سوچنے کا موقع دیں، پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر تک چاہیں ارشاد فرمائیں، مَیں بھی اُسی خاموشی کے ساتھ سُننے کو تیار رہوں گا۔"

واہ رے حکیم الامت! یہ جواب جس میں اتنی مصلحتوں کی رعایت ہو اُن کے سوا کوئی اور دے سکتا تھا؟ اِن ہی تجربوں سے تو بار بار کہنا پڑتا ہے کہ عالم و فاضل، ذاکر و شاغل، عابد، و زاہد، بزرگ درویش ہونا اور چیز ہے، اور حکیم و مصلح ہونا کچھ اور!

ہم جس پہ مر رہے ہیں وُہ ہے بات ہی کچھ اور　　　عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

اب آگے یہ نہ پُوچھئے کہ "تدبیر" کا یہ اقدام "تقدیر" کی قوت کے آگے کس طرح ناکام رہا، دِل چاہا خوش خوش یہ پیام مَیں نے، اپنی طرف سے مولانا محمد علیؒ کو پہنچایا، اور عرض کیا کہ تھانہ بھون کا پروگرام میرے وہاں قیام کے زمانہ میں بنائیں، اِس پر مولانا خوشی سے آمادہ تو نہیں کیا ہوتے، کچھ نیم راضی سے

ہو چلے تھے، اور ادھر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آئندہ ملاقات میں انھیں اور زیادہ آمادہ کر سکوں گا کہ عین اُسی زمانہ میں اُن کی علالت بہت زیادہ بڑھ گئی، یہاں تک کہ دہلی سے شملہ جانا پڑا، میں نے وہاں بھی اُن کی خدمت میں حکیم الامت کی غیر سیاسی کتابیں، یاد آخرت، وحقائق تصوف سے متعلق (شوق وطن وقصد السبیل وغیرہ) ارسال کیں کہ اسپتال میں لیٹے لیٹے اِن کا مطالعہ جاری رہے، لیکن قبل اس کے کہ زمین اتنی بھی تیار ہو سکے یا مجھے اپنے حسب توقع اُن کی خدمت میں ایک بار پھر حاضری وگفتگو کا موقع ملے، اُن کا وقت موعود اُنھیں کشاں کشاں شملہ سے بھوپال اور بمبئی اور پھر لندن لے گیا، اور بجائے یاد آخرت کے کتابی مطالعہ واستحضار کے وہ خود ہی اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے، اور من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ کی خلعت سے سرفراز ہو گئے ——— آہ کہ تاریخ امت کے کتنے صفحات ایسی ہی حسرتوں سے رنگین ہیں!

یک کاشکے بود کہ بہ صد جا نوشتہ ایم!

(۴۰)

شروع جون کی کوئی تاریخ تھی، مولانا محمد علی کی چوتھی اور سب سے چھوٹی لڑکی گلنار بی سلمہا کا عقد مشہور قومی کارکن شعیب قریشی صاحب[1] کے ساتھ قرار پایا، اور مولانا کے ہاں سے میرے پاس دعوت نامہ آیا، حضرت تھانوی سے مولانا کے تعلقات اب بھی شگفتہ نہ تھے، اس لئے جانے کی اجازت میں نے ڈرتے اور بچکچاتے ہی طلب کی، حضرت کے ہاں ان چیزوں میں تنگی کہاں؟ اجازت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ مرحمت ہوئی، بلکہ تشویق وہمت افزائی کے لہجہ میں محمد علی کو اب کی کئی مہینے کے بعد دیکھا، بیچارے ضعف وبیماریوں کی ایک پوٹ۔ ۵۳ سال کی ادھیڑ عمر میں، ستر بہتر سال کے بوڑھوں سے بدتر!
——— خیر یہ تو داستان ہی دوسری چھڑی جاتی ہے ——— یہیں مولوی احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء سے ملاقات ہوئی، محفل عقد میں نہیں، آپس کے تعلقات آمد ورفت بھی اب ختم ہو چکے تھے

---

[1] یہ وہی شعیب قریشی ہیں جو مدتوں ریاست بھوپال میں وزیر رہ کر اس وقت (۱۹۵۲ء میں) پاکستان کی طرف سے روس میں سفیر ہیں، اور کتاب کی طبع ثانی کے وقت مدت ہوئی مرحوم ومغفور ہو چکے ہیں۔

محفل سے باہر، سڑک کے کنارہ، شب کے اندھیرے میں، چوروں کی سی ملاقات ہوئی" فرمان کی حقیقت سے بہت خوش ہوئے، مبارکباد دی، اور الجمعیۃ کے لئے اس کی نقل لے گئے، بہر حال دو چار دن بعد دہلی سے سہارنپور ٹھہرتا ہوا پھر تھانہ بھون پہونچ گیا، اور مدتِ قیام پوری کر آخر جون میں سہارنپور، دیوبند ٹھہرتے ہوئے وطن واپسی ہوئی ——— عبادت گذاروں اور اہل تقویٰ کی تو مولانا کے حلقہ میں کمی کبھی نہ رہتی، اب کی طویل قیام چونکہ اس زمانہ میں رہا، جب انگریزی اسکولوں میں گرمیوں کی بڑی چھٹی ہوتی ہے، اس لئے خانقاہ میں دو ایک ایسے ماسٹر صاحبان سے بھی ملاقات ہوئی، جو ماشاءاللہ اہل فہم بھی تھے، اور یہ فہم کی نعمت بڑی نعمت ہے!

اب کی گھر پہونچ کر تین دن بعد جو عریضہ لکھا وہ اس قابل ہے کہ مع جواب تقریباً پورا ہی نقل ہو۔ (معروضات ماجدی کے لئے "م" کی اور ارشادات اشرفی کے لئے "ا" کی علامت یاد رہے)

"م۔ تین دن ہوئے بحمداللہ مع الخیر دریاآباد واپس پہنچا ہوں۔

ا۔ اوّل خجالت کے ساتھ غالباً تین روز کے توقف جواب کی معافی چاہتا ہوں، میں اس کا منتظر رہا کہ فراغ کا وقت ملے تو خط لکھوں، مگر اضیاف[1] کا ہجوم فوق العادت رہا، اس لئے فراغ میسر نہ ہوا، اب بھی قیلولہ کے عوض یہ خط لکھ رہا ہوں، ورنہ ظہر کے بعد پھر مجمع ہو جائے گا، مع الخیر پہنچنے سے اطمینان ہوا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔

م۔ تھانہ بھون کی یاد برابر آئے جاتی ہے، یاد تو پہلے بھی آتی ہی رہتی تھی، اب کی بار اور زائد۔

ا۔ یہاں بھی علیٰ ہذا کوئی دن آپ کے ذکر و فکر سے خالی نہیں جاتا۔

م۔ شب پنجشنبہ (۲ر جولائی) پچھلے وقت زلزلہ محسوس ہوا، آنکھ کھل گئی، اس وقت اندازہ یہ ہوا کہ کوئی دو منٹ تک قائم رہا ہوگا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ معاصی کو معاف فرمائے۔

م۔ کلام مجید کی آیات اس اثنا میں برابر زبان پر رہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو باب ۲۷، چند صفحہ قبل۔ [1] جمع ضیف، یعنی مہمان۔

ا۔ ایسے وقت میں ذکر اللہ کا استحضار علامت حُبّ الٰہی کی ہے، مبارک ہو۔

م۔ تجربہ ہے کہ جب زلزلہ آتا ہے، کسی اہل اللہ کا وصال ہوتا ہے + کوئی تین سال ہوئے یہاں جوار کے ایک متقی بزرگ (مولانا عابد حسین صاحب فتح پوری) کا انتقال ہوا، عین تدفین کے وقت زلزلہ آیا۔

ا۔ تجربہ لزوم کے متعلق ہوتا ہے، یہ اقتران اتفاقی ہے، جس کا تخلّف اقتران پر غالب ہے، نیز حدیث میں ہے اِنَّ الشمس وَالقَمَرَ لَا یَنۡخَسِفَانِ لِمَوۡتِ اَحَدٍ وَلَا حَیَاتِہٖ۔ اس پر زلزلہ کو قیاس کر لیا جائے۔

م۔ اب جو یہ زلزلہ محسوس ہوا، خیال اس وقت معاً جناب والا کی طرف گیا، چنانچہ اُسی وقت آپ کی خیریت کی بھی دُعائیں کیں، اور بعد کو نماز دُعائیں بھی کیں۔

ا۔ خیر اس خیال سے میرا تو بھلا ہو گیا، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ مزید اتفاق یہ ہے کہ عین اُس وقت خواب میں جناب ہی کی زیارت ہو رہی تھی، اس کے بعد دن میں دو بار خواب میں ہوئی، پھر کل جمعہ کو دن میں چوتھی بار ہوئی، چاروں مرتبہ بہت اچھی حالت میں دیکھا، تفصیلات تو اب یاد نہیں، اتنا خوب خیال ہے کہ جناب والا خوش بشاش مطمئن تھے، اور میری جانب بھی پوری شفقت کے ساتھ ملتفت، ان واقعات کو محض اتفاق پر محمول کروں، یا ان کے کچھ معنی بھی سمجھوں؟

ا۔ مجھ کو تو ایسے اسرار سے بالکل دلچسپی نہیں، میں تو اتفاق پر محمول کرتا ہوں، البتہ علامت محبت کی ضرور ہے۔

م۔ اب کی سفر میں جب دیو بند ٹھہرا تو گھر میں مولانا سے بیعت ہو گئیں۔

ا۔ دونوں صاحبوں کو مبارک ہو۔

م۔ اور مولانا ہی نے تجدید عقد بھی کرا دی[1]۔

---

[1] راقم آثم یہاں ایک دور الحاد کا طاری رہ چکا ہے، فقہا نے لکھا ہے کہ ایسی حالت میں عقد نکاح کی تجدید کرا لینا چاہئے۔

ا۔ اِس پر بھی دونوں صاحبوں کو مبارکباد عرض کرتا ہوں۔

م۔ والا نامہ جو "فرمان" کی حقیقت سے متعلق میرے عریضہ کے جواب میں عنایت ہوا تھا، اُسے اپنی تمہید کے ساتھ میں نے سچ اور الجمعیۃ میں شائع کرا دیا تھا، الحمد للہ کہ آپ کے مخلصین کی ایک بڑی تعداد مثلاً..... وغیرہم اس سے بہت مسرور و مطمئن ہوئے، اور مجھے تو بڑی خوشی اس کی ہے کہ مولانا نے بھی اسے بہت پسند فرمایا۔

ا۔ اہلِ اصلاح کی مسرت کو اپنے لئے فالِ نیک سمجھتا ہوں، مگر واقعات بتلا رہے ہیں کہ باستثناء جناب مولانا کے کہ وہاں علم و عمل کے اثر سے تنگی نہیں اور مسرت اصلی ہے، اور بے غرض، باقی سب حضرات یا اکثر حضرات بہت جلد اس مسرت عارضی و عرضی کو ختم کر دیں گے، چونکہ اب تک کسی نے اصول کے موافق، اِن تحریکات کے متعلق باقاعدہ سوال نہیں کیا تھا، اِس لئے اپنی رائے کچھ ظاہر نہیں کر سکا، اب ایک صاحب نے باقاعدہ سوال کیا ہے، اِس لئے باقاعدہ جواب لکھا، جو کہ واقع میں تو اِس جواب کے معارض نہیں، جو آپ نے لکھوایا تھا، لیکن سطحی نظر والوں کی نظر میں باہم تعارض موہوم ہوگا، اِس لئے وہ مسرت ختم ہو جائے گی، اور بدگمانی پیدا ہو جانا عجب نہیں، مگر میں اِس کی سب کو اجازت دیتا ہوں، مجھ کو جیسا چاہیں سمجھیں، اور جو چاہیں کہہ لیں، انشاء اللہ دلگیر نہ ہوں گا۔

بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ اگر ان جوابوں کے ملاحظہ کے بعد کچھ ثقل ہو جو مانع خطاب ہو تو موقت یا موبّد طور پر اِس مانع پر عمل رکھیئے، میں ہر حال میں دُعا کرتا رہوں گا۔

م۔ مولانا محمد علی صاحب اِس وقت بہت زائد علیل ہیں، قدیم امراض ذیابیطس وغیرہ پر جدید امراض ریاحی، دورۂ قلب وغیرہ کا اضافہ ہو گیا ہے، تنفس سا ہر وقت رہنے لگا ہے، شملہ کے ایک اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں، خواب آور دوا کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہ سونا ممکن ہے نہ لیٹنا، دُعائے صحت کے لئے خصوصیت کے ساتھ استدعا ہے۔

ا۔ خود میرا دل دُکھا، دِل سے دُعائے خیر کرتا ہوں۔

اطلاع بغرض استدعاء دعا۔ مولوی عبدالباری صاحب کے چھوٹے بھائی میاں شعیب کل یہاں

پہونچ گئے، دُعا کیجئے، جو غرض ان کو یہاں پہنچنے کی ہے، یعنی اصلاح، اللہ تعالیٰ اس کو پُوری فرما دیں،

(۲۹)

حضرت اپنی ذات سے اپنے سیاسی، بلکہ مذہبی مخالفین کے بھی حق میں جتنے نرم، مہذب و متین تھے اور اپنی تحریروں میں اس کا پورا لحاظ رکھ لیتے تھے، اِس کے تجربے ایک دو بار نہیں، بار بار ہو چکے تھے، لیکن اِس پر بھی برابر حیرت رہا کی کہ حضرت کے اس مذاق طبیعت کے باوجود مقرّبین اور مخصوص حاشیہ نشینوں میں بعض صاحب، زبان اور قلم دونوں بے لگام رکھتے تھے، اور ان سب کے سرغیل ایک خاص مولوی صاحب تو بس اپنی نظیر آپ تھے، مدّت سے اُن کی بدزبانی، اور اُس کے ساتھ مولانا کے ہاں اُن کا تقرب، دل کو کھٹک رہا تھا، آخر ایک بار خط میں اس کو عرض ہی کر دیا ——— اور کچھ خانگی باتیں ہر عریضہ کا جُزو ہوتی ہی تھیں، خط پر تاریخ ۱۲ر جولائی کی ہے:-

تین چار دن سے اپنے عریضہ کے جواب کا برابر انتظار رہتا[1]، بحمد اللہ مفصّل جواب سے سرفرازی ہوئی، جس سیاسی تحریر کا حوالہ اِس والا نامہ میں ہے، وہ ہنوز نظر سے نہیں گذری[2] لیکن گذرنے پر بھی انشاء اللہ قلب پر کوئی مخالف اثر مترتب نہ ہوگا[3]، البتہ ایک دوسرے امر میں قلب کو اکثر خلجان رہا کیا ہے، آج اِس بارہ میں اپنی تشفّی چاہتا ہوں، یعنی جناب والا کے قلم سے بعض اور صاحبوں، مثلاً مولوی . . . . کی تحریروں کی تائید و تصویب[4]، ابھی اسی ہفتے اُن کی حل القرآن جلد اوّل کو پڑھا، اور کیا عرض کروں کہ جا بجا اُسے پڑھ کر کیسی تکلیف ہوئی، تتمہ (ص تا ۱۰۷) میں محض ایک اجتہادی مسئلہ میں اختلاف کے جُرم میں نہ صرف تنہا "مسٹر" محمد علی بلکہ ساری جمعیۃ العلماء کو صاف صاف "مکذّب القرآن" "افتراء علی القرآن" "جہالت" اور "دعاوی کُفریہ" کا مرتکب بتایا ہے، علی ہذا مقدمہ (ص ۱۲) میں بعض ناقہم اہلِ بدعت کے حق میں بے دھڑک یہ فتویٰ کہ "صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ مُشرکین مکّہ سے بدتر ہیں" ایسی تحریروں پر جب جناب کے قلم سے صاد پاتا ہوں[5] تو فرطِ ادب سے کچھ کہتے نہیں بنتا، اجازت ہو تو حالی مرحوم کا ایک شعر عرض کر دوں ؎

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا[6]

آخر خود جناب کے بیان القرآن میں بھی تو موقع بموقع باطل فرقوں کی تردید ہے، اُس طرز اور اِس طرز میں کیا مناسبت ہے؟ کہاں وہ متانت و شانِ عالمانہ، اور کہاں یہ دلآزار طرزِ عامیانہ[7]،
مجھ سے عرصہ ہوا، آپ کے ایک بڑے مخلص نے (جو خود بھی ماشاءاللہ ایک ممتاز عالمِ دین ہیں) کہا تھا کہ حضرت تھانوی کو سب سے زیادہ بدنام اُن کے بعض مقرب تلامذہ ہی نے کیا ہے[8]۔ اِس قول کا میں محض ناقل ہوں، باقی خود اپنے قلب پر جو گذرتی رہتی ہے، وہ اُوپر عرض کر چکا۔

پچھلا عریضہ روانہ کرنے کے بعد بھی دوبارہ خواب میں زیارت ہوئی[9]۔

میاں نعیب کو خدا کرے پیسے استفادہ کی توفیق نصیب ہو[10]۔

گھر میں آثارِ حمل معلوم ہو رہے ہیں، والدہ ماجدہ مدظلہا اس کو جناب کی دُعاء و توجہ کا ثمرہ فرماتی ہیں[11]
تحفظ کے لئے کوئی دُعا یا نقش اگر مناسب خیال فرمایا جائے تو مرحمت ہو[12]۔

جواب حسبِ معمول فوراً ہی آیا:-

(۱) یہ تعلق سے ناشی ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

(۲) ابھی چھپی نہیں ہے، سائل چھپوانے کو کہتے ہیں، اگر مجھ کو بھی چند نسخے دیئے تو میں کسی خط کے ساتھ بھیج دوں گا۔

(۳) یہ آپ کی بلند نظری ہے، جہاں تک میری نظر نہ گئی تھی، اب آپ کے لے جانے سے گئی۔ بارک اللہ فیکم۔

(۴) مجھ کو یاد نہیں کہ کبھی ایسی تیز تحریر کی جس نے تصویب تحریر کی ہو، جب کہ میں خود اس کے خلاف اُن کو مشورہ دیتا رہتا ہوں، ہاں اگر کسی مضمون کو فی نفسہٖ صحیح سمجھتا ہوں، گو عنوان تیز ہو، زبانی تصویب کر دیتا ہوں۔

(۵) مجھ کو واقعی یاد نہیں پڑتا، لیکن اگر میری یاد کے خلاف کہیں ایسا پایا جائے، اُن کی نیت پر موافقت کر دی ہو گی، جیسے فقہ کی کتابوں میں تکفیر کے فتووں کی سب علماء موافقت کرتے ہیں، حالانکہ بہت سے فتووں میں اُن اقوال کا کفر ہونا مشکل ہے، مگر محض موافقت کی بنا پر اہلِ فتویٰ کی

نیت ہے کہ عوام الناس ایسے اقوال سے سختی کے ساتھ بچیں۔

(۶) شعر یاد آنا بالکل برمحل ہے، میں جیسا ہنسنے میں شریک ہوں ایسا ہی رونے میں بھی، کیونکہ رونے والوں کو بھی خوش نصیب سمجھتا ہوں، اور ہنسنے والوں کو بھی، اور سچ تو یہ ہے کہ برکاتِ اسلام کے فائض ہونے میں دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہے، رونا رعد ہے ہنسنا برق، دونوں کے جمع ہونے سے بارش ہوتی ہے۔

(۷) فطری تفاوت کو کون مٹا سکتا ہے، ابن تیمیہؒ اُستاد ہیں، ابن القیمؒ شاگرد، اُستاد گرم، شاگرد نرم، اب کس کو کیا کہا جائے، وہاں ابن تیمیہؒ کا رنگ ہے، فطرۃً بھی اور کچھ ان کے مطالعۂ کُتب سے بھی۔

(۸) وہ تو میرے تلمیذ بھی نہیں اور نہ مقرب، وہ عنایت کرتے ہیں اور میں رعایت، آپ کو شاید اس کا علم نہ ہوا ہو کہ وہ میری تحریرات پر بھی ایسی ہی آزادی سے کلام کرتے ہیں، جس میں اگر مضمون صحیح ہوا قبول کرکے اپنے قول کو واپس لے لیتا ہوں ورنہ قبول نہیں کرتا، لیکن بُرا نہیں مانتا صرف نیّت پر نظر کرکے، باقی بدنامی کا تو مجھ پر بحمداللہ دانۂ خردل کے برابر بھی اثر نہیں ہوتا، البتہ آپ کے دل دُکھنے سے دِل دُکھتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ اُن تحریرات کو نہ دیکھا کیجئے۔

(۹) یہ سب آثار ہیں محبت کے، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

(۱۰) ہاں دُعا کرتے رہیئے، اُن کو بھی اُنس تو معلوم ہوتا ہے اور اُن سے مجھ کو بھی، وہی ہادی حقیقی ہیں۔

(۱۱) اُن کی محبت ہے، میں کیا چیز ہوں۔

(۱۲) میں عامل تو ہوں نہیں، مگر توکلاً علی اللہ ایک تعویذ دے دیا کرتا ہوں اب بھی حاضر ہے، گلے میں ایسے طور پر رہے کہ زیرِ ناف پڑا رہے۔''

خط و کتابت بعض اوقات بڑی تیزی سے ہوتی، ابھی اُدھر سے جواب آیا نہیں، کہ اِدھر سے دُوسرا نیاز نامہ پھر تیار، چنانچہ اِس ۱۲ والے عریضہ کے بعد دوسرے عریضہ کی تاریخ ۱۹ رجولائی

ہے — حضرت کی صحبت کی اصلی برکت یہ تھی کہ ذہن خود اپنی کوتاہیوں کی جانب منتقل ہو جاتا، نماز کے ارکان ٹھیک ادا ہو پاتے ہیں یا نہیں؟ وضو بھی ٹھیک ٹھیک کر آتا ہے یا نہیں، قرآن مجید کے الفاظ ضروری حد تک صحیح ادا ہو پاتے ہیں یا نہیں؟ پڑوسیوں کے ساتھ، اپنے نوکروں چاکروں کے ساتھ جو طرزِ عمل ہے، وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ بھائی بہنوں کے، عزیزوں کے، بیوی بچوں کے جو حقوق شریعت نے واجب کئے ہیں، وہ بھی ادا ہو رہے ہیں یا نہیں؟ تقسیم جائداد شریعت کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں! آمدنی کا کوئی جزء ناجائز اور اکل بالباطل کے تحت میں تو نہیں؟ وغیرہا، بیسیوں سوال اپنے ہی متعلق ذہن کے سامنے آنے لگے، ذیل کا مکتوب تمامتر ایک استفتاء فقہی ہے اور نسبتاً مختصر ہے اس لئے سوال و جواب ساتھ ہی ساتھ پڑھتے چلئے۔

م۔ آج کے عریضہ میں دو فقہی سوالات عرض کرنے ہیں، ایک اپنی ذات سے متعلق دوسرا ایک ہم وطن سے متعلق۔

ا۔ چونکہ ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں، اس لئے اس کو اپنے کلیہ سابقہ سے مستثنیٰ کر کے جواب عرض کرتا ہوں۔

م۔ ہم لوگ دو بھائی اور ایک بہن ہیں، اور ہم دونوں کی ماشاء اللہ کئی اولادیں، لیکن ہم لوگوں کا کہنا چاہیئے ہر مال مشترک ہی ہے، زمینداری، مکان، سامان مکان و خانہ داری، ہر شے مشترک، اور آمدنی کے لحاظ سے بھی خلط ملط، کچھ نہیں معلوم کہ کون سی شے کس کی ملک ہے، ہر چیز سب کے کام میں یکساں رہی ہے، اور یہ بات ایک پشت قبل سے چلی آ رہی ہے، والد مرحوم اور چچا صاحب مرحوم میں بھی ایسی ہی یکجہتی تھی، ان کی بھی جائدادیں ملی جلی ہوئی تھیں، اب آپ کے فیض صحبت سے عموماً اور دعظا احکام المال کے مطالعہ سے خصوصاً ذہن کی رہنمائی اس جانب ہوئی کہ ہر ایک کی ملک متعین ہونا ضروری ہے کہ بغیر اس کے وارثوں کے درمیان تقسیم شرعی کیونکر ہو سکے گی، سو اب اشکال کا حل ہمارے ہاں کے لئے فرمایئے، ہمارے ہاں تو ملک ہی متعین نہیں، کئی دن سے اس فکر میں ہوں، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اب آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں

۱۔ ایسی صورت میں ضرورت اس کی ہے کہ سب مصالح پر نظر کرکے ایک صورت صُلح کی تجویز کرلی جائے، مناقشہ نہ کیا جائے کہ ہر شخص اپنا پُورا حق وصول کرنا چاہے بلکہ ہر شخص تسامح سے کام لے، البتہ ان میں اگر کوئی نابالغ ہو، اُس کا حصہ اتنا لگایا جائے کہ کسی کمی کا احتمال نہ رہے، اگر میری یہ تقریر کافی نہ ہو تو عدمِ کفایت کی وجہ ظاہر فرما کر مع اِس پرچہ کے دوبارہ استفسار فرمایا جاوے۔

۲۔ دُوسرا سوال یہ ہے کہ یہاں ایک رئیس کے ہاں ایک مُلازم کی بیوی پر گھر کی مالکہ خفا ہوئیں اور طنز سے بولیں کہ جا اپنے بیٹے کو یہ پیسہ دے آ، شوہر نے یہ سُنا تو اُس نے بھی مزاح و طنز کے لہجہ میں بیوی سے کہا" اماں، لاؤ سودے کے پیسے لاؤ"، اِس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ اماں کہنے سے طلاق واقع ہوگئی۔

۱۔ اگر مزاح نہ بھی ہوتا تب بھی یہ قول محض بے اثر تھا، طلاق وغیرہ کچھ بھی نہیں ہوئی"

اگست کے مہینہ کی مراسلت اتفاق سے دو کارڈوں تک محدود رہی، اور وہ کارڈ بھی محض ذاتی و خانگی معاملات میں طلب دُعا کے لئے، پہلا کارڈ جس پر یکم اگست کی مُہر ہے!۔

" وبا کی خیر سے قلب کو تعلق ہے، دِل سے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمادیں، اگر دِل چاہے متعلّقین کو بتلا دیجئے کہ ہر خوردنی نوشیدنی چیز پر ۳ بار سورۂ اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ دم کرکے کھائیں پئیں اور استغفار کی کثرت رکھیں (۱)"

دُوسرا کارڈ جس پر مُہر ۲۰ر اگست ہے:۔

" اللہ تعالیٰ آپ کو اور برخورداری کو صحت بخشے، بعد افاقہ بھی اطلاع دیجئے، اللہ تعالیٰ سب بلاسے ہر قسم کی وبا، ہیضہ و طاعون کو دفع فرمادے، میں بھی اُمیدوار دُعا ہوں"

مولانا کا وقت عزیز بلا ضرورت لینا یُوں بھی طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا تھا، اور کوئی خاص ضرورت اتفاق سے پیش آئی نہیں، اِس لئے مراسلت اِن چند ہفتوں کچھ کچھ رُکی رُکی سی رہی، اتفاق مزید یہ کہ سنہ ۱۹۳۰ء کی اس تیسری سہ ماہی میں نمک سازی اور قانون شکنی کے سلسلہ میں ہندوستان کا سیاسی بحران، تیز سے تیز تر ہُوا، اور مُسلمان خصوصاً ایک عام ابتلاء میں گرفتار، بھائی بھائی میں تفرقہ پڑگیا،

بیٹے باپ سے جدا ہونے لگے، اور مرید مرشد سے چھٹنے لگے، اور عین اسی زمانہ میں حضرت مولانا کے قلم سے رسالہ معاملۃ المسلمین شایع ہوا (پورا نام معاملۃ المسلمین فی مجادلۃ غیر المسلمین) اور اب وہ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ کے مجموعہ کا ایک جزو بن کر دار الاشاعت دیوبند، ضلع سہارنپور سے شایع ہو رہا ہے، جس کی زد تمامتر آکر مولانا حسین احمد صاحب کے سیاسی مسلک پر پڑتی ہے ——— تکوینی اتفاقات اور ترتیب حالات کے سامنے جب حضرات صحابہ تک بے بس ہو ہو گئے تو ہم غریبوں نادانوں کا کیا ذکر، میرا ذہن اپنی سادہ دلی سے اس جانب بالکل نہ منتقل ہوا کہ اس زمانہ میں اور اس ماحول میں میری ذرا طویل خاموشی یا نیم خاموشی کے معنی ارادی اعراض یا عمداً کنارہ کشی کے بھی لئے جا سکتے ہیں، بات اب اتنے عرصہ کے بعد بالکل کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس وقت ذہن اس طرف گیا ہی نہیں ——— حافظ کی مشہور غزل کے مصرعے

گر زمن دیدے شما بر ما جفائے رفت رفت

اور

درمیان جان و جانان ماجرائے رفت رفت

نظر سے بارہا گذرے تھے، انھیں پڑھا تھا، گنگنایا تھا، تحریروں میں دہرایا تھا، لیکن اس شاعری کو ہمیشہ شاعری ہی سمجھتا رہا تھا۔

(۳۰)

وسط ستمبر کے بعد کی کوئی تاریخ تھی کہ ایک عزیز مع دو رفیقوں کے اپنے اپنے مقام سے تھانہ بھون کے لئے پہلی بار روانہ ہوئے، اور اپنے حسن ظن سے پہلے دریاآباد کو سرفراز کرتے گئے۔ ان کی خدمت میں مناسب مشورے عرض کر دیئے تھے، اور خیال یہ ہوا کہ وہ واپس آلیں جب پھر حضرت کی خدمت میں خط لکھا جائے، ۲۹ ستمبر کو وہ سیدھے دریاآباد واپس آئے، حضرت کی خیر و عافیت تو انھوں نے بحمد اللہ سنائی اور خود بھی بہت خوش خوش آئے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خبر بھی لائے کہ حضرت کو میرے اس طویل سکوت سے ایک گونہ گمان ارادی اعراض کا ہے! ——— ایں گل دیگر شگفت!

سن کر سنّاٹے میں آگیا، طبیعت خبر کے راویوں پر جھنجھلا کر رہ گئی ؎

ہمراہ عدو آئے وہ یاں ہائے قیامت — اِک آدھ بھی ساتھ اپنے لگا لائے قیامت

صبح اُٹھتے ہی ایک عریضہ حضرت کی خدمت میں چلا گیا —— عریضہ تنہا پہلے پڑھ لیجئے، جواب بعد کو پڑھئے گا، جواب اگر ساتھ ساتھ پڑھتے گئے، تو عریضہ تو بالکل بیکار اور بیجان نظر آئے گا، عریضہ کی عبارت میں حسبِ معمول اختصار و تلخیص سے کام لیا جائے گا، جواب لفظ بہ لفظ درج ہوگا، نیاز نامہ اب ملاحظہ ہو:-

"سیّدی و مطاعی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مدّت سے عریضہ نگاری کا ارادہ کر رہا تھا، آج کل پر ٹلتا رہا، اِدھر چند روز ہوئے میرے ایک عزیز (جو باندہ میں وکیل ہیں) مع اپنے دو رفیقوں کے خدمتِ والا میں حاضر ہوئے تھے، خیال یہ کر رہا تھا کہ واپسی پر اُن سے خیریت معلوم ہو جائے، جب عریضہ لکھوں، اب وہ کل سہ پہر کو یہاں پہونچے، بحمد اللہ خیریت تو اُن سے معلوم ہو گئی، وہ تینوں صاحب میری حسبِ توقع مسرور و مطمئن بھی ہر طرح آئے[1]،

البتہ اِس سے قلب کو تکلیف پہنچی[2] کہ رسالہ معاملۃ المسلمین کی اشاعت کی بنا پر میری جانب سے ترکِ مراسلت کا گمان (وہ گمان درجۂ احتمال ہی میں سہی) جناب کو کیسے پیدا ہوا[3]، کیا میری نیازمندی اور قلبی عقیدت ایسی ہلکی چیزوں سے بدل جانے والی ہے؟[4] مسائلِ مختلف فیہ میں اختلاف و نزاع تو آج سے نہیں سلف سے چلا آیا ہے[5]، پھر جب مالکؒ و شافعیؒ سے بدعقیدگی کسی حنفی کے لئے جائز نہیں[6]، تو اس وقت ان مسائل کی بنا پر دورِ حاضر کے حکیم الامت[7] سے کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ یہ تو خیر ایک سیاسی مسئلہ ہے، میں تو متعدد فقہی مسائل میں بھی جناب والا کے ارشادات کو اپنی فہم سے بالاتر پاتا ہوں[8]، با ایں ہمہ عقیدت و نیازمندی قائم ہو چکی، وہ غیر متزلزل ہے، غزالیؒ کی فقہ کو اپنے لئے حجت نہیں سمجھتا، لیکن سلوک و فنِ اصلاحِ نفس میں اُنھیں امام الائمہ سمجھتا ہوں، اور وہ زندہ ہوتے تو اُن کی کفش برداری، اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا —— بلا شائبۂ تصنع و تملق عرض ہے کہ ایسا ہی معاملہ جناب والا کے ساتھ ہے[9]،

خدمت والا سے واپس ہوئے اب کوئی تین مہینے ہوئے، اب پھر حاضری کا بہت دل چاہنے لگا ہے،
زیارت خواب میں متعدد بار ہوئی، کبھی نماز پڑھتے پایا، کبھی نماز کے لئے تیار ہوتے، تسکین ہر مرتبہ حاصل
رہی، ایک مہینہ کے اندر ہی انشاء اللہ حاضری کا پھر قصد ہے[10]؛
پچھلے دنوں یہاں ہیضہ کا زور رہا، ہم لوگ بحمد اللہ محفوظ رہے، اب آب و ہوا صاف ہے[11]۔

والسلام۔ محتاج دعا

عبدالماجد

جواب پڑھئے، اور انتظار کے بغیر پڑھئے، سہولت کے لئے نمبر ہر فقرہ پر ڈال دیئے ہیں:۔
''مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ
(۱) یہ سب برکت آپ کی توقع کی ہے۔
(۲) بیشک تکلیف پہونچی، جس کی میں معافی چاہتا ہوں، لیکن اس پر نظر فرمائی جائے کہ اس احتمال کے
ظاہر نہ کرنے میں آپ رفع بھی نہ فرماتے، اور براہ بشریت مجھ کو وہ احتمال بڑھ جاتا، اور اس وقت
آپ کو اطلاع ہوتی تو زیادہ تکلیف ہوتی، اگر اس پر نظر فرمائی جائے تو پھر میرے اظہار کو سبب جو
تکلیف ہوئی وہ نہ ہوتی، بلکہ اخفاء کو موجب تکلیف قرار دیتے، لیکن پھر بھی معافی چاہتا ہوں۔
(۳) حقیقت کے نہ جاننے سے۔
(۴) اسی میں تو شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب کے نزدیک ظنی ہیں یا نہیں۔
(۵) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے کہ سب کے نزدیک مختلف فیہ ہیں یا نہیں۔
(۶) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے یہ اختلاف سب کے نزدیک مثل اختلاف حنفی شافعی کے ہے
یا نہیں۔
(۷) یہ لقب تو مجھ کو خود مسلّم نہیں۔
(۸) اسی میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ مثل فقہی مسائل کے ہے یا نہیں۔
(۹) اب تو کوئی شبہ ہی نہ رہا مگر بدوں حقیقت پر مطلع ہوئے تو شبہ ہو سکتا تھا، اور ہوا، اور

منشاء اس کا احتیاط تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا تعلق کسی کے لئے تکلیف کا سبب نہ بنے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ عطا فرمائیے، میرے پاس بجز دعا کے کوئی چیز نہیں۔

راز۔ جس میں میری کوئی مصلحت نہیں، صرف آپ کی مصلحت ہے، اور وہ بھی دینی، متواتر اور معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کانگریس کی شرکت کو فرض فرماتے ہیں، اس صورت میں معلوم نہیں اپنے خاص متعلقین کے لئے تارکین فرض سے خاص تعلق رکھنے کو عقلاً یا شرعاً یا طبعاً پسند فرماتے ہیں یا نہیں، اس لئے خاص عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ مولانا سے ایسے طریقہ سے کہ مولانا اپنا اصلی خیال ظاہر فرما دیں ضرور تحقیق کر لیں کہ مجھ جیسے تارک فرض سے ان صاحبوں کا ملنا ان کے قلب لطیف پر گراں تو نہ ہوگا، کیونکہ گرانی کی صورت میں باطنی فیض منقطع ہو جاتے ہیں، جو ضرر عظیم ہے، نیز یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آیا وہ روایت گو ظاہراً متواتر ہے صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہو اور ملنا گراں ہو تو چند روز کے لئے مجھ سے ملنا بند کر دینے سے کچھ ضرر نہیں، پھر جب موقع ہوگا عود ہو جائے گا، اور میں زمانۂ بے تعلقی میں بھی دعا گو رہوں گا۔

(۱۱) مبارک ہو۔

اشرف علیؒ۔

اسی ۱۵-۱۶ برس کے عرصہ میں دُنیا کیا سے کیا ہو گئی! اور اب تو خیر حضرت کے وصال کو پانچواں برس ہو رہا ہے، زندگی ہی میں دُنیا کتنی بدل چکی تھی! مزاجوں کے رُخ بدل گئے، دلوں کی دھڑکنیں بدل گئیں، فضا کی ہر سانس بدلی ہوئی، یُوں کہئے کہ زمین آسمان بدل گئے۔ ع

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانہ میں!

اَلْعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ، جس نے کہا بالکل سچ کہا، دیکھنے میں ایک بہت موٹی سی بات، لیکن حقیقت میں بہت گہری اور باریک بات تھی، —— کاش سنہ ۱۹۳۰ء منجمد ہو گیا ہوتا! زمانہ کی گھڑی کی سوئی اسی ہندسہ پر پہنچ کر رُک گئی ہوتی! —— کاش یہ آپ بیتی، سرگذشت صرف شیرینیوں اور حلاوتوں ہی کی ہوتی، لیکن زندگی ساری کی ساری، خواب شیریں ہی کا نام نہیں، کیسے کیسے تلخ تجربے کتنے

بھیانک اور ڈراؤنے خواب اسی زندگی میں دیکھنے پڑتے ہیں! طبیعت اِس سے ہچکچاتی ہے کہ ساری ہی رُوداد دہرادی جائے، لیکن پھر دل یہی فیصلہ کرتا ہے کہ دوسروں کو پُورا نفع جب ہی ہو سکتا ہے جب سب ہی کچھ اُگل کر رکھ دیا جائے، اور لکھنے والے پر جو کچھ بھی گذر جائے، پڑھنے والے اس کی موت کے بعد بھی ان نقوش کاغذی سے بہر حال کچھ سبق ہی حاصل کرتے رہیں، پھر یہ نظارہ کہ ایک طرف ایک سپاٹ دل و دماغ اور سطحی نظر رکھنے والا ۲۸ سال کی عُمر کا ہے اور دوسری طرف ایک حکیمانہ نظر رکھنے والا محقق و اُستاد، صاحبِ فن ستّر بہتّر سال کی عُمر کا جہاندیدہ، وُہ کس کس طرح اُسے گھوم گھُما کر گرفت میں لاکر راہ راست پر لا رہا ہے، اور کس کس طرح نکاتِ فن کا افادہ کرتا جا رہا ہے، یہ سب چیزیں اگر منظرِ عام پر نہ لائی جائیں تو یہ کتنا بڑا بُخل ہوگا، گو بعض دُوسری مصلحتوں کا اِس سے خُون ہی ہو رہا ہو لیکن پھر دُنیا میں کون سی بڑی مصلحت ہے، جس کے لئے چھوٹی چھوٹی مصلحتوں کی قُربانی کرنی نہیں ہوتی ؟

(۲۱)

نقوش و تاثرات کی یہ قسط جو حضرت کی وفات سے پُورے تین سال بعد وسط جولائی ۱۹۴۶ء میں سپردِ قلم ہو رہی ہے (اور مجموعہ کی اشاعت کی نوبت تو دیکھئے کب آئے) پُوری طرح سمجھ میں نہ آئے گی، بلکہ ذہن میں اور اُلجھن پیدا کر دے گی، جب تک سلسلہ کے ابتدائی نمبر خصوصاً ۵ و ۶ پیشِ نظر نہ ہوں جو حضرت کی وفات سے چند ہی ہفتے بعد ۱۹۴۳ء کی آخری سہ ماہی میں لکھے گئے تھے، جن حضرات کے ذہن میں ان نمبروں کے مضامین نہیں، وُہ لاکھ ذہین ہوں، مگر اِس گُتھی کو حل ہی نہ کر سکیں گے کہ آخر ایک باضابطہ مُرشد کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے بزرگ سے رابطہ و تعلق قائم رکھنے پر اتنا اصرار کیوں ہے ——— وہاں ایک ایک تفصیل اِسی لئے درج ہو چکی تھی کہ آگے چل کر ذہن کو جھٹکا نہ لگے، اور پڑھنے والا آسانی سے سمجھتا رہے کہ لکھنے والے کا اصلی مرکزِ عقیدت کون تھا، یہ ضروری نہیں کہ پڑھنے لکھنے والے کی موافقت ہی میں قائم کریں + لیکن یہ تو بہر حال ضروری ہے کہ رُوداد واقعات وہ من و عن اُسی کی زبان سے سُنیں۔

مرکزِ عقیدت و عظمت والے بزرگ کے حق میں یہ عقیدہ بھی اصلاً ہرگز ضروری نہیں کہ وہ بھی عن اللہ زکی

سب سے زیادہ مقبول ہیں، اس کا فیصلہ کوئی بندہ کیونکر کرسکتا ہے، چہ جائیکہ ایسا شخص جو خود ان بزرگوں سے کہیں فروتر ہو، طالب کے دیکھنے کی بات تو صرف یہ ہوتی ہے، کہ میرے حق میں نافع تر کون ہے، میری تعلیم و اصلاح کون بہتر طریقہ سے کرسکتا ہے؟ —— وہی ایک گستاخ شاعر کی زبان میں سے

ابن مریم ہوا کرے کوئی　　　میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

—— لکھنؤ میں ابھی ۲۰-۲۱ سال اُدھر تک ایک مشہور بزرگ تھے، اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ کے لئے عوام ہی میں نہیں، حلقۂ خواص میں بھی مقبول و ناموراں کی خدمت میں ایک سے زائد بار حاضری کا اتفاق ہوا، اُن کی بزرگی اور برگزیدگی میں ذرا شک نہیں، یقیناً عند اللہ بڑے مقبول ہوں گے، لیکن دل کو یہ نظر آیا کہ یہ اپنے کام کے زیادہ نہیں، اول تو چند منٹ سے زائد بیٹھنے کی اجازت نہیں، اور پھر وہ چند منٹ بھی ادب کے ساتھ سر جھکائے خاموش رہئیے، اور جو کچھ دل میں ہو اُسے دل ہی میں رکھیئے، بس دُعا کرائیے اور برکت کا لطیف و نازک سا عطیہ لئے چلے آئیے —— تو حاصل گذارش یہ کہ بزرگی اور نافعیت لازم و ملزوم ہرگز نہیں۔

اُوپر ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء کا عریضہ اور حضرت کا جواب دونوں درج ہو چکے، اور اُس وقت کی رُوئداد اُن سے معلوم ہو چکی، آگے کی کارروائی کے لئے میرا دُوسرا عریضہ مورخہ ۶ اکتوبر (کسی قدر ملخص) اور حضرت کا جواب پُورا ملاحظہ ہو،

"سیّدی و مطاعی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

گرامی نامہ نے سرفراز اور حسب معمول ہر طرح مطمئن بھی فرمایا، ہر گرامی نامہ گویا تشفی و تسکین خاطر کا مخزن ہوتا ہے، اور اسی لئے تو میں سرفراز ناموں کے وصول ہونے پر اتنا حریص رہتا ہوں(۱)،

مولانا مدظلہٗ سے ابھی دو ہفتے ہوئے لکھنؤ میں نیاز حاصل رہا تھا، ارشادات زیادہ تر مسائل حاضرہ ہی سے متعلق رہے، شرکت کانگریس کے لئے فرضیت کی تصریح تو میں نے نہیں سُنی(۲)، البتہ یہ معلوم ہوا کہ ممدوح کا میلان اس جانب بہت زائد ہے، اور دل سے چاہتے یہ ہیں کہ مسلمان اس تحریک میں

بڑی کثرت سے شریک ہوں[1]، خود تو اپنے لئے طے ہی فرما چکے ہیں، باقی از راہ ذرّہ نوازی اپنے ایک خُرد سے بھی اس بارہ میں مشورہ فرماتے رہے، خیر، یہ مسئلہ تو الگ ہے، باقی جناب والا نے جس امر کی بابت خیال ظاہر فرمایا، کہ متوسلین مولانائے ممدوح اگر تارکین فرض سے ملتے رہے تو اس سے ممدوح کو گرانی ہوگی، تو مجھے کم از کم اپنے حق میں اس کا احتمال ہی نہ گزرا، اور نہ اب ہے[3]، مَیں تو جناب کو بھی ایسے احتمالات سے ارفع ومنزہ سمجھتا ہوں[4]، اور مولانا مدظلہ کو بھی[5]، بلکہ میرا تو ذہن ہی اس صورت کے فرض کرنے سے اباء کرتا ہے کہ کسی حال میں مولانا اپنے خدام کی جناب کی خدمت میں حاضری سے گرانی محسوس کریں گے[6]، یا اس کے بالعکس جناب والا اپنے خدام کی مولانا کی خدمت میں حاضری سے[7]۔

ایسی اولاد کی بدبختی میں کیا شک ہے، جو باپ اور چچا کے درمیان کسی معمولی سے اختلاف کی بنا پر ایک کی جُنبہ داری میں دوسرے سے بے اَدبی، گستاخی اور ترک تعلقات پر اُتر آئے[8]،

رہا میرے لئے مولانا کی طرف سے باب فیض کی مسدودی کا احتمال، تو میرے لئے تو خوش قسمتی سے دو دروازے موجود ہیں، اور یکساں شفقت وکرم والتفات کو دیکھ کر میرے لئے یہ فیصلہ ہی دشوار ہے کہ دونوں آستانوں میں سے میرے لئے شفیق تر کون ہے، بہ قول کسی کے، صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم![9]

اِس مسئلہ پر یہ گذارش اپنی فہم کے بساط کے لائق کی ہے، اگر کسی اصولی غلطی میں مبتلا ہوں تو برائے خدا ضرور تصحیح فرمادی جائے[10]،

شب کو خواب میں جناب والا کی پھر زیارت ہوئی اور اب کی اپنے والد ماجد مرحوم کو بھی میں نے اُسی مجلس میں شریک پایا[11]، (والد مرحوم بڑے نیک اور دیندار تھے، سنہ ۱۳۳۰ھ میں حج سے فارغ ہو کر معاً ۱۲ ذی الحجہ کو صبح تڑکے منیٰ میں ہیضہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۴ ذی الحجہ کو اذان فجر کے وقت مکہ معظمہ میں انتقال کیا) اِس سے قبل والد مرحوم کو مولانا مدظلہ کے ساتھ بھی ایک مجمع میں دیکھا تھا[12]۔

ایک اپنے ضروری خانگی مسئلہ کے متعلق بھی عرض کرنے والا تھا، مگر یہ عریضہ یوں ہی بہت طویل ہوگیا، اس لئے اُسے آیندہ ہفتہ تک ملتوی کرتا ہوں[13]، والسلام"

سلہ وہی سنہ ۱۹۳۰ء کی تحریک نمک سازی وقانون شکنی مراد ہے، جس سے علی برادران علانیہ اپنی علٰحدگی ظاہر کر چکے تھے،

جواب وہی ہر فقرہ کا نمبروار ملاحظہ ہو، اور اس کے قبل والے مکتوب کے مفہوم کا استغفار تو بہرحال ضروری ہے۔

"اگر کارڈ نہ آگیا ہوتا[۱] تو میرا خیال مبسوط عرض کرنے کا تھا، مگر پریشانی میں زیادہ وقت لینا بے رحمی معلوم ہوئی، اس لئے بہت مختصر عرض ہے۔

(۱) اس محبت کا صلہ بجز دعا کے کیا پیش کروں۔

(۲) مجھ کو اس روایت کی صحت پر اصرار نہیں، لیکن نہ سننے سے استدلال نفی محتاج نظر ثانی ہے، بعض اوقات سنانے کے لئے محرّک کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ محرّک کسی مخالف خیال کا کان میں پڑنا ہوتا ہے، ممکن ہے وہاں یہ محرّک واقع نہ ہوا ہو، اور جس نے بلکہ جنھوں نے میرے سامنے روایت کی، اُن کے سامنے یہ محرّک واقع ہوا ہو۔

(۳) آپ کے شایان شان یہی ہے، لیکن اگر مجھ کو یہ احتمال کسی راوی یا رواۃ کے ثقہ ہونے کی بنا پر ہو گیا تب بھی مستنکر نہیں، کیونکہ جو بنا آپ کو احتمال نہ ہونے کی ہے، یعنی مولانا کا تدیّن وہی بنا مجھ کو احتمال ہونے کی ہے، کیونکہ جس امر کا دین ہونا ثابت ہو تو خلاف دین کے متعلّق ایسا اثر ہونا لازم ہے۔

(۴) اپنا عدم تنزّہ ابھی عرض کر چکا ہوں۔

(۵) اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ایسا اثر ہونا تنزّہ کے خلاف نہیں، عین تنزّہ و تدیّن ہے۔

(۶) اگر گرانی طبعی ہو اور دین اس کا منشا ہو تو ذہن کو اس کے لئے آمادہ کرنا چاہیئے۔

(۷) واقعی اس کا موقع پیش نہ آنے سے اِس کا اندازہ نہیں، لیکن مجھ کو اپنے اوپر بھروسہ نہیں۔

(۸) بیشک آپ کا خیال عین حق ہے، لیکن چند روزہ جسمانی بُعد خدا نہ کرے ترکِ تعلق نہیں، اصل تعلق قلب سے ہے، اور جسم قلب پر حاکم نہیں کہ جسم کے قید سے قلب کو قید ہو جائے، مجھ کو اپنے قلب کی حالت مشاہد ہے، ان چیزوں سے وہ مطلقاً متاثر نہیں ہوتا، میرے قلب کا اِس باب میں یہ

---

[۱] گھر میں اختلاجی دورے، غشی اور تشنّج کے ساتھ سخت قسم کے پڑنے لگے تھے، کارڈ میں اس کی اطلاع و درخواست دعا تھی،

مذہب ہے سے

نہ دوری دلیل صبوری بود　　　　که بسیار دوری ضروری بود

(۹) اگر یہ عرض کرنا گستاخی نہ ہو تو مجھ کو یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جس فن کا یہ مسئلہ ہے، آپ کا جواب اس کے متعلق نہیں، اور میری تجویز اس سے متعلق ہے، اور آپ نے ابھی اس پر نظر نہیں فرمائی؛ گو نظر فرمانے کے بعد آپ کی تحقیق مجھ سے بھی بلند و محیط ہو سکتی ہے، مگر ابھی ایسا نہیں ہوا، اس لئے ابھی مجھ کو اس دعویٰ پر اصرار ہے، کہ ایسے امور گو ابہام ہی کے درجہ میں ہوں، فیض میں سدِّ راہ ہو سکتے ہیں اور ہو جاتے ہیں۔

(۱۰) اصول کی شان تو بہت بلند ہے، اس کو میں اصول میں سے نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض فروع میں اثر اصول جیسا ہوتا ہے، و ہٰذہٖ منہا۔

(۱۱) آپ نے مجھ کو صلحاء کی شرکت مجلس کی خبر سنائی، اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

(۱۲) بیساختہ یہ نکتہ ذہن میں آیا کہ مولانا کے اجتماع کو مقدم اور میرے اجتماع کو مؤخر دیکھنا شاید اشارہ اس طرف ہو کہ مولانا کا حق مقدم ہے اور یہی میں بھی لکھ رہا ہوں۔

(۱۳) بہت بہتر۔

تجدید مشورہ مفیدہ | میں نے مضمون صفحۂ اوّل کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے، اس پر عمل ہونے نہ ہونے میں میرا کوئی نفع ہے نہ ضرر، دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے، وہ آپ ہی سے متعلق ہے، اور اس بناء پر مجھ کو اس پر اصرار کا حق نہیں، لیکن فرط خیر خواہی پھر تجدید پر مجبور کرتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، جس کا ایک درجہ تو بہت سہل اور اسلم ہے، یعنی بُعد موقّت، اور ایک درجہ نہ سہل اور اسلم تو نہیں، لیکن آپ کے مذاق کے موافق، وہ مولانا سے پوچھ لینا ہے، مگر ایسے عنوان پر کہ اصلی رائے ظاہر نہ ہو جانے کی تدبیر ہو۔

تائید مشورہ مفیدہ | سیر میں حضرت علیؓ کا ابوجہل کی بیٹی سے جو کہ شرعاً حلال تھی، نکاح کا قصد، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر ایک خاص خطبہ پڑھنا کیا اس کو نہیں بتلاتا کہ انبیاء علیہم السلام تک کا

طبعاً تاثر ممکن ہے، چہ جائے عُلماء خوب غور فرمالیں۔

ضمیمہ

متعلّق نمبر ۳۱

(ابھی دو ہی چار صفحہ اُوپر اسی نمبر ۳۱ میں حضرت کے نام خط میں ذکر ایک "ضروری خانگی معاملہ" کا آچکا ہے، معاملہ یہ تھا کہ مَیں نے اپنے ایک مرحوم دوست کی صاحب اولاد بیوہ سے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں اپنی عُمر کے ۳۸ ویں سال میں عقد کر لیا تھا، پہلی بیوی سے پُوری طرح گُفتگو و مشورہ کے بعد، لیکن عقد کے بعد نباہ آسان نہ معلوم ہوا، اور اندازہ و توقع کے خلاف طرح طرح کی سخت پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں، آخر میں حضرت سے رجوع کیا، جو خود بھی صاحبِ تجربہ تھے، آگے حضرت کا جواب مُلاحظہ ہو)

از اشرف علی عفی عنہ، بمکرمی محترمی دام لُطفہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

داستانِ غم سُنی۔ طبعاً دِل دُکھا، دو وجہ سے، ایک آپ کی کُلفت سے مگر وہ چونکہ اختیاری تھی، اِس لئے کم دِل دُکھا۔ دُوسرے اہل خانہ کی کُلفت سے اور وہ چونکہ غیر اختیاری تھی، اِس سے زیادہ دِل دُکھا، یہ تو اظہار تھا اُس اثر کا جو میرے قلب پر ہوا، جو کہ آپ کا اِس خط سے مقصود بھی نہیں، اب مَیں اُس جُزو کی طرف رجوع کرتا ہوں، جو خط سے آپ کا مقصود ہے، یعنی اس معاملہ کے متعلّق اجزاءِ مشورہ طلب میں رائے ظاہر کرنا، میری رائے میں اِس خط میں جتنے اجزاء لکھے ہیں سب مناسب ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کو نافع فرمادے، اگر اس پر مزید مطلوب ہو مولانا[1] کا خط کافی اور جامع ہے اور جو اس سے بھی زیادہ توضیح مقصود ہو، گو حاجت نہیں لیکن اِس بناء پر کہ شاید مجھ کو اِس معاملہ کا زیادہ تجربہ ہے، مجھ سے اس کی درخواست کرنا زیادہ بے محل بھی نہیں اور اس کا درجہ مولانا کی تحریر کے سامنے ایسا ہوگا جیسے دواؤں کی خاصیّت تو طبیب زیادہ جانتا ہے، جس سے پنساری کے علم کو کوئی نسبت نہیں لیکن خود دواؤں کو پنساری زیادہ پہچانتا ہے، جو کہ پنساری کے

---

[1] مُراد مولانا حسین احمد صاحب ہیں، جن کا خط تمام تر مبارکباد ہی کا آیا تھا۔

لئے نہ کمال ہے نہ طبیب کے لئے کچھ نقص ہے، اِس کے متعلق جو مَیں عرض کروں گا اس کا یہی درجہ ہوگا، اِس معروض کے چند اجزاء ہیں۔

(۱) قدیمہ سے کہئے کہ مَیں نے جو کچھ کیا ہے تمھارے مشورہ سے کیا ہے، اگر تم روک دیتیں ممکن ہے مَیں ایسا نہ کرتا۔

(۲) اب ہو چکنے کے بعد آخر کیا چاہتی ہو، کیا اُس کو چھوڑ دوں، مگر اس کے ساتھ ہی دو باتوں پر نظر کر لی جاوے، ایک یہ کہ کیا بلا وجہ ایسا کرنا عند اللہ مبغوض نہ ہوگا اور کیا عرفاً ایسا کرنا بدنامی کا سبب نہ ہوگا، کیونکہ خاندانی لوگوں کے لئے ایسا کرنا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے، پھر ہمیشہ کے لئے خاندان کے سب لوگوں کے لئے وقت کا سامنا نہ ہوگا، سب کا اعتبار جاتا رہے گا، جہاں بھی پیام بھیجا جاوے گا، یہ جواب ملے گا کہ جس خاندان کے بڑوں نے ایسا کیا، چھوٹوں کا کیا اعتبار، تو اُن کے رشتے ناطے مشکل ہو جاویں گے۔ دوسری بات یہ ہے اِس کے چھوڑ دینے کے بعد اگر خواہش نفس کا تقاضا ہوا جو کہ بس سے باہر ہے اور تمھارے معاملہ میں احتیاط کو ضروری کہا گیا ہے تو اس کی کیا صورت ہو گی؟ تو پھر یہی صورت ہو گی جس سے فرار ہوا، یا خدانہ کرے کسی معصیت میں ابتلاء ہوگا، جس کو کوئی گوارا نہیں کر سکتا، اِس سوال کا اُن سے نرمی کے ساتھ جواب لینا چاہئے، امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ چھوڑنے کو گوارا نہ کریں گی، اور آپ کی آمادگی دیکھ کر اُن کا غم ہلکا ہو جاوے گا۔

(۳) قدیمہ کی دلجوئی پہلے سے زیادہ رکھیئے، اور مناسب موقع پر بطور خوش طبعی کے یہ جتلا دیجئے کہ دیکھو دوسرے عقد سے تمھارا یہ فائدہ ہوا کہ تمھاری خاطر زیادہ ہونے لگی اور پہلے جو کبھی کبھار غصہ کر لیتا تھا اب وہ بھی نہ رہا تو تمھارا نفع ہوا یا نقصان،

(۴) جدیدہ سے خُفیہ اجازت لے کر ضرورت اور مصلحت سمجھا کر انتظام خانہ داری قدیمہ کے ہاتھ میں رکھیئے لیکن جدیدہ سے یہ کہنا بھی ضروری ہوگا کہ جُدا خرچ لینا تمھارا حق ہے جب اِس حق کو حاصل کرنا چاہو بے تکلف کہدو۔ اس کے بعد اگر کبھی انھوں نے اپنے حق کا مطالبہ کیا تو دینا پڑے گا،

لیکن اگر ایسا ہوا ، مدتوں بعد ہوگا اور اس انتظام کے اطالتِ عمر میں اس سے زیادہ اعانت ہوگی، کہ جدیدہ کا کچھ نقد ماہوار مقرر کر دیجئے کہ پھر آپ اس کا اُن سے حساب نہ لیں۔

(۵) کوئی وقت گو تھوڑا ہی سا ہو ایسا معیّن کر لیجئے جس میں دونوں کو بیٹھ کر اولیاء کے تذکرے کسی کتاب سے سُنایا کیجئے اس سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے اور درمیان درمیان میں دونوں سے کچھ مزاح و لُطف کی ایسی باتیں کرتے رہا کیجئے جس سے وہ دونوں بھی باہم بے تکلّف ہو جاویں۔ اس کو قلق کی کمی میں خاص دخل ہے، دوسری غرض آپ نے یہ لکھی ہے کہ کوئی تعویذ وغیرہ دیا جائے، ملفوف ہے، گلے میں ایسے طور پر ڈالا جائے کہ قلب پر پڑا رہے، اللہ تعالیٰ نافع فرمائے اور اگر پانچوں نمازوں کے بعد یا باسطُ سَو بار پڑھ کر قلب پر دَم کر لیا کریں مزید نفع کی توقع ہے، ملامتِ خلق کی حکایت جو تحریر فرمائی ہے یہ اسی جہاد میں داخل ہے جس کا مولانا نے تذکرہ کیا ہے، جس مسئلہ کے متعلق رائے تحریر کی ہے اس کا فیصلہ اگر نہ ہو چکا تو ضرورت تھی ہم لوگوں کی نظر و فکر کی، مگر جو حضرات کتاب و سنّت کو ہم سے زیادہ سمجھتے تھے وہ اس کو طے کر چکے ہیں، وہ یہ ہے کہ صرف دو چیزوں میں عدل واجب ہے خواہ اِن چیزوں کا کوئی درجہ مستحب ہی ہو، لیکن اگر ایک کے ساتھ اس مستحب کا برتاؤ کیا جائے تو دوسری جگہ بھی واجب ہے، ایک شب باشی اس میں اختیار ہے کہ مضاجعت ہو یا نہ ہو، مباضعت ہو یا نہ ہو، دوسری چیز انفاق، ایک کو جو چیز دی جائے خواہ نقد، خواہ کھانا، خواہ کپڑا خواہ واجب کے اندر ہو یا واجب سے گذر کر مستحب کے درجہ میں ہو اس میں بھی عدل واجب ہے، باقی دوسرے امور میں جیسے وہ معاملات جن کا برتاؤ حضرت عائشہؓ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس میں مساوات واجب نہیں، اُن پر شب باشی و انفاق کو قیاس نہیں کیا جا سکتا پھر عقلاً بھی مناسب حال کا کوئی ایسا معیار نہیں جو صاحبِ معاملہ پر حجّت ہو، بس تو اس کی دل شکنی ضرور ہوگی [1]

---

[1] میں نے اپنے عریضہ میں لکھا تھا کہ حکم قرآنی 'عدل' کی جو تفسیر مساوات سے کی گئی ہے، یہ نظر ثانی کی محتاج ہے، دل کو لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ عدل کی تفسیر "ہر بیوی کے ساتھ اس کے مناسب حال برتاؤ" سے کی جائے، یعنی ایسا برتاؤ جو اس کے سن، سیرت، عادات وغیرہ کے لحاظ سے مناسب ہو، مکتوب گرامی کی آخری سطروں میں میرے ہی معروضہ کا جواب ہے

ایک ہی موضوع پر اتنی لمبی گفتگو سے حاضرین بزم اُکتا چلے ہوں، تو کچھ عجب نہیں، بلکہ سرے سے موضوع سخن ہی اگر ذہن سے گم ہو گیا ہو، تو بھی کچھ بعید نہیں، لیکن بات ہے ہی اتنی اہم اور عجیب سی، کہ اُسے اس تفصیل سے اگر نہ بیان کیا جائے، تو ذہن میں اُترے بھی نہیں، اور نہ صاحب سوانح کی زندگی اور تعلیم کا یہ پہلو ہی روشنی میں آسکے —— غالب نے بہت سے بہت کہا تھا تو یہ کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار   یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یہاں ماجرا اس سے بھی عجیب تر اور لطیف تر تھا، شیخ وقت اپنے ایک طالب سے بیزار ہرگز کسی درجہ میں بھی نہیں، بلکہ غایت شفقت ہی کی بنا پر اُسے اپنے ہاں حاضری دینے سے روک رہے ہیں، اور اُس کے اشتیاق و تمنا کو اُسی کی مصلحت کے خلاف بتا رہے ہیں! اِدھر سے بار بار یہ اصرار کہ تھانہ بھون حاضری کی اجازت دی جائے، اور اُدھر سے ہر بار یہی جواب کہ یہ قصد و آرزو ممکن ہے کہ جو صاحب ضابطے مرشد ہیں اُن کے لئے باعث گرانی ہو، اس لئے مناسب و قرین مصلحت نہیں! —— ارشاد و اصلاح کی ساری تاریخ میں بھی ایسی مثالیں بس ڈھونڈھے ہی سے ملیں گی!

حاضری پر جہاں دو چار مہینے بھی گذر جاتے دل بے اختیار اس طرف کھنچنے لگتا، آخری لمبی حاضری جون میں ہوئی تھی، اب چار پانچ مہینے گذر چکے تھے، اُدھر سے لطیف گرپُر زور پیرایوں میں ممانعت ہوتی رہی، اِدھر یہ تہیہ اس کے باوجود ہو گیا کہ شروع دسمبر میں بہر حال اپنے کو اس در تک پہنچا ہی دیا جائے، چنانچہ ۱۴ر نومبر کے عریضہ میں ذوبارب اور شروط طریقہ پر نہیں، بلکہ گویا قطعیت کے ساتھ

عرض کر دیا :-

"۔۔۔۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب اِدھر ایک روز کے لئے دریاباد بھی تشریف لائے تھے، میں نے اپنی حاضری تھانہ بھون سے متعلق حضرت کا عندیہ لے لیا، جواب بحمد اللہ وہی ملا جس کا میں متوقع تھا، اب انشاء اللہ دو ہفتہ بعد بھائی صاحب کے پاس سہارنپور آنے کا ارادہ ہے، اور وہاں سے تھانہ بھون کا طویل قیام کے لئے، اور دیوبند کا مختصر قیام کے لئے۔"

خیال کیا معنی یقین تھا کہ بس اِس آخری مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب اجازت نامہ مسرت خوش دلی کے ساتھ آہی رہا ہوگا —— جواب آیا لیکن توقع کے بالکل برعکس، انکار میں! ارشاد ہوا،

"ہنوز میں متفق نہیں، یہ غور فرمائیے کہ آپ نے کس عنوان سے مولانا کا عندیہ لیا، غالباً آپ کا ذہن بوجہ میری محبت کے اُس عنوان کا فی تک پہنچا نہ ہوگا، اب میں وہ عنوان بتلاتا ہوں، اِس عنوان سے پوچھئے، تو اصل خیال ظاہر ہو جائے گا۔

وہ عنوان یہ ہے کہ یہ لکھیئے کہ اشرف کا ایک فتویٰ ممانعت شرکت کانگریس میں نظر سے گزرا جس سے انگریزوں کو قوت پہنچنے کا احتمال ہے، اِس لئے ملنے کو دِل نہیں چاہتا، لیکن چونکہ پہلے سے ملتا تھا، اِس لئے شبہہ یہ ہوتا ہے کہ شاید نہ ملنا مضر دین ہو، اِس صورت میں اولیٰ کیا ہے، ملنا یا نہ ملنا + ملنا مضر ہوگا یا نہ ملنا۔"

داغ صاحب کا ایک شعر ہے، غزل کے عاشقانہ رنگ میں ؎

وعدہ پہ مرے اُن کے قیامت کی ہے تکرار   اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج!

تھوڑی سی ترمیم کے بعد یہی منظر آج پیش تھا، اِدھر سے اصرار "آج" پر اُدھر سے گفتگو "کل" کے لئے! "قیامت کی تکرار"، بہر حال پیش نظر! —— یہ جدید حکم نامہ آکر سر چکرا یا، زمین پیر کے نیچے سے سرکتی معلوم ہوئی! ہمت کر کے ایک آخری اور انقطاعی خط یہ لکھ ڈالا:-

دریاباد۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۳۰ء

"سیدی ومطاعی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

تعمیل ارشاد میں مجال عذر ہی کیا، لیکن گذارش یہ ہے کہ جناب کی جس عبارت پر میں نے سُرخ نشان بنا دیا ہے (یعنی یہ کہ "اب ملنے کو دل نہیں چاہتا") اُسے اپنے قلم سے کیونکر لکھوں[1]؟ میرا دل تو اُس فتویٰ اور اُس قسم کی ساری دوسری تحریروں کے باوجود بھی حاضری کو بے اختیار چاہے جا رہا ہے؛ پھر واقعہ کے بالکل برعکس یہ کیسے لکھ دوں کہ ملنے کو دل نہیں چاہتا[2]!

گستاخی نہ سمجھی جائے تو صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ اپنے قلب میں تو اس باب میں کوئی تشویش سرے سے پاتا ہی نہیں، اس لئے کسی مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا، اور اب اگر کچھ کروں گا بھی تو محض تعمیلِ ارشاد میں، نہ کہ اپنے قلب و ضمیر کی کسی اُلجھن کی بنا پر[3]! — والسلام۔

محتاجِ دُعا۔ عبدالماجد''

——— محبّت کی دُنیا میں سُنا ہے کہ ایسے مقامات بھی آ جاتے ہیں جہاں نافرمانی ہی عین اطاعت، اور انکار ہی عین اتباع بن جاتا ہے! ——— امیرالمومنین علی مرتضیٰؓ سے بڑھ کر عاشقِ صادق اور مطیعِ کامل اور کون ہوا ہے، پھر کیا یاد نہیں کہ صُلح حدیبیہ کے موقع پر اسمِ مبارک کے آگے لقب "رسول اللہ" کے مٹانے کے حکم سے انکار کس نے کر دیا تھا؟ ——— بڑوں کی مثالیں چھوٹوں کے لئے، کوہ کی نظیر کاہ کے لئے، قوت والوں کے نمونے ناتوانوں کے لئے، کتنا بڑا سہارا بن جاتے، اور کیسے ہمت اور ڈھارس کے سبب ثابت ہوتے ہیں:

بچّے ضدی اور نادان سہی، شفیق بزرگ اور ماں باپ اور اُستاد کبھی کبھی ان کی بھی بات رکھ ہی لیتے ہیں۔

——— جواب حسبِ معمول پہلی ڈاک سے آیا، پند نامہ تو ہمیشہ ہی ہوتا تھا، اب کی پند نامہ سے بڑھ کر شفقت نامہ:۔

"مُشفقی ومکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،۔

(۱) مصلحت مضائقہ نہ تھا، لیکن آپ کی طبیعت جو محبّت کا محل ہے فتویٰ عقلی پر جو مصلحت کا منشا ہے غالب آ گئی، جس میں آپ بھی معذور رہیں، یہ ظالم محبّت اکثر مصلحت پر ظلم کر کے غالب آ جاتی ہے

(۲) اس پر مجھ کو بیساختہ شعر یاد آ گیا،

عشق را نازم کہ یوسف را بہ بازار آورد ہمچو صنعاں زاہدے را زیرِ زنار آورد!

مگر اب میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ آپ کا لقب بجائے فلسفی کے عاشق ہونا چاہیئے، اِس لئے کہ فلسفی ہمیشہ عقل کو غالب رکھتا ہے، اور عاشق طبیعت کو۔

(۳) میں نے جو کچھ مشورہ دیا تھا اپنی کسی مصلحت سے نہیں بلکہ محض آپ کی مصلحت سے دیا تھا کہ خُدانخواستہ مولانا سے آپ کو بُعد نہ ہو جاوے، میرا تو بلکہ ایک نقصان ہی تھا، کہ ایک دوست کم ہوتے تھے مگر میں رگو مدعی ایثار نہیں لیکن) الحمد للہ کہ دوسروں کی مصلحت کو خصوص دوستوں کی مصلحت کو اپنے مصالح پر مقدم رکھنے پر لپیٹ کرتا ہوں اور کبھی عمل بھی نصیب ہو جاتا ہے، میں مشورہ کا حق ادا کر چکا، اب اگر خدا نخواستہ مولانا کو کوئی گرانی ہو تو میں سبکدوش ہوں، آپ سر آنکھوں پر آئیں۔

اشرف علیؒ

کیسے ظالم یا نابینا ہیں وُہ دانا دشمن یا نادان دوست، جنھوں نے حکیم الامت کو "خُشک" یا "چوبِ خُشک" خود سمجھا یا دوسروں کو سمجھایا ــــــ ظاہر ہے کہ اس وقت حکیم الامت کو مولانا ئے مدنی سے شدید سیاسی اختلاف تھا، اور جو دونوں کے خیال کے مطابق مذہبی اختلاف کی طرف منجر تھا، اِس شدید اختلاف کے وقت وہ یہ نہیں کرتے کہ مولانا کے ایک متوسل کا میلان اپنی طرف دیکھ کر اُسے اور اپنانے کی کوشش کریں، بلکہ جب وُہ اُس طرف بڑھتا ہے، تو اور اُلٹا اُسے روکتے اور بہ اصرار بار بار روکتے ہیں کہ اِدھر قدم اُٹھانے سے "شیخ" کے قلب پر غُبار آجانے کا اندیشہ ہے!

(۳۴)

اجازت مِل جانے کے بعد اب انتظار کا ہے کا ہوتا، شروع دسمبر میں عرض کر دیا، کہ سہارنپور کے لئے روانہ ہو رہا ہوں، ۸ر دسمبر کو حاضر خدمت ہو جاؤں گا، جواب ۵ر دسمبر کو سہارنپور میں ملا کہ "محبت نامہ نے اشتیاق میں اضافہ کیا، انشاءاللہ سب انتظام دلخواہ ہو جائے گا، اتوار کی صبح کو تو کھانا کھائیے گا، جواب کی ضرورت نہیں، نہ گنجایش، بھائی صاحب کے لئے برابر دُعا کرتا ہوں، والدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرماوے کہ کوئی شکایت لاحق نہ ہو"

قیام کی گنجایش اب کی دو ہی تین دن کے لئے نکل سکی لیکن مدّت کی قلّت کی تلافی لطف و عنایت کی شدّت نے کر دی، التفات کی فراوانی ہمیشہ ہی رہتی تھی، اب کی فزوں تر رہی، ۱۰ ر دسمبر کو سہارنپور واپس آ گیا، اور یہاں سے عریضہ ارسال کیا، جواب بھی ساتھ ہی ساتھ ملاحظہ ہو :۔

م ۔ بحمد اللہ رخصت ہو کر یہاں بخیریت پہنچ گیا۔

ا ۔ الحمد للہ۔

م ۔ دیوبند بھی حاضری دے آیا ۔

ا ۔ بارک اللہ تعالیٰ ۔

م ۔ میرے حال پر جناب کی عنایت و شفقت یوں تو شروع ہی سے ہے، اور ہر مرتبہ اس میں ترقی ہی محسوس ہوئی، مگر اب کی بار کا لطف و کرم تو سب سے بڑھ کر رہا۔

ا ۔ مجھ کو بھی محسوس ہوتا تھا، مگر اس سے زیادہ مسرت ہوئی کہ آپ کو بھی محسوس ہوا، مگر اس کا سبب شاید معلوم نہ ہو، عرض کرتا ہوں کہ باوجود میری بے مروّتی و بے تہذیبی کی تحریروں کے آپ کی عنایت و توجہ میں کمی نہ ہوئی اور تشریف آوری کی تکلیف برداشت فرمائی، اس سے قلب پر یہ اثر ہوا کہ یقین ہو گیا کہ بیشک آپ کو بہت محبت ہے، اس کا اثر یہ ہوا کہ مجھ کو بھی محبت بڑھ گئی، اور امید ہے کہ بڑھتی جائے گی۔"

اس مکتوب کا کتاب میں درج کرنا واجبات و ضروریات میں سے تھا، کسی کو کسی چیز پر فخر ہو، اس تہی مایہ و تہی دامن کے فخر و مباہات کے لئے ان چند الفاظ کے اندر ایک دفتر کا دفتر موجود ہے ـــــــ اے اللہ گواہ رہیو کہ تیرا ایک مقبول و برگزیدہ بندہ اس بے عمل و بدعمل کو یوں پروانۂ محبّت عطا کر رہا ہے، کیا حشر میں یہ صداقت نامہ بے وزن نکلے گا، اور اثر سے خالی جائے گا ؟

۱۹۳۱ء

۱۹۳۱ء کو اپنے لئے اگر عام الحزن کہوں، تو کچھ بیجا نہ ہوگا، سال شروع ہی ہوا تھا کہ تنہا اِسی نیازمند پر نہیں، کہنا چاہیئے کہ مُلک کی ساری ملّت اِسلامی پر قیامت ٹوٹ پڑی، یعنی مُسلمانوں کا محبوب ترین ومُخلص ترین سردارِ ملّی، محمد علیؒ "سُلطان جابرؓ کے سامنے "کلمۂ حق" کہہ کر افضل الجہاد، کرتا ہوا اِس دُنیائے فانی سے رخصت ہوگیا، ——— آہ بے بس انسان اور اُس کی آرزوؤں کے خواب! دِل میں کیا کیا امیدیں تھیں کہ اس محبوب سردارِ ملّت کو وقت کے شیخ اعظم سے ملایا جائے گا، آپس کی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ کا نمونہ جنّت سے قبل اِسی دُنیا میں نظر آنے لگے گا!

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند!

۵ جنوری کو میں حیدر آباد دکن سے دہلی وسہارنپور کے راستہ سے واپس ہو رہا تھا کہ صُبح سویرے دہلی کے اسٹیشن پر یہ خبرِ واقعہ اثر سُننے میں آئی۔ خیر، اُس وقت جو گذری گذری، گھر پہنچتے ہی غالباً ۸ جنوری کو حضرتؒ کی خدمت میں بڑے دُکھے ہوئے دِل سے ایک اطلاعی و تعزیتی کارڈ لکھا، جواب فوراً موصول ہوا، آپ بھی پڑھیں:-

"مکرمی - السلام علیکم ورحمۃ اللہ -

محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے، بیان نہیں کر سکتا، خُدا جانے کتنی دفعہ دُعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم کی حسنِ صفت کا اعتقاد، اور اِس اعتقاد کی بنا پر محبّت ہے، صرف

ایک صفت مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے، باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے، اور اس کو میں شرح الصفات سمجھتا ہوں"

اشرف علی"

حضرتؒ کی عالی ظرفی و شرافت نفس کا اعتقاد تو پہلے ہی سے تھا، اب اس حقیقی تعزیت نامہ نے علم الیقین کو عین الیقین میں تبدیل کر دیا۔

مربی حقیقی بھی بندہ کو کس کس منزل سے گذارتے ہیں، اور کن کن حالاتِ تکوینی میں اُسے ڈال کر کیسے کیسے تجربے اُسے کراتے ہیں، اور پھر کبھی اسی ذیل میں بعض حقائق شرعی کا علم بھی اسے کبھی روایتہً اور کتابۃً اور کبھی عیاناً اور عینی بھی اُسے عطا کر دیتے ہیں! —— اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ایک مرحوم دوست کی بیوہ سے عقد کرنے کو تو کر لیا تھا، لیکن وہ صاحبہ جب سے آئیں، موافقت کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اسباب و وجوہ کی تفصیل کی نہ یہاں گنجائش، اور نہ اس سلسلہ میں کوئی ضرورت ہی۔ مختصر یہ کہ افسوسناک تجربے ہوتے رہے، ۱۹ جنوری ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں مولانا سے تفصیلی ہدایات چاہیں، مضمون عریضہ تقریباً یہ تھا:۔

" یہ تو قرآن مجید کی تصریح ہے کہ اگر عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ ہو تو ایک ہی بیوی کرو، دوسری نہ کرو، لیکن اگر کر چکنے کے بعد یہ تجربہ ہو کہ عدل پر قدرت نہیں، تو اب کیا حکم ہے، یہی کہ طلاق دیدی جائے یا کچھ اور؟ یہ تو عمومی اور اصولی استفتاء تھا، اب اپنی آپ بیتی مختصراً عرض ہے کہ یہ جدیدہ جب سے آئی ہیں، میرے لئے مطبوع کبھی نہیں رہی ہیں، اور جب سے تنہا ان ہی کا ساتھ ہے (قدیمہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں) اُس وقت سے بے رغبتی اُن کی جانب بجائے گھٹنے کے اور بڑھ ہی گئی ہے، رات کا پورا، اور دن کا بھی خاصہ وقت اُنھیں دیتا ہوں، پھر بھی گفتگو کی نوبت بھی بہت ہی کم آتی ہے، پھر اگر دل پر جبر کر کے اُن کی طرف توجہ و التفات بڑھاؤں بھی، تو اُن بیچاری قدیمہ کے مرض اختلاج وغیرہ کے بڑھ جانے ہی کا نہیں بلکہ خطرناک صورت اختیار کر لینے کا اندیشہ ہے، اس صورت حال پر مستزاد یہ کہ میری والدہ ماجدہ اور دوسرے اہل خاندان کوئی بھی ان جدیدہ کے آنے سے خوش نہیں، تو علاوہ مسئلہ کے شرعی پہلو کے جناب والا جیسے صاحب تجربہ و فطرت شناس بزرگ کے مشورہ و ہدایت سے بھی مستفید ہو

چاہتا ہوں[2]

ایک اور شبہ بھی اسی سلسلہ میں عرض کروں، آپ کی زبان سے سُنا تھا، اور فقہ کی کتابوں میں بھی دیکھا تھا، کہ نفقہ کی حد تک دونوں بیویوں کو برابر رکھنا چاہیئے، لیکن بحر الرائق (شرح کنز) اور ردّ المختار (شرح دُرّ المختار) دونوں میں یہ عبارت بھی نظر سے گذری کہ والحق انہ علی قول من اعتبر حال الرجل وحدہ فی النفقہ واما علی القول المفتیٰ بہ من اعتبار حالھما فلا فان احدھما قد تکون غنیۃ والاخریٰ فقیرۃ فلا یلزم التسویۃ بینھما مطلقاً فی النفقہ۔ اس کا مفہوم مَیں تو یہ سمجھا کہ قول مفتیٰ بہ یہ ہے کہ دونوں بیویوں کی حالت پر، نفقہ کے بارہ میں نظر کی جائے گی، اور مُطلق مساوات ضروری نہ رہے گی، اگر مَیں مطلب غلط سمجھا ہوں، تو اس کی اصلاح فرما دی جائے[3]،

جواب فقیہانہ، حکیمانہ دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے آیا، فقیہانہ بہت مفصّل:-

(۱) "اس میں تفصیل ہے کہ جس کا حق ادا نہ کر سکے اُس سے بہ رفق و لُطف پُوچھ لے کہ مَیں تمھارا حق ادا نہیں کر سکتا، اب آگے دو راہ ہیں، غور کر کے ایک راہ کو ترجیح دے لو، ایک راہ یہ ہے کہ اپنے سب حقوق سے دست بردار ہو جاؤ اور معاف کر دو اور نکاح میں رہو (اس میں بھی دو طریق ہیں، ایک یہ کہ نفقہ جاری رہے، دوسرے حقوق معاف کرا لے) اور اگر اس حالت میں نکاح میں نہیں رہنا چاہتی ہو تو مہر کے ادا یا ابراء کے بعد تم کو طلاق دیدوں، اور اس کے ساتھ ہی اس مسئلہ کی بھی اطلاع کر دی جائے کہ اگر تم معافی حقوق کی شق اختیار کر و تو آیندہ اس سے رجوع کر لینے کا بھی تم کو حق ہے، مگر جب رجوع کرو مجھ کو اطلاع کر دو، پھر اُس وقت بھی مَیں تم کو ان دونوں شقوں کا اختیار دوں گا۔

(۲) ان سب حالات و جُزئیات کو پڑھ کر بھی تفصیل مذکور سے زاید کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی، انشاء اللہ تعالیٰ کافی و وافی ہے، آگے مسئلہ کی تحقیق مذکور ہے۔

(۳) الجواب۔ مَیں نے یہ روایت آج ہی دیکھی، مگر دیکھنے کے بعد رائے سابق نہیں بدلی، وجہ خدشہ یہ ہے کہ اوّل تو یہ مسئلہ اپنی اصل سے باب القسم یعنی العدل کا نہیں، باب النفقہ کا ہے، جس میں زوجہ کے یسار و اعسار کی بحث بہ مقابلہ زوج کے ہے جس پر نفقہ کی ضمانت ہے، زوجہ کا حق اور

زوج کی مؤنت دونوں پر نظر کر کے یہ بحث پیدا ہوگئی، آگے اُس پر باب القسم کے جزئیہ کو قیاس کر لیا گیا، اور قیاس کرنے والے بھی نہ مُجتہدین ہیں نہ مرجّحین۔ تو خود اصل مسئلہ قیاسی کہ ظنّی ہے پھر اُس قیاسی پر قیاس کرنے سے جو حاصل ہوگا وہ اصل سے بھی ضعیف ہو کر اضعف ہو جاوے گا، خصوص جب قائس بھی ضعیف ہو، پھر خود صحت قیاس کی ایک فارق کی وجہ سے متکلّم فیہ بھی ہے، اور فارق یہ ہے کہ اصل میں مقابلہ ہے مَنْ عَلَیْہِ الحقّ اور مَنْ لَہُ الحقّ کا اور ان دونوں کی بناؤں میں تساوی نہیں، اِس لئے وجہ تعدیل میں اختلاف ہو سکتا ہے، اگر قائل نے دونوں بناؤں کی رعایت کے طریق تجویز کرنے میں مُختلف رائے قائم کی جس میں کسی کی ترجیح کسی پر لازم نہیں آتی، اور یہاں مقابلہ ہے ایک من لہ الحق کا دوسرے من لہ الحق سے جو بناء استحقاق میں متساوی ہیں، پھر با وجود تساوی فی بناء استحقاق محض ایک وصف خارج یعنی یسار کی وجہ سے جس کا بناء استحقاق پر کوئی اثر نہیں، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا البطال ہے بناء استحقاق کا ایک وصف خارج کے سبب جو ترجیح بلا مرجح ہے، غرض قیاس کی صحت بھی ضعیف پھر قائس بھی ضعیف اور قیاس در قیاس کی وجہ سے جبی ضُعف، مسئلہ میں اتنے ضعف، پھر نصوص وجوب عدل سے تعارض، کیونکہ وہ نصوص اپنے اطلاق سے اِس صورت کو بھی شامل کہ ایک موسرہ ہو ایک فقیرہ، اور تخصیص وتقیید کی کوئی دلیل نہیں، اِس لئے یہ حکم سخت مخدوش ہے، پھر دوسرے قواعد اس کو مُقتضی ہیں کہ اگر اس حُکم پر عمل بھی کیا جائے تو زوج کی رائے پر اس کا مدار نہ رکھا جائے گا، بلکہ قضاء قاضی کی حاجت ہوگی، کیونکہ اس صورت میں جو فقیرہ کی طرف ہے نزاع ہوگا کہ وہ دوسرے قول کو لینا چاہے گی اِس کا قاطع صرف قضاء قاضی ہو سکتا ہے، اور عجب نہیں کہ اسی احتمال نزاع کی بنا پر اصل مسئلہ میں بھی قضاء قاضی شرط ہو، گو میں نے منقول نہیں دیکھا، شاید تلاش سے مل جاوے لیکن اگر یہی مُفتی کو اِس قول میں شرح صدر ہو جاوے اور عامی کو بھی اس کے فتوے میں شرح صدر ہو جاوے تو افتاء اور اخذ جائز ہے"

اِس عامی کا اپنا خیال یہ تھا، اور اب بھی ہے کہ شرط عدل کے سمجھنے میں بعض فقہاء کو تسامح ہوا ہے، عدل کے معنی اِس سیاق میں، یکسانیت یا مساوات مُطلق کے نہیں، بلکہ ہر ایک کے ساتھ اِس کے

مناسب حال برتاؤ کرنے کے ہیں، ایک بیوی سن رسیدہ ہے، دوسری بالکل نو عمر، ایک بیوی کشمیر کی ہے جو ہندوستان کی گرمی نہیں برداشت کر سکتی، دوسری بیوی افریقہ کی ہے، جس سے ہندوستان کی سردی نہیں برداشت ہوتی، ایک ٹھیٹھ دیہاتن ہے، دوسری خالص شہری۔ اس قسم کی تمام صورتوں میں ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ ایک بیوی کی ضرورتیں اور دلچسپیاں دوسری سے بالکل الگ ہوں گی، اور دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جانا، مثال عدل کی نہیں، ظلم کی پیش کرے گا، ایسی حالت میں عدل یہی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اُسی کے حال و مذاق کی رعایت سے برتاؤ کیا جائے، اور نفقہ بھی یک، جانکہ اسی کلیہ کے تحت میں آ جاتا ہے، بڑی خوشی اس کی ہوئی کہ اس خیال کی تائید بحر الرائق اور ردّ المختار سے مل گئی، مولانا اس کے بعد بھی اپنی رائے پر قائم رہے، اور مسئلہ پر جو فقیہانہ موشگافیاں کیں، وہ ابھی اُوپر گذر چکیں ——— مولانا فقہیات میں نرے مقلد جامد اور محض جزئیات کے حافظ و ناقل نہ تھے، خود بھی فقیہ تھے، حق رکھتے تھے، کہ اگلے فقیہوں سے الگ ہو کر اپنی راہ نکالیں، اور بڑی بات یہ کہ کبھی کبھی اِس حق کو فرض سمجھ کر ادا بھی کر ڈالتے تھے۔

(۳۵)

مولانا تو جیسے گھر بھر کے پیر تھے، بوڑھا، بچہ کوئی بھی بیمار رہا دعا مولانا کریں، تعویذ مولانا دیں، گھر میں پیدائش ہو، میت ہو، خبر مولانا کو کی جائے، اِس طرح کے خطوط کے نمونے اُوپر گذر چکے، اب ٹھیٹھ خانگی خط اِس قسم کے سب کہاں تک نقل کئے جائیں، اِس لئے ۲۸ جنوری کے نیاز نامہ کو تو سرے جانے ہی دیجئے، اِس کے بعد کا عریضہ، میرے ذخیرہ میں محفوظ ۳ مارچ ۱۹۳۱ء (۱۱ شوال ۱۳۴۹ھ) کا ہے، جو خانگی اور پبلک حیثیتوں کا جامع ہے، اِس لئے اس کی نقل میں مضائقہ نہیں، جواب سوال ساتھ ہی ساتھ ملیں گے۔

م ۔ کل سہ پہر کو گھر میں لڑکی کی ولادت ہوئی۔

ا ۔ مبارک ہو۔

م ۔ معمولاً جتنی شدید تکلیف ہوتی تھی، اب کی نسبتہً اُس سے بہت کم رہی، کیا عجب ہے کہ

جناب کے تعویذ اور دُعاؤں کی برکت ہو،

ا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گمان کی برکت ہو۔

م۔ البتہ تعویذ جو مولود کے واسطے عطا ہوا تھا، اسے احتیاط سے رکھ لیا تھا، لیکن تلاش سے نہ ملا، اگر مکرر عنایت ہو جا تا تو زہے کرم۔

ا۔ ملفوف ہے۔

م۔ لڑکی کا نام بھی آپ ہی تجویز فرما دیں، اس کی ماں نے تھا نہ بھون ہی میں اس کا عہد کر لیا تھا مجھے ذاتی طور پر زہراء پسند ہے، اس کی ایک بہن کا نام حمیراء ہے۔

ا۔ مجھ کو بھی پسند ہے، صرف اتنی ترمیم کرتا ہوں، اگر سب کو پسند ہو کہ زہیراء صیغۂ تصغیر سے کر دیا جائے، حمیراء کا وزن بھی ہو جائے گا۔

م۔ اس طرف جناب کے رسالہ **اصلاح الخیال** کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، سُبحان اللہ، جزاک اللہ۔

ا۔ اس سے مسرت ہوئی کہ آپ کو پسند آیا۔

م۔ اس کے آخر میں جو نصیحت نامہ ہے اس کے کاتب تو مولانا محمد قاسم نانوتوی معلوم ہوتے ہیں، اور مکتوب الیہ سرسید احمد خاں، کیا یہ گمان صحیح ہے؟

ا۔ جزو ثانی صحیح ہے، جزو اول کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے مجھ کو حکم دیا تھا اس خط کے لکھنے کا، سو اس کی عبارت میری ہے۔

م۔ اگر صحیح ہے تو اب تو اس تصریح کے بھی شائع کر دینے میں کوئی امر غالباً مانع نہیں۔

ا۔ کوئی مانع نہیں، اور اُس وقت بھی کوئی مانع نہ تھا، مگر خواہ مخواہ بعض حضرات نے اُس وقت خط بھیجنے سے بھی روک دیا، حضرت نے اپنے اخلاق سے اس کو قبول کر لیا، مگر کبھی بار نہ جانے سے افسوس ظاہر فرمایا،

م۔ اجازت ہو تو اب اپنے پرچہ سچ میں اُسے شائع کر دوں؟

ا۔ کیا مضائقہ، شاید کسی کو نافع ہو۔"

حضرت کے ہزارہا مُریدوں میں سب ہی طرح کے لوگ تھے، بعض پر حیرت ہوتی تھی، کہ دلآزاری اور دل شکنی سے بچنے اور احتیاط رکھنے کا جو سبق حضرت کے ہاں کا سب سے پہلا اور مقدم درس تھا، یہ لوگ اُسی کی طرف سے غافل بلکہ اُلٹا اور اُسے پامال کرنے کو تیار رہتے ہیں، ہر شخص پر عیب چینی اور خردہ گیری کی نگاہ، اپنے اذکار و نوافل پر غرّہ، حضرت مولاناؒ کو بدنام کرنے والے حقیقۃً سب سے بڑھ کر حضرت کے مُرید اسی قبیل اور قماش کے ہوئے ہیں، ایک ایسے ہی بزرگ سے، جو لکھنؤ اور کانپور میں کُتب فروشی کرتے تھے، اور عجب نہیں کہ اب بھی زندہ سلامت ہوں، اپنا[1] بھی سابقہ پڑگیا، اور کچھ دنوں تو خیر صبر و تحمّل سے کام چلتا رہا، لیکن ادھر بھی آخر اتنی بے نفسی کہاں تھی؟ عاجز آکر ایک طویل عرضی مولانا کی خدمت میں پیش کردی، اور جواب جو مرحمت ہوا، وُہ شان حاکمانہ سے زیادہ مصلحانہ، مصالحانہ اور حکیمانہ پہلوؤں کو لئے ہوئے، پہلے مضمون استفتا تہ ملخصاً ملاحظہ ہو،

مورخہ ۱۲؍ مارچ ۱۹۳۱ء:۔

"اِس وقت ایک ذرا تکلیف دہ موضوع کی طرف توجہ سامی مبذول کرانا ہے، اور اس کے لئے قبل ہی سے دست بستہ معافی مانگے لیتا ہوں[1]،

جناب کے مریدوں میں مرزا..... صاحب لکھنوی میرے لئے عجب عذاب جان ثابت ہو رہے ہیں[2]، مجھ سے کبھی کی شناسائی نہ تھی[3]، کوئی ۲-۳ سال ہوئے ہوں گے کہ تھانہ بھون ہی میں خود بڑھ کر مجھ سے ملے، پھر لکھنؤ میں خواجہ صاحب کے ہمراہ دو ایک بار گھر پر کرم کیا، شاید سچ کے خریدار بھی ہوں (جس کا تعلق تمامتر دفتر سے ہے مجھے خبر بھی نہیں ہوتی) اب اس کے بعد سے معمول یہ ہے کہ ہر دوسرے تیسرے مہینہ میرے نام ایک دلآزار مکتوب روانہ کرتے رہتے ہیں؟ پچھلے سال میرے قدیم اور عزیز دوست ظفر الملک سیاسی تحریک کے سلسلہ میں جیل خانہ گئے مرزا صاحب کا طنز یہ خط موجود، مولانا محمد علیؒ کا انتقال ہوا، دُشمنوں تک نے ماتم کیا، خود جناب والا کا تعزیت نامہ میرے نام آیا۔"

---

[1] ۲۲ء یا ۶۳ء تھا کہ ان صاحب کے فرزند کا خط آیا، اپنے والد مرحوم کی طرف سے بڑی معذرت کی تھی۔ میں نے مرحوم کو معاف کیا۔ اللہ بھی معاف فرمائے۔

مرزا صاحب ہی ایسے جنھوں نے اِس موقع پر بھی زخم پر نمک پاشی کی، لکھا کہ "محمد علی (نام بس اسی طرح درج تھا، نہ مرحوم، نہ مولانا، نہ کچھ اور) کی وفات پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب دُنیوی تزک و حشم ہے، عاقبت بخیر گذرے، جب خوشی ہونا چاہیئے"[4] اب تازہ خط جو کل ہی صادر ہوا ہے، اور جس میں سچ پہ اِس تلخ انداز میں نکتہ چینی کی ہے، بجنسہٖ خدمت والا میں روانہ کر رہا ہوں، مضمون لغو و بیہودہ سہی، لیکن آخر ان حضرات کو اتنے کرخت لہجہ میں مجھے مخاطب کرنے کی کیا ضرورت لاحق رہا کرتی ہے؟[5] میں نے تو انھیں نہ کسی رشتہ سے اپنا بزرگ تسلیم کیا تھا نہ مُصلح و ناصح، میرا نفس بھی کچھ مُردہ تو ہے نہیں، بُری بھلی اچھی خاصی سخت تحریروں پر بھی قادر ہوں، لیکن بحمد اللہ اپنی طرف سے ابتداء نہیں کرتا، اور حتی الامکان پہلے اتمام حجت کر لیتا ہوں[6]

جناب والا کی صحبت میں رہ کر تو پہلا ہی سبق دوسروں کی رعایت جذبات کا حاصل ہوتا ہے بلکہ میں تو اِس باب میں جناب کی احتیاط و ضبط کو دوسروں کے سامنے سنداً پیش کرتا رہتا ہوں[7]، مگر یہ حضرت خدا معلوم کس قسم کے مُرید ہیں کہ روش شیخ کے بالکل برعکس اختیار کئے ہوئے ہیں[8]، سچ انھیں ناپسند ہے تو ظاہر ہے کہ فوراً بند کر سکتے اور دوسروں سے بند کرانے کی کوشش کرا سکتے ہیں[9]؛ لیکن آخر اس دلآزار روش سے کیا نفع سوچے ہوئے ہیں، بجز اس کے کہ میرے نفس میں بھی انتقام کے لئے حرکت پیدا ہو۔"[10]

مولانا ایسے مسائل کے حل کرنے کے بادشاہ تھے، اصل معروضات کا مفصّل نمبروار جواب تو حسب معمول آیا ہی، اور ایک اور مُستقل مقالچہ اس کے علاوہ! پہلے نمبروار جوابات ملاحظہ ہوں:-

(۱) جس تکلیف دہی کا اثر تخفیف دہی ہو وہ تکلیف دہی ہی نہیں، میں تو آپ کے تعلّق کو ایسا قوی سمجھتا ہوں کہ شاید معافی مانگنے سے معافی مانگنے کی ضرورت ہو۔

(۲) مگر ثواب ایمان بھی ساتھ ساتھ ہوں گے کیونکہ سبب ہیں اجر صبر کے، جیسا جُداگانہ پرچہ میں لکھا ہے۔

(۳) اچھا ہوا ورنہ زیادہ کُلفت ہوتی، جیسا نگار مدّت سے مجھ پر سخت حملہ کرتا ہے، مگر

اس ناشناسائی کی برکت ہے کہ مجھ کو پرواہ بھی نہیں ہوتی، اُس کے خاص خطی خطاب کرنے پر میں نے منھ نہیں لگایا اور راحت میں ہوں، رنج کی حقیقت ہے خلاف توقع، تو قع ہی چھوڑ دی۔

(۴) رنج کی باتیں ہیں، مگر رنج کے مصالح سے اِس رنج کا علاج کرنا جس کے تین طریقے جُداگانہ پرچہ میں لکھے ہیں، یہ ہے اپنا فعل اختیاری، اِس میں مشغول ہونا چاہیئے، دوسرے کے فعل کو جو کہ اپنے اختیار میں نہیں کیونکر روکا جاوے۔

(۵) بیشک سچ ہے، مگر یہ تو خود ان کو سمجھنا چاہیئے، اب ایک شخص نہیں سمجھتا، تو آگے تین ہی راستے ہیں، ایک صبر، دوسرا انتقام، تیسرا انتظام، سب کی تفصیل جُداگانہ پرچہ میں لکھی ہے، مُلاحظہ فرمائیں۔

(۶) یہ تو عین طریق ہے اہل طریق کا۔

(۷) یہ آپ کی محبت و حسن ظن ہے، میں کیا چیز ہوں، لیکن آپ کو جب خود احساس ہو گیا، تو مجھ کو نا مُدا احساس کرا دینا بھی جائز ہو گا، اور زاید یہ ہے کہ میں اپنے مخالفین اور موذیوں کے جذبات کی بھی رعایت کرتا ہوں کہ ان پر نیک نیتی کا بھی احتمال رکھتا ہوں، اور صبر تو ہر حال میں کرتا ہوں، احمد رضا خان کے جواب میں کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی، کافر، خبیث، ملعون سب کچھ سُنتا رہا۔

(۸) اُسی رعایت جذبات کے تحت میں یہ احتمال ہے کہ وہ اہل دین اِسی طریق کو سمجھتے ہوں اور میرے طرز کو محتاج تاویل سمجھتے ہوں۔

(۹) میں تو خود فروخت کو بند کر دیتا۔

(۱۰) حد شرعی کے اندر اجازت تو ہے"

اب وہ مُستقل ہدایت نامہ یا دستور العمل جس کا حوالہ بار بار اُوپر آ چکا ہے، ملاحظہ طلب ہے:-

"مکرمی دام لطفکم، السلام علیکم۔

عنایت نامہ نے ممنون کیا، آپ نے جو حکایت اِس میں لکھی ہے اُس نے محزون کیا، آپ کو تو زیادہ محزون ہونا چاہیئے کہ آپ اس کے مخاطب کیئے گئے ہیں، ایسے موقع پر میں جس تدبیر سے اپنے

حزن کا ازالہ کرتا ہوں، اسی تدبیر سے آپ کے ازالۂ حزن کے لئے استعمال کرنے کی کیا آپ اجازت دیں گے، استفہام کا جواب چونکہ آپ کی خصوصیت سے اثبات ہی میں متوقع ہے اس لئے بلا انتظار جواب اِس تدبیر سے کام لیتا ہوں۔

وَهُوَ هٰذَا۔ مجھ کو اِس سے زیادہ سخت مواقع پیش آتے ہیں، دو حیثیت سے، ایک الفاظ اِس سے زیادہ سخت ہوتے ہیں، ابھی ابھی ایک عنایت فرما کا خط آیا تھا اِس میں مجھے گدھا تک لکھا ہے ایسے اشخاص کی طرف سے جو اوّل مدّعی اعتقاد کے تھے، مگر مَیں ان مراقبات کو اپنا امام بناتا ہوں۔

(۱) اپنی زبان یا قلم یا قلب کو ملوث کیا، میرا کیا بگڑا، رہا رنج وہ کوئی بگاڑ نہیں، محض خیال کے تابع ہے۔

(۲) ممکن ہے کہ اس شخص کی نیّت اچھی ہو، مثلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس لئے وہ معذور ہو، گو ہم بھی اِس لئے معذور ہوں کہ ہم اپنے کو حق پر سمجھتے ہوں یا اپنی غلطی بھی نظر میں ہو مگر اصلاح کا طریق ہماری رائے میں اِس سے سہل اور اسلم ہو۔

(۳) اگر اُس نے ہم کو ناحق بھی رنج دیا تو اپنی عاقبت خراب کی، ہم کو صبر کا ثواب ملا۔

(۴) نیز ایسے واقعات سے بعض اوقات اپنی کوتاہیوں پر نظر ہو کر اصلاح کی توفیق ہو جاتی ہے، اگر یہ بھی نہ ہو تو کم از کم معتقدین کی عنایت سے جو عُجب و کبر پیدا ہو گیا تھا، یا ہو سکتا تھا اِس کا ازالہ یا انسداد ہو جاتا ہے۔

(۵) نیز خود بھی ایسے مخاطبات اپنے سے سرزد ہو جاتے ہیں، اپنی ناگواری سے اُن کی ناگواری سامنے آجاتی ہے، اور ایسے مخاطبات سے اجتناب کی توفیق ہو جاتی ہے۔

اور بہت سے اسرار و فوائد ہیں، نمونہ کے لئے یہ کافی ہے، یہ تو حقیقی تدبیر ہے زوالِ حزن کی، اور ایک طبعی تدبیر یہ ہے کہ انتقام لے لیا جائے یا جو شخص روک سکے اس کو رُکوا دیا جائے، سو اگر مجھ کو اطلاع دینے سے یہ مقصد ہے تو صریح اجازت کا انتظار ہے، اور ایک تحریر آپ کی اپنی

تحریر کے ساتھ اُن کے پاس بھیجنے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس کی بنا پر خطاب کرسکوں۔

یہ کُل تین تدبیریں ہیں اور اگر کوئی چوتھی بات میرے کرنے کی ذہن میں ہو ظاہر فرمائیے میں حدِ قدرت و حدِّ اذن شرعی کے اندر اس کے لئے حاضر ہوں۔

بقیہ اجزاء کا جواب اصل خط کے حواشی میں ہے"

(۳۶)

اِس کے بعد کا نیاز نامہ مورخہ ۳۱ مارچ گویا اسی کا تکملہ اور تتمہ ہے، مع بعض زاید و کارآمد مضامین کے ـــــ مثنوی مولانائے رومؒ سے شوق و شغف تو اُس وقت سے کوئی ۱۱، ۱۲ سال قبل ہی پیدا ہو گیا تھا، اور اس کے کانپوری ایڈیشن میں اِس پر جو لاجواب حاشیے درج ہیں (خصوصاً افادات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) اُن کی مدد سے اُلٹا سیدھا ساری کتاب کو جلدی جلدی پڑھ گیا تھا، اب ذرا کچھ تو فرصت و یکسوئی حاصل ہوئی، اور بڑی بات خود مولانا کا فیض صحبت، جی میں آیا کہ مثنوی کو مولانا کی لکھی اور لکھوائی ہوئی شرح کی مدد سے از سرِ نو پڑھ ڈالئے، کلید مثنوی، مولانا کی اس شرح کا نام ہے، اس کے بعض حصّے (دفتر ششم) تو خود مولانا کے لکھے ہوئے ہیں، اور بعض حصّوں کو مولانا کے بعض شاگردوں نے ان سے پڑھ کر بطور خود لکھ دیا ہے، شرح شبیری، اسی کلید مثنوی کا ایک جزو، بعض اور دفتروں کی طرح، مولانا کے عزیز برادر زادے مولوی شبیّر علی صاحب تھانوی کی تیار کی ہوئی شرح کا نام ہے، یہ خاص طور پر سلیس و عام فہم معلوم ہوئی ـــــ خط میں یہ ذکر بھی خاصہ آ گیا ہے، اِس کے سمجھنے کے لئے یہ تمہید ضروری تھی، اب آگے خط و جواب دونوں کو ساتھ ساتھ پڑھئے:۔

م ۔ والا نامہ ایک ہفتہ ہوا وصول ہو گیا تھا، جو کچھ ارشاد ہوا بالکل حق ہے، اب اِس وقت تو مَیں اُن صاحب کے باب میں بالکل خاموش ہو گیا ہوں، نہ اپنے پرچہ میں کچھ لکھا، نہ خط لے انھیں جواب دیا، جناب والا سے بھی کچھ عرض نہیں کرتا، جیسا مناسب خیال فرمایا جائے، اُن سے معاملہ فرمایا جائے۔

ا۔ مناسب تو یقیناً یہی ہے کہ ان پر احتساب کروں، مگر ساتھ ہی ضرورت ہے کہ ذریعۂ اطلاع کا بھی ظاہر کروں، تو اس میں آپ کی تحریر کا حوالہ بلکہ ساتھ بھیجنا ضروری ہے، اور یہ بدوں آپ کی اجازت کے ممکن نہیں، اور اجازت کی درخواست میں احتمال ہے آپ کے خلاف مذاق ہونے کا جو میرے اصول رعایت جذبات کے خلاف ہے، البتہ اگر آپ اُن کی مصلحتِ اصلاح کے لئے بدوں میری استدعا کے از خود کوئی ایسی تحریر دیدیں، پھر میں اچھی طرح اُن کے کان کھول سکتا ہوں۔

م۔ البتہ یہ بھی عرض کردوں کہ طبیعت میں سکون صرف اِس وقت ہے، ممکن ہے کہ اگر حسبِ عادت پھر چند روز کے بعد اُن کا کوئی جدید مکتوب اِسی قسم کا آگیا، تو طبیعت اُس وقت ضبط پر قادر نہ ہو۔

ا۔ تو ضبط پر مجبور رہونے کی ضرورت بھی تو نہیں بشرطیکہ حدِّ شرعی کے اندر ہو۔

م۔ ایک عشرہ سے کلید مثنوی (دفتر ششم) زیر مطالعہ ہے، کوشش کرتا ہوں کہ روز تھوڑی تھوڑی سی سمجھ کر پڑھوں، شرح مطالب کی خوبیوں کا کیا کہنا، لیکن بعض مقامات پر شرح کی عبارت زیادہ بلند ہوگئی ہے، اور بجائے خود شرح طلب ہے۔

ا۔ بیشک، مگر یہ میری قدرت سے خارج ہے، خواہ علوئے مضمون کے سبب اس کو سہل کرنا دشوار ہو خواہ اپنے محاورات کو بدلنا بوجہ خلاف عادت ہونے کے مشکل ہو۔

م۔ ہم جیسے عامیوں اور مبتدیوں کے لئے تو بعض دفتروں کی شرح شبیری بہت کارآمد ہے۔

ا۔ جو کارآمد ہو، کام اس سے شروع کیا جائے، ممکن ہے کہ مناسبت بڑھ جانے سے پھر دشواری مبدّل بہ سہولت ہو جائے۔

م۔ رات خواب میں دیکھا کہ کسی صاحب کی مجلس میں حاضر ہوں، اور اور بہت سے لوگ ہیں، صاحب مجلس ہر شخص سے بڑے اخلاق والتفات سے پیش آرہے ہیں، اور اشعار مثنوی کے مطالب بالکل صاف وسادہ الفاظ میں، لیکن بڑے دل نشیں ومؤثر انداز میں بیان فرمارہے ہیں، ہم سب لوگ محو ہیں، اتنے میں کسی نے کہا کہ یہ صاحب حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہیں، بڑی حیرت ہوئی کہ اُن کی وضع وصورت سے تو درویشی ذرا نہیں معلوم ہوتی، بالکل دُنیاداروں کے سے ہیں، خدا معلوم ہمالے

مولانا تھانوی اُن سے بیعت کیونکر ہو گئے، لیکن ہاں باتیں واقعی بڑے پتہ کی کہہ رہے ہیں۔ اور اخلاق وگفتگو ضرور عارفوں اور درویشوں کے سے ہیں، بس آنکھ کھل گئی۔

ا۔ مبارک، زیارت بھی، استفادہ بھی، حیرت بھی معرفت بھی!!

بیعت کا تعلّق ضابطہ سے، جیسا کہ ان "نقوش" کے بعض ابتدائی نمبروں میں خوب صراحت کے ساتھ گذر چکا ہے، ایک دوسرے بزرگ سے تھا، لیکن عملاً مرشد و ہادی حضرت مولانا تھانویؒ ہی تھے، علمی و اخلاقی و اصلاحی سے لے کر ذاتی و خانگی چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں نگاہ اِسی دربار کی طرف اُٹھتی تھی، اور زندگی کی ہر مُشکل کا حل یہیں سے ملتا تھا ——— ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال   مُشکل از تو حل شود بے قیل و قال

مشورے اور ہدایتیں یہیں سے برابر ہر چیز کے لئے ملتی رہتیں، عقدِ ثانی کے ناخوشگوار عواقب و نتائج کا سلسلہ چل رہا تھا، اور آپ بیتی کے تجربوں کے بعد اُن دریدہ دہن اور کم عقل آریہ اور مسیحی مناظرین پر غصّہ آ رہا تھا، جنھوں نے حضورِ انورؐ کے تعددِ ازواج پر اس حیثیت سے اعتراضات کی بوچھار کی کہ گویا دُنیا میں کئی کئی بیویاں رکھنا انتہائی خوش عیشی کے مرادف ہے! ذاتی تجربہ نے چند ہی مہینوں میں بتا دیا کہ دو بیویاں رکھنا اور پھر اُن کے درمیان بلند اور معیاری نہیں بلکہ اوسط درجہ کا بھی توازن قائم رکھنا عیش پرستی نہیں، بلکہ ایک سخت مجاہدہ ہے، جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں، خیال آخری علاج، طلاق کی طرف گیا، اور ۴ر اپریل کے عریضہ میں حضرت کو ساری روئداد غم لکھ کر مشورہ و ہدایت کا طالب ہوا، خط خاصہ مفصّل تھا، یہاں اِس کی بہت مختصر تلخیص درج ہو رہی ہے ——— اور حضرت کے وہ تکلیف دہ لکھنوی مُرید تو یاد ہی ہوں گے، ان کا تذکرہ ابھی پچھلے ہی نمبر میں تو آ چکا ہے:۔

"م۔ ش۔ مرزا.... صاحب کے خط کی نقل میں اپنے عریضہ کے دوسرے کاغذ پر حاضرِ خدمت کر رہا ہوں۔

ا۔ مَیں نے اُن کو آج ہی لکھ دیا، امید ہے کہ اب وہ خطاب نہ کریں گے، اور اگر پھر بھی جوش ہوگا، تو اُس جوش کا جو سبب ہے، پیچ کا دیکھنا وُہ اِس کو ترک کر دیں گے، اور جب دیکھنا ترک

کر دیں گے تو دیکھنے کا جو سبب ہے یعنی خریدنا وہ اس کو بھی ترک کر دیں گے" اور اس میں سلامتی ہے اور اگر وہ پھر ایسا کریں تو آپ مجھ کو اسی طریق سے اطلاع دیجئے۔

م۔ عقد ثانی کو اب چھ ماہ سے زائد ہو چکے، اس مدت میں خوب تجربے ہو لئے، انہی کے ساتھ مجھے موانست ہی پیدا ہو سکی نہ مناسبت، اور یہی حال اُدھر سے بھی ہوگا، جزئیات لکھ لکھ کر کہاں تک آپ کا وقت خراب کروں، خلاصہ یہ کہ جب یہاں ہوتی ہیں، تو دن دن بھر گذر جاتا ہے اور معمولی بات چیت کی بھی نوبت نہیں آتی، اور اب جب کہ اپنے میکے میں ہیں، خط و کتابت سے بھی بجائے شرح و انشراح کے انقباض ہی بڑھتا رہتا ہے، والدہ، جدہ اور دوسرے عزیزوں کو اُن کی ذات سے جو ناگواری ہے وہ اس کے علاوہ، صورت، سیرۃ، فہم، سلیقہ، نسب، ہر شے میری توقع سے فروتر ہی نکلی، بہت غور کے بعد یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اُن سے علیحدگی اختیار کر کے حتی الامکان اُنھیں کوئی دوسرا شوہر تلاش کر دوں، اُنھیں کوئی سزا دینا یا اُن کا دل دُکھانا ہرگز نہیں چاہتا، صرف اپنے لئے سبکدوشی حاصل کرنا مقصود ہے، جانتا ہوں کہ بلا ضرورت طلاق کوئی پسندیدہ امر نہیں، مباحات میں ابغض ہے، لیکن آخر متعدد اجل صحابہ اور خود حضور انور کے عمل سے طلاق کی مثالیں ملتی ہیں، اپنی تجویز پر عمل کرنے سے قبل جناب کے ارشاد و مشورہ سے استفادہ ضروری سمجھتا ہوں۔

ا۔ ہاں ایک پہلو تو یہ ہے، مگر اس میں ایک گہری خطرناک خرابی بھی ہے کہ اگر دوسری جگہ باہم توافق نہ ہوا، خواہ کسی جانب سے کوتاہی ہو تو آپ پر الزام آوے گا اور رحم دلی کے سبب عمر بھر اسی ضیق میں ابتلاء رہے گا کہ میں ایک بار دو مسلمان کی کلفت کا سبب بنا اور یہ ایسا ضیق ہوگا کہ اس سے نکلنا آپ کے قابو سے باہر ہوگا، کیونکہ آپ منکوحۂ غیر کو طلاق بھی نہیں دے سکتے، اس میں نظر ثانی کر لیجئے اور ساتھ ہی دوسرے پہلو کو پیش نظر رکھئے، اور پھر ایک کو ترجیح دیجئے، وہ دوسرا پہلو یہ ہے کہ طلاق کے ساتھ یہ وعدہ کر لیجئے کہ اگر تم نکاح کرنا نہ چاہو تو تم کو مثلاً ہمیشہ دیا کروں گا، اور اگر نکاح کرنا چاہو تو نکاح کرنے تک ماہوار ایک سال تک دوں گا۔

م۔ بچی کے لئے تعویذ پچھلے والا نامہ کے ساتھ وصول ہو گیا تھا، بارہا کا تجربہ ہے کہ اِدھر کسی

مرض کے لئے لکھا گیا، اُدھر قبل اس کے کہ تعویذ آئے یا دُعا ہو، مرض میں افاقہ ہو گیا، چنانچہ اب کی بھی بحمد اللہ یہی ہوا۔

ا۔ یہ آپ کے حسن ظن کی برکت ہے، ورنہ دوسری جگہوں میں تو خاص تعویذ کا بھی اثر بعض اوقات نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ آپ کے اس حسن ظن کی برکت سے میری آخرت درست کر دے۔

اپنے کو جن بزرگ سے بیعت کا تعلق ضابطہ سے تھا، اُن سے عقیدت اگرچہ اپنی جگہ پر قائم تھی، اور باوجود بار بار سخت دھکے پہنچنے کے بھی، بڑی حد تک قائم تھی، ذہن ہر مرتبہ ان کے لئے کوئی نہ کوئی تاویل کر لیتا تھا، تاہم حضرت تھانویؒ کی بھی عظمت و عقیدت دل میں کچھ کم نہ تھی، بلکہ بعض حیثیتوں سے تو کچھ بڑھی ہی تھی، اور بعض خاص موقعوں پر تو اور زیادہ بڑھ جاتی تھی، اس پر بھی ذہن میں یہ کانٹا کھٹکتا رہتا تھا کہ کہیں یہ حال اہل طریق کے ناپسندیدہ و غیر مرضی تو نہیں، بلکہ خود یہ خلش بھی کہنا چاہئے کہ حضرت ہی کی بعض تحریروں کی بنا پر پیدا ہوتی رہتی ——— پچھلے عریضہ کو بھیجے ہوئے ابھی دو ہی چار دن ہوئے تھے کہ ایک نئی تقریب اس مسئلہ میں استفتاء و استفسار کی پیدا ہو گئی ——— مولاناؒ کے اوقات کی ماموری پوری طرح ذہن میں رہتی تھی، مشغولی کا بخوبی علم رہتا تھا اس پر بھی طبیعت مراسلت و مکاتبت کے بہانے ڈھونڈتی رہتی تھی، اپریل کی ۲۵ر تھی کہ تازہ عریضہ میں اس باب میں سوالات کر ڈالے، عجب زمانہ تھا۔ خواب میں بھی حضرتؒ کی زیارت کثرت سے ہوا کرتی، اور استفادہ بھی، اس کا بھی ذکر کر دیا، اور ایک آدھ خانگی بات بھی کہہ ڈالی، اکثر خط اسی طرح کے کشکول نما تو ہوا ہی کرتے تھے۔

(۲۷)

"النور کے تازہ پرچہ کی وساطت سے العظائف کے نام سے ایک تحفۂ بے مثل وصول ہوا، سبحان اللہ وجزاک اللہ، دل سے بے اختیار دُعائیں نکلتی رہیں[1]۔

دو عبارتوں پر سوالات پیدا ہوئے ہیں، انھیں عرض کر کے مزید تشفی حاصل کرنا چاہتا ہوں:۔

صفحہ ۲۳۔ آخری سطر میں ہے کہ ان تینوں علائم کا تحقق وال علی الولایۃ نہیں، الخ اس پر دل چاہتا

ہے کہ علاماتِ ولایت و مقبولیت بھی جناب کی زبان سے سُن لوں[۲]؟

صفحہ ۱۸۔ وسطِ صفحہ میں ہے کہ ظاہر ہے کہ ایک مُعتقد و مُرید کے لئے اُس کا شیخ سب سے احب ہوتا ہے، اِس پر عرض ہے کہ کبھی کو کسی دوسرے زندہ بزرگ کے ساتھ اپنے شیخ ہی کی سی محبت ہو، تو اس کے لئے کیا ارشاد ہوگا؟

یہ سوال اِس لئے کر رہا ہوں کہ اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو بلا شائبۂ تصنّع عرض ہے کہ آپ کی محبت و عقیدت کو اپنے شیخ سے کم درجہ میں نہیں پاتا، بلکہ اگر کسی جہت سے اُنھیں ترجیح دیتا ہوں تو دوسری جہت سے جناب والا کو[۳]؟

جہاں تک خواب (بلکہ بیداری میں بھی تصوّر) کا تعلق ہے، آپ کی زیارت سے بہ کثرت مشرف ہوتا رہتا ہوں، کبھی کبھی تو بحمداللہ ہفتہ میں چار چار بار یہ شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

ابھی پرسوں شب میں دیکھا کہ تھانہ بھون کی مسجد میں حاضر ہوں، البتہ مسجد خوب عالیشان ہو گئی ہے مثل جامع مسجد دہلی کے، وقت رات کا ہے، اور غالباً نمازِ عشاء کی تیاری ہو رہی ہے، اپنے کو دیکھا کہ جہاں آپ سُنتیں پڑھتے ہیں اس مصلّی پر کھڑا ہوا، وہیں نماز پڑھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، مسجد میں روشنی کم ہے، اندھیرا سا ہے، دل میں کہتا جا رہا ہوں کہ مصلّی تو تاریک رہ نہیں سکتا، شیخ وقت کی جائے نماز ہے، ضرور از خود روشن ہو جائے گا، چنانچہ واقعۃً وہ مصلّی جگمگاتا نظر آنے لگا، اتنے میں نظر جناب پر پڑی کہ کچھ فاصلہ پر بیٹھے وضو فرما رہے ہیں، دل نے کہا کہ کہیں اِدھر دیکھ لیا تو فرمائیں گے "بڑا بے ادب و گُستاخ ہے، ساری جگہ چھوڑ خاص میرے مصلّی پر نماز پڑھنے لگا"، بس آنکھ کھُل گئی، مضائقہ نہ ہو تو اِس کی تعبیر سے بھی ایما فرما دیا جائے[۴]۔

گھر میں اللہ کے فضل سے افاقہ تو ہے[۵] لیکن دورے پڑنا ابھی موقوف نہیں ہوئے ہیں، جس وقت اختلاج کا زور ہوتا ہے، غضب کی بات ہے کہ آپ حضرات کو بھی جو کچھ منھ میں آتا ہے کہہ بیٹھتی ہیں، گو وہ معذور ہوں، لیکن سُننے سے بہرحال تکلیف تو ہوتی ہے[۶]۔

جواب کے ملاحظہ میں توقف کی حاجت نہیں:۔

(۱) "اللہ تعالیٰ آپ کی دُعاؤں سے مجھ گدائے بے نوا کا بیڑا پار فرمادے۔

(۲) بزرگوں کے کلام سے جو مُستفاد ہوتا ہے اُس کا حاصل اپنے الفاظ میں عرض ہے۔

نمبر۱۔ عقائد صحیحہ۔

نمبر۲۔ اعمال صالحہ۔

نمبر۳۔ اس کی صحبت کا طبعاً موجب رغبت آخرت و نفرت عن الدنیا ہونا۔

نمبر۴۔ اُس کی طرف خواص یعنی عُلماء و صلحاء کا رُجحان و میلان بہ نسبت عوام و امراء کے زیادہ ہونا۔

نمبر۵۔ خود اس کا اتقیاء و سالکین کے ساتھ نیازمندی اور محبت کے ساتھ پیش آنا اور شیخ ہونے کی علامات اور ہیں۔

(۳) جو مضمون اِس مقام میں ہے وہ اس شخص کے لئے بھی محفوظ ہے، بدلا نہیں، یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ احب ہونا چاہیئے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ احب ہوتا ہے یعنی عادۃً، سو اگر اس کے خلاف بھی ہو تب بھی کچھ حرج نہیں، اِس مقام پر تصوّر کے نافع ہونے کا ذکر ہے، یہ نفع اُن دوسرے بزرگ کے تصوّر سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، اور جس مسئلہ کے متعلق آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہے وہ ایک مستقل مسئلہ ہے، اِس کی مختصر تحقیق یہ ہے کہ شیخ کا احب ہونا ضروری نہیں بلکہ خاص تربیت میں اُس کی انفعیت کا اعتقاد ضروری ہے، اگر دوسرے کے ساتھ اعتقاد ہے تو پھر تربیت میں اُسی سے رجوع کرنا چاہیئے، البتہ اگر شیخ کے مکدّر ہونے کا احتمال نہ ہو تو اس سے اِذن لے لینا اسلم ہے۔

(۴) مجھ کو تعبیر سے مناسبت نہیں، اِس لئے تفصیلاً تعبیر سے معذور رہوں، اجمالاً اچھا خواب ہے چنانچہ ظاہر ہے۔

(۵) الحمدللہ۔

(۶) غلبہ میں تو بعض اللہ سُبحانہ وتعالیٰ کو کہہ بیٹھتے ہیں، مگر سامعین کو بجائے تکلیف کے اُن کہنے والوں سے عقیدت ہو گئی، سو آپ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے؟

اِس کے بعد کے دونوں خط بھی فقہ و سلوک ہی کے بعض جزئیات، لیکن اہم جزئیات پر شامل تھے، گو بہ ظاہر خانگی مسائل سے متعلق ——— اہل خانہ مولوی جمیل سے مُراد حضرت مولانا کی ربیبہ (دوسرے شوہر سے صاحبزادی) مراد ہیں پہلا خط مورخہ ۲۹ مئی :-

م۔ عزیزوں میں ایک نوجوان کی شادی ابھی چند روز ہوئے ہوئی تھی، اب بیوی شوہر کے ناکارہ ہونے کی بنا پر خلع کا مطالبہ کر رہی ہے، شوہر کو اِس دعویٰ سے قطعی انکار ہے، اب اگر دونوں اپنا بیان مؤکّد بہ حلف ایک دوسرے کے خلاف دیں تو مخاصمہ کے حل کی شرعی صورت کیا ہوگی؟

ا۔ جُداگانہ کاغذ پر مرقوم ہے، مگر یہ فیصلہ اُس وقت نافذ ہوگا جب زوجین بہ تراضی کسی کو حَکَم بنالیں، یعنی شرعی فیصلہ کے نافذ کرنے کا اختیار دیدیں، وہ حَکَم بجائے قاضی کے ہو جائے گا۔

م۔ عزیزہ اہل خانہ مولوی جمیل احمد کا اب کیا حال ہے، خدا کرے بالکل صحت ہوگئی ہو۔

ا۔ بعد معالجہ میرٹھ کے پانچ ماہ تک بالکل تندرست رہیں، بیفکری ہوگئی، مگر اس کے بعد کے دو دورے نہایت شدید پڑے جس سے وہی پہلی سی حالت ہوگئی، لیکن آج کل زیادہ اثر نہیں ہے آئندہ کا علم حق تعالیٰ کو ہے، دُعا فرمائیے صحت کا ملہ عاجلہ نصیب ہو۔"

دُوسرا مکتوب، اِسی سے ملتی، ۳ رجُون کا :-

م۔ مسئلہ کا جواب جُداگانہ پرچہ تھا، وہ شاید لفافہ میں رکھنے سے رہ گیا۔ دوبارہ زحمت دیتے ہوئے۔

ا۔ واقعی ڈاک کی کثرت سے ذہول ہوگیا، اب مُرسل ہے، سہو معاف کیجئے، خواہ مخواہ تکلیف ہوئی۔

م۔ محض تلاوت قرآن مجید میں جی نہیں لگتا۔

ا۔ اِس سے نقص اجر نہیں ہوتا اور اجر ہی مقصود ہے، یا کہ جی نہ لگنا مجاہدہ ہے جس سے اجر بڑھ جاتا ہے۔

م۔ صرف اُن تفسیروں اور دوسری کتابوں میں جی لگتا ہے، جن میں نکات قرآنی کا بیان ہوتا ہے، مثلاً آپ کی مسائل السلوک من کلام ملک الملوک وغیرہا۔

ا - چونکہ مضامین جدیدہ سمجھ میں آتے ہیں -

م - اور جہاں کسی آیت سے متعلق کوئی سوال ذہن میں آیا، بس حل کے شوق و جوش میں معاً تفسیروں کی ورق گردانی شروع کر دی، جس میں وضو بے وضو کی بھی قید نہیں -

ا - اس میں کراہت ہے، اور قرآن کو بے وضو مس کرنے میں حرمت ہے -

م - یہ اگر مرض ہے -

ا - یہ یعنی حل اشکال کے لئے بیتابی -

م - تو اس کا علاج ارشاد ہو -

ا - مرض منحصر ہے معصیت میں اور یہ معصیت نہیں، ایک طبعی تقاضا ہے "

ابھی اوپر کے ایک فقرہ میں ضمناً مولانا کی " ڈاک کی کثرت " کا ذکر آ گیا ہے، تو اس متن کی شرح مجمل بھی ذرا سنتے چلیئے، ڈاک لانے والی اصل گاڑی سہارنپور کی طرف سے، دوپہر یا ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پر پہنچتی، اور کچھ دیر بعد ڈاک کی تھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ جاتی کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے، اور اس کے بعد مولانا کی ڈاک ٹین کے چنگلے میں بہ حفاظت روانہ ہو جاتی - ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقت مقرر پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے، اور پوسٹ مین (ڈاکیہ) کے ذریعہ تقسیم کا انتظار کئے بغیر اسے لے کر چستی و مستعدی کے ساتھ حاضر خدمت ہو جاتے، حضرت کبھی تو اس وقت سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے، اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے ہوتے، ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصاً پوسٹ کارڈ ان کو اسی وقت پڑھ ڈالتے، اور ڈاک کا جواب اسی کے دو گھنٹے کے بعد، بعد ظہر کی مجلس کے لئے اٹھ رہتا، خطوط کی تعداد روزانہ ۳۰، ۳۵ سے کیا کم ہوتی، بعض دن اور زاید - پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں، بڑے لمبے چوڑے، اور فقہ، سلوک، کلام، وغیرہ کے مسائل سے متعلق + اب حضرت ہیں، اور خطوط کا یہ پشتارہ اردگرد حاضرین بزم حلقہ کئے ہوئے، خواص بھی عوام بھی، مثلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے

چھڑے ہوئے، حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں، حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ دیتے جاتے ہیں، اور ساتھ ہی خط کا جواب اُسی کے حاشیہ پر، یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سُبحان اللہ، جوابات جس طرز و انداز کے ہوتے ہیں اُس کی مثالیں تو اُوپر کے صفحات میں دو چار نہیں، بہ کثرت گذر چکیں، اللہ اللہ، دماغ کتنا حاضر پایا تھا! عموماً یہ سارے جوابات اِسی طرح قلم بر داشتہ لکھ دیئے جاتے، اور اتنے جامع محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پُورے غور و فکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے، خال خال خط ایسے بھی ہوتے، جن کو جواب کے لئے مولانا دوسروں کے حوالہ کر دیتے، یہ وہی خط ہوتے جن میں کتابوں کے حوالہ کی ضرورت ہوتی،

بار ہا ایسا بھی ہوتا کہ ابھی یہ انبار نپٹنے نہ پاتا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آجاتی؛ اور دو چار خط اُس میں بھی ہوتے! جواب کے لئے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دوسرے ہی دن نکل جائیں ——— اور یہ منظر بھی ان آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ دن ختم ہو گیا، اور حجم و ضخامت والی ڈاک ختم نہ ہو پائی، اب مولانا اِس سن و سال میں، بعد نماز مغرب وا ورادِ مغرب، لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے، بیٹھ گئے ہیں، اور رات گئے تک کام کر کے، ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی کر کے اُٹھے ہیں! ——— اِس مختصر سی تفصیل سے یہ تو بہرحال معلوم ہی ہو گیا ہو گا کہ حضرت اُس رنگ کے صُوفی صافی بالکل ہی نہ تھے، جس میں درویشی کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ انسان خلق سے بالکل کنارہ کر کے تنہا کسی جنگل میں رہنا شروع کر دے، اور انسانوں سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے!

ضمیمہ

متعلق نمبر ۳

زوج کے عنین ہونے کی صورت میں اگر عورت تفریق چاہتی تو اس کا طریقہ شرعاً یہ ہے کہ عورت قاضی کے اجلاس میں درخواست دے کہ اس کے عنین ہونے کے سبب میں اس سے علیحدگی چاہتی ہوں، (قاضی سے مُراد حاکم مُسلم ہے گو من جانب سلطنت غیر مُسلم کے مقرر ہو کذا فی دُرالمختار و ردّ المختار)

قاضی مرد سے دریافت کرے کہ اُس کا دعویٰ عنین ہونے کا صحیح ہے یا نہیں اگر وہ صحیح بتلا دے تو قاضی اُس کو علاج کے لئے ایک سال کی مُہلت دے اور اگر وہ تغلیط کرے اور کہے کہ میں اِس سے ہم بستر ہوا ہوں تو اگر وہ نکاح کے وقت باکرہ تھی یعنی باکرہ ہونے کی حالت میں اس کا نکاح ہوا تھا، تو اب ایک یا دو مُعتبر ماہر عورتوں کو دکھلایا جاوے گا کہ اب وہ باکرہ ہے یا ثیبہ، اگر وہ باکرہ بتلا دیں تو عورت کو راست گو سمجھ کر مرد کو علاج کے لئے اِس صورت میں بھی مُہلت دی جائے گی اور اگر وہ ثیبہ بتلا دیں یا کہ نکاح ہی ثیبہ سے ہوا تھا تو اِس صورت میں مرد سے حلف لیا جاوے گا کہ میں اُس سے ہم بستر ہوا ہوں اگر وہ اس پر حلف کرے تو عورت کا دعویٰ خارج ہو جاوے گا اور اگر اس حلف سے انکار کرے تو پھر عورت کا دعویٰ صحیح قرار دے کر مرد کو علاج کے لئے ایک سال کی مُہلت دی جاوے گی اور جن صورتوں میں ایک سال کی مہلت ملی ہے اِس ایک سال گذرنے کے بعد اگر سکوت کرے تو حاکم دست اندازی نہ کرے گا اور اگر عورت پھر درخواست دے کہ یہ اب تک بھی ہم بستر نہیں ہوا تو قاضی پھر مرد سے دریافت کرے گا اگر وُہ اِس دعویٰ کو صحیح مانے تو عورت کو کہا جاوے گا کہ اب تم کو اختیار دیا جاتا ہے خواہ اِس کے ساتھ اسی حالت میں رہو یا تفریق کو اسی مجلس میں یعنی اجلاس برخاست ہونے سے پہلے اختیار کرو اگر وہ تفریق کو اختیار کرے تو اُس وقت قاضی مرد سے کہے کہ اِس کو طلاق دیدو، اگر وہ طلاق نہ دے تو قاضی زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں میں تفریق کر دی بس اِس سے بھی طلاق بائن واقع ہو گی اور اِس میں پُورا مہر اور عدّت سب لازم ہے لصحۃ خلوۃ مع العنۃ اور اگر مجلس میں اس نے تفریق کو اختیار نہ کیا تو پھر اختیار عورت کا باطل ہو جاوے گا اور اگر اس دریافت کرنے پر وہ مرد اِس عورت کی تکذیب کرے یعنی دعویٰ ہم بستری کا کرے تو پھر اس میں وہی تفصیل مذکور ہے کہ اگر وُہ نکاح کے وقت باکرہ تھی تو اب ایک یا دو معتبر عورتوں کو دکھلایا جاوے گا اگر وُہ اب بھی باکرہ بتلا دیں تو اُس عورت کا قول صحیح قرار دے کر مثل بالا اس کو اختیار تفریق کا دیا جاویگا اور مہر و عدّت لازم ہو گی اور بصورت اِس کے تفریق کو اختیار کرنے کے قاضی تفریق کر دے گا

اور اگر وہ ثیبہ بتلاویں یا کہ وہ نکاح کے وقت ہی ثیبہ تھی تو مرد اگر اپنے قول پر حلف کر لے تو عورت کا دعویٰ خارج ہو جاوے گا اور اگر حلف سے انکار کرے تو پھر دعویٰ عورت کا صحیح قرار دے کر اس کو تفریق کا اختیار دیا جاوے گا مع لزوم مہر و عدت اور یہ تمام تفصیل درمختار و ردالمختار میں ہے۔

(نوٹ) ایک مسلمان جنٹ کے اجلاس میں اس کا ایک مقدمہ تھا اُن کے پوچھنے پر یہ جواب لکھا تھا اِس لئے اس کی عبارت بہت صاف ہے،

بعض ذاتی حالات کا ابتلاء بھی عجب سبب رحمت بن گیا، اور اسی کے ضمن میں حضرت سے مسائل کی خوب خوب تحقیق ہو گئی + اور بعض، کیا معنی، حکمت الٰہی تو بلا استثناء ہر ابتلاء کے عقب میں ہوتی ہی ہے + یوں کہیے کہ بعض حالات ابتلاء کے ضمن میں یہ حکمت الٰہی اپنے مشاہدہ میں بھی آگئی، اور شاعر کی بات پوری ہو کر رہی، کہ ؎

اِسی تقریب اُس گلی میں رہے منتیں ہیں شکستہ پائی کی!

ذیل کے دو خطوں کے فقہی مسائل اسی صورت حال کا نتیجہ ہے، اور دوسرے مسائل کی اہمیت بجائے خود ظاہر و روشن ہے، پہلا عریضہ ۱۲ رجون ۱۳ء کا ہے:-

م- زوجۂ مطلقہ سے متعلق یہ بہ تصریح تو قرآن مجید ہی میں موجود ہے کہ زمانۂ عدت میں اُنھیں گھر سے نہ نکالو، نہ وہ خود نکلیں، لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ بیوی اپنے میکے ہی میں تھی، جب اسے طلاق ملی، تو کیا اِس صورت میں بھی شوہر اُسے زمانۂ عدت کے لئے بُلا کر اپنے گھر میں رکھے؟

ا- اصلی قانون یہی ہے، لیکن ضرورت کے وقت اِس میں تبدل بھی ممکن ہے، اب وہ ضرورت دیکھنے کے قابل ہے، دلیل الاوّل ما فی الهدایة- لو زارت اهلها وطلقها زوجها كان عليها ان تعود الیٰ منزلها فتعتد فيه. ودليل الثانی ما فی العناية، إلّا اذا اضطرت نحو ان خافت سقوط او دیار فيه علی نفسها و مالها او اخرجها اهل المنزل بان كانت تسكن بكراء او كان زوجها غائباً ولا يقدر علی الاجرة-

م- درآنحالیکہ عورت کو زیادہ آسایش اپنے میکے ہی میں ہے، اور شوہر کے گھر آکر اپنے میں

مزید مفاسد کا اندیشہ ہے۔

ا۔ مفاسد کا اندیشہ اگر وہ مفاسد معتد بہا ہوں عذر ہے۔

م۔ اگر شوہر ہی کے ہاں عدت گذارنا ہر صورت میں لازم ہو، تو آیا یہ درست ہوگا، کہ مفاسد سے بچنے کے لئے، شوہر بجائے اپنے ذاتی گھر کے اپنے کسی عزیز (مثلاً بھائی) کے مکان میں رکھ دے اور نفقہ بہر صورت خود ہی دیتا رہے۔

ا۔ یہ گھر شوہر کا گھر نہ ہوا۔ جب شوہر کے گھر میں رہنے سے اندیشہ ہے تو بھائی کا گھر اور عورت کا میکا برابر ہے۔

م۔ زحمت جناب کو اس لئے دے رہا ہوں کہ میری نظر سے یہ جزئیات فقہ کی کسی کتاب میں گذرے نہیں۔

ا۔ بلکہ رحمت دے رہے ہیں کہ بیان حکم کا اجر ملا۔

دوسرے عریضہ پر تاریخ ۱۲ رجولائی ۱۳۱ئہ کی درج ہے:۔

م۔ گمراہ فرقوں کے بعض افراد کے متعلق ایک سوال دل کو بیچین کئے ہوئے ہے، بعض شیعہ حضرات ایسے دیکھنے میں آئے، جو دیکھنے میں ہر طرح عبادت گذار بلکہ متقی و خاشع ہیں، اسی طرح ایک قادیانی کو جانتا ہوں، جو اونچے سرکاری عہدہ دار ہونے کے باوجود نماز و تلاوت قرآن کے گرویدہ عاشق ہیں، اور گھنٹوں قال اللہ و قال الرسول کے مذاکرہ میں رہا کرتے ہیں، جب میں حج کو روانہ ہونے لگا، تو مجھ سے بڑے الحاح سے کہا کہ وہاں میرے حق میں دعا ضرور کیجئے گا، اگر میں گمراہی میں مبتلا ہوں تو حق تعالیٰ مجھے اس سے نجات دے، سوال یہ ہے کہ ایسے اشخاص کا شرح صدر عقاید حقہ صحیحہ کے لئے کیوں نہیں ہو جاتا؟ اور کیا ان کا حشر بھی اہل عناد و اہل استکبار ہی کا سا ہوگا؟

ا۔ سوال کا حاصل یہ ہے کہ باوجود کوشش طلب حق کے حق کیوں نہیں واضح ہوتا، اور اگر اس حالت میں بھی حق واضح نہ ہو تو ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، سو یہ سوال گو نازک ہے مگر جواب اس کا بھی ہے، لیکن جواب کا موقع اُس وقت ہے جب یہ واقعہ اول ثابت ہو جائے کہ طلب حق کی

کوشش کی گئی ہے، اگر کوئی بیمار ہو تو اُس کے علاج کی کوشش صرف یہ نہیں ہے کہ تمنا اور دُعا پر اکتفاء کرے، کوشش یہ ہے کہ اطباء سے ملے، روپیہ خرچ کرے، اِس کا اندازہ کرے کہ کون طبیب حاذق ہے، اِسی طرح یہاں ایسے شخص کو علماء فریقین سے ملنا چاہیئے، دونوں سے تحقیقات کرکے پھر اندازہ کرنا چاہیئے کہ کون سی بات جی کو لگتی ہے اور ہر وقت اُسی دُھن میں رہنا چاہیئے، اگر مل نہ سکے تو مکاتبت رکھے، ایک تقریر کا جواب دوسرے سے لینا چاہیئے، اور دُعا بھی چاہیئے، خصوص اگر اس شخص نے اپنا پہلا مذہب چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا ہو، تو اس سے یہ بھی سوال ہوگا کہ جب تم کو اِس جدید مذہب میں شرح صدر نہ تھا تو اِس کو اختیار کیوں کیا، اِس سابق ہی پر قائم رہ کر بہ طریق مذکور جستجو حق کی کرنا چاہیئے، جب یہ مرحلہ طے کرلے تب اِس سوال کا حق ہے۔

م۔ زوجۂ مطلقہ اگر غصہ میں آکر مہر بلکہ نفقۂ عدت کی بھی رقم لینے سے انکار کردے اور اِس طرح کے الفاظ کہے کہ "مہر نہ معاف کروں گی نہ اِس کا روپیہ لوں گی، یہ روپیہ آپ ہی کو مبارک رہے" تو ایسی صورت میں شوہر کیا کرے؟

مہر اور نفقہ کی رقم خود یا کسی ثقہ عورت یا مرد کے واسطہ سے مطلقہ کے روبرو رکھ کر کہلا دے کہ فلاں شخص نے یہ رقم مہر اور نفقہ کی دی ہے، اور دے کر فوراً وہاں سے علیحدہ ہو جاوے، بس جب وہ قبضہ پر قادر ہوگئی اور دینے والے نے سب موانع مرتفع کردیئے، شرعاً ادا ہوگئی، خواہ وہ قبضہ کرے یا نہ کرے۔

م۔ ابھی خواجہ صاحب کی مناجات فریادِ مجذوب موصول ہوئی، ماشاء اللہ بہت خوب ہے، خاص کر آخر کے بعض اشعار حمد، لیکن سوچ یہ رہا ہوں کہ داد کس کو دوں، آیا بجلی کے جگمگاتے ہوئے قمقمہ کو، یا اُس مخفی خزانہ کو جس نے ایک معمولی تار کو اتنا منور کر رکھا ہے۔

ا۔ مثل سوال سابق کے یہاں بھی اوّل یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ جس کو خزانہ سمجھا ہے وہ خزانہ ہے بھی، اُس وقت اِس سوال کا موقع ہے، اور جب تک یہ ثابت نہ ہو "خزانہ کنزاً مخفیاً کو سمجھ کر اور مظہر اس تار قمقمہ کو سمجھ کر حسب تفاوت مراتب داد دینا چاہیئے"

"یہ خواجہ صاحب" کی تلمیح تو سمجھ میں آ ہی گئی ہوگی، مُراد خواجہ عزیز الحسن غوری بی، اے (علیگ) سے ہے، مجذوب تخلص مولانا ہی کا عطا کیا ہوا تھا، واقعۃً بھی کچھ نیم مجذوب سے تھے، مولانا کے خلیفۂ مجاز تو تھے ہی، مولانا کے عاشقوں کے بھی سرگروہ تھے، چہرہ بڑا نُورانی، قلب نُورانیت میں شاید اس سے بھی بڑھ کر، مدّتوں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز رہے، آخر میں اس سے بھی بڑے عُہدہ ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز پر فائز رہے، خط میں عرض یہ کیا گیا تھا کہ عارفانہ مضامین نظم کی داد انھیں دی جائے، یا اُن کے شیخ طریق، سرچشمۂ مضامین و معارف کو؟ جواب شاعرانہ انکسار اور عارفانہ حقیقت آموزی کے ساتھ یہ ملا کر میرا سرچشمۂ معرفت ہونا ہی کہاں سے ثابت ہے، کنزاً مخفیاً سے اشارہ صُوفیوں کی مشہور حدیث قُدسی کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً الخ کی جانب ہے، اور ارشاد یہ ہوا کہ بجلی کا "خزانہ مخفی" اُسی حقیقی کنز مخفی کو سمجھو!

کوئی کوئی خط بالکل اپنا کچّا چٹھا ہوتا تھا، آج انھیں نقل کرتے وقت حیرت سی ہوتی ہے، کہ اُس وقت حضرت کی خدمت میں سب کچھ کہہ ڈالنے کی جرأت اللہ نے کہاں سے دیدی تھی، ذیل کا معروضہ اور اُس کا جواب دونوں اس اعتبار سے بڑے سبق آموز ہیں، خط تو حسب معمول ملخصاً نقل ہوگا، اور جواب پورے کا پورا خط پر تاریخ ۹ اگست کی ہے:۔

"کبر کی مذمّت اور اس کا علاج تو جناب کی تصانیف اور مواعظ میں جابجا کثرت سے ملا، لیکن کبر کی حقیقت کبھی نظر سے گذرنا یاد نہیں پڑتی(۱)"

ایک عجیب مرض میں مُبتلا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میری ہی طرح بیشمار اور بندگانِ خدا بھی اس میں مُبتلا ہیں، وہ یہ کہ غلطی کو غلطی سمجھ لینے کے باوجود بھی طبیعت اُس کے پُورے تدارک پر آمادہ نہیں ہوتی، حقوق العباد میں تو اس کا تجربہ ہر روز ہوتا رہتا ہے، مُلازم پر بیجا سختی بارہا کر گذرا ہوں، کچھ دیر بعد نادم ہوا، سمجھا کہ بُرا کیا، اپنے اُوپر نفرین کی، آیندہ کے لئے احتیاط کا بھی دل میں عہد کیا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ اُسے خوش کرنے کے لئے کچھ دے دلا دیا، اللہ کے سامنے توبہ و استغفار بھی کر لیا، لیکن یہ کبھی نہ ہوا کہ خود اس مُلازم سے اپنے قصور کی معافی چاہ لیتا، اور ایک ملازم ہی غریب پر کیا

موقوف ہے، عزیزوں دوستوں سے بھی معافی چاہتے، طبیعت رُک جاتی ہے، حد یہ ہے کہ خود والدۂ ماجدہ سے صراحت کے ساتھ معافی چاہنے کی توفیق نہ ہوئی، حالانکہ خُدا جانے کتنے قصور اُن کے کر چکا ہوں اور آج تک کرتا آرہا ہوں۔

عقلاً بھی کوئی امر اس میں مانع نہیں پاتا، بس ایک نفس ہی اس پر آمادہ نہیں ہوتا، دوسروں کو اس کے منافع وفضائل بتادوں، دوسروں کو ترغیب دے کر اس پر آمادہ کر دوں، بس اپنے ہی کو عمل کی توفیق نہیں ہوتی، یہ آخر کیا ہے؟ نفس کا کبر ہے یا کچھ اور؟ والدۂ ماجدہ کے مقابلہ میں تو ظاہر ہے کہ ادنیٰ تخیّل بھی اپنی بڑائی کا نہیں رکھتا، اُن کی فرمانبرداری اپنے لئے انتہائی سعادت سمجھتا ہوں، اس پر بھی یہ کیا شامت ہے کہ عملاً اُن کے آگے نہیں جھکا جاتا، اپنی لڑکیوں پر تاکید رکھتا ہوں کہ برابر اُن کی خدمت کرتی رہیں، لیکن جب خود اُن کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں تو یہ نہیں ہوتا کہ اُن کے پیر دابنے لگوں یا پنکھا جھلنے لگوں، اُلٹے وہ خود ہی میرے پنکھا جھلنا شروع کرتی ہیں، دل میں خفیف ہو کر اُنھیں روکتا ہوں، جب بھی وُہ نہیں مانتیں، اکثر یہ اُلجھن رہتی ہے کہ آخر میرا انجام کیا ہوتا ہے، اللہ کے ہاں محض جاننا یا دوسروں کو بتا دینا کیا کام آئے گا، خود ان سطور کی تحریر کے وقت استحضار آخرت سے آنسو بہہ رہے ہیں، لیکن عمل کا معاملہ جُوں کا تُوں[2]۔

امراضِ نفس پر متفرق طور پر تو جناب نے بہت کچھ تحریر فرما دیا ہے، جی چاہتا ہے کہ احیاء علوم الدین کے جزء مُہلکات کی طرح آپ کے قلم سے اس مُبحث پر کوئی مُستقل کتاب ہوتی[3]۔

گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں کہتی ہیں کہ تھانہ بھون کے قیام کے بعد سے حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کا تصوّر اکثر غالب رہتا ہے، خواب میں بھی دو ایک بار زیارت ہو چکی ہے[4]۔

یہ حافظ صاحبؒ مولانا کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے رفیق اور پیر بھائی تھے، ہنگامۂ ۱۸۵۷ء میں بندوق کی گولی سے شہید ہوئے، تھانہ بھون ہی میں مدفون ہیں، مولانا کے مواعظ میں ان کا ذکر کثرت سے ملے گا، روزانہ ـــــــ مجلسوں میں بھی اکثر اُن کا ذکرِ خیر رہتا۔

جواب حسب معمول نمبر وار ملاحظہ ہو:۔

(۱) "ممکن ہے نہ لکھی ہو، اگر یہ صحیح ہے تو وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ حقیقت اس کی ظاہر ہے کہ اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھنا ہے، آگے اس میں دو درجے ہیں، ایک بلا اختیار خیال بڑائی کا آنا، اور ایک باختیار ایسا خیال کرنا، پھر اوّل میں دو درجے ہیں، اس خیال کے مقتضا پر عمل نہ کرنا، پس یہ تو بالکل مذموم نہیں، دوسرا عمل کرنا یہ مذموم و معصیت ہے، اسی طرح قصداً بڑا سمجھنا بھی علی الاطلاق مذموم ہے گو اس کے مقتضا پر عمل بھی نہ ہو۔

(۲) آپ نے جس غلطی میں ابتلاء عام لکھا ہے، صحیح ہے، مگر اس میں قدرے تفصیل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے، کہ بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ سے معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہوکر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شرمندہ ہوگا، اور یہ اُس وقت تک عذر ہے جب تک اُس سے تعلق رکھنا چاہیں، ان صورتوں میں تو صرف اس کا خوش کردینا امید ہے کہ قائم مقام معافی کے ہوجائے گا، اور بعض اوقات اس سے تعلق ہی رکھنا نہیں جیسے ملازم کو موقوف کردیا، یا وہ خود چھوڑ کر جانے لگا، اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہوجانے کی صورت میں اُس سے صریح معافی مانگی جاوے کیونکہ یہاں دونوں عذر نہیں، اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور کبر ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضاء پر عمل تو ہوا، تو غایت سے غایت کبر اعتقادی نہ ہوگا مگر کبر عملی ضرور رہی ہے، اور اگر کوئی کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، تو اگر کبر کا گناہ نہ ہوا ظلم کا تو ہوا، میرے خیال میں خط کے سب شقوں کا جواب اس میں فیصلہ آچکا، اگر انطباق میں کچھ تردّد رہے، پھر تحریر فرمائیں۔

(۳) حضرت اب نہ دل ہے نہ دماغ، ہر چیز میں طبیعت اختصار کو ڈھونڈھتی ہے، خصوص جب کہ حضرت امام غزالیؒ کبر پر بحث کرچکے ہیں، مجھ کو پہلے سے یہ خیال آتا تو میں اُسی کا حوالہ دے دیتا، اتنا بھی نہ لکھتا۔

(۴) مجھ کو اس باب میں بہت تنگی ہے، مَیں مُشکل سے کسی تصوّر یا کسی خواب کو کسی باطنی سبب سے مُسبّب سمجھتا ہوں، یہ تصرفات اکثر متخیلہ کے ہوتے ہیں، لیکن احتمالاً اگر یہ کبھی باطنی سبب سے مسبّب ہے، تو وُہ سب رُوحانی مناسبت ہے، جس کی کُنہ معلوم ہونا ضروری نہیں، البتہ نتیجہ اس کا خاص فیض و برکات کا حاصل ہوتا ہے، اَللّٰھُمَّ ارْزُقْھا۔

حضرت کے ہاں خواب، کشف وغیرہ کی ایسی ہی بے وقعتی تھی، حالانکہ دوسرے آستانے ان ہی چیزوں کو گویا اصل مقصود بنائے ہوئے ہیں!

یہ مکتوب گرامی محض میرے عریضہ کا جواب ہی نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی شامل تھا ——— بالکل خانگی معاملے اب پھر شروع ہوتے ہیں ——— جن صاحبہ کو میں نے آخری علاج کے طور پر (نہ کہ بہ طور سزا یا انتقام کے) طلاق دیدی تھی، اور طلاق نامہ ٹھنڈے اور نرم الفاظ میں لکھ بھیجا تھا، اور بحمد اللہ ادائے مہر و نفقۂ واجبہ وغیرہ سے زائد ہی کا انتظام ہنسی خوشی کر لیا تھا، اُن بیچاری کی طرف سے اُن کے بعض نافہم عزیزوں کی لکھی ہوئی، ایک بڑی لمبی تحریر حضرت کے پاس پہونچی، جس میں اس سیہ کار پر اتہام ہی اتہام تھے، اب سُنیئے کہ حضرت نے اس تحریر سے کیا اثر لیا، اور اُس کے اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا ——— اور یہی بات تو دُنیا کے بتانے کی ہے۔

لفافہ کے اندر سے اب کی ایک چھوٹا سا الگ پرچہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا، علاوہ اُس اتہام نامہ کے جو مولانا کے پاس بھیجا گیا تھا، برآمد ہوا، پُرزہ کا عنوان تھا "جسارت" پوری نقل ملاحظہ ہو:

"جسارت"

اگر خلافِ مذاق ہو معاف فرمائیں، مَیں جو دُوسرا پرچہ رکھتا ہوں نیّت اِس میں حاجت مندی کی حاجت پہونچانے کی ہے، اُس کو کسی مناسب شکل میں پُورا کرنا یہ اپنی مصلحت پر ہے، اِس کو جسارت اس لئے کہا کہ شاید واقعۂ تفریق کا مجھ پر ظاہر ہونا گراں ہو، لیکن اگر مجھ پر ظاہر نہ ہوتا تب تو کبھی آپ سے بھی نہ پوچھتا، اِس گرانی کے احتمال کی رعایت کرتا، لیکن ظاہر ہونے کے بعد اب یہ مجھ پر گراں ہے

مجھ پر ظاہر ہو جانا آپ پر ظاہر نہ ہو، یہ حقوقِ تعلقات کے خلاف ہے، مگر اس اوّل احتمال میں اس کو جسارت سمجھتا ہوں اور عذرِ مذکور کے سبب قابلِ معافی سمجھتا ہوں، اس وجہ کا میں نے کچھ جواب نہیں دیا، کیونکہ ممکن ہے آپ کی مصلحت کے خلاف ہوتا، میں اس سے زیادہ دخل دینا نہیں چاہتا کہ افتراق کی صورت میں اگر اُن کے گذارہ کے لئے کچھ مقرر کرنا سہل ہو دریغ نہ کیا جائے، اور ان کو تسلی کے ساتھ اطلاع بھی دیدی جائے، آیندہ جو مصلحت ہو"

یہ تھا اُن بزرگ کا اندازِ تحریر اپنے ہر طرح کے ایک خورد کے نام! کتنے مختلف اور کیسے کیسے باریک پہلوؤں کی رعایت! یہی ادائیں تو تھیں، جنھوں نے حکیم الامت کو حکیم الامت بنا دیا تھا، محض رسمی درویشوں کے ہاں، خالی ذاکروں شاغلوں کے ہاں کہیں بھی، یہ حقائق ملیں گے؟ ؎

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور تم سے جہاں میں لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

اس کے بعد کا مکتوب، اگست کا ہے، اسی درمیان میں ایک اور واسطہ سے خبر ملی، کہ حضرت کی چھوٹی بیوی صاحبہ اپنی صاحبزادی (یعنی حضرت کی ربیبہ) کا علاج کرانے لکھنؤ تشریف لائی تھیں، بڑی حسرت ہوئی، اطلاع ذرا قبل سے ہو جاتی، تو میرے گھر میں اُن سے ملنے لکھنؤ ضرور چلی جاتیں، انھیں تھانہ بھون کے قیام میں اُن سے اچھی خاصی نیاز مندی حاصل ہو چکی تھی، اب کی عریضہ میں اس کا ذکر بھی بصورتِ شکایت ناگزیر سا تھا، اور اب کی نیاز نامہ ایک پہلو سے شکایت نامہ تھا، ملاحظہ ہو:-

"والا نامہ نے سرفراز کیا، کبر کی شکایت کا مجمل بیان بھی حسبِ معمول جامع و مانع ثابت ہوا، اور میرے سوالات کے حل کے لئے کافی، جزاک اللہ

زوجۂ مطلّقہ کی طرف سے جو خط جناب کی خدمت میں پہنچا، اس پر کیا عرض کروں، حیف ہے کہ لوگ بزرگوں کی خدمت میں اپنا دردِ دل کہتے وقت بھی بڑی سی بڑی غلط بیانیوں اور مکر و تلبیس سے ذرا نہیں چوکتے، جواب میں میرا کچھ عرض کرنا بلا ضرورت بھی ہے، اور جناب کے وقتِ عزیز کے لئے خواہ مخواہ باعثِ تضییع ...... اب فقہی مسئلہ یہ ارشاد ہو کہ مطلقہ کی طرف سے بصورتِ انکار رقمِ مہر

نفقہ کی بابت شوہر کب تک انتظار کرتا رہے، آیا ختم عدّت تک یا اس کے بعد بھی[2]؟

ایک صاحب سے بالواسطہ یہ روایت پہنچی کہ رشیدہ سلمہا کی والدہ ماجدہ انھیں بہ غرض علاج لے کر حال میں لکھنؤ آئی ہوئی تھیں، اور کچھ عرصہ تک قیام پذیر رہیں، یہ اگر صحیح ہے تو غالباً مجھے نیازمندانہ شکایت کا حق پہنچتا ہے، اگر اس کی خبر ذرا قبل سے مل جاتی تو گھر میں لکھنؤ جا کر موصوفہ سے ضرور مل آتیں، لکھنؤ برابر آمد و رفت رہا ہی کرتی ہے، ایسے موقعے ہر روز کہاں نصیب ہوتے ہیں[3]؟

جواب آیا، اور ان ہی "خشک" مولانا تھانوی کا آیا:۔

(۱) آپ کو پسند آئی اس سے مسرور ہوا۔

(۲) جو رقم شرعاً واجب ہے وہ بدوں معاف کئے معاف تو ہو نہیں سکتی، تو اس صورت میں دینا ضروری ہوگا، لیکن جب وہ نہیں لیتیں تو کیا صورت ادائی ہو، وہ صورت یہ ہے کہ رقم واجب کسی کے ذریعہ ان کے روبرو اس طرح رکھ دی جائے، کہ اس پر قبضہ کرنا ان کو ممکن ہو اور رکھ کر وہاں سے جدا ہو جائیں، شرعاً وہ ادا ہو جائے گی، پھر اگر نہ اٹھایا اور وہ ضایع ہوگئی تو ان کی ضایع ہوگی، اس سے شرعی برأت تو ہوگئی، باقی قانونی سو وکلاء سے مشورہ لے لیا جائے۔

(۳) میں تو اس شکایت کو نازمندانہ قرار دے کر محظوظ ہوں، واقعی میرا ذہن اس طرف اس لئے نہیں گیا کہ دریاآباد اور لکھنؤ کا فاصلہ مجھ کو معلوم نہ تھا، وہ ابھی لکھنؤ سے نہیں آئیں، خواجہ صاحب سے مدّتِ قیام پوچھ کر حال معلوم ہو سکتا ہے۔ اگر گھر میں تکلیف فرما کر مل لیں گی تو ملیں گی وہ اور مسرور رہوں گا میں"۔

اس آخری فقرہ کی لطافت کیا اُردو کے نامور شاعر و ادیب غالب کے لطیف فقروں سے کچھ کم ہے؟

اسی مکتوب کے ساتھ خواجہ صاحب کا پتہ بھی ایک لفافہ پر حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا، موصول ہوا۔ خواجہ صاحب سے یوں بھی تعلّقات قائم تھے، اُسی وقت اُن کے نام لکھنؤ خط بھیجا، مجذوب آخر مجذوب تھے، دِن پر دن گذر گئے، اور خط کا جواب نہ آیا، ستمبر کی کوئی تاریخ تھی، جب

مولانا کو اس ظلم کی شکایت لکھنی پڑی، جواب کارڈ پر حسب ذیل آیا :-

"خواجہ صاحب کی تاخیر جواب اخلاقی غلطی ہے لیکن اس سے کوئی مضرت نہیں ہوئی، اس لئے کہ میں نے جناب کو اُن کے لکھنؤ ہونے کی اطلاع دی تھی، اسی کے متصل بعد اُن کا خط کانپور سے آ گیا تھا کہ سب کانپور آ گئے، اگر خواجہ صاحب فوراً ہی جواب دیتے، تب بھی آپ کے پاس ایسے وقت پہنچتا کہ وہ لکھنؤ نہ ہوتیں اور غالباً اسی نتیجہ کے خیال سے اُنھوں نے جواب میں عجلت ضروری نہ سمجھی ہو، بہرحال بہ قول جناب کے ظلم ضرور ہوا، مگر اس ظلم کا گناہ کسی کو نہیں ہوا، سب معذور تھے، اللہ تعالیٰ خیریت رکھے اور آپ دونوں صاحب ہم لوگوں کو ملاقات سے مسرور فرما کر اَحْسِنْ اِلیٰ مَا اَسَاءَ کا اجر حاصل کریں، ہم کو بھی فخر کا موقع ملے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے ایسے احباب دیئے ہیں کہ کوتاہیوں کے عوض میں کرم کرتے ہیں، عزیزہ دوائیں استعمال کر رہی ہیں، قلب و دماغ پر اچھا اثر بتلاتی ہیں، جس سے امید شفا ہے، خواجہ صاحب مجذوب ہیں معذور ہیں"

اس سے بہتر، اس سے زیادہ شگفتہ، اس سے زیادہ حکیمانہ کوئی معذرت نامہ ہو سکتا تھا؟

——— بار بار عرض کیا جا چکا ہے، اور ایک بار پھر بے ساختہ عرض ہے، کہ حضرت کے ولی اللہ ہونے کی شہادت تو کوئی ولی اللہ ہی دے سکتا ہے، یہاں تو حضرت کی روزمرہ کی معاشرتی، ذاتی، زندگی ہی پر دل فدا ہوتا رہا!

(۴۰)

سچ (ہفتہ وار) لکھنؤ سے اپنی ادارت میں کئی سال سے نکل رہا تھا۔ براہ راست سیاسی مضامین بہت کم ہوتے۔ مضامین عموماً علمی اور سب سے زیادہ کلامی رنگ کے ہوا کرتے۔ لوگ خصوصاً انگریزی خوان نوجوان، مذہبی عنوانات، پردہ، سود، تعدّدِ ازواج، وغیرہ سے متعلق اپنے شبہات و سوالات لکھ لکھ کر بھیجا کرتے، اور ان کے جوابات نکلتے رہتے، مسئلہ جبر و اختیار علم کلام میں ہمیشہ سے بڑا معرکۃ الآرا چلا آ رہا ہے۔ اس پر بھی کئی بار سوالات آ چکے تھے۔ آخر اس پر ایک بار، ایک میڈیکل کالج کے طالب علم کے استفسار کے جواب میں ایک طویل مضمون ذرا

نئے عنوان سے سپرد قلم کیا، لکھنے والے بہت کچھ اس پر لکھ گئے ہیں، لیکن حق تعالیٰ کی دین کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اپنے کو چھپنے کے بعد ایسا نظر آیا کہ شاید انگریزی خوانوں کے حق میں یہ خاص طور سے مفید اور شبہات کا قاطع ہو۔ پھر بعد کو خیال آیا کہ حضرت کی نظر اصلاح اگر اس پر ہو جائے تو کیا کہنا۔ خود اس مضمون کی تحریر بھی بہت کچھ مولانا ہی کے افادات قلم کی ممنون تھی، تاہم اپنے کسی مضمون کو مولانا کی خدمت میں پیش کرنے کی ہمت مشکل ہی سے ہوتی تھی، اس خاص مضمون کو، کئی دن کے حیص بیص کے بعد، بالآخر روانہ کر ہی دیا، دل میں یہ خیال آتا رہا ؎

بنمائے بہ صاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نہ تواں گشت بہ تصدیق خرے چند!

جواب تنقیدی رنگ کا آیا۔ پورا شرح صدر اس سے ہوا یا نہیں، یہ الگ سوال ہے، بہرحال بصیرت تو بہت کچھ ہو ہی گئی۔ اصل مضمون تو ضمیمہ میں درج ملے گا، یہاں عریضہ مورخہ ۱۱ستمبر مع جواب حاضر ہے:-

م- اپنی ایک ناچیز تحریر جو ایک اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ سائل کے جواب میں ہے، حاضر خدمت کر رہا ہوں، از راہ شفقت و نوازش کچھ وقت نکال کر اس پر ایک نظر فرمالی جائے۔

ا- میں مستفید ہوا۔

م- اور جو اسقام خیال مبارک میں آئیں، اُن سے مطلع فرما دیا جائے۔

ا- میں بیچارہ اسقام کیا نکالتا مگر امتثالِ امر کر دیا۔ "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کر لیا۔

مجموعہ مکتوبات محفوظ میں اس کے بعد معاً عریضہ مورخہ ۲۴ستمبر ملتا ہے، ــــــ سلوک و فقہ کے دو سوالوں کا جامع:-

م- صوفیہ کے ہاں ایک اصطلاح "نسبت" ہے۔ آپ کے مواعظ و تصانیف میں بھی بار بار یہ لفظ آیا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے۔

ا- نسبت کے اصطلاحی معنی وہی ہیں جو لغوی معنی ہیں، یعنی تعلّق یا لگاؤ۔ اتنا فرق ہے کہ

لُغوی معنی مطلق ہیں کسی کا تعلق کسی سے ہو۔ اور اصطلاحی معنی مقید ہیں۔ یعنی عبد کا تعلق حضرت حق سے۔ اور یہ تعلق دو قسم سے ہے۔ ایک عام جو ہر مومن کو ہے۔ اور یہ ولایت عامّہ ہے۔ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا میں اسی کا ذکر ہے، اور ایک خاص جو مخصوص ہے اولیاء اللہ کے ساتھ، یعنی اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق جس کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں کثرت ذکر و دوام طاعت۔ یعنی یہ دو چیزیں مثل امر طبعی کے ہو جاویں، اور اس کے صلہ میں حق تعالیٰ کی طرف سے تعلق رضا کا ہو۔ اِن دو نوں تعلق کے مجموعہ کا نام نسبت ہے اصطلاح میں۔

م۔ اور اس کی شناخت کیا ہے کہ فلاں شخص صاحبِ نسبت ہے۔

ا۔ اُس کی صحبت میں یہ اثر ہو کہ کثرت ذکر و دوام طاعت کی رغبت پیدا ہو۔

م۔ ایک شخص ایک زن منکوحہ سے حرام کاری کا مرتکب ہو گیا تھا۔ وہ عورت اور اُس کا شوہر دونوں وفات پا چکے ہیں۔ اب یہ شخص نہایت درجہ نادم و منفعل ہے۔ لیکن اب کفارہ کی صورت بجز توبہ و استغفار کے اور کیا ممکن ہے۔

ا۔ اصل تدارک توبہ و استغفار ہی ہے، اور اس کی تکمیل اس عورت کے شوہر کے لئے دُعائے مغفرت اور تصدّق بالمال کہ غضب ربّانی کا بجھانے والا ہے۔

آج آپ کے بڑے بھائی صاحب بھی سہارنپور سے تشریف لائے۔ اس وقت تین بجے واپس تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے آپ کا خط بھی دکھلا دیا تھا۔"

یہ بھائی صاحب اُس وقت سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے، کئی سال تک وہیں رہے۔ اور وقتاً فوقتاً مولانا کے پاس تھانہ بھون بھی حاضری دیتے رہتے۔ حضرت بھی ان پر خاص لُطف و کرم رکھتے تھے۔ حضرت کے ہاں دُنیوی حُکّام، رؤساء، عہدہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی خاص اعتدال ملحوظ رہتا تھا۔ یعنی نہ اُن لوگوں کی طرف گرنا (جیسا کہ بعض مشہور آستانوں اور خانقاہوں میں دستور سا پڑ گیا ہے) اور نہ اُن سے اپنے کو بالکل کھینچے رکھنا، جیسا کہ بعض غیر محقق مشائخ نے تقویٰ و درویشی کا مقتضا سمجھ لیا ہے۔

اکتوبر کا آخری عشرہ تھا، جب ایک طویل قیام کے لئے مع زنانہ سفر تھانہ بھون کا ارادہ کیا۔ جہاں کئی مہینے حاضری کو ہو جاتے تھے، طبیعت میں شدید تقاضا پیدا ہو جاتا تھا اور حسب معمول کئی ہفتے قبل عرض بھی کر دیا، کہ مکان ٹھیک ٹھاک ہو رہے ——— کہ نیاز فتحپوری کے ماہنامہ نگار کی سخت ملحدانہ اور مسلم آزار روش کے مقابلہ میں ہیچ کو بڑی قوت و اہتمام کے ساتھ میدان میں آنا پڑا تھا، اور مہینوں یہ معرکہ جاری رہا تھا۔ ہیچ کی غل پکار سے بحمد اللہ سارا اسلامی پریس بیدار ہو گیا تھا، اور ملت بھر میں کہنا چاہیئے کہ آگ سی لگ گئی تھی۔ اطلاعی عریضہ کا جواب کارڈ پر حسب ذیل ملا:-

"وعدۂ قدوم کی مسرت میں بجز اس کے کیا عرض کروں، کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست۔ مکان فی الحال کوئی ذہن میں نہیں۔ میرے رہنے کے دو مسکن ہیں۔ ایک میں والدۂ رشیدہ ہیں۔ ایک میں مولوی جلیل احمد۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ سعی کروں گا جس میں کامیابی کی امید ہے۔ لیکن چونکہ مردانہ کے رہنے اور زنانہ کے رہنے میں ضروریات میں کسی قدر اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تنہا تشریف آوری ہو گی یا مع گھر کے لوگوں کے۔ تو غالباً تجویز مکان میں سہولت ہوتی۔

نیاز کے مقابلہ میں جو قلمی خدمت دین کی گئی ہے، وہ جہاد ہے، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماوے کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا کیا۔

مولوی حبیب احمد بھی باوجود بعض امور میں شدید رائے رکھنے کے بیحد مسرور و مداح تھے، خود مجھ سے اپنی اس کیفیت کو ظاہر کیا اس وقت گھر چلے گئے ہیں۔ اور غالباً پورے نومبر گھر رہیں۔ علالت کے سبب تبدیل آب و ہوا کی غرض سے گئے ہیں۔ والسلام"

مکان کا انتظام چند ہی روز میں ہو گیا۔ اور جس کارڈ پر مولوی شبیر علی صاحب (حضرت کے بھتیجے اور کارکن) کی ڈالی ہوئی تاریخ ۲۷ اکتوبر ہے حسب ذیل موصول ہوا:-

"اس روز سے مکان ہی کی فکر میں رہا، خدا خدا کر کے آج مکان موقع کا ملا جس کو شبیر علی ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔ اور اس کی کیفیت پشت پر لکھ رہے ہیں۔ اس خوف سے کہ کسی اور کو نہ

دیا ہیں ابھی کرایہ پر لے لیا ہے۔ جہاں شبیر علی رہتے ہیں، اُسی کے قریب یہ مکان ہے۔ میرے دونوں گھروں سے کچھ دُور رہے ہے۔ پہلا مکان مالک نے اپنے ایک عزیز کو دے رکھا ہے۔ تاخیر جو آپ سے طبعاً خجلت ہے، گو عقلاً معذوری ہے۔"

وطن سے روانگی حسب ارادہ شروع نومبر میں ہوئی۔ لیکن سہارنپور پہونچا، تو بھائی صاحب کی طبیعت زیادہ خراب پائی۔ جاڑوں میں ہمیشہ ہی دمہ کے دَورے اُنھیں سخت پڑتے رہتے ہیں، اب کی اور زیادتی پائی۔ اِس حال میں بَن نہ پڑا کہ اُنھیں اِس حال میں چھوڑ فوراً تھانہ بھون روانہ ہوں۔ والدۂ ماجدہ کی یہ رائے تو تھی ہی، خود مولانا کا بھی مذاق طبیعت یہی تھا! یہ اِس باب میں دوسرے مشائخ کے لئے ایک بڑا نمونہ موجود ہے۔ تاریخ و وقت مقرر پر تھانہ بھون نہ پہنچ سکا، اور معذرت نامہ حضرت کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ اور جواب یہ مرحمت ہوا:۔

"الطاف نامہ عین انتظار میں پہنچا۔ جس سے بجائے انتظار کے جناب بھائی صاحب کی ناسازیٔ مزاج سے انتشار پیدا ہو گیا۔ اللہ صحت کاملہ عاجلہ بخشے۔ آپ کی تو خود یہی رائے ہونا چاہیئے مگر میں بھی ادائے حق کے لئے یہ عرض کرتا ہوں کہ جب تک ممدوح عافاہم اللہ تعالیٰ کی کیفیت طبیعت کی قابلِ اطمینان نہ ہو جاوے سفر میں عجلت نہ فرمائی جاوے۔ باقی خیریت ہے۔ والسلام۔

ایک تکلیف دی جاتی ہے۔ برخورداری رشیدہ تپ ولرزہ میں مبتلا ہے۔ طبیب کی اجازت سے کیلے کی پھلی کی رغبت ظاہر کرتی ہے۔ ایک درجن خرید کر لیتے آئیں۔ مگر قیمت قبول کرنا پڑے گی۔ اِس میں تکلف منظور نہ ہوگا۔

بخدمت جناب ڈپٹی صاحب۔ اگر مولوی عبدالماجد تشریف نہ رکھتے ہوں تو جناب کو بھی تکلیف دیتا ہوں۔ ایک درجن پھلیاں خرید کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں مولوی ولی محمد گورداسپوری کے پاس مع اِس کارڈ کے کسی نوکر کے ہاتھ بھجوا دیجئے۔ وہ کسی آتے جاتے کے ہاتھ یہاں بھیج دیں گے۔"

یہ کارڈ ۵ نومبر کو ملا۔ بھائی صاحب کی طبیعت ٹھیک ہو گئی، اور میں دو ہی ایک روز بعد

تھانہ بھون حاضر خدمت ہو گیا۔

(۴)

تھانہ بھون پُرانا قصبہ ہے۔ مکانات پرانی وضع کے، عالیشان اور اُونچے اُونچے، پرانی لکھوری اینٹوں کے بنے ہوئے، مکینوں سے تقریباً خالی۔ اُن کے پھاٹک علی الخصوص شان دار۔ اُن ہی میں سے ایک مکان لب سڑک اب کی بھی ملا۔ سڑکیں قصبہ کے اندر کھنجڑ کی بنی ہوئی۔ برسات میں گویا ناقابل گذر۔ یہ مکان خانقاہ اور مولانا کے مسکن کے وسط میں تھا، اور خانقاہ سے مولانا کے مسکن کا فاصلہ کہیں اُوپر گذر چکا ہے کہ کوئی ڈیڑھ دو فرلانگ کا تھا۔ مشہور یہ تھا کہ اس مکان کے کوٹھے پر کوئی جن رہتے ہیں، اور یہی شہرت قصبہ کے بعض اور پُرانے مکانوں سے متعلق بھی تھی۔ جنات کے قصے سُن سُن کر شوق بارہا ہوا کہ کبھی کسی سے مُلاقات ہو جائے۔ کبھی آرزو پُوری نہ ہوئی۔ اِس "جنات زدہ" مکان میں قیام خاصے عرصہ تک رہا۔ یہاں بھی یہ شوق پُورا نہ ہو پایا ——— معمولات اب کی بھی کئی ہفتہ کے قیام میں وہی رہے، جو ہمیشہ رہتے تھے، پانچوں وقت کی نماز خانقاہ کی مسجد میں مولانا کی امامت میں، جو بجائے خود ایک ایسی لذیذ نعمت تھی، جس کے لئے حق تھا کہ تھانہ بھون تک سفر اختیار کیا جائے، خصوصاً فجر اور عشا کی جہری نمازیں، اور اُن میں بھی اخص، نماز فجر، اور اس میں مولانا کی وہ نہایت دلکش لحن اور جاذب قلب قرأت! نو اور دس کے درمیان گھنٹہ سوا گھنٹہ کے لئے مجلس خاص میں باریابی، اور بعد ظہر دو سوا دو گھنٹہ کے لئے مجلس عام میں حاضری۔ پھر کبھی بہ طور استثناء بعد مغرب یا بعد عشاء بھی چند منٹ کی حضوری۔ باقی وقت اپنا، اور اس میں سچ کے لئے ترتیب مضامین، مطالعہ کتب و اخبارات و رسائل ——— "برکات" کا نُور اور "انوار" کا ظہور ایک وجدانی مشاہدہ ہے۔ کوئی دوسروں کی آنکھیں چیر کر کیسے دکھا دے!

"مجلس خاص" کی اصطلاح تو ذہن میں ہو گی۔ مولانا کے ہاں مجلس کا وقت وہی ایک ہوتا تھا، ظُہر کے بعد سے عصر تک ۱۹۲۹ء میں جب سے اِس نامہ سیاہ کی حاضری ہونے لگی، از راہ کرم خاص و شفقت مخصوص کچھ وقت بعد چاشت مرحمت فرمایا گیا، اور اس میں مخصوص مہمانوں کو شرکت کی

اجازت ملنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ مجلس بھی مستقل قرار پاگئی۔ یہاں کہنے بلکہ شاید دہرانے کی بات یہ ہے کہ اس عنایت خاصہ کے باوجود یہ کبھی اتفاق سے بھی نہ ہوتا کہ مولانا اُس وقت مجھے بُلا بھیجتے۔ یا یُوں خود ہی لپکا ہوا چلا آتا۔ بلکہ ہر روز یہ ہوتا کہ اُس وقت صرف یہ کہلا بھیجتے کہ "اب میں فارغ ہوں، جی چاہے تو آجائیے" اور بار بار فرماتے کہ "اگر کسی روز جی نہ چاہے، یا کوئی دوسری مشغولیت درپیش ہو، تو ہرگز نہ آئیے۔ بلا صاف عُذر کہلا بھیجئے جب ہی میں سمجھوں گا کہ آپ آزادی اور بے تکلّفی سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ مجھے شُبہ تکلّف کا رہے گا" اللہ اللہ! کیا ٹھکانا ان معاشری مجلسی نکتہ سنجیوں و دقیقہ شناسیوں کا ہے! ——— باتیں وہی رہتیں، جو اُن کے سے حکیم و مصلحِ شفیق کے شایانِ شان تھیں۔ اکثر اپنے بزرگوں، اُستادوں کے قصّے اور حکائتیں نقل کرتے، اور ان ہی کے ضمن میں سب کچھ کہہ جاتے۔ حدیث پر تو کم، تفسیر پر گفتگو نسبتہً زیادہ رہتی۔ اور ان دونوں سے کہیں بڑھ کر فقہ اور تصوّف کے موضوع چلتے رہتے۔ صحیح تصوّف و سلوک کی حقیقت اپنے فہمِ ناقص کے متعلق تھوڑی بہت جو کچھ بھی سمجھ میں آئی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنا زیادہ دخل ان ہی مجالس اشرفی کو ہے۔ اور اہلِ فقہ کی طرف سے جو بُغض دِل میں مدّت سے بیٹھا ہوا، اور خود علمِ فقہ کی جو حقارت اور بے وقعتی ذہن میں جمی ہوئی تھی، یہ سارا زنگ بحمد اللہ کہنا چاہیئے کہ ان ہی صحبتوں کی برکت سے دُور ہوا۔ فقہاء کی تحقیقات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ اور کنز، ہدایہ، فتح القدیر، درّ مختار، ردّ المختار اور اُن کی شرحوں اور حاشیوں اور مبسوط وغیرہ کے متن کی اوراق گردانی، اُلٹی سیدھی اور بے سمجھے بوجھے سہی جو کچھ بھی اپنے نصیب میں آئی، سب اسی در کے فیض سے ——— اور یہ ساری تعلیمات بالکل سادہ، بے تکلّف، عام فہم، دلچسپ گفتگو کے ضمن میں ہوتی رہتیں۔ یہ پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ کچھ سکھایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی فارسی اور اردو شاعری کے تذکرے بھی چھڑ جاتے اور مولانائے روم، سعدی و حافظ کے علاوہ اکبر الہ آبادی اور مجذوب کے کلام کا دور بھی چلنے لگتا۔

طویل قیام کے دوران میں اچھے اچھے اہل علم و اہل طریق کی بھی زیارت کا شرف حاصل ہو جاتا۔ دیوبند، سہارنپور، دہلی کے اکابر تو اکثر ہی آتے رہتے۔ کبھی یہ کرتا کہ میں خود بھی جامعہ وغیرہ سے کسی کو بُلا بھیجتا کہ میرے ہی بہانہ سے مولانا کی خدمت میں حاضری و استفادہ تو ہو جائے۔ چنانچہ اب کی جامعہ کے ایک سینیر اور بڑے ہونہار طالب علم مولوی رئیس احمد جعفری ندوی خیرآبادی کو بُلایا۔ جو آگے چل کر سیرت محمد علیؒ کے مصنف ہوئے۔ اور اس وقت پاکستان میں ایک ممتاز اہل قلم ہیں۔ اُس وقت مولانا کی طرف سے اُن کے بعض مریدوں کی مثالیں دیکھ کر خاصے بدگمان و بدعقیدہ تھے، اور سمجھے ہوئے تھے کہ یہاں بس تشدد ہی تشدد ہے۔ میری دعوت پر آئے، اور دو ایک روز ٹھہر کر مولانا کی مجلسوں میں شریک ہوئے۔ پھر جو واپس گئے، تو منتقد کے بجائے معتقد، اور بدگمان کے بجائے مخلص ہو کر ——— اب اتنا حافظہ کمبخت کہاں سے لاؤں کہ سنہ ۲۸ء کے تفصیلات وجزئیات سنہ ۴۸ء میں دماغ کے خزانہ سے اُگلنے لگوں! اور اتنی سمجھ اُس وقت کہاں نصیب تھی کہ اُسی وقت مجلسوں اور گفتگوؤں کو قلمبند کرتا جاتا، یا یادداشتیں لکھتا جاتا۔ آہ وہ بیش قیمت ذخیرہ، جو محض سہو، غفلت و نسیان کی نذر ہو گیا۔

شروع دسمبر کی کوئی تاریخ تھی، جب واپسی کی اجازت چاہی۔ اب کی زنانہ میں علاوہ بیوی اور بچیوں کے آخری چند روز میں والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ معظمہ کو بھی بُلا لیا تھا، اور وہ دونوں تہجد گذار بندیاں مولانا کے ارشادات سے خاص طور پر مستفید ہوتی رہی تھیں۔ سارے قافلہ کے ساتھ بجائے ریل کے لاری پر چلنے میں زیادہ سہولت نظر آئی۔ بھائی صاحب سہارنپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ بلا زحمت پوری لاری کا انتظام تھانہ بھون سے سہارنپور تک کے لئے ہو گیا۔ ایک راستہ گنگوہ ہو کر تھا، قصداً وہی اختیار کیا کہ مزار رشیدی پر بھی فاتحہ خوانی ہوتی چلے۔ خیر گھر پہونچ کر پہلا عریضہ حضرت کی خدمت میں ۱۵ دسمبر کو لکھا:۔

خط لکھنے کو بار بار جی چاہا، نوبت آج سے قبل نہ آسکی! بڑا وقت فتنۂ نگار کے سلسلہ میں صرف کرنا پڑ رہا ہے۔ ظالم نے زبردست اور جان توڑ کر پروپیگنڈا کر کے بہت سے سادہ دل اور

بھولے بھالے مسلمانوں کو بھی اپنا لیا ہے۔ اور وہ لوگ اُلٹے مجھ سے اور مولوی ظفر الملک سے فرمائش کر رہے ہیں کہ کیوں خواہ مخواہ ایک شخص کے پیچھے پڑے ہو، جب وہ معافی مانگ رہا ہے، تو قصّہ ختم کرو۔ خیر۔ انشاءاللہ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ[2]۔

بھائی صاحب کے خط آتے رہتے ہیں۔ اُن کی طبیعت گو نسبتہً بحمد اللہ بہتر ہے، پھر بھی قابلِ اطمینان نہیں[3]۔ گھر کے لوگ لڑکیاں وغیرہ وہیں سہارنپور رہیں۔ تنہا وطن آیا ہوا ہوں۔ فتنہ نگار کے سلسلہ میں جو کچھ کرنا ہے لکھنؤ ہی میں کرنا ہے۔ دل سے ساتھ دینے والے مولوی ظفر الملک اور دوہی چار صاحب اور ہیں[4]۔ بھائی صاحب کے پاس بھی اُن کی اس علالت کے زمانہ میں پہنچنا ضروری ہے۔ انشاءاللہ ۱۰، ۱۲ دن میں یہاں کے زیادہ ضروری کاموں سے فراغت پاکر وہیں پہونچ سکوں گا، اور ماہِ مبارک کے آخر تک وہیں رہوں گا[5]۔ اور درمیان میں ایک آدھ روز کے لئے سرسری حاضری تھانہ بھون کی انشاءاللہ ہوگی[6]۔

پچھلے زمانۂ حاضری کی ممنونیت کی داستان کہاں تک پھیلاؤں، البتہ اتنی شکر گزاریوں کی ساتھ ایک شکایت بھی ہے، اس کا اظہار ضروری ہے[7]۔ شکایت یہ ہے کہ اب کی جب حاضر ہوا تھا تو تاریخ و وقت حاضری صرف ظنِ غالب کے طور پر عرض کیا تھا، لیکن جناب نے اسٹیشن تک زحمت فرمائی، اور میں اُس گاڑی کے پہنچنے سے معذور رہا۔ (چنانچہ معذرت نامہ پہلی ڈاک سے روانہ کر دیا تھا) اس کا علم مجھے ایک عرصہ کے بعد محض اتفاقاً مولوی محمد محمود صاحب (سابق مہتمم دیوبند) سے ہوا[8]۔ اور دل کو بڑی ندامت و تکلیف ہوئی[9]۔ آیندہ کے لئے ادب کے ساتھ دست بستہ اس قسم کے اخلاق سے معافی چاہتا ہوں[10]۔ مجھے اس سے بجائے راحت کے تنگی ہوتی ہے، اور اپنی آزادی میں فرق محسوس کرتا ہوں۔ اپنی آزادی کا بڑا حریص ہوں اور تھانہ بھون حاضر ہوتے ہی جو الگ مکان لے لیتا ہوں اس کا اصل محرک بھی یہی حرصِ آزادی ہے۔ اپنے شیخ کے بھی اس عمل سے مجھ پر بڑی گرانی ہوتی تھی، اور میری بڑی منت و سماجت کے بعد اب انھوں نے دیوبند اسٹیشن پر تشریف لانا چھوڑا ہے[11]۔

اِس دو ہفتہ کے اندر کم از کم تین بار جناب کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا ہوں۔ عموماً مسجد ہی میں دیکھتا ہوں یا نماز پڑھتے ہوئے یا اِس کے اہتمام میں۔ شب گذشتہ پھر مشرف ہوا۔ دیکھا کہ آپ ایک بڑی جماعت کے ساتھ مسجد کے اندر ہیں اور نماز کی تیاری ہو رہی ہے۔ میری طرف التفات خاص ہے۔ حکیم محمد مصطفیٰ صاحب کو بھی دیکھا (حالانکہ اُن سے کبھی نہیں ملا ہوں) کہ وُہ آپ سے متصل کھڑے ہیں۔ اور آپ اُن کے متعلق بہت ہی مدحیہ الفاظ فرما رہے ہیں یہاں تک کہ یہ ارشاد فرمایا کہ "بہ ظاہر میں مُرشد ہوں اور یہ مُرید، لیکن حقیقتہً یہ علم اللہ ہی کو ہے کہ مُرشد کون ہے اور مُرید کون"۔ خواجہ صاحب کو بھی دیکھا۔"[12]

تھانہ بھون سے لاری پر سہارنپور آتے قصداً گنگوہ کا راستہ اختیار کیا، اور تلاش کر کے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے مزار پر حاضری دی۔ ایک عجب خنک نُورانیت اور سکینت قلب نے محسوس کی۔ سُبحان اللہ۔ ہٹنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔"[13]

جواب کے مُلاحظہ میں بھی زحمت انتظار کیوں اُٹھائیے:۔

(۱) محبین کے سب واقعات میں حکمت ہوتی ہے، چُنانچہ اشتیاق کا بڑھنا اس کی حکمت ہوئی۔

(۲) جب محبین کے افعال میں حکمت ہے، محبوب المحبین کے تصرفات میں حکمت کیوں نہ ہو گی اِس میں یہ حکمت ہوئی کہ آپ کا یہ جہاد جہاد خالص ہو گیا۔ حظِّ نفس کا حصہ بھی آخرت ہی کے لئے ذخیرہ ہو گیا۔

(۳) یہاں بھی دردناک خط آیا تھا، دردمند دِل سے دُعا کرتا ہوں۔

(۴) بارک اللہ تعالیٰ فیہم۔

(۵) اللہ تعالیٰ اِس قیام کو اُن کے لئے مایۂ تسلی مسبب شفا فرما دے۔

(۶) ادائے حقِ محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ عاشقِ مسکین بہ ہیچ خرسند ست

(۷) بہت ضروری۔ ع

بے شکایت نہیں اے ذوقِ محبت کے مزے

مگر جیسے شکایت میں مجھ کو مزہ آیا امید ہے اس روایت کے رد جو کہ ہمارے اِس لُطف کی خلاف واقعہ ثابت ہونے سے آپ کو اس سے زیادہ مزہ آئے گا۔

(۸) یہ اُن کا اجتہاد تھا۔ نہ میں نے اُن سے ظاہر کیا نہ واقع میں اِس قصد سے گیا تھا اس وقت یہ تو مجھ کو یاد نہیں رہا کہ کیوں گیا تھا، مگر یہ یاد ہے کہ اِس قصد سے نہیں گیا تھا، خاص کر جب اپنے دوست پر بار پڑنے کا احتمال ہو۔

(۹) اِس کے ذمہ دار سر دفتر صاحب ہیں، میں نہیں۔

(۱۰) میں تو واقعی آپ کے دست بستہ ہونے سے پہلے ہی پابستہ ہوں۔ میں کبھی تکلیف دینا نہیں چاہتا، اطمینان فرمائیں۔

(۱۱) میں یقین دلاتا ہوں کہ میں آزادی کا حریص ہوں۔ اپنے لئے بھی دوستوں کے لئے بھی۔ اور مولانا کی سی تواضع مجھ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اِس لئے مجھ پر اس کا احتمال بھی نہ فرمائیں۔ اگر کبھی دِل چاہے گا تو آپ کی اجازت کے بعد ایسا کر سکتا ہوں، اور اجازت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

(۱۲) صلحاء کی زیارت مبارک ہو۔ خیر مجھ کو تو نصیب نہیں ہوتی، مگر آپ نے تو مجھ کو شریک زیارت دیکھا، یہ بھی نعمت ہے۔

(۱۳) مبارک ہو۔ اب تو غالباً جوش پر اس کو راجح فرمائیں گے۔"

(۴۲)

۱۳۱ء اب ختم ہو رہا تھا، لیکن ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اپنے ایک عزیز دوست، اور محترم کرم فرما اور نامور ہم نام کی وفات کی خبر گویا اچانک ملی۔ مولانا عبدالماجد صاحب قادری بدایوں کے مشہور و قدیم خاندان علماء و مشائخ کے ایک فرد تھے۔ خود بھی عالم، تحریک خلافت کے بڑے پُر جوش کارکن، جمعیۃ العلماء کے ممتاز رُکن اور بڑے ہی خوش تقریر۔ بیان اُن کا سُننے سے تعلق رکھتا تھا۔ عقائد میں بڑے زبردست "قادری" اور ذرا غالی قسم کے

صُوفی تھے۔ حضرت مولانا کی طرف سے قُدرۃً دل صاف نہ تھا۔ دَوران گفتگو میں نا ملائم الفاظ زبان پر آجانے ناگزیر سے تھے۔ وفات کی خبر سُنتے ہی ذہن اِدھر منتقل ہُوا کہ دُعائے مغفرت حضرت سے کرانی چاہیئے۔ بے تکلّف ایک عریضہ اس مضمون کا لکھ بھیجا۔ جوابی کارڈ پر مُہر ۱۸ر دسمبر کی ہے ——— یہ رنگ بھی حضرت مولانا کا اگر آپ نے نہ دیکھا، تو حضرت مولانا کو گویا دیکھا ہی نہیں۔ دیکھیئے۔ ایک عمر بھر کے مخالف کا ذِکر کِس انداز سے کرتے ہیں :-

"میَں کل کے خط کا جواب لکھ کر روانہ کر چکا ہوں کہ دُوسرا کارڈ آیا۔ جِس سے ایک محبِ اسلام واہلِ اسلام کی مفارقت ناسوتی کا عِلم ہو کر قلق ہوا۔ رائے کا اختلاف میری نظر میں کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے۔ اصول اور نیّت پر نظر رہتی ہے۔ سو مرحوم کے متعلّق اس کے خلاف کوئی بات نہیں سُنی گئی۔ اِس لئے خاص قلق ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرماویں اور اُمّت کو ان کا نعم البدل عطا فرماویں۔ مجھ سے جو فرمایش اُن کی گُفت وشنید کے معاف کرنے کے متعلّق فرمائی ہے، میَں اُس کا اِس لئے شُکر گزار ہوں کہ اِس میں دو مسلمانوں کا بھلا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے قلب میں بحمدللہ تعالیٰ کسی کی طرف سے غل نہیں ہے اور ایسی گفت شنید میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کو گناہ بھی نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ روایات کے تحت میں معذور رہیں۔ اِس لئے معافی کی حاجت بھی نہیں۔ لیکن اِس سے آپ کی طبیعت خوش نہ ہوگی۔ اِس لئے آپ کے مذاق کا اتباع کر کے صریح الفاظ میں دُعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میَں نے سب کچھ اُن کو معاف کیا، آپ بھی معاف فرمائیں۔ اور اُن کو تو ایک امتیاز تھا کہ وہ بدایوں کے متوطن تھے۔ جو وطن ہے ہمارے شیخ المشائخ حضرت سُلطان جی کا۔ میَں تو خیر اہلِ بدایوں کے لئے یہ سمجھ کر ایسے امور کو گوارا کرتا ہوں کہ "بدا۔ یوں۔ ہی تھا" حضرت مولانا کی زیارت مبارک ہو"

مولانا (وہی خُشک مزاجی کے لئے بدنام مولانا) رعایت لفظی کے اُستاد ماہر تھے۔ بدایوں کی مناسبت سے پُورا فقرہ "بدا۔ یوں ہی تھا"، کیا خوب!

۱۹۳۲ء

وطن تو چند ہی روز ٹھہرنا ہوا، وہی فتنۂ نگار کے سلسلہ میں۔ دسمبر ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ پھر سہارنپور آ گیا۔ اور آتے ہی اطلاع حضرت کو کر دی۔ جوابی کارڈ یکم جنوری کو ملا:-

"قرب مسافت سے مسرت ہوئی۔ خدا تعالیٰ عافیت سے ملا دے۔ بھائی صاحب کی تکمیل صحت کے لئے دعا کرتا ہوں۔ تفصیل الدین کے مضامین کے پسند آنے سے اس وجہ زیادہ مسرت ہوئی کہ جب غیر مقصود مضامین کی اتنی قدر فرمائی ہے جس روز مضامین مقصود کی طرف توجہ فرمائیں گے، کس درجہ قدر فرمائیں گے۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا عِلْماً نَافِعاً وَعَمَلاً صَالِحاً"

یہ تفصیل الدین یقیناً مولانا ہی کا کوئی مقالہ یا رسالہ ہوگا۔ اب اتنے دن کے بعد بالکل خیال نہیں پڑتا کہ اس میں کیا تھا ——— یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا کے ایک معلوم و معروف رسالہ تعلیم الدین سے اس کا التباس ہو گیا ہو۔ جنوری ۳۲ء شروع ہو چکی تھی۔ اور رمضان اب شروع ہونے ہی کو تھا کہ وہ ایک روز کے لئے پھر تھانہ بھون حاضری دے آیا۔ غالباً ۲۸ شعبان کو گیا تھا۔ واپسی بہرحال ۲۹ کو قریب شام کے ہوئی۔ آمد رمضان پر مسجد کی رونق، خانقاہ کی آبادی اور چہل پہل، دونوں میں اضافہ، استقبال رمضان کا اہتمام، یہ سب دیکھنے کے قابل تھا، اور اسی کا شوق دیداب کی لے بھی گیا تھا۔

مجلس کے تذکرے تو اکثر ہی یاد رکھنے اور نوٹ کئے جانے کے قابل ہوتے تھے۔ ایک روز کی گفتگو آج تک یاد ہے۔ صبح کی مجلس خاص میں مسئلہ جزائے اعمال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خاص

م۔ کل سہ پہر کی ڈاک سے ایک عریضہ خدمت والا میں بھیجا ہے، جو اس نیاز نامہ کے پہنچنے کے بعد ملاحظہ میں آئے گا۔ چھوٹی بچی کی طبیعت اس عریضہ کے بعد ہی بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ اور آج صبح سے تو خدا کے فضل سے نمایاں افاقہ ہے۔

ا۔ الحمد للہ۔

م۔ اب تو یہ تجربہ بار بار کا ہو چکا کہ ادھر دعا کے لئے عریضہ روانہ ہوا کہ اُدھر قبولِ دعا کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور حضرت رومیؒ کے قول کی تصدیق ہو گئی ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں | می دہد یزداں مرادِ متقین

ا۔ جب تک میرے پاس خط نہ پہنچے اُس وقت تک تو چنیں خواہی کا مصداق آپ ہوں گے۔ الحمد للہ بہت تواضع کے بعد ایک کمال کا تو اقرار کیا۔

م۔ اِس نمایاں اثر کو دیکھ کر گھر میں شفائے کامل وعاجل کے لئے اور زیادہ تقاضا پیدا ہوا۔ چنانچہ اُن ہی کی فرمائش پر یہ نامہ روانہ ہو رہا ہے۔

ا۔ دِل سے دُعائے صحت کرتا ہوں۔

مولانا نے جس لطیف انداز سے مزاح فرماتے رہتے، اُس کی مثالیں تو اوپر بھی جا بجا گذر چکی ہیں۔ باقی یہ" تو چنیں خواہی" کے تحت میں لطیفہ تو بھولنے والی چیز ہی نہیں!

خانقاہ کے اطراف میں مکانات پختہ اور عالی شان تو بہت سے تھے۔ لیکن زیادہ تر وہی پُرانی وضع کے۔ اور بعض بعض تو بہت بوسیدہ۔ ٹھہرنے میں کچھ زیادہ آرام اُن لوگوں کو نہ ملتا جو ذرا جدید تمدن کے خوگر ہوتے۔ مولانا کے حقیقی چھوٹے بھائی منشی اکبر علی صاحب قصبہ کے خوش حال لوگوں میں تھے، اور گورکھپور وغیرہ کی طرف کہیں کورٹ آف وارڈس کے اسپیشل منیجر تھے۔ اُن کا مکان ذرا جدید تمدن کی رعایتیں لئے ہوئے تھا، اور قصبہ میں شاید سب سے بہتر سمجھا جاتا۔ بڑے بڑے عمائد جب کبھی باہر سے اتفاق سے آ جاتے، تو اسی میں اُتارے جاتے ـــــــ حضرت کی جو روز افزوں شفقت اس عاصی کے حال پر تھی، اُس کا ایک نمونہ یہ بھی اب ظاہر

ہونے لگا، کہ اب جو دو ہی چار دن کے لئے حاضری کا اتفاق ہوتا، اور اپنے کھانے رہنے کا کوئی الگ اُور مستقل انتظام نہ کرتا، تو بجائے مہمان خانۂ خانقاہ کے یہیں ٹھہرایا جاتا۔ اِس مکان کے آرام کا کیا کہنا۔ خانقاہ کے مہمان خانہ میں بھی حتی الامکان آسایش کی رعایتیں ہیں۔ لیکن بہرحال وُہ اللہ والوں ہی کے ٹھہرنے کے لئے مُناسب جگہ تھی۔ ہم جیسے تن پرستوں، آرام طلبوں کے لئے جن کا شُمار نہ ذاکروں میں، نہ شاغلوں میں، نہ درویشوں میں، یہی مکان موزوں ترین تھا۔ سونے کو گدّے دار مسہری، بیٹھنے کو کرسیاں اور تخت کا فرش لگا ہوا چوکا + نہانے دھونے کو کمرہ سے متصّل ہی غُسل خانہ، وغیرہا۔

(۴۳)

خُدا معلوم کیا بات ہوئی کہ کئی ہفتے گذر گئے، اور مراسلت کی نوبت نہ آئی، جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا، تو طبیعت بے چین ہونے لگتی۔ آخر ۱۶ مارچ کو دل نہ مانا اور کاغذ کے صفحہ پر کہنا چاہیئے کہ کلیجہ نکال کر رکھ دیا۔ فتنۂ روزگار رنگار کے معاملہ نے بڑی طوالت اختیار کرلی تھی۔ ایک مذہبی رنگ کے مُسلمان جو اُس وقت عارضی طور پر اور چند روز کے لئے گورنمنٹ کے بہت بڑے اور ذی اختیار عہدہ دار تھے، چاہتے تھے کہ مَیں اُن سے جاکر ملوں، تو وہ توہین مذہب کا مقدمہ دائر کرانے کی اجازت دیدیں:۔

"مدّت سے مزاج گرامی کی خیریت میں دِل لگا ہوا ہے۔ خُدا کرے ہر طرح بصحتِ عافیت ہو۔[1] جہاں چند ہفتے گذر جاتے ہیں، طبیعت حاضری کو بے اختیار چاہنے لگتی ہے، اور عریضہ نگاری کا داعیہ تو اس سے بھی کہیں قوی ہوتا ہے[2] بعض دفعہ یہ سوچا کرتا ہوں کہ خط لکھوں تو آخر کیا لکھوں[3]۔ پھر دل یہ کہتا ہے کہ کچھ بھی سہی، اُدھر سے جواب تو آئے۔

یہی صورت اِس وقت بھی تھی۔ طبیعت میں تقاضا کئی دن سے تھا۔ اتفاق سے بیان القرآن میں آیۂ لیغفر لک اللہ من ذنبک ما تقدم وما تاخر پر نظر پڑ گئی۔ سُبحان اللہ وبحمدہ۔ ساتھ ہی سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی بھی تفسیر پڑھ لی عربی کی ۸۔۱۰ تفسیریں اور اُردو کی بھی

۳-۴ موجود تھیں۔ سب میں اِن مقامات کو دیکھا۔ کسی صاحب کی بھی توجیہ اتنی معقول و دلنشین اور سارے اطراف کی جامع نظر نہ آئی۔ کمال یہ ہے کہ عتاب قرآنی بھی اپنی جگہ پر بالکل حق بجانب رہتا ہے، اور ساتھ ہی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ میں بھی کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ[4] الخ

آج کل اپنے اندر ایک خاص مرض پا رہا ہوں۔ عریضہ کی ضرورت اِس غرض سے بھی تھی، یعنی اپنے اندر جاہ پسندی زیادہ پانے لگا ہوں[5]۔ اُمراء و حکام سے مُلاقات اِدھر سالہا سال سے گویا بالکل ترک تھی۔ اب اِدھر نفس میں اس کا تقاضا پھر پیدا ہونے لگا ہے[6]۔ اعلیحضرت نظامِ دکن ابھی چند روز ہوئے لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ اُن کی خدمت میں حاضری اور امرائے دولت سے ملنے کا ولولہ دل میں اچھا خاصا پیدا ہوا[7]۔ اور لکھنؤ گیا بھی اِس ارادہ سے۔ وہاں پہنچ کر اس پر عمل البتہ نہ کیا[8]۔ صرف ایک وزیر صاحب سے ملا تھا، جن سے تعلّقات قدیم اور بے تکلّفانہ تھے۔

اسی طرح بعض انگریز حکام سے بھی ملنے کو دل چاہنے لگا ہے[9]۔ نفس تو بڑا مجتہد ہے، ہر موقع کے لئے عُذرات بھی تلاش کر لیتا ہے، لیکن پھر بھی جانتا ہوں کہ یہ سب تسویلات و تاویلات ہیں۔ حقیقی ضرورت کوئی بھی نہیں[10]۔ آج سے پندرہ سال قبل میرے تعلّقات اُونچے اُونچے انگریز حکام سے ہمسرانہ اور بے تکلّفانہ تھے۔ اور اِن تعلّقات پر فخر کیا کرتا۔ جب سے زندگی میں انقلاب ہوا اور سوٹ بُوٹ کی جگہ جسم پر کھدر کے کپڑے اور چپل نے لے لی، اور لکھنؤ چھوڑ کر دریاباد میں گوشہ نشین ہو گیا، تو ان بڑے بڑے حکام کے خطوط (جو اُس وقت تک بڑی احتیاط سے جمع کر رکھے تھے) کے پشتارہ کو آگ لگا دی۔ اب الحمدللہ اُن میں سے کوئی کا غذ باقی نہیں[11]۔ برسوں کے بعد اب اِدھر چند روز میں دل نے پہلی بار ابھی اِس حماقت پر افسوس محسوس کیا[12]۔

نفس ایسے موقع پر عذرات یہ پیش کرتا ہے کہ فلاں حاکم سے مِل کر فلاں مُوذی دشمن ملّت کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ یا فلاں مسلمان کو فلاں فلاں قسم کے نفع پہنچائے جائیں۔ لیکن پھر اپنے اِن خیالات پر لعنت بھیجتا ہوں[13]، اور کہتا ہوں کہ مجھ سے پیشتر شیطان نے جتنوں کو پھسلایا، اور

پھسلایا ہے، سب کو اسی طرح تو دانہ ڈال کر جال میں پھانسا ہے۔[14]

مرض کا مفصّل حال حکیم الامت کی خدمت میں بہ امید دواءت دعائے علاج پیش ہے[15]۔ گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں۔[16]،،

جواب کے لئے آپ ہمہ تن اشتیاق ہوں گے۔ بہتر ہے، شوق پورا کر لیجئے:۔

(۱) بحمداللہ اب طبیعت صاف ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلہ عطا فرما دے۔

(۳) اپنی خیریت۔

(۴) اس فضل کا واسطہ مقبولان الٰہی ہیں۔ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم۔

(۵) جاہ پسندی ذمیمہ نہیں امر طبعی نہیں ہے خواہ عام نہ ہو۔ اس کے لئے تدبیر کرنا یہ مذموم ہے۔ سو وہ اور اس کا ترک دونوں اختیاری ہیں، اس لئے آدمی اس سے بچ سکتا ہے۔

(۶) اگر تقاضا پر عمل نہ ہو تو کچھ ملامت نہیں۔

(۷) آخر وہ محسن ہیں اور امراء شاید واسطۂ احسان ہوں۔ اور اگر یہ بنا ہو تو ایک قسم کی شکر گذاری ہے۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی محسن کو خوش کرنا امر طبعی ہے۔ لامحمود ولا مذموم۔

(۸) بس تو اس ارادہ کا تدارک بھی ہو گیا۔

(۹) کسی مصلحت سے یا بلا مصلحت۔

(۱۰) تو اپنے ہاتھ کی بات ہے کہ عمل نہ کیا جائے۔

(۱۱) جملہ اوراق و کتب در نار کن سینہ را از نور حق گلزار کن، یہی تھا

(۱۲) یعنی جلانے پر۔ تو اب اس افسوس پر افسوس کر لیجئے، تدارک ہو جائے گا۔

(۱۳) بس تو کفارہ ہو گیا۔

(۱۴) یہ بصیرت مبارک ہو، حق تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر کیجئے اور اس سے کام لیجئے یعنی اعدائے اسلام سے کام نہ لیجئے۔ حق تعالیٰ سے کہئے جو کہنا ہو۔ اگر کامیابی نہ ہو تو اجر یقینی ہے۔

(۱۵) میں کیا، میری حکمت کیا۔ عوام کے لقب دینے سے کیا ہوتا ہے۔ لیکن خدمت سے عُذر نہیں۔ جابجا تشخیص و نُسخہ کے اجزاء عرض کر دیئے۔ قواعد پر منطبق کر کے خود تصحیح فرما لیجئے۔

(۱۶) میرا بھی سلام مع الدعاء کہہ دیجئے۔

ضمیمہ۔ اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ مجاہدۂ اختیاریہ ہے جو قانونی علاج ہے۔ ایک مجاہدۂ اضطراریہ ہے جو موہوب غیر مکسوب ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر چاہتے ہیں اور مجاہدۂ اختیاریہ سے اِس کو قاصر و عاجز دیکھتے ہیں تو ایسے اسباب غیب سے فرما دیتے ہیں۔ جس سے اُس کے امراض نفسانیہ حُبّ جاہ وغیرہ کا علاج ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا اُسی کو فرماتے ہیں ؎

ہم بدلہا او نماید خویش را ؏ ہم بدوزد خرقۂ درویش را

مثلاً اِس پر کوئی مرض مُسلّط ہو جاتا ہے یا کوئی عدو مُسلّط ہو جاتا ہے جو اس کو ایذائیں خصوصاً بدنامی کی ایذاء پہنچاتا ہے۔ جس کی روایات کو اگر کوئی غلط سمجھتا ہے، تو دُوسرا صحیح سمجھتا ہے۔ اور اِس طرح سے وُہ رُسوا ہو جاتا ہے۔ جو اوّل اوّل نفس کو بے حد ناگوار ہوتا ہے مگر صبر و رضا جب اختیار کرتا ہے پھر تو اُس میں ایسی قوت تحمّل کی ہو جاتی ہے کہ نہایت محبّت کے ساتھ یہ کہنے لگتا ہے ؎

ساقیا برخیز و درده جام را — خاک بر سر کُن غمِ ایّام را

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں — ما نمی خواہیم ننگ و نام را

پھر اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کے موافق اِس کو قبول عام و عزت نصیب فرماتے ہیں جس میں اس کو ناز نہیں ہوتا۔ جس قدر رفعت بڑھتی جاتی ہے۔ نیاز میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ بس جاہ عظیم میسّر ہوتی ہے اور جاہ پسندی فناہ ہو جاتی ہے۔"

کیا عرض کیا جائے، معمولی سا ایک ایک خط کیسے کیسے بیش بہا مضامین کا مجموعہ ہوتا تھا!

——— خوش قسمت تھا ایسے مکتوب کا مکتوب الیہ کہ گھر بیٹھے اُسے یہ دولت حاصل رہی۔ بد قسمت تھا وہ مکتوب الیہ کہ یہ ایک نعمت بھی اس سے اور زیادہ کیوں نہ حاصل کر لی!

اس کے بعد کا عریضہ ۲۰ اپریل کو لکھا۔ بہ طور ضروری تمہید کے یہ سن لیجئے کہ مملکت آصفیہ کے مشہور پیشکار اور سابق وزیر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کا انتقال اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ مہاراجہ بڑے تصوف دوست اور مسلم دوست تھے۔ نعتیہ نظمیں بھی کہتے تھے۔ لیکن بہر حال باقاعدہ اسلام لے آنے کی کوئی روایت سننے میں نہیں آئی۔ اب آگے مکتوب ملاحظہ ہو:-

م۔ پچھلا والا نامہ جس میں حب جاہ کی حقیقت و علاج پر لفظاً مختصر لیکن معنیً جامع و شافی تقریر تھی۔ خاص طور پر آیۂ رحمت و مایۂ سعادت ثابت ہوا۔ بار بار پڑھا، اور رو رو کر بھی پڑھا۔ ہنس ہنس کر بھی پڑھا، پھر بھی جی نہ بھرا۔ جزائے خیر اللہ پاک ہی دے سکتا ہے۔

ا۔ میں اس سے خوش ہوا کہ آپ کو مضمون سے خوشی ہوئی۔

م۔ ایک روز خواب یہ دیکھا کہ جناب والا کے دسترخوان پر کھانا کھا رہا ہوں علمائے فرنگی محلی میں سے بھی دو ایک صاحب موجود ہیں۔ میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ دیکھئے حضرت، یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ مہاراجہ کشن پرشاد کے جنتی ہونے میں شبہ نہیں، اس لئے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے خواب میں مشرف ہو چکے ہیں۔ حالانکہ مطلق رویت ہرگز نجات کے لئے کافی نہیں، رویت مع الایمان ہونی چاہیئے۔ ورنہ مطلق زیارت تو خواب میں نہیں، بیداری میں ابوجہل وابولہب کو ہر روز ہوتی ہی رہتی تھی۔ جناب اس پر سر جھکائے ہوئے کچھ ارشاد فرما رہے ہیں۔ الفاظ مطلق یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ تائید میرے ہی خیال کی فرمائی ہے۔ اس کے بعد چند قاشیں کسی حلوے کی مجھے خاص طور پر عنایت ہوئیں۔ دیکھنے میں وہ حلوہ معمولی تھا، لیکن اس کی لذت و حلاوت حد بیان سے باہر تھی، ایسی کہ تین چار ہفتہ گذر جانے پر بھی نہیں بھولی ہے۔ اسی افراط تلذذ میں آنکھ کھل گئی۔

پرسوں خواب دیکھا کہ مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے کہ تم دعا اچھی طرح نہیں مانگتے ہو۔ ذرا جی لگا کر مانگا کرو، اس کے عجیب وغریب اثرات کا مشاہدہ خود ہو جائے گا۔

ا۔ مبارک اور مبشر بالعلم والعمل خواب ہیں۔

م۔ یہ تو خواب تھا۔ باقی واقعہ یہ ہے کہ مجھ سے دُعا زیادہ مانگی ہی نہیں جاتی۔ مانع صرف دو ہیں۔ ایک تو یہ خیال کہ وہ ارحم الراحمین خود ہی ہر طرح عالم و بینا ہیں اُن کے سامنے اتنی تفصیلی عرض حاجت کی ضرورت کیا۔

ا۔ معروضات اعلام کے لئے نہیں ورنہ مختصر دُعا بھی لا حاصل ہوتی۔ بلکہ اظہار احتیاج کے لئے ہیں، اور یہ اظہار جس قدر مُمتد ہو عین مطلوب ہے۔

م۔ دُوسرا یہ کہ خود اتنی زاید خواہشوں اور حاجتوں کا ہجوم ہونے لگتا ہے کہ طبیعت اس سے اُکتا جاتی ہے، اور دل کہنے لگتا ہے کہ کس کس چیز کے لئے کہا جائے۔

ا۔ ایک ایک چیز کا نام لینا ضروری نہیں۔ ادعیہ جامعہ کا تکرار دیر تک جی لگا کر کیا جائے۔ ایسا کرنے سے تھوڑی ہی دیر میں ایسا لُطف پیدا ہوگا کہ دوسرے وقت ایسے موقع کا انتظار رہیگا

م۔ میرے ایک مخلص دوست .... حیدر آباد میں ایک معزز عہدہ پر مامور ہیں۔ بیچارے کچھ عرصہ سے سخت دُنیوی افکار میں پریشان ہیں۔ مجھ سے اصرار ہے کہ میں الحاح و اہتمام کے ساتھ حضرت والا میں دُعا کے لئے عرض کروں۔

ا۔ مَیں دل سے دُعائے خیر کرتا ہوں۔ وہ بھی دُعا کرتے رہیں۔ اُس دربار میں ایسی ہی ملی جُلی چیزیں مقبول ہوتی ہیں۔

م۔ ظالموں نے میرے خلاف جو پمفلٹ بازی شروع کی ہے۔ اس کا سلسلہ جاری ہے۔ پمفلٹ میں میرے ساتھ ساتھ جناب کو بالواسطہ اور مولانا حسین احمد صاحب کو براہ راست شریک جُرم کرنا چاہا ہے۔

لیکن جب کہ وہ جُرم جُرم ہی نہیں تو شرکت فی الجرم کیسے ہو سکتی ہے۔ تو شریک جُرم کہہ نہیں سکتے، ہاں کہہ سکتے ہیں۔ تو اس کہنے سے کیا ضرر ہو سکتا ہے۔

م۔ گیہوں کے ساتھ گھُن پِسنا تو سُنتا تھا، یہ گھُن کے ساتھ گیہوں پسا جا رہا ہے۔

ا۔ تو ضرر کیا پہنچا۔ اس کو تو اور قابل انتفاع بنا دیا۔ پسنے کے قبل تو وہ روٹی نہیں

بن سکتا تھا، پینے سے ردی بن گیا۔

م۔ طرح طرح کے جعلی دستخط، جعلی تحریریں، جعلی حرث نامے برابر تیار ہو رہے ہیں۔ حق تعالیٰ کے حلم پر حیرت ہوتی ہے کہ کیسی کیسی مہلتیں دی جا رہی ہیں۔ جس بیچاری کے نام سے یہ ساری فرضی کارروائیاں ہو رہی ہیں، وہ دق میں مبتلا، نقل و حرکت سے معذور، زندگی کے دن جوں توں پورے کر رہی ہے۔ اُسے خبر نہیں، اُس بیچاری کے حق میں دعائے خیر فرمائی جائے۔

ا۔ آپ کی برابر تو نہیں۔ مگر آپ کے قریب قریب میرا بھی دل دکھا۔ اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے بھی دعائے خیر کرتا ہوں۔

م۔ اگر کہیں میرا نفس بھی انتقام لینے اور کچا چٹھا چھاپ دینے پر آمادہ ہو گیا، تو اُس غریب کی زندگی دس دن کے بجائے دو ہی دن میں ختم ہو جائے گی۔

ا۔ آپ کا نفس آپ پر غالب آکر آمادہ نہیں ہو سکتا انشاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ پر توکل رکھیے۔"

جدیارہ کی طلاق عرصہ ہوا واقع ہو چکی ہے۔ بعض مہربانوں نے اُن ہی کے نام سے ایک پمفلٹ "عبدالماجد دریابادی بے نقاب" (ٹھیک نیاز صاحب کے انداز تحریر و عنوان میں) چھاپ کر لکھنؤ و حیدرآباد وغیرہ میں گھر گھر شائع کیا تھا۔ آخری سطروں میں اشارے سب اسی طرف ہیں۔

(۴۴)

سُہیل صاحب اعظم گڑھی، علی گڑھ کے ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، اور شہر کے نامور وکیل ہونے کے علاوہ شاعر بھی بہت اچھے ہیں، اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے بھی۔ مولانا حسین احمد صاحب کا جانا جب سرائے میر (اعظم گڑھ) کے مدرسہ میں ہوا، تو انھوں نے اُن کے استقبال میں ایک بڑی پُرلطف فارسی نظم کہہ کر ایک خوش لحن طالب علم سے پڑھوا دی۔ جی میں آیا کہ حضرت کو بھی (جن کے ذوق شعر و ادب پر ہمیشہ اُن کی عالمانہ اور درویشانہ شہرت پردہ ڈالے رہی)

اِس لُطف میں شریک کر لیا جائے، اور جب خط لکھنے بیٹھا، توحسبِ معمول کچھ اور باتیں بھی دینی اور علمی رنگ کی یاد پڑگئیں۔ خط پر تاریخ ۱۱ رمئی کی ہے:۔

م "چند روز ہوئے مولانا مدظلہ سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح میں تشریف لے گئے تھے۔ اعظم گڈھ میں ایک صاحب فارسی کے بہت اچھے کہنے والے ہیں۔ انھوں نے ایک طالب علم سے خیر مقدم کی نظم پڑھوادی، جواتنی پُرلطف ہے کہ بے اختیار جی چاہا کہ اُسے حضرت تک بھی پہنچادوں۔ پُشت صفحہ پر حاضر ہے۔

ا۔ واقعی نفیس ہے اور لُطف یہ کہ سلیس ہے۔ گویا سہل مُمتنع ہے۔ میں نے نقل کر لی۔

م۔ اللہ آپ کا اُن کا دونوں بزرگوں کا سایہ مدتوں قائم رکھے، بعد کو لوگ اِن صحبتوں کو ترسیں گے۔

ا۔ حسب وعدہ صادق مصدوق بہت سے بادل پیدا ہوتے رہیں گے جو ہم سے زیادہ برسیں گے۔

م۔ شب میں اپنے مولانا کے ساتھ مولانا محمد قاسمؒ کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔

ا۔ مبارک ہو۔

م۔ بیان القرآن، تفسیر سورۃ الطلاق میں، اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ کے تحت میں تحریر فرمایا گیا ہے کہ استطالت لسان کا مسئلہ مفسرین، محدثین حنفیہ کے کلام میں تو دیکھا گیا مگر فقہ کی کسی کتاب میں نہ ملا۔ عرض ہے کہ عینی شرح کنز میں یہ مسئلہ اسی طرح مسطور ہے۔

ا۔ میں نے بھی ابھی عینی منگا کر دیکھا۔ اُنھوں نے بھی مذہب کے طور پر نہیں لکھا۔ آیت نقل کر کے حضرت ابن عباسؓ سے اِس کی تفسیر نقل کی ہے، اِس کو مذہب نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جو نُسخہ میں نے دیکھا وہ بہ طور حاشیہ کے ہے۔ آپ نے جو نُسخہ دیکھا ہے شاید وہ مکمل شرح ہو اس میں مذہب کے طور پر نقل کیا ہو۔"

وسط مکتوب گرامی میں نفیس کا قافیہ "سلیس"، اور میرے "ترسیں گے" کے جواب میں "برسیں گے"

یہ اُن ہی "خشک" مولانا کے قلم سے ہے۔

سرمایہ تسکین اور دانش آموز تو حضرت کا ایک ایک والا نامہ ہوتا تھا۔ ار جون کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م: پچھلے دِنوں جناب والا سے متعلق عجب عجب اتہامات سُننے میں آئے۔ ایک صاحب نے ایک مشہور مولوی صاحب کے حوالے سے بیان کیا کہ جناب نے یہ فتویٰ دے رکھا ہے کہ جب تک جسم پر ولایتی کپڑے کا کوئی جُزو نہ ہوگا۔ نماز درست نہ ہوگی۔ معاذ اللہ۔ ایک دوسرے صاحب نے بیان کیا کہ آپ نے بیان القرآن، سورۃ المائدہ کی آیت وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً کے تحت میں گورنمنٹ انگریزی کے ساتھ موالات و مودّت فرض قرار دی ہے۔ پہلے افتراء کی تو زبانی تردید کرکے خاموش رہا۔ اِس دُوسرے افتراء کی تردید اصل تفسیر سے اقتباس دے کر اب کی ہفتہ کے پرچہ سچ میں کر رہا ہوں۔

ا۔ یہ آپ کی محبّت ہے۔ مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اِس اتہام میں نہ اُن کا ضرر نہ میرا۔ بلکہ جواب دینے میں اُن کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور رہیں، اور جب وہ جواب پر مطلع ہوکر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے۔ تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔

م۔ حیرت ہی ہوتی رہتی ہے کہ بعض لوگ افتراء کرنے پر، اور بعض لوگ ہر ضعیف سے ضعیف بلکہ مہمل سے مہمل روایت قبول کرلینے پر کیسے آمادہ و مستعد رہتے ہیں۔

ا۔ حکمت نہ معلوم ہونے پر حیرت لازم ہے۔ مگر مجھ کو حیرت نہیں ہوتی حکمت معلوم ہوگئی ہے۔ اِس حکمت کا حاصل ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ جس امام کے پیچھے جتنے مقتدی کم ہوں گے اگر غلطی بھی کرے گا، تب بھی اس سے ہلکا رہے گا جس کے زیادہ مقتدی ہوں۔

م۔ حیدر آباد کے جن عہدہ دار صاحب کے حق میں دُعا کے لئے میں نے عرض کیا تھا، آپ وہ تازہ خط میں پھر مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔ لکھا ہے کہ حضرت تھانوی کی اجابتِ دُعا کا آج تک منتظر ہوں

ا۔ اور میں اس انتظار کے رفع کا منتظر ہوں۔

م۔ بیچارے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اِدھر دُعا ہوئی اور اُدھر اُن کا مقصد پُورا ہو گیا۔

ا۔ اِس خط کشیدہ عبارت پر اگر اُن کو بھی اطلاع ہو جائے تو مناسب ہے۔

م۔ گھر میں حمل کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ حفاظت کا تعویذ مرحمت ہو۔

ا۔ ملفوف ہے۔ گلے میں اِس طور پر ڈالا جائے کہ زیر ناف رہے۔"

اِسلام پر عجیب عجیب وقت ہر زمانہ اور ہر مُلک میں پڑتے رہتے ہیں۔ اور اُمّت کے صبر کا امتحان عجیب عجیب طریقوں سے ہر دَور میں ہوتا ہے۔ ۲۱ء میں فتنۂ نگارجس طرح پھیلا ہے۔ اِس کا ذکر بالاجمال تو پچھلے صفحات میں آ ہی چکا ہے۔ ۳۲ء میں اِس سے بھی کہیں زیادہ کریہ و دلآزار صورت نمودار ہوئی۔ برما میں ایک عیسائی نے بیہودگی اور گندہ ذہنی کی حد ہی کر دی۔ دو باتیں خط پڑھنے سے قبل پیش نظر رکھ لیجئے۔ ایک یہ کہ برما اُس وقت تک ہندوستان ہی میں شامل تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت کے عزیز قریب اور مُرشد مولانا ظفر احمد تھانوی وہاں کے ذی اثر علماء میں سے تھے،

۲۹ جولائی کا عریضہ اصلاً اسی کے متعلّق ہے۔ گو دوسرے مضامین بھی بجائے خود اہم ہی ہیں:۔

"بہت روز سے خیریت مزاج دریافت نہیں ہوئی۔ دِل لگا ہوا ہے[1]

حال میں رنگون سے سچ کے ایک خریدار نے ایک انگریزی ماہنامہ میرے پاس روانہ کیا ہے۔ جو وہاں کے سینٹ گبریلس ہائی اسکول کے پادریوں کی طرف سے نکلتا ہے۔ اِس کے دسمبر نمبر میں صفحہ ۱۳ پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلّق، حُرمت خنزیر کے سلسلہ میں، اِس درجہ بیہودہ، دلآزار، اشتعال انگیز عبارت لکھی ہے کہ اُسے پڑھ کر ہر کلمہ گو کا خُون بے اختیار جوش کھانے لگتا ہے، میرے لئے تو اصل الفاظ نقل کرنے بھی دُشوار ہیں...... سچ کے علاوہ میں اور مُسلمان اخبارات کو بھی آمادہ کر رہا ہوں اور اپنی بساط بھر اس کی پُوری کوشش کروں گا کہ شتم رسُولؐ کی شرعی سزا نہ سہی، کم از کم وہ سزا تو اِس گندہ ذہن کو مل ہی رہے جو خود تعزیرات ہند میں ایسے مجرموں کے لئے درج ہے[2] ضرورت اِس کی ہے کہ خود رنگون میں بھی یہ تحریک زور و قوت کے ساتھ اُٹھائی جائے،

مولانا ظفر احمد صاحب اگر رنگون میں ہوں اور جناب والا کوئی مضائقہ نہ خیال فرمائیں تو انھیں بھی تحریر فرما دیا جائے۔(۳) یہ مسئلہ تو ایسا ہے، جس پر ہر فرقہ اور ہر طبقہ مسلمانوں کا متحد و متفق ملے گا۔(۴)

کل شام کو نماز میں سجدہ سے سر اُٹھا ہی رہا تھا کہ یک بیک بڑے زور کی گرج ہوئی، زبان پر اضطراراً آیۂ کریمہ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ الخ آ گئی۔ نماز اس سے کہیں ٹوٹ تو نہیں گئی۔(۵)

اپنے متعلق ایک عرض یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک اچھے اچھے خواب بہ کثرت دیکھا کرتا تھا۔ کبھی اپنے کو مصروف عبادت پاتا، کبھی اولیاء و صالحین سے ہم کلام دیکھتا، اب اِن خوابوں میں بہت کمی آ گئی، یہاں تک کہ خود جناب کو یا مولانا مدظلہ کو بھی مدتوں سے نہیں دیکھا۔ خواب کوئی امر اختیاری نہیں اور اس لئے آپ ہی کی تعلیم کے طفیل میں اس معصیت کی طرح تو متاسف نہیں، تاہم ایک دولت سے محرومی پر اس سے بعض اوقات ایک حسرت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔(۶)

علوم و معارف کے خزینہ دار کے ہاں سے جواب میں دیر یا کمی کی وجہ ہو ہی کیا سکتی تھی۔ جواب فوراً آیا:-

(۱) اللہ تعالیٰ اس عنایت پر جزائے خیر دے۔ بحمداللہ تعالیٰ میں خیریت سے ہوں۔

(۲) خدا کے لئے ضرور کوشش کیجئے۔ گو آپ کو میرے اس لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ لکھنا بھی اُسی ہیجان کا اثر ہے جو ہر مسلمان کو اس ناپاک ناول سے ہونا لازمی ہے۔

(۳) میں ضرور لکھوں گا اور آج ہی لکھوں گا۔ اور وہ وہاں کے سب ذی اثر اپنی جان لڑا دیں گے۔

(۴) بیشک ایسا کون ہو گا جو اس میں اختلاف یا سکوت یا صبر کر سکے۔ جتنا جس سے ہو سکے۔

(۵) ٹوٹتی کیوں، اور زیادہ کامل ہو گئی۔

(۶) حسرت ہونا امر طبعی ہے۔ اور دلیل ہے اُن امور غائبہ کی محبت کی جو محمود بلکہ مقصود ہے، گو یہ حسرت مقصود نہیں مگر محمود ضرور ہے۔ اور جس مضرت کا اس حسرت میں احتمال تھا کہ مقصودیت کا اعتقاد نہ ہو جائے، جب یہ اعتقاد نہیں ہے تو محمود محض رہ گئی۔ اسباب ایسے تغیرات کے مختلف ہوتے ہیں، طبعی بھی، حکم و مصالح غیبی بھی۔ اول کو اطباء اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کیونکہ اِن اسباب کا تعلق

اختلاف امزجہ وحصولِ اغذیہ وقوائے نفسانیہ سے ہوتا ہے۔ اور ثانی کو اہلِ طریق سمجھتے ہیں، کاملین تو درجۂ اطمینان میں اور ہم جیسے درجۂ ظن وتخمین ہیں، چنانچہ اسی درجہ میں جو سبب اس تفاوت کا میں سمجھا ہوں وہ معروض ہے۔ وہ یہ کہ اُس وقت رجوع الی الطریق جدید تھا۔ جدید کا اثر طبعاً نمایاں ہوتا ہے بیداری میں بھی، اور بیداری کی تبعیت میں خواب میں بھی۔ اور جُوں جُوں زمانہ گزرتا جاتا ہے باطن میں تو اثرِ حق کا قوی ہوتا جاتا ہے، مگر تاثر طبعی کم ہوتا جاتا ہے۔ اِسی کو مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے ایک ذاکر کی اس شکایت کے جواب میں کہ اب پہلی جیسی لذّت ذکر میں نہیں، فرمایا کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ اور اسی کو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس طرح فرمایا کنا کذالک حتی قست قلوبنا۔ امام غزالیؒ نے اِس قول کے یہی معنی فرمائے ہیں۔ جس وقت تلاوت کے وقت ایک شخص کو روتے دیکھا۔"

ہر ہر خط، مختصر پیمانہ پر سہی، تحقیقاتِ عالیہ کا ایک گنجینہ ہوتا تھا۔

۲۲ر اگست کا عریضہ پھر اُسی گندہ دہن مسیحی مضمون نگار کے سلسلہ میں ہے۔ اور ایک اور فقہی سوال کو لئے ہوئے:۔

م: خیر و عافیت مزاج گرامی کا خواستگار ہوں۔

ا۔ جواب ہر جزو کا ساتھ ساتھ معروض ہے۔ باقی بفضلہ تعالیٰ سب خیریت ہے۔ دُعائے خیر کا طالب ہوں اور آپ کے لئے کرتا ہوں۔

م۔ مولانا ظفر صاحب کا خط رنگون سے جناب کے گرامی نامہ کے حوالہ سے آیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ اِس مضمون نگار نے معافی مانگ لی۔ اور اپنے اسکول میں مُسلم طلبہ کے ساتھ رعایتیں منظور کرلیں، اِس لئے اُسے معاف کر دیا گیا۔ میری تشفی اِس جواب سے نہ ہوئی۔ قانون میں توہین مذہب کی جدید دفعہ (جو مولانا محمد علیؒ کی سعی جمیل سے ابھی چند سال ہوئے بڑھائی گئی ہے) ناقابلِ مصالحت ہے، چوری، ڈکیتی وغیرہ کی دفعات کی طرح۔ یعنی اس کا مجرم ثبوت جرم یا اقبالِ جُرم کے بعد جیل خانے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ اور اقبالِ جُرم تو وہ اپنے معافی نامہ میں کر ہی چکا۔ شرعی حیثیت سے شاتم

رسول کی جو سزا، قاضی عیاضؒ کی الشفا اور ابن تیمیہ کی الصارم المسلول علی شاتم الرسول کے مطالعہ کے بعد، مجھ پر واضح ہوئی ہے، وہ مجھ سا عامی مولانا ظفر جیسے عالم کے سامنے کیا عرض کر سکتا ہے۔ باقی میں تو یہی سمجھتا ہوں، کہ جب قتل پر قدرت نہیں، تو تعزیراً جیل خانہ تو بھجوانا ہی چاہئے[1]۔ یہ سب میں نے اُنھیں لکھ بھیجا ہے، لیکن جناب کا ارشاد بہرصورت مقدّم و مسلّم رہے گا۔

ا۔ رائے تو ہر مُسلمان کی یہی اور حُکم شرعی بھی یہی ہے۔ مجھ کو سوچنے سے یاد آیا کہ وہاں اُسی زمانہ میں اِس میں مشورہ ہوا تھا۔ اکثر باخبر لوگوں نے یہ کہا کہ اب تو وہ مُعافی بھی مانگتا ہے۔ اگر دعویٰ کیا گیا اور عیسائیت کی رعایت میں کوئی پہلو براءۃ کا نکل آیا، حکام کا بالکل بھروسہ نہیں تو پھر اور زیادہ جراٗت ہو جائے گی۔ اِس لئے بادلِ ناخواستہ اِس کو گوارا کر لیا گیا۔ مگر چونکہ ایک جماعت کی صُلح دوسری جماعت پر حُجّت نہیں۔ اِس لئے قانون سے غالباً مُسلمان ہر وقت استغاثہ کر سکتے ہیں خواہ رنگون کے نہ ہوں۔ تو اگر کسی باخبر خیر خواہ اسلام شخص سے مشورہ کر کے لکھنؤ وغیرہ میں دعویٰ دائر کر دیا جاوے اب بھی ممکن ہے۔ جی ٹھنڈا ہو جائے گا اگر کوئی کافی سزا ہو گئی آئندہ جو رائے ہو۔

م۔ ایک فقہی مسئلہ بھی دریافت کرنا ہے۔ مسمّاۃ عائشہ کے پاس اُن کی اُستانی مسمّاۃ فاطمہ نے کچھ روپیہ امانتہً یہ کہہ کے رکھا دیا تھا (حسب بیان عائشہ) کہ اِس سے ہم تم حج کو چلیں گے۔ اب فاطمہ بہت سخت علیل ہیں۔ صحیح طور پر بات کرنے کے ناقابل۔ تو اگر اسی میں اُن کا انتقال ہو گیا، تو وہ روپیہ آیا اُن کے شرعی ورثاء میں تقسیم ہو جائے گا۔

ا۔ جی ہاں۔

م۔ یا عائشہ اُن کی طرف سے حج کرا دیں۔

ا۔ نہیں، کیونکہ کوئی صیغہ وصیّت کا نہیں پایا گیا۔ اور اگر فرضاً پایا بھی جاتا تب بھی اِس

---

[1] مولانا ظفر صاحب کا ایک بڑا مفصّل خط اِس کتاب کے طبع اوّل کے بعد موصول ہوا جس میں پوری تفصیل اِس سزا کی تھی جو مسلمان خود اپنے ہاتھ سے توہین مجرم کو دے چکے تھے اور وہ جیل کی ہر سزا سے بڑھ کر تھی۔

شرط سے وہ وصیت نافذ ہوتی کہ یہ روپیہ اُن کے ثلث ترکہ سے زاید نہ ہوتا۔"

(۴۵)

"حکیم الامت" ایک طرح کی "قلمی" تصویر بھی ہے حضرت حکیم الامت کی مختلف پہلوؤں اور مختلف جہتوں سے۔ لیکن مصوّر کی اِس بے تمیزی کو کیا کیجیے کہ حضرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی سیرت کو بھی بےجا بجا عُریاں کرتا جا رہا ہے! وہ بچنا چاہے بھی تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ ——— مولانا تو اس کے لئے "مُشیر با تدبیر" بھی تھے، اور "پیر روشن ضمیر" بھی۔

اے تو افلاطون و جالینوس ما!

اِن کے آگے تو وُہ نیک بد، بُرا بھلا، گفتنی و ناگفتنی سب ہی کچھ اُگل کر رکھ دیتا تھا۔ اب برسوں کے بعد وہ سب کے دیکھنے اور پڑھنے کے لئے، سب کچھ کیسے چھاپ ڈالے! قلم رُک رُک جاتا ہے۔ طبیعت ہچکچاتی ہے۔ ہمت کا قدم جواب دے جاتا ہے ——— لیکن نہیں، مولانا کے افادات کے کسی جزو سے بھی دُنیا کو محروم رکھنا ناظرین پر ظلم کرنا ہے۔ ہنس لیجئے، طنز کے ٹھٹھے لگا لیجئے، بہرحال آپ بیتی کی ہر ضروری جھلک اِن اوراق پر من وعن ہی نقل ہو گی۔

بیوی، محبوب و قدیم بیوی، چند ہفتے کے لئے اپنے میکے گئی ہوئی ہیں، اور اِدھر اُن کا فراق خاصہ ستا رہا ہے ——— کیسے احمق اور فطرت بشری سے جاہل وہ ناول نویس اور شاعر ہیں، جنھوں نے وصل و فراق کی ساری کیفیتوں کو صرف نوجوانوں یا نئی دُلہنوں کے ساتھ مخصوص و محدود رکھا ہے ——— اِس عالم میں نیا زنامہ حضرت کو لکھا۔ خط پر تاریخ ۴ر ستمبر ۳۳ء کی ہے۔ لکھنے والے کی عُمر مُستحضر کر لیجئے، ۴۰ سال کی۔

م۔ گھر میں آج کل اپنے میکے بارہ گئی ہوئی ہیں۔ اولاد کی محبت پہلے بھی بہت زاید تھی، چھوٹی اولادوں کی مَوت نے اُسے اور بڑھا دیا۔ اور اب جب سے اختلاجی دَورے پڑنے لگے ہیں، بچیوں کی خفیف سی بیماریوں پر بھی بالکل بے قرار ہو جاتی ہیں۔ چھوٹی لڑکی کئی دن ہوئے زکام و بخار میں مُبتلا ہوئی۔ بس اتنی تکلیف بھی دیکھی نہ گئی۔ غش کھا کر کھڑے سے زمین پر گریں،

اور دَورہ پڑ گیا۔ جمل کا زمانہ، اللہ نے یہی بڑا فضل کیا کہ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ یہ سب داستان اس لئے دہرا رہا ہوں کہ شاید کوئی مناسب تدبیر خیال مبارک میں آ جائے۔

ا۔ تدبیر کی حقیقت ہے سببِ مرض کا ازالہ۔ اور یہاں سبب ضُعفِ قلب ہے۔ اِس کا ازالہ جس طریق سے ہو یہی تدبیر ہے۔ اِس کے طُرق مختلف ہیں۔ مقویاتِ قلب، مُفرحاتِ قلب کا استعمال۔ ایسے واقعات کے وقت کسی عاقل کا پاس ہونا، اور جب قرائن سے اِس کا احتمال ہو یعنی کوئی واقعہ ایسا ہو جائے، جس سے ایسے آثار کا شبہہ ہو جاوے، اُس وقت اُن کے دل کو بہلایا جاوے تسلّی آمیز گفتگو کی جائے۔ بزرگوں کے تذکرے، حق تعالیٰ کی حکمت اور رحمت ایسے واقعات میں گوش گذار کی جاویں۔

م۔ یہ سوال تو اُن کے متعلق بہ حیثیت تیماردار میں نے پیش کیا۔ اب دُوسرا سوال اپنے متعلق بہ حیثیت بیمار پیش کرتا ہوں۔ وُہ تو اپنی اولاد کے حق میں بیقرار رہتی ہیں اور میں خود اُن کے لئے۔ یہ آج سے نہیں۔ مدّت سے۔

ا۔ اصل چیز سے موافقتِ سُنّت کی بنا پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اب آگے احوال کی خصوصیات سے آثارِ خاصّہ مُختلف ہوتے ہیں، اِس پر کلام باقی رہا۔

م۔ سن کی زیادتی سے اِس کیفیّت میں کمی نہیں، اضافہ ہی ہے۔

ا۔ محبّت میں کمی نہیں ہوا کرتی، جس چیز میں سن کی زیادتی سے کمی ہو جاتی ہے، وُہ ہیجان نفسانی ہے اور محبّت کی خاصیّت شرابِ جیسی ہے۔

خود قوی تر می شود خمر کہن

م۔ حد یہ ہے کہ چند روز کی مفارقت بھی سخت گراں گذرتی ہے۔ میکے بھیجتا ہوں تو اپنے نزدیک ایک سخت مجاہدہ کرتا ہوں۔ دُوسروں پر حیرت ہوتی ہے کہ مہینوں بے تکلف اپنی بیویوں سے جُدا رہتے ہیں۔

ا۔ تو اُن سے حقوق بھی نہیں ادا ہوتے اِلّا نادراً۔ والنادر کالمعدوم۔ اور اگر حقوق بھی ادا

ہو جائیں تب بھی ایک لذت سے محروم ہیں - ان پر رشک کیسا،

م - اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ چند روزہ جدائی میں تو دل پر بن جاتی ہے، تو دائمی جدائی کے وقت کیا گذرے گی -

ا - اوّل تو مومن کی منجانب اللہ اعانت ہوتی ہے - دقوع کے وقت اللہ تعالیٰ کا تعلق ایسا غالب کر دیا جاتا ہے کہ دوسرے تعلقات مغلوب ہو جاتے ہیں - گو حزن طبعی کسی درجہ میں رہے - جیسا کہ موت کی کراہت حیات میں کسی درجہ میں ہوتی ہے مگر عین موت کے قریب اکثر تو یہ کراہت مبدل بہ شوق اور اقل درجہ میں مبدل بہ گوارا کی جاتی ہے کما ورد فی الحدیث ویشاہد کثیرا -

م - پوری کیفیت عرض کرتے حجاب آتا ہے -

ا - حجاب کیسا -

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو،

م - حدیہ ہے کہ بارہا جنت بھی اس لئے عزیز معلوم ہوئی ہے کہ وہاں ان کا ساتھ بلا اندیشۂ مفارقت رہے گا -

ا - شافعیؒ کی سنت پر عمل نصیب ہوا، وہ فرماتے ہیں جب سے مجھ کو معلوم ہوا کہ جنت میں دوستوں سے ملنا ہوگا مجھ کو جنت کی تمنا ہوگئی - اور راز اس کا یہ ہے کہ جنت لذات ہی کے لئے مقصود ہے، اور لذات میں اعلیٰ لذت محبوب کا قرب ہے - اگر یہ بات نہ ہوتی تو قرآن مجید میں اسباب ترغیب جنت میں یہ نہ فرماتے هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلَالٍ الخ بس اتنی ترمیم کی ضرورت ہے کہ بجائے اس عبارت کے کہ "جنت اس لئے عزیز" یہ عبارت کر دیجئے کہ جنت اس لئے بھی عزیز" الخ

م - دوسروں سے کہوں تو لوگ ہنسیں اور ٹھٹھے لگائیں -

ا - اگر کوئی ایسا کرے تو آپ کے پاس قرآنی جواب ہے اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ -

م۔ نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ خلوت خاص کے وقت دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے یہ دُعا کی ہے کہ جنت میں بجائے حُور کے یہی انعام میں مرحمت ہوں۔

ا۔ یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ بیویاں حُوروں سے افضل و اجمل ہوں گی۔ اور اجمل کی طلب نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف نقل۔ اِتنی ترمیم یہاں بھی کیجئے کہ اگر کسی حکمت سے دونوں عطا نہ ہوں تو بجائے حُور کے الخ

ضمیمہ۔ مَیں نے باوجود جی چاہنے کے اس کی نقل اس لئے نہیں کرائی کر رازہے۔ اگر آپ اِس خط کو چاک کریں تو قصہ پاک ہے۔ اور اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو ایک نقل مجھ کو بھی بدول تصریح نام کے صرف اِس عنوان سے کہ ایک شخص نے یہ سوال کیا، یہ جواب دیا گیا۔ آیندہ جو مصلحت ہو مَیں راضی ہوں۔"

اُس کے بعد کا عریضہ ۱۷ ستمبر کا ہے۔ حاجی محمد شفیع بجنوری وقت کے اچھے بزرگوں میں ہیں[1]۔ مولانا کے شاگرد رشید، اور مولانا فضل الرحمٰنؒ گنج مُرادآبادی اور حضرت حاجی امداد اللہ شاہ مہاجر مکیؒ جیسے کاملین کے مسترشد۔ خود ایک زمانہ میں زبردست صاحب جذب تھے۔ ماشاء اللہ اِس وقت بھی (یعنی ۱۹۵۰ء میں) سلامت باکرامت ہیں۔ حضرت کے متعدد وعظوں میں ان کے کیف و جوش کا ذکر مدح کے ساتھ بغیران کے نام کی تصریح کے ہے۔ آگے کے خط میں ذکر اُن ہی کا آرہا ہے۔ اور بجنور سے مُراد شہر لکھنؤ سے متصل ایک قصبہ ہے۔

م۔ تعمیل ارشاد میں عریضۂ سابق کی نقل بہ حذف اجزائے غیر متعلق دوسرے کاغذ پر کرکے ارسال خدمت ہے۔

ا۔ ممنون ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ ایک جگہ صورت یہ پیش ہے کہ محلّہ کی مسجد میں جو صاحب امامت اکثر اوقات میں کرتے رہتے ہیں، وہ علاوہ امامت کے دوسرے شرائط کے مفقود ہونے کے، قرآن مجید عادۃً اور

---

[1] ستمبر ۱۹۵۱ء میں مکہ معظمہ میں ۸ ذی الحجہ کو رحلت فرمائی۔

مُستقل غلط پڑھتے ہیں۔ مثلاً عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ کی جگہ عَنِ الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ۔ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کی جگہ بِمَا کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کو مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ فَاَصَّدَّقَ کو فَاَصْدَقَ (بلا تشدید صاد) وغیرہا۔ اُن کی امامت سے اختلاف میں نزاع وجدال کی صورت پیش آنا یقینی ہے۔ ایسے میں کیا کیا جائے۔

ا۔ بہتر ہے کہ تنہا پڑھ لی جائے۔ پُوچھنے پر کوئی عُذر کر دیا جائے۔ اور اگر یہ بھی خلافِ مصلحت ہو تو اقتداء کر کے پھر اعادہ کر لیا جائے

م۔ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری کچھ روز ہوئے یہاں تشریف لائے۔ فرماتے تھے، کہ اب لوگ بہت پریشان کرنے لگے ہیں، سکون کا کوئی وقت نہیں ملتا۔ ارادہ ہے کہ تھانہ بھون جا کر مولانا کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیں۔

ا۔ سر آنکھوں پر آئیں۔

م۔ اپنے لڑکے ۔۔۔۔ سے بہت نالاں تھے۔ آبدیدہ ہو کر فرماتے تھے کہ تعلیم وتربیت کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں ۔۔۔۔ کی صحبت میں رہ کر بالکل "مفہور" ہو گیا ہے۔ اور واقعی کہاں باپ کا وہ رنگ، اور کہاں صاحبزادہ کے یہ ڈھنگ۔ حضرت نوحؑ اور اُن کے فرزند کا قصّہ قرآن مجید میں نہ ہوتا تو شاید بعض صالح والدین فرطِ یاس سے دیوانے ہو جاتے۔

ا۔ طبعی تعلق تو ہوتا ہی ہے۔ خود حضرت نوح علیہ السلام کو ہوا۔ پھر راضی بہ قضا ہو رہے۔ اب دو طرح سے اتباع نصیب ہوتا ہے۔ طبعی تعلق سے اور عقلی تفویض سے"

اِس کے بعد کا عریضہ اس لحاظ سے تشنہ و ناتمام ہے، کہ اس میں بعض صرف سوالات ہی ہیں بغیر جوابات کے۔ تاریخ اِس پر ۱۳ر اکتوبر کی پڑی ہے۔

م" حاضری کو کئی مہینے گذر گئے، اور اب پھر دل بہت چاہنے لگا ہے۔ انشاءاللہ دو ہفتہ میں حاضر خدمت ہوں گا، گو وہ ہی ایک روز کے لئے:۔

ا۔ سے ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست ۔۔۔ وگرنہ عاشق مسکین بہیچ خورسند است

م۔ آبائی زمینداری تھوڑی سی ہے۔ انتظام اور دیکھ بھال دوسرے عزیز کرتے ہیں، لیکن بہرحال آمدنی تو میرے ہی صرف میں آتی ہے۔ آمدنی کی مختلف صورتیں دل میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ فقہ کی عام کتابوں میں صریح و واضح احکام مجھ عامی کو نظر آئے نہیں، ممکن ہے زیادہ تفحص و تلاش سے مل جائیں۔ ذیل کی صورتیں عام ہیں :۔

(۱) رعایا جب مکان بنانا چاہتی ہے یا پرانے ہی مکان میں ترمیم، تو زمیندار سے اجازت لینا ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی نذرانہ کی ایک رقم پیش کرنا ہوتی ہے۔ جو اکثر "بہ طیب خاطر" نہیں بلکہ بہ اکراہ پیش کرتی ہے۔

(۲) رعایا میں سے جو پیشہ ور ہیں، اُن سے بھی ہم لوگ منتفع ہوتے ہیں، مثلاً قصابوں سے گوشت کسی قدر رعایتی شرح سے لیتے ہیں، یا گڈریوں سے عید و بقر عید کے موقع پر دودھ کی مقدار بہ طور نذر کے۔

یہ آمدنیاں خدا معلوم کہاں تک جائز ہیں۔ اور یہ دو صورتیں تو محض بہ طور مثال عرض کی گئیں۔ ورنہ خلجان اکثر معاملات میں رہا ہے۔

ا۔ اِن سوالات میں شقوق ہیں تحریر کافی نہ ہوگی۔ انشاءاللہ بروقت ملاقات عرض کرنے سے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اگر یہ پرچہ دکھلا دیا جائے تو اولیٰ ہے، ورنہ زبانی سہی۔

م۔ ایک عزیزہ ہیں جناب کی بڑی معتقدہ بہشتی زیور برابر پڑھتی رہتی ہیں۔ مرید ہونا چاہتی ہیں۔ لیکن شوہر اور خویش و دامن رسوم و بدعات میں غرق ہیں۔ اب وہ بیچاری کشمکش و ترجیح میں ہیں، اور مجھ سے مشورہ کی طالب ہیں۔ اگر اپنے عقیدہ پر عمل کرتی ہیں اور آپ سے بیعت، تو وہ لوگ اسے روکیں گے تو نہیں۔ البتہ اس کے بعد زندگی اُن پر تنگ کر دیں گے۔

ا۔ یہ مرید ہونے کی وجہ سے یا شریعت پر عمل کرنے کی وجہ سے۔ شق اول ہو تو مرید ہونا مناسب نہیں۔ ایک امر غیر مؤکد کے لئے کیوں پریشانی میں پڑیں۔ اور شق ثانی پر میں کیا عرض کروں اُن کے تنگ کرنے کی تفصیل معلوم ہو تو حکم شرعی عرض کروں۔ بہتر ہے کہ یہ بھی زبانی ہی طے ہو جاوے گا۔

اللہ تعالیٰ بہ عافیت ملا دے۔ والسلام۔ دُعاگو و دُعاجو۔ اشرف علی۔"

اب مُلاقات کے وقت خُدا معلوم یہ سوالات زبانی پیش کرنے یاد نہ رہے، یا اُن کے جوابات ملے اور ذہن سے نکل گئے۔ بہرحال اب کوئی صورت ان جوابات کی اشاعت کی نہیں۔ اِن خاتون سے متعلق حضرت رح نے تنقیح خوب قائم کی تھی، شوہر اور سسرال والوں کو اعتراض اتباعِ شریعت پر نہ تھا، حضرت سے تعلقِ بیعت رکھنے پر ہوتا۔

(۴۵)

دُوسرا خط تین ہی دن بعد، ۲۰ر اکتوبر کا ہے ——— طبیبوں کے عامی ہم نشینوں کو بھی طبیب یا نیم طبیب سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور بہت سے لوگ علاج کے لئے اُن ہی کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔ خود انھیں بھی سُنی سُنائی دوائیں کچھ یاد بھی ہو جاتی ہیں، اور کبھی کبھی وہ کام بھی دے جاتی ہیں۔ اِن سطور کے راقم کے نام بھی ایسے ہی خطوط معالجہ کے سلسلہ میں آتے رہتے ہیں۔ اور مدت سے صدق میں "مشورے اور گذارشیں" کا عنوان ہی اُن کے جوابات کے لئے وقف رہتا ہے۔ اصل عریضہ ملاحظہ ہو، حسبِ دستور راسخ تلخیص کے ساتھ:۔

"شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑی مسجد ہے، بلکہ گویا دو تین مسجدیں ہیں، سب کے صحن متصل۔ کچھ ایسا منظر جیسے درگاہ خواجہ اجمیری میں جہانگیری اور شاہجہانی مسجدوں کے اتصال کا ہے۔ مجمع عظیم بھی وہیں کا سا۔ میں وہیں مقیم ہوں۔ اتنے میں ظُہر کی جماعت یک بیک کھڑی ہو گئی۔ میں جب وضو کر چکا، تو اب جماعت میں کہیں جگہ نہیں۔ سب گھری ہوئی۔ درمیان میں البتہ جگہ خالی ہے۔ لیکن وہاں عورتیں اور بچے ہیں۔ میں دل میں پیچ و تاب کھا رہا ہوں کہ اتنی بڑی مسجد اور یہ بے ترتیبی۔ جماعت چاہے ترک ہو جائے، لیکن میں عورتوں کی صف میں یا ان کے پیچھے تو نہ کھڑا ہوں گا۔ خیر کسی طرح ایک کونہ میں جگہ ملی، اور امام نے اُسی وقت سلام پھیر دیا۔ امام سے مجھ سے بڑا فاصلہ ہے شکل کیا دکھائی دیتی، آواز تک نہیں سُنائی پڑتی۔ لیکن معاً یہ القا ہوا کہ امام آپ ہیں، اور مسجد مسجد حرم ہے۔ میں نماز پڑھتا جا رہا ہوں، لیکن توجہ ساری اِس طرف کہ اللہ اکبر!

حرم مکّہ کی امامت جناب کے حصّہ میں آئی۔ یہ خیال کر کر کے لیے انتہا مسرّت ہو رہی ہے، گویا خود مجھے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی۔ آنکھ اِس جوشِ مسرّت میں کھُل گئی۔ وقت چار بجے کا تھا، قبل فجر[1]

لکھنؤ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بیمار ہو کر علاج کے لئے آئے ہیں۔ میرے دوست ہی نہیں، محبُوب بھی ہیں۔ اب اِدھر چند روز لکھنؤ میں اُن کے پاس گذارنے ہیں۔ خُدا کرے وہ جلد شفایاب ہو کر روانہ ہولیں۔ اُس وقت انشاء اللہ حاضری کا قصد کروں گا۔[2]

دُنیا عجب اندھی ہے۔ بہت سے مریض مجھے طبیب سمجھ کر میری طرف رجوع کرتے ہیں۔ بعض سے تو پیچھا چھُڑا لیتا ہوں لیکن بعض کو ایک پُرانے مریض کی حیثیت سے، طبیبوں کی زبان سے سُنی سُنائی دوائیں کچھ اُلٹی سیدھی بتا دیتا ہوں۔ حال میں ایک انگریزی خوان نوجوان نے اپنا حال لکھ بھیجا کہ ایک عزیز قریب لڑکی سے اُنھیں محبّت ہو گئی ہے۔ وُہ لڑکی بھی اُن پر فریفتہ ہے، لیکن بدبختی سے وُہ صاحب خود اس لڑکی کی ماں سے ملوث رہ چکے ہیں۔ اب مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ گُناہ کا کفارہ کیا ہے، نیز آیا اُس لڑکی سے عقد اب جائز ہے۔ بصورتِ انکار لڑکی کی جان کا اندیشہ ہے۔

مَیں نے جواب لکھ دیا کہ ایسی لڑکی حُکماً خود آپ کی بیٹی ہے، اِس سے عقد حنفی مذہب میں تو کسی طرح جائز نہیں، اور محض اس سے بچنے کے لئے مذہب حنفی سے تحوّل بھی جائز نہیں۔ اب آپ کے لئے مشورہ یہ ہے کہ پچھلے گُناہوں پر صدقِ دل سے توبہ کیجئے اور محض زبانی توبہ و استغفار کافی نہیں۔ بلکہ اِس کا عملی ثبوت یُوں دیجئے کہ اس لڑکی سے عقد کا خیال بالکل ترک کر دیجئے۔ ہر نماز کے بعد پانچوں وقت حضورِ قلب اور خشوع کے ساتھ اِس کی دُعا کرتے رہیئے۔ اور بعد نماز عشا دس پندرہ منٹ تک برابر یہ مراقبہ جاری رکھیئے کہ وُہ لڑکی آپ کی بیٹی ہے۔ اور آپ اُس کے ساتھ برتاؤ حقیقی بیٹی کا سا کر رہے ہیں۔ نیز عمل اور برتاؤ سے آج کی تاریخ سے اُس کے ساتھ وہ طرز اختیار رکھیئے جو باپ بیٹی کے ساتھ ہوتا ہے۔ محبّت کے جذبات جس پرورش سے بڑھتے ہیں اُسی طرح عدم پرورش سے کمزور ہو کر تدریجاً فنا بھی ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ذہن میں جب یہ اُتر جائیگا کہ حکماً آپ اس کے والد ہیں، تو اُس کا دِل آپ کی طرف سے ایک ممکن شوہر کی حیثیّت سے

بالکل ہٹ جائے گا، بلکہ ممکن ہے کہ اُسے اُور نفرت پیدا ہو جاوے۔

یہ خلاصہ ہے میرے جوابات کا، سارا قصہ جناب والا کی خدمت میں اِس غرض سے پیش کر رہا ہوں کہ اِس میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو براہ کرم اُن سے مطلع فرما دیا جائے، کہ اب بھی اُن صاحب کو لکھ بھیجوں"۔[۳]

جواب کے لئے انتظار پیدا ہونا امر طبعی تھا، لیکن قبل اِس کے کہ انتظار شروع ہو، جواب بھی آگیا۔ بسم اللہ:۔

(۱) "خیر میں تو جیسا ہوں خود ہی جانتا ہوں مگر آپ یقینی خوش قسمت ہیں کہ ایسے مقام اور ایسی جماعت میں اپنے کو دیکھا۔

(۲) مناظر احسن کے مناظر احسن و اہم ہیں، عجلت نہ فرمائیے جب تک کافی اطمینان نہ ہو جائے۔

(۳) حالت موجودہ میں تو یہی علاج متعیّن ہے۔ سچ یہ ہے کہ میری سمجھ تو یہاں تک پہنچی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو عمل کی توفیق دے اور نفع بخشے۔ ماشاءاللہ سب پہلوؤں کی جامع تدبیر ہے۔ والسلام۔

بعد تحریر سطور ہٰذا ایک نئی بات خیال میں آئی۔ وُہ یہ کہ حق تعالیٰ نے آپ میں حُسن ظن کی صفت غالب فرمائی ہے۔ اِس لئے ممکن ہے کہ آپ نے اِس شخص کی طبیعت کو سلیم سمجھ کر یہ علاج تجویز فرمایا ہو۔ سو اگر واقع میں ایسا ہی ہو تو علاج کے نافع ہونے کے متعلّق میری وہی رائے ہے جو اُوپر کی سطروں میں عرض کر چکا ہوں۔ لیکن اگر طبیعت میں سلامتی نہ ہو، جیسا اِس وقت عام طور پر دیکھا ہے تو یہ طریق عجب نہیں کہ زیادہ مضر ہو اِس لئے اس سے تعلق بڑھے گا۔ پھر تعلق کے بعد رُکنا کارے دارد۔ اِس صورت میں متعیّن علاج یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں میں بتاعد ہونا چاہیئے۔ یعنی پردہ بھی گہرا ہو۔ ایک دُوسرے کی آواز تک کان میں نہ پڑے۔ بلکہ دُوسرے شخص کی زبان سے تذکرہ تک نہ سُنا جائے۔ اِس میں اوّل سخت کلفت ہو گی۔ پھر عادۃ اللہ ہے کہ سکون شروع ہو جاتا ہے۔ خصوص جب اُس کے ساتھ عقد کا خیال بالکل دل سے نکال دیا جاوے اور کسی قدر ذکر و مراقبہ سے بھی کام لیا جاوے۔ اِس تدبیر میں بہت قوت ہو جاوے گی۔ ذکر لا اِلٰہ اِلّا اللہ کا جس قدر

سہل ہو اس تصور کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل نشین ہو رہی ہے، اور مراقبہ عقبیٰ حساب کا۔ یہ سب پہلو آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب آپ اپنی خدا داد بصیرت سے کام لے کر تجویز فرمائیے"۔

اللہ اللہ حق تعالیٰ نے کیسی گہری نظر اور کیسی دقیق بصیرت مرحمت فرمائی تھی! عقلائے فرنگ کو اپنی نفسیاتی تحقیق پر بڑا ناز ہے۔ کیا نفسیاتی دقائق پر نظر حضرت سے بڑھ کر بھی کسی کی ہوگی۔

شروع نومبر میں کسی تاریخ کو تھانہ بھون، غالباً تین روز کے لئے ہو آیا۔ غالباً، اس لئے کہ اب مدت تو یاد نہیں، لیکن عام عادت یہی تھی کہ جب مختصر حاضری ہوتی، تو تین دن کے لئے ہوتی۔ ملفوظات عالی جو کچھ مختلف جلسوں میں ہوئے، وہ تو بالکل ذہن میں نہیں۔ صرف اتنا یاد رہ گیا کہ اب کی بار حضرت کی طبیعت کو ذرا ناساز پایا۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ایک روز صبح کی مجلس خصوصی میں کچھ الفاظ اس طرح کے ادا فرمائے، جس سے معلوم ہوتا تھا، اب اپنا وقت موعود قریب سمجھ رہے ہیں۔ کلمات میں یاس کا پہلو مطلق نہ تھا۔ کچھ اس طرح کا ذکر تھا کہ لکھنے پڑھنے کا کام جو کرنا تھا، وہ کر چکا، یہ کلمات کچھ اس مؤثر انداز میں زبان مبارک سے نکلے، کہ میرا تو دل لرز گیا، اور یہ خیال کر کے کہ شمع اب جلد ہی بجھنے والی ہے، وہیں سر محفل آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ خیر بیماری کے لحاظ سے تو کھانسی بہ شدت آتے ہوئے دیکھی۔ اس سے قدرۃً دل بہت دکھا۔ نزلہ اس زمانہ تک مجھے خود بہت رہا کرتا تھا۔ ایک آدھ تدبیر جو اپنے حق میں تجربہ سے مفید ثابت ہوئی تھی، حضرت کو بھی بتا آیا۔ مثلاً یہ کہ پانی جب نوش فرمایا جائے، تو ناک بند کر کے۔ اور عناب ولایتی برابر منہ میں پڑے رہیں، کہ ان کا عرق آہستہ آہستہ حلق میں جاتا رہے۔

ایک خاص بات اب کی یہ رہی کہ ایک مجلس میں مشائخ قابل بیعت کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے خیال میں اس وقت کون کون صاحب اس کے اہل ہیں۔ فرمایا کہ کسی وقت پرچہ پر لکھ کر دیدوں گا۔ چنانچہ اسی دن ایک چھوٹے سے پرزہ پر یہ ۳ نام اسی ترتیب سے لکھے ہوئے مرحمت ہوئے:۔

مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری۔

مولانا الٰہی بخش صاحب بہاول نگر۔ ریاست بہاولپور۔

مولانا محمد الیاس صاحب۔ نظام الدین۔ دہلی۔

مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث، سہارنپور۔

حافظ فخر الدین اسٹیشن ماسٹر۔

مولانا عاشق الٰہی صاحب۔ میرٹھ کمبوہ دروازہ۔

مولانا انور شاہ صاحب۔ ڈابھیل سورت۔

مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث دیوبند۔

مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دارالعلوم۔ دیوبند۔

یہ لازم نہیں کہ حضرت کی یہ رائے اِن سب صاحبوں کے متعلق آخر وقت تک بھی قائم رہی ہو، بہرحال شروع نومبر ۱۹۴۳ء تک تو یہ حضرات مولانا کے معیارِ انتخاب پر پُورے اُتر رہے تھے۔ لکھنؤ کے ایک مشہور معاصر بزرگ کو حضرت نے ایک بار اپنی مجوزہ فہرست میں جگہ دی تھی۔ بعد کو جب اِن بزرگ کے مزید حالات حضرت کے علم میں آئے تو اُن کا نام اِس فہرست سے خارج کر دیا۔

وطن آتے ہی دریافت خیریت کا کارڈ لکھا۔ جواب میں چند روز بعد کارڈ خوب مفصّل موصول ہوا۔

"میں سخت شرمندہ ہوں کہ جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی جس کی وجہ عنقریب عرض کروں گا۔ میں ممنون ہوں کہ میری خیریت دریافت فرمائی۔ کھانسی ہلکی تو ہے مگر رفع نہیں ہوئی۔ علاج برابر جاری ہے۔ آج ایک دوا اور منگائی ہے جو پہلے بھی نافع ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اب جلد ہی صحت ہو جائے گی۔ عناب اُسی روز سے بالالتزام استعمال میں ہیں۔ ہر وقت جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ ناک بند کرنے کی پابندی یاد نہیں رہتی۔ جس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی ٹھنڈا پانی بالکل بند ہے۔

اب وجہ تاخیر جواب کی عرض کرتا ہوں، آپ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص صالح مصلح ندوہ کے لئے اگر ذہن میں آوے مطلع کیا جائے۔ مجھ کو تب ہی سے خیال تھا مشورہ بھی کرتا رہا۔ آخر ایک شخص ذہن میں آگیا، مگر اُن کا پتہ یاد نہ تھا۔ مولوی طیب صاحب آنے والے تھے، احتمال تھا کہ

شاید اُن کو یاد ہو۔ اُن کے انتظار میں دیر لگی۔ وہ آئے معلوم ہوا اُن کو بھی یاد نہیں بلکہ ناظم دیوبند میں محفوظ ہے جو مولوی طاہر صاحب ناظم رسالہ القاسم سے معلوم ہوسکتا ہے سو اگر دل چاہے مولوی طاہر صاحب سے پتہ دریافت فرما کر اُن کو خط لکھ دیا جائے اور ضروری امور طے کر لئے جائیں۔ اُن کا نام ہے مولوی میرک شاہ کشمیری۔ باقی کوئی نیا حال نہیں بھائی صاحب کی صحت کے لئے دُعا کرتا ہوں۔"

حضرت کی صحت اتنی اچھی رہا کرتی تھی کہ شاید کھانسی کا آنا ایک بالکل نئی بات معلوم ہوتی ——— اور صحت اچھی بھی کیوں نہ رہتی۔ قواعد صحت کا اتنا لحاظ رکھنے والا، اور اتنا حفظانِ بدنی بھی تو کوئی ہوسے پرہیز گار" حضرت اپنے متعارف معنی کے علاوہ خالص طبی حیثیت سے بھی تھے۔ اب حضرت کا سن کچھ اوپر ستر سال کا تھا۔ لیکن قویٰ بحمداللہ اتنے اچھے تھے کہ پچاس کے سن والے کا ہاتھ اگر پکڑ لیتے تو وہ چھڑا نہ سکتا۔

(۴۶)

۱۶ر نومبر کا عریضہ اپنے ایک سوال کے جواب کے لحاظ سے بڑی اور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ افسوس ہے کہ اخباری معترض کے اصل اعتراضات محفوظ نہ رہے۔ اور اُن کے بغیر جوابات کا بھی پورا لطف نہیں آسکتا، تاہم جواب کے سیاق عبارت سے اعتراض کی نوعیت بالاجمال تو سمجھی ہی جاسکتی ہے:۔

"ایک تراشہ پیغام صلح کا ملفوف ہے۔ یہ لاہور کی قادیانی جماعت کا پرچہ ہے، یہ لوگ نسبتاً قادیانیوں کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہیں (۱) مضمون کی تمہید میں ذکر عام علماء کا ہے۔ اُسے چھوڑ کر جتنا جزو جناب والا سے متعلق ہے، اِس کا جواب لکھ کر خود اسی پرچہ میں چھپواؤں گا، یہ آپ کی ذات کی نہیں حق کی نصرت وحمایت ہے (۲) اگر جناب والا کے اصول یا مصالح یا معمولات کے بالکل ہی منافی نہ ہو، تو ازراہ کرم اعتراضات کے جواب میں چند مختصر کلمات بطور اشارات تحریر فرما دیئے جائیں، اپنی عبارت میں انھیں لکھ دوں گا، پھر عرض کئے دیتا ہوں کہ یہ دفاع آپ کی ذات کی طرف سے نہ ہوگا، خود دین ومذہب کی طرف سے ہوگا، اِس لئے توقع ہے کہ میرا یہ التماس

رد نہ فرما دیا جائے گا۔[۳]"

ایک بات اب کی زبانی عرض کرنا رہ گئی۔ مکان مسکونہ میں اکثر تیز خوشبوئیں، جیسے اگر کی بتیاں یا لوبان جلنے کی محسوس ہوتی رہتی ہیں، خصوصاً شب کے اوقات ہیں۔ کوئی مادی سبب خیال میں نہیں آتا۔ دیوار کے نیچے ہی ایک مزار ہمارے خاندان کے مورث اعلیٰ کا ہے، جو آج سے ۵ سو سال قبل ایک نامور چشتی نظامی بزرگ گذرے ہیں۔ کچھ خیال اُن ہی کے مزار کی طرف جاتا ہے۔ قبر کھلے ہوئے احاطہ میں ہے۔ چھت وعمارت، وغیرہ کی سخت ممانعت کر گئے تھے۔[۴]"

جواب حسب ذیل عنایت ہوا:۔

(۱) میں اس میں موافقت کرنے سے اس لئے معذور ہوں کہ اُن کے فقر کو معتقدین نبوت مرزا کے ضرر سے اشد سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ لوگ جب نبی کہتے ہیں سب کو نفرت ہو جاتی ہے اور محفوظ رہتے ہیں۔ اور یہ لوگ جب نبوت کی نفی اور ولایت کا اثبات کرتے ہیں تو نفرت نہیں ہوتی اور اشتیاق ہوتا ہے اُس کی کتابیں دیکھنے کا، پھر دیکھ کر گمراہ ہوتے ہیں۔

(۲) خیر یہ تو ایک مستقل بحث ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اگر وہ اس پر پھر لکھے، تو کیا پھر لکھا جائے گا۔ اور یہ سلسلہ کہاں تک چل سکتا ہے۔ تو اس صورت میں کیا نتیجہ۔

(۳) میں چونکہ عبث سمجھتا ہوں اس لئے اپنے دل سے تو نہیں مگر آپ کے شوق سے لکھ رہا ہے۔ مگر آئندہ میں اس سلسلہ میں کوئی شرکت نہیں کر سکتا۔ اس کے نباہ اور عدم نباہ کو خود غور فرما لیجئے۔

(۴) ایسے واقعات کے ایسے اسباب بھی ہو سکتے ہیں مگر عادۃً اُن کو دوام نہیں ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مخفی مخلوق جن وغیرہ اس کا سبب ہو۔ غالباً ایسی تحقیقات مقصود تو نہیں۔"

ڈوالگ پرچوں پر اعتراضات کے جوابات حضرت کے قلم سے ہیں:۔

"جواب نمبر۱۔ جو الزام معترض نے دوسروں پر رکھا ہے یعنی عدم تحقیق، اس میں خود اپنے مبتلا ہونے کی خبر نہیں۔ کیا اس کی تحقیق کر لی ہے کہ یہ نقش و تعویذ میرے لکھے ہیں۔ کیا کسی عبارت سے یہ مستفاد ہوا ہے۔ یا اس پر میرے دستخط ہیں۔ اگر مطبع والے ہی سے پوچھ لیتے تو خبر ہو جاتی۔ میرا

ترجمہ و تفسیر جو میری رائے اور اجازت اور تجویز سے چھپی ہے وہ مطبع مُجتبائی میں چھپی ہے۔ اِس کے بعد لوگوں نے مُختلف اشکال میں اسی سے لے کر اور کچھ تصرّفات و اضافات کر کے چھاپا جس کی نہ مجھ کو اطلاع اور نہ میری اجازت نہ مجھ سے مشورہ لیا گیا۔ اب بتلایا جائے کہ اُس کی نسبت میری طرف کرنا کیسا ہے۔

بہشتی زیور کے مسئلہ کا جواب نمبر ۲ میں ہے۔ اِسی طرح نشر الطیب والا سوال بھی بیخبری سے ناشی ہے۔ جس رسالہ کا یہ مضمون ہے وُہ دوسرے بزرگ کا ہے۔ جن کا نام بھی اِس میں لکھا ہے۔ لطافت کے سبب اِس کو نشر الطیب میں نقل کر دیا گیا ہے۔ تو یہ مضمون اُن ہی کا ہے۔ میری طرف نسبت چہ معنی۔ اور یہ امر نامناسب تھا کہ اس کا صرف وُہ حصّہ چھوڑ دیا جاتا کہ تصرّف تھا دُوسرے کے کلام میں حفظ الایمان کا جواب بھی نمبر ۲ میں ہے۔

جواب نمبر ۲۔ ضابطہ کا تو جواب ہو گیا کہ دوسروں کے کلام کو میری طرف منسوب کرتے ہو یہ کہاں کی تحقیق ہے۔ باقی تبرعاً میں اُن اصحاب مضامین کی طرف سے کہتا ہوں کہ قرآن کی آیات کا رقیہ میں استعمال کرنا حدیثوں میں وارد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع سے لدیغ کا قصّہ منقول ہے۔ تو اگر کسی نے تجربہ کی بناء پر یا بزرگوں کے کلام سے نقل کر کے بطور حواشی لکھ دیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ بلکہ اکثر جہلا تو کفّار و مُشرکین سے ایسے امور میں رجوع کرتے ہیں اُن کی حفاظت ہو گئی۔ اِسی طرح نشر الطیب کی طرف جس مضمون کی غلط نسبت کی ہے، اگر کسی بزرگ نے بطور نکتہ اور لطیفہ کے اپنے ذوق عاشقانہ سے لکھ دیا جو نہ کسی نص کے خلاف نہ کسی دلیل عقلی کے خلاف، تو کیا خرابی ہوئی۔ خصوص جب کہ ذوق مُؤیّد بالمشاہدہ ہے۔ چنانچہ معلوم ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام اور حضرت زلیخا کا جو حال ہوا وہ کسی کا بھی نہیں۔ یعنی عموماً اور دواماً نہیں ہوا۔ گو زنانِ مصر پر دفعتہً وقتی اثر ہوا لیکن جیسا استمراری اثر ان دونوں پر ہوا ایسا دُوسروں پر نہیں ہوا۔ اِسی طرح دُوسرا جزو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عاشق نہ ہونا غیرتِ الہٰی کے سبب ہوا اس کی اصل دلیل تو ایک بزرگ کا ذوق ہے۔ باقی تائید اس کی اِس طرح ہے کہ

حضورؐ سب کمالات میں سب انبیاءؑ سے افضل ہیں، تو حُسن میں بھی۔ پھر اس کے آثار کا اس قوت کے ساتھ ظاہر نہ ہونا اس کا سبب بجز اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِن آثار کو ظاہر نہیں فرمایا، جس میں ضرور حکمت تھی۔ اِس حکمت کا نام غیرت الٰہی رکھ دیا تو کون سا گُناہ ہوا۔ پھر آخیر بات یہ ہے کہ جب مرزائیوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ اب بھی بندوں سے کلام فرماتا ہے تو اگر اُن بزرگ سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات فرما دی ہو تو کیا محال ہے۔

تتمہ جواب نمبر ۲۔ اب رہ گیا اعتراض بہشتی زیور و حفظ الایمان کا سو اس کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ اگر معترض کو حاصل ہے تو وہ مخاطب ہیں۔ ورنہ کیوں خود تکلیف اُٹھائی اور کیوں اَوروں کو تکلیف دی۔ قابل غور ہے کہ اگر میاں بیوی پاس ہوں اور بچہ ہو تب بھی اس کی کیا دلیل ہے کہ بچہ اسی کا ہے۔ بجز اس کے کہ اِن میں باہم نکاح ہوا ہے اور حالت ایسی ہے کہ صحبت ممکن ہے۔ حدیث الولد للفراش کے یہی معنی ہیں۔ غرض دلیل نقلی ہے اور امکان عقلی۔ یہی بات یہاں ہے کہ نکاح بھی ہوا ہے۔ اور امکان عقلی گو استبعاد ہے لیکن استبعاد سے امکان کی نفی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ مخفی آ کر بیوی سے مل لیتے ہیں تسخیر جن یا کسی بزرگ کے خارق سے بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ تو تحقیقی جواب ہے۔ باقی قانونی جواب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اِس کا بچہ ہے، یہ معنی نہیں کہ واقع میں ایسا ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ قانوناً اُس کا ہے۔ اور قانون عقلاء کا بھی اِسی کے موافق ہے۔ چنانچہ اگر ایسی ہی صورت میں باپ کی اگر کوئی جائداد ہو اور وُہ عدالت میں درخواست دیدے کہ فلاں لڑکا میرا ہے میرے مرنے کے بعد اِس کو جائداد ملے۔ یا درخواست بھی نہ دے مگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس کی منکوحہ سے ہے تو کیا اس کو جائداد اسی بنا پر نہ ملے گی۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ محض اِس استبعاد پر اُس کو ولد الحرام اور بیوی کو زانیہ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب اِس میں کیا اعتراض رہا۔ رہا حفظ الایمان کی عبارت کا مطلب، سو جس نے سمجھ لیا وہ اعتراض ہی نہیں کر سکتا، اِس میں جو یہ عبارت ہے کہ ایسا علم تو زید و بکر الخ ایسا سے مُراد علوم نبوی نہیں بلکہ بعض غیوب کا علم ہے۔ اب بھی اگر اس کی سمجھ میں نہ آوے تو اغبیاء کا کیا علاج ؟"

۳۰۔ دسمبر کے عریضہ اور اس کے جواب کو اس سابق نیاز نامہ سے بالکل متصل اور اسی سلسلہ کی دوسری کڑی ہی سمجھنا چاہیئے۔

"عریضۂ سابق کا جواب باصواب، پاکر دل سے شکر گزار رہوا۔ لاہوری پرچہ کے جواب میں انشاءاللہ اس انداز سے لکھا جائے گا کہ انھیں زیادہ گنجایش ہی اُلجھاؤ سے پیدا کرنے کی نہ رہے گی۔ بالفرض یہ توقع نہ بھی پُوری ہوئی، جب بھی اپنا تو کچھ گیا ہی نہیں، ایک فرض ادا ہو گیا۔ بہر حال یہ عریضہ اظہار شکر کے لئے ہے[1]

ایک انگریزی خوان کی طرف سے سوال آیا ہے کہ حدیث میں یہ جو ذکر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان ؓ سے مشرکین کی ہجو کہلائی۔ یہ کسی کی ہجو کہلانا اخلاق پیمبری سے بہت فروتر معلوم ہوتا ہے۔

مَیں اس کا جواب یہ لکھ رہا ہوں کہ ہجو علی الاطلاق ہرگز معیوب و مذموم نہیں، اگر کسی غرض صحیح سے ہے تو جب قتال تک جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب و فرض ہے تو ہجو تو اس سے بہت ہلکی چیز ہے، خصوصاً جب کہ ہجو کا مقصد اپنے ذاتی دشمنوں سے نہیں بلکہ دشمنان دین وحق سے انتقام لینا ہو، اور تجربہ سے اس حربہ کا مؤثر و کارگر ہونا ثابت ہو چکا ہے[2] اس جواب میں اگر اضافہ کی ضرورت ہو، تو ایما فرمایا جائے۔"

جواب متصل ہی پڑھیئے:۔

(۱) ایک بات اور خیال میں آئی، وہ پہلے لکھنے سے رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ جیسے بعض امور میں دوسروں کے افعال میری جانب منسوب کئے اسی طرح تمام فقہاء کا لکھا ہوا مسئلہ ثبوت نسب کا میری طرف منسوب کیا۔ پس جو جواب مَیں نے لکھا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں، بلکہ تبرعاً فقہاء کی طرف سے لکھا ہے۔ بلکہ حفظ الایمان کا الزام یہ بھی اسی قبیل سے ہے کیونکہ اسی کے قریب قریب عقاید کی کتابوں میں عبارت ہے۔ بسط البنان و تغییر العنوان میں موجود ہے، دیکھ لیجئے (پھر وہ عبارت میں نے خود دوسرے پرچہ پر نقل کر دی) فی شرح المواقف۔ الموقف السادس۔ المرصد الاول۔ المقصد الاول

فی جواب الفلاسفة وَ قُلنا انا و کَرتم مردودٌ بوجوهٍ اذا الاطلاع علیٰ جمیع المغیبات لا یجب للنبی اتفاقاً بیننا وَ بینکم ولهذا قال سید الانبیاء وَ لَو کُنتُ اَعلم الغیب لاستکثرت من الخیر و ما مسنی السوء والبعض الاطلاع علی البعض لا یختص به لیس بالنبی۔

انصاف درکار ہے۔ کیا لا یختص کا وہی مفہوم نہیں ہے جو عبارت حفظ الایمان کا ہے؟ اور اس عبارت سے بھی اصرح و اشبہ مطالع الانظار شرح طوالع الانوار للبیضاوی کی عبارت ذیل ہے جو صفحہ ۴۰۰ طبع استنبول و صفحہ ۱۹۹ طبع مصر میں ہے حکماء کے جواب میں وان اراد به الاطلاع علی بعضها فلا یکون ذلک خاصة النبی اذ ما من احد الا و یجوز ان یطلع علی بعض الغائبات۔

خط کشیدہ عبارت میں زید و بکر و صبی و مجنون سب آ گئے۔

اگر جواب نہ لکھا ہو اس وقت اس مضمون کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔ اور ایک بات اور یاد آئی، کہ مسئلہ ثبوت نسب میں جو معترض نے یہ شبہہ نکالا ہے کہ اس سے باب زنا مفتوح ہو جائے گا اس لئے مہمل ہے کہ حقیقت میں معاملہ بالعکس ہے جس کا شوہر حاضر ہو اس کے زنا کا تو پتہ بھی نہیں لگتا، اس میں زیادہ احتمال ہے فتح باب زنا کا، اور غایب زوج والی تو ڈرے گی کہ میں بدنام ہو جاؤں گی، اور اس دقیق مخدر کو کون قبول کرے گا۔

(۲) الاضافة فی الجواب۔ قولہ ثابت ہو چکا ہو گا چنانچہ اس حکمت کی طرف خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ قریب بصراحت فرمایا ہے حیث قال اهجوا قریشاً فانه اَشَدُّ علیها من رشق النبل وقال صلی اللہ علیه وسلم ان روح القدس یؤیدك ما نافحت عن الله ورسوله وقال صلی الله علیه وسلم هجاهم حسان فشفی واشتفی (مسلم فضائل حسان) وقال النووی فیه جواز الانتصار من الکفار وقال فیه جواز هجو الکفار ما لم یکن امان وامر صلی الله علیه وسلم بهجاءهم الی قوله فالمقصود منه النکایة فی الکفار وقد امره الله تعالیٰ بالجهاد فی الکفار والاغلاظ علیهم وکان هذا الهجو اشد علیهم من رشق النبل

فکان منذوباً لذلک معما فیه من کف اذاھم بیان نقصہم والانتصار بھجائہم المسلمین

قال العلماء ینبغی ان لایبدء المشرکون بالسب والھجاء مخافۃ من سبہم الاسلام واھلہ

قال اللہ تعالیٰ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم ولتنزیہ

السنۃ المسلمین عن الفحش الا ان تدعوا الی ذٰلک ضرورۃ لابتداءھم بہ فکیف

اذاھم ونحوہ کما فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اِس عبارت میں اِس حکمت کی شرح

اور آداب و شرائط بھی جمع کر دیئے گئے اور ایک حکمت زائد بھی بتلائی۔ فی قولہ مع مافیہ من

کف اذاھم فی قولہ فیکف اذاھم۔ یعنی کفار کی جرأت اور زیادتی کا روکنا بھی مقصود

تھا۔ کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ہم کہیں گے تو اس سے زیادہ سُنیں گے تو پھر اُن کی ہمت

ٹوٹ جائے گی تو اس میں مُسلمانوں کی حفاظت ہے اور اہل حق کی حفاظت شر و ایذاء سے عِلم اخلاق

مطلوبہ سے ہے۔ اور یہ حکمتیں فلسفیانہ ہیں۔ اور ایک حکمت صُوفیانہ بھی نہایت لطیف ہے، وُہ یہ کہ

خود بدلہ لینے سے اُن پر غضب خداوندی شدید ہوتا۔ اور انتقام لینے سے اِس میں تخفیف ہو جاتی

ہے۔ تو اس میں عین اُن کی خیر خواہی ہے۔ دلیل اِس شدّت وخفت کی ایک حدیث ہے کہ حضرت

عائشہؓ کی کسی نے چوری کی۔ انھوں نے بددُعا کی۔ آپ نے فرمایا بددُعا کرنے سے اس کی

عقوبت میں تخفیف ہو جائے گی۔ اور آپ کی اسی حکمت کی نظیر دوسری حدیث میں ہے کہ مرض

وفات میں گھر والوں نے آپ کے دہن مبارک میں دوا ڈالی اور منع کرنے پر بھی ایسا کیا۔ آپ نے

اپنے سامنے سب کے مُنہ میں دوا ڈالنے کا حُکم دیا رواہ البخاری فی باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلّم

ووفاتہ۔ وہاں محققین نے یہی حکمت بیان فرمائی ہے کہ اگر آپ انتقام نہ لیتے تو اُن پر کوئی وبال

نازل ہوتا۔ آپ نے اُن کو بچا دیا۔ غرض یہ ہے کہ آپ کا اصلی مذاق تو یہ تھا کہ حدیثوں میں وارد

ہے کہ آپ سے کفار کے لئے بددُعا کرنے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ اور اصلی

مذاق کے خلاف جہاں ہوگا کسی قوی عارض کی وجہ سے ہوگا۔

یہ بحثیں ختم ہوئیں، تو ایک دوسری بحث چھڑی، خاصی طویل ــــــ کلمہ گو فرقوں کی تکفیر کے باب میں (اُن کی ساری گمراہیوں اور زیادتیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی) مجھے شرح صدر کبھی نہیں ہوا، اور اب تک بھی نہیں ہے، چنانچہ اِس بارہ میں اس عامی کا مسلک اپنے اکابر سے بہت بڑی حد تک اب بھی الگ ہے۔ میرے ۳ر دسمبر کے عریضہ کے جواب میں مولانا کا والا نامہ مولانا کے مسلک کا ترجمان ملے گا:۔

م۔ "پیغام صلح" نے میرے خط کا نہ جواب دیا، نہ اپنے اخبار میں چھاپا۔ خیر، خدا کرے دِل ہی میں ندامت ہوئی ہو۔

ا۔ متردد یا جاہل بہ جہل بسیط نادم ہو سکتا ہے اور جاہل بہ جہل مرکب نادم نہیں ہوتا۔ اگر آپ کی رائے میں ضرورت کا مقتضی ہے آپ کا اخبار موجود ہے۔ باقی میرا مذاق تو معلوم ہی ہے۔

م۔ ایک نوجوان انگریزی طالب علم نے آیۂ کریمہ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا پر سوال میرے پاس بھیجا ہے کہ ایک نبی کی عصمت کاملہ پر اس سے شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ میں نے مختلف تفسیریں اُلٹ پلٹ کر دیکھیں۔ امام رازیؒ کی تقریر سب سے بہتر نظر آئی، لیکن بیان القرآن کی اس سے بھی بڑھ کر رہی۔ ماشاء اللہ ہر پہلو سے جامع و تشفی بخش ہے۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء

ا۔ میں آپ کے خوش ہونے سے خوش ہوا۔ اور خوش ہو کر تفسیر منگا کر دیکھی۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کیا۔ باقی میں کیا بلا ہوں ؎

اینہمہ مستی و مدہوشی نہ حد بادہ بود ｜ باحریفاں انچہ کرد آں نرگس مستانہ کرد

م۔ ایک فتویٰ تکفیر شیعہ کی نقل ملفوف ہے۔ اِس پر علاوہ دوسرے اکابر علماء کے ہمارے مولانا کے دستخط ثبت ہیں۔ کیا عرض کروں، مجھے شرح صدر اب بھی نہیں۔ شیعوں کو مبتدع، فاسق العقیدہ، گمراہ، اور جو کچھ بھی کہہ لیا جائے، لیکن کافر اور خارج از اسلام کہتے دِل لرز اُٹھتا ہے۔

ا۔ یہ علامت ہے آپ کی قوت ایمانیہ کی۔ مگر جنھوں نے یہ فتویٰ دیا ہے اُن کا منشا بھی وہی

قوت ایمان ہے۔ کہ جس کو ایمانیات کا منکر دیکھا بے ایمان کہہ دیا۔

م۔ اگر سب گمراہ فرقے یوں ہی خارج از اسلام کیے جاتے رہے تو مسلمان رہ ہی کتنے جائیں گے۔

ا۔ اِس کا ذمہ دار کون ہے۔ کیا خدا نا کردہ اگر کسی مقام میں بکثرت لوگ مرتد ہو جائیں اور تھوڑے ہی مسلمان رہ جائیں تو کیا اِس مصلحت سے اُن مرتدین کو بھی کافر نہ کہا جائے گا۔

م۔ شیعوں سے مناکحت اگر تجربہ سے مضر ثابت ہوئی ہے تو بس تہدیداً اس کا روک دینا کافی ہوگا۔

ا۔ اِس تہدید کا عنوان بجز اس کے کوئی ہے بھی نہیں۔ غور فرما لیا جائے۔

م۔ میرا دِل تو قادیانیوں کی طرف سے بھی ہمیشہ تاویل ہی تلاش کرتا رہتا ہے۔

ا۔ یہ غایت شفقت ہے۔ لیکن اِس شفقت کا انجام سیدھے سادھے مسلمانوں کے حق میں عدم شفقت ہے۔ کہ وہ اچھی طرح ان کا شکار ہوا کریں گے۔

م۔ جو بناء تکفیر قرار دی گئی ہے یعنی عقیدۂ تحریف قرآن۔ اِسی میں تو گفتگو ہے۔ اگر یہ عقیدہ ان کے مذہب کا جُزو ہوتا تو ہمارے قدیم محققین شاہ عبدالعزیزؒ وغیرہ سے مخفی نہ رہتا۔

ا۔ جب اُن کی مسلّم کتابوں سے جُزئیت ثابت ہے، پھر اگر حضرت شاہ صاحبؒ کا سکوت ثابت ہے جس کی مجھ کو تحقیق نہیں تو اُن کے سکوت میں تاویل ہوگی نہ کہ جزئیت میں۔

م۔ بہت زائد خلش مجھے اس کی ہے کہ اب تک ہم آریوں اور عیسائیوں کے سامنے کلام مجید کے غیر محرّف اور محفوظ ہونے کو بطور ایک بالکل مسلّم و ناقابلِ اختلاف عقیدہ کے ہی پیش کرتے رہے ہیں۔ اب اِن معاندین کے ہاتھ میں ایک نیا حربہ آ جائے گا کہ دیکھو خود تمہارے ہی کلمہ پڑھنے والے اور تمہارے ہی قبلہ کو ماننے والے قرآن کو ناقص و محرّف مان رہے ہیں۔

ا۔ اِس سے تو اور زیادہ ضرورت ثابت ہوگئی اُن کی تکفیر کی۔ پھر ہمارے پاس صاف جواب ہوگا کہ وہ مسلمان ہی نہیں۔

م۔ حضرت حاجی امداد اللہؒ کا جو مکتوب سر سید احمد خاں کے نام تھا وہ مجھے انتا پسند آیا

تھا کہ میں نے اُسے اہتمام کے ساتھ ہیچ میں شایع کیا تھا[1]۔ میری فہم ناقص میں اُسی کو معیار رکھنا چاہیئے۔ اور اُسی کے مطابق برتاؤ تمام گمراہ فرقوں سے رکھا جائے۔ یعنی نہ مداہنت، اور نہ ایسی مخالفت کہ اُن میں اور آریوں عیسائیوں میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔

ا۔ لیکن اگر وہ خود ہی اپنے کو کافر بنائیں (بالنون) تو کیا ہم اُس وقت بھی اُن کو کافر نہ بتائیں (بالتاء)۔ دُنیا میں آج تک اپنے کو کسی نے کافر نہیں کہا بلکہ کوئی عیسائی کہتا ہے کوئی یہودی مگر چونکہ ان کے عقائد کفریہ دلائل سے ثابت ہیں اِس لئے ان کو کافر ہی کہا جائے گا۔ تو مدار اِس حکم کا عقاید کفریہ پر ٹھہرا، تو اگر ایک شخص اپنے کو فرقۂ شیعہ سے کہتا ہے اور کوئی عقیدۂ کفریہ اِس مذہب کے اجزاء یا لوازم سے ہے، تو اپنے کو اُس فرقہ میں بتلانا بدلالت التزامی اُس عقیدہ کو اپنا عقیدہ بتلانا ہے۔ پھر عدم تکفیر کی کیا وجہ۔ اور اگر اُن کے ہاں یہ عقیدہ مُختلف فیہ بھی ہوتا تب بھی کسی کی تکفیر میں تردد ہوتا۔ لیکن یہ بھی نہیں، اور جو اختلاف ہے وہ غیر معتد بہ ہے، جن کو خود اُن کے جمہور رد کر رہے ہیں۔ اِس حالت میں اصل تو کفر ہوگا البتہ اگر کوئی صراحتہً کہے کہ میرا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ یا کوئی فرقہ اپنا لقب جُدا رکھ لے مثلاً جو علماء اُن کے نافی ہیں تحریف کے، اُن کی طرف اپنے کو منسُوب کیا کریں مثلاً اپنے کو صدوقی یا قمی یا مرتضوی یا طبری کہا کریں، مُطلق شیعہ نہ کہیں، تو خاص اس شخص کو یا اس فرقہ کو اس عموم سے مُستثنیٰ کہہ دیں گے۔ لیکن ایسے استثناؤں سے قانونی حُکم نہیں بدلتا ہے۔ حُرمت نکاح و حُرمت ذبیحہ احکام قانونی ہیں۔ یہ اِس پر بھی جاری ہوں گے جب تک وہ فرقہ متمیز و مشہور نہ ہو جاوے۔ خصوص جب تقیہ کا بھی شُبہ ہو تو خواہ سوءِ ظن نہ کریں مگر احتیاطاً عمل سوءِ ظن ہی جیسا ہوگا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اِس کا معاملہ اس کے عقیدہ کے موافق ہوگا۔ اگر کوئی ہندو توحید کا بھی قائل ہو اور رسالت کا بھی، لیکن اپنے کو ہندو ہی سمجھتا ہو تو اس کے ساتھ آخر کیا معاملہ ہوگا، یہی حالت یہاں کی ہے۔ ضلع فتحپور میں ہندؤں کی ایک جماعت ہے جو قرآن و حدیث پڑھتے اور نماز روزہ کرتے ہیں، مگر اپنے کو ہندو کہتے ہیں،

---

[1] اِس کا ذکر ان ہی اوراق میں کہیں پہلے گذر چکا ہے۔

لباس اور نام سب ہندؤں جیسا رکھتے ہیں[1]، اگر وہ اپنے کو ہندو کہیں اور اپنا مشرب ظاہر نہ کریں، تو کیا سامع کے ذمہ تفصیل واجب ہوگی۔

م۔ جناب کو ہر معاملہ میں اپنا کچا چٹھا لکھ بھیجتا ہوں، خدا کرے اِس باب میں بھی آپ کا جواب باصواب میرے حق میں ذریعۂ تشفی ہو جاوے۔

ا۔ تشفی کا ذمہ تو مشکل ہے، خصوص اِسی خشیت کا غلبہ خود مجھ پر بھی ہے۔ مگر حضرت جنیدؒ نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے حسین بن منصور کے خلاف فتویٰ لکھا تھا[2] محض حفاظت شرع کے لئے، ہم لوگ بھی ان ہی کے متبع ہیں اور راز اس کا وہی ہے کہ اس رعایت میں سادہ لوح مسلمانوں کی ہلاکت ہے۔ مولوی محمد شفیع صاحب[3] نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع اور نافع رسالہ لکھا ہے۔ بعض اجزاء میں میں بھی اُلجھا۔ مگر اُن کی تقریر و تحریر سے قریب قریب صاف ہو گیا، وہ عنقریب چھپ جائے گا، میں نے اس کا نام رکھا ہے اصول الافکار الی اصول الاکفار۔

م۔ ہاں حضرت ایک ضروری بات اب یاد پڑی۔ ایک بڑے ذی علم معتبر شخص نے حال میں مجھے لکھا کہ جناب نے اپنی کسی تصنیف میں نظر بد کا علاج یہ لکھا ہے کہ اُس کی شرمگاہ دھو کر مریض پر پانی چھڑکا جائے۔ وہ فرماتے تھے کہ اِس علاج میں حدیث نبوی کے لفظ داخلۃ الازار سے حضرت کو دھوکا ہوا ہے، جس کے معنی شرمگاہ کے کئے گئے ہیں، جو صحیح نہیں۔ اُن کا قول تھا کہ یہی دھوکا حضرت سے قبل شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کو ہو چکا ہے۔ انھوں نے تو حوالہ بہشتی زیور کا دیا تھا، مگر مجھے سرسری تلاش میں نہ ملا۔

---

[1] اور سننے میں آیا ہے کہ یہ اثر مولانا ظہیر الاسلام فتحپوری کے حسن تبلیغ کا تھا۔ ڈاکٹر دیس راج، رنجیت سنگھ، آنریبل منشی ایشوری سرن وغیرہ ممتاز رکن کہا جاتا ہے کہ اسی جماعت کے تھے۔ (عبدالماجد)

[2] حضرت نے یہ روایت عام صوفیانہ تذکروں کے مطابق نقل کر دی ورنہ جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے اپنے مکتوب میں مجھے لکھا، حضرت جنیدؒ کی وفات ابن منصور کے واقعۂ قتل سے ۱۲ سال قبل ہو چکی تھی۔

[3] مراد ہیں مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ سابق مفتی دیوبند۔ حال مقیم پاکستان۔

ا- میرے ذہن میں تو یہی تفسیر ہے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف لکھا ہو میں رجوع کر لوں گا۔"

اِس عاجز کا ذہن ان ارشادات عالیہ سے تشفی نہ پا سکا۔ ۱۰ دسمبر کے عریضہ میں پھر جرأت کر کے کچھ عرض کیا۔ اور پھر اُدھر سے کچھ مزید جوابات ملے:-

م- تکفیر شیعہ کے مسئلہ میں ارشادات گرامی سے مستفید ہوا۔ لیکن غالباً پہلے عریضہ میں اپنا مفہوم پوری طرح واضح نہ کر سکا تھا۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ وہ تحریف قرآن کے قائل ہیں، بیشک فتویٰ وہی ہوگا جو آپ حضرات دے رہے ہیں۔ لیکن یہی تو اصل مدار کلام ہے۔ آیا یہ عقیدۂ تحریف قرآن ہے بھی، واقعۃً اُن کے مذہب کا جزو؟ مولانا[1] نے اپنے والانامہ میں تحریر فرمایا ہے کہ مولانا عبدالشکور صاحب کی نظر اس باب میں ہم سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اور ایسا ہی کچھ جناب کے گرامی نامہ سے بھی مترشح ہے۔ تو گویا تکفیر کا مدار ایک عالم کی روایت ٹھہرا۔

ا- نہیں۔ بلکہ اِس فرقہ کی مسلّمہ کتابوں کی متواتر روایات۔ جو کتابیں ہم لوگوں نے نہیں دیکھیں۔ ایک عالم نے دیکھیں۔ مگر مدار صرف اِس کے دیکھنے پر نہیں۔ بلکہ وہ دکھلانے پر تیار رہیں۔ وہ ایک عالم پتہ دینے والے ہیں۔ اِس سے صرف اُن کے قول کا مدار ہونا لازم نہیں آتا۔

م- میرا اصلی اشکال یہی ہے کہ اتنی بڑی اہم روایت جس سے لاکھوں افراد کا خروج عن الاسلام لازم آتا ہے، تنہا ایک راوی کے اعتماد پر (وہ راوی کیسا ہی متدیّن سہی) مان لیا جائے، درآنحالیکہ ہمارے ہاں کے صدہا علماء محققین اُس مذہب کی کتابوں کا ہزار بارہ سو سال سے مطالعہ برابر کرتے آ رہے ہیں، اور اُس فرقہ کی گمراہی پر بھی سب متفق ہیں۔ اور پھر خود اس فرقہ کے علماء اِس عقیدہ سے انکار و تبری کر رہے ہیں۔

ا- تو وہ ان کتابوں کا کیا جواب دیتے ہیں؟ کیا وہ کتابیں مسلّم نہیں؟

م- مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا شاہ عبدالعزیزؒ سب نے ردّ شیعہ میں لکھا ہے۔ لیکن یہ بناء تکفیر کسی نے نہیں تحریر فرمائی۔

---

[1] یعنی مولانا حسین احمد صاحب۔

ا۔ کتابوں کے ہوتے۔ یہ احتمالات کیا قوت رکھتے ہیں۔ کیا عدم التفات اِس کا سبب نہیں ہو سکتا۔

م۔ میری فہم ناقص میں تو یہ آتا ہے کہ اِن سب حضرات کے اقوال میں تاویل کرنے سے یہ آسان تر ہے کہ خود مولانا عبدالشکور صاحب کی تحقیق میں تاویل کر لی جائے، خصوصاً جب کہ مصالحِ ملت بھی اسی کے داعی ہیں۔

ا۔ کیا تاویل؟ اور آیا وُہ اِس تاویل پر مطلع ہو کر قبول بھی کر لیں گے۔ یا وہ تاویل القول بما لا یرضیٰ بہ القائل میں داخل ہو گی۔

مشورہ۔ مولانا عبدالشکور صاحب سے بھی اِن سب خیالات کو پیش فرمایا جاوے۔

م۔ یہ خط بند ہی کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے ڈاک سے مشہور و مُستند شیعہ مُجتہد قاضی نُور اللہ شوستری کی کتاب مصائب النواصب سے حسب ذیل اقتباس بھیج دیا ہے:۔

مانسب الی شیعۃ الامامیۃ	شیعہ امامیہ کی جانب جو عقیدہ تغیر فی القرآن
بوقوع التغیر فی القرآن لیس	کا منسُوب کیا گیا ہے، تو جمہور امامیہ اس کے
من ماقال بہ جمہور الامامیۃ	قائل نہیں۔ یہ قول تو صرف ایک حقیر سی
انما قال بہ شرذمۃ قلیلۃ	جماعت کا ہے، جو قابل اعتناء نہیں!
ولا اعتداد بھم	. . . .

ا۔ اس کا مفصل جواب تو مولوی عبدالشکور صاحب دیں گے۔ مگر مَیں اِس وقت قاضی صاحب کی نسبت اتنا سوال کرتا ہوں کہ اس شرذمۂ قلیلہ کو جمہور امامیہ مُسلمان سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو تصریح دکھلائی جائے۔ اور اگر مُسلمان سمجھتے ہیں تو کافر کو مُسلمان سمجھنا اور تحریف قرآن کے عقیدہ کو کُفر نہ سمجھنا یہ بھی کُفر ہے یا نہیں، اگر نہیں تو کیوں۔ اگر ہے تو جمہور امامیہ کیا ٹھہرے؟"

(۴۸)

وہ طویل مکتوب، ار دسمبر والا ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی چل رہا ہے۔ اور یہ پُورا نمبر بھی اُسی کی

نادر ہوگا۔ بہرحال پچھلے نمبر کی حضرت کی عبارت سے مسلسل آگے پڑھیئے :۔

" جواب سابق جانے کے بعد اس کے متعلق ایک مختصر مضمون اور ذہن میں آیا تھا اگرچہ اس کی چنداں حاجت نہیں مگر ضیافت طبع کے طور پر اس کی نقل جداگانہ کاغذ پر بھیجتا ہوں۔

تنقیح علی اصول الفقہ۔ تکفیر کے دو درجے ہیں۔ ایک فی ما بینہ و بین اللہ یعنی جو معاملات عبد اور حق تعالیٰ کے درمیان ہیں اُن کا مدار تو کفر باطنی پر ہے جس کا بالتعیین کسی پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اور دوسرا درجہ احکام ظاہرہ کے اعتبار سے ہے۔ اس کا مدار قوانین خاصہ پر ہے جو علماء کے کلام میں مدوّن ہیں۔ اس درجہ میں احتمالات غیر ناشی عن دلیل ملحوظ نہیں۔ ورنہ کسی کافر پر جہاد تک بھی جائز نہ رہے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ یہ دل میں مومن ہو اور اظہار کفر میں اس کے پاس کوئی واقعی عذر ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کس قدر خلط خبط لازم آتا ہے۔

توضیح علی اصول الکلام۔ ایمان جس طرح ایک اجمالی ہے، ایک تفصیلی۔ اور دونوں مدار احکام ہیں۔ اسی طرح کفر بھی ایک اجمالی ہے ایک تفصیلی۔ اور دونوں مدار احکام ہیں۔ پس جیسا فرقہ اسلامیہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالایمان ہے گو ایک ایک عقیدہ اسلامیہ کی تفصیل نہ کرے۔ اسی طرح کسی فرقۂ کفریہ کی طرف اپنے کو نسبت کر دینا موجب حکم بالکفر ہے گو ایک ایک عقیدۂ کفریہ کی تفصیل نہ کرے۔ آگے ایک ضعیف سوال رہ جاتا ہے کہ اگر ایسے فرقہ کی طرف اپنے کو منسوب کرے جس کے کچھ عقاید اسلامیہ ہوں کچھ کفریہ اُس کا کیا حکم ہوگا۔ سو قواعد سمعیہ و عقلیہ اس پر متفق ہیں کہ مجموعہ ایمان و کفر کا کفر ہی ہے وَقَدْ صَرَّحَ فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ورنہ دنیا میں ایسا کوئی کافر نہ نکلے گا جس کا ہر عقیدہ کفریہ ہی ہو کثرت سے کفار صانع کے قائل ہیں۔ کثرت سے معاد کے قائل ہیں۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اگر ننانوے وجوہ کفر کی ہوں اور ایک ایمان کی تو ایمان کا حکم کیا جائے گا۔ اس سے مراد کسی ایک ہی قول یا فعل کے وہ وجوہ ہیں جن میں دونوں احتمال ہیں جیسے ایک کلام کے کئی معنی ہوسکتے ہیں۔

م ۔ حال میں ایک دوست کے پاس بسط البنان[1] کا انگریزی ترجمہ دیکھا۔ انگریزی ترجمہ کے لئے اِس خاص رسالہ کے انتخاب کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ انگریزی خوانوں کو اس بحث سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ پھر مترجم صاحب نے ترجمہ بھی (شاید افراط عقیدت کی بناپر) لفظی ہی کیا ہے انگریزی اور اُردو طریقِ ادا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لفظی ترجمہ تقریباً مُہمل ہو جاتا ہے۔

ا ۔ مجھ کو رنگون کے خطوط سے معلوم ہوا کہ کسی بدعتی نے حفظ الایمان پر وعظوں میں میری تکفیر کی۔ مقدمہ عدالت میں گیا۔ وہاں اُس عبارت کے جواب کی ضرورت ہوئی جو خود میں نے جواب لکھا ہے وُہ عدالت میں پیش کرنا تھا، اِس لئے اِس کا ترجمہ انگریزی میں کردیا گیا، عوام کے لئے نہیں۔

م ۔ البتہ اس کے مقابل بڑی خوشی حل انتباہات[2] کو دیکھ کر ہوئی۔ کتاب البتہ انگریزی خوانوں کے ہاتھوں میں جانے کی تھی۔ میں حکیم صاحب کو طبیب حاذق جانتا تھا، یہ خبر نہ تھی کہ میدانِ تصنیف و تالیف کے بھی مرد ہیں۔ ماشاءاللہ خوب لکھا ہے۔ انتباہات اِس حل کے بعد کہیں زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ دِل آپ کی متعدّد تصانیف کے لئے یہی چاہا کرتا ہے کہ کوئی صاحبِ فہم اُن کی شرح اُسی طرح لکھ دے۔ تسہیل المواعظ اور تسہیل قصد السبیل والوں نے محض اتنا کیا ہے کہ بعض مُشکل الفاظ کی جگہ آسان الفاظ رکھ دیئے ہیں۔ شرح لکھنے کا حق حکیم صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ اور اصل ضرورت جس قسم کی شرح کی تھی وہ لکھ دی ہے۔ فالحمد للہ وجزاہ اللہ کاش انگریزی زبان میں بھی اس کے منتقل ہونے کا اللہ تعالیٰ سامان کرا دے۔

یہ کام انگریزی دانوں کا ہے۔ مگر اُن میں دو طرح کے لوگ ہیں۔

کریماں را بہ دست اندر درم نیست　　　خداوندانِ نعمت را کرم نیست

م ۔ لفظ دافعۃ الازار سے متعلق (بہ سلسلۂ عریضہ گذشتہ) عرض ہے کہ لُغت میں اس کے معنی

---

[1] حضرت کا ایک پُرانا رسالہ حفظ الایمان تھا۔ اِس پر اہل بدعت کی طرف سے اعتراضات کا ہجوم تھا، آخر میں حضرت نے اپنی سابق تحریرات کی توجیہات لطیف کرکے اِس رسالہ کا نام بسط البنان رکھ دیا تھا۔

[2] مولانا کے کلامی رسالہ الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ کی قابل قدر شرح از مولوی حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری میرٹھی۔

لباس کے اس حصہ کے ہیں جو اندر کی طرف ہو۔

داخلۃ الازار طرفه الذی یلی الجسد (قاموس)

داخلۃ الازار طرفه الداخل الذی یلی جسده (لسان العرب)

داخلۃ الازار طرفے کہ بہ تن رسد (صراح)

وفی حدیث الزهری فی العائن ویغسل داخلة ازاره قال ابن اثیر اراد یغسل الازار

شرمگاہ کے لئے لفظ داخلة الرجل کا آتا ہے، (لسان العرب)

لیکن یہ قول بھی لغت میں مل گیا۔

وقیل اراد یغسل العائن موقع داخلة ازاره من جسده لا ازاره (لسان العرب)

گویا لغت میں اصل اور صریح معنی تو لباس ہی کے نکلے، باقی ایک قول حصۂ جسم کے متعلق بھی ہے اور ابھی ابھی زمخشری کے لغت غریب الحدیث الفائق پر نظر پڑی۔ اس میں لغت دخل کے تحت ہے۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اراد احدکم ان یضطجع علی فراشه فلینزع داخلة ازاره وروی صنفة ازاره ثم لینفض فراشه فانه لا یدری ما خلفه علیه هی حاشیة الازار التی یلی جسده۔

ا۔ میں نے بھی احتیاطاً مجمع البحار میں دخل و غسل کے مادہ میں دیکھا۔ مختلف فیہ تفسیر ہے۔ البتہ ترجیح غسل ثوب ہی کی تفسیر کو ہے۔ مجھ کو کبھی شبہہ ہی نہ ہوا تھا۔ اب ترجیح الراجح میں لکھوا دیا ہے۔ اور وقت پر شایع ہو جائے گا۔ اور یہ ترجیح تو قواعد روایت سے ہے۔ لیکن قواعد درایت سے ترجیح معنی مجازی کو معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس تدبیر میں بقیہ مغسولات سب اعضاء ہیں دوسرے اگر کوئی صاحب ازار نہ ہو تو وہاں یہ تدبیر مکمل نہ ہو سکے گی۔

م۔ اب کی ترجیح الراجح صفحہ ۵۲ پر، جو النور نمبر ۲ و ۳ کا صفحہ ہے کسی صاحب نے حدیث

لے یہ رسالہ النور میں ایک مستقل عنوان ہوتا تھا۔ حضرت کو جب کبھی اپنی تحقیق سابق میں کچھ ترمیم کرنا ہوتی، اس عنوان کے ماتحت دیدیا کرتے۔

لولاک لما الخ کی کسی حد تک توثیق کرنا چاہی ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ شوکانی نے اپنی الفوائد المجموعۃ فی بیان الاحادیث الموضوعۃ میں اسے موضوعات میں شمار کیا ہے، اور صفحہ ۱۱۶ (مطبعہ محمدی پریس لاہور) پر اُسے درج کرکے لکھا ہے وقال الصغانی موضوع۔ اور بعینہٖ یہی عبارت طاہر الفتنی کی تذکرۃ الموضوعات (مطبوعہ مصر) کے صفحہ ۸۶ پر درج ہے۔

۱۔ اوّل تو بعض حضرات اِن احکام میں متشدد ہوتے ہیں، دوسرے اگر نفی حدیث کو روایت باللفظ پر اور مشیئت حدیث کو روایت بالمعنی پر محمول کیا جائے تو کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ پھر یہ احکام میں سے نہیں، فضائل میں سے ہے، جس میں توسع ہے۔"

اللہ اللہ! کیا زمانہ تھا، جب تحقیقات عالی اور مضامین گرامی سے بھرے ہوئے ایسے لمبے لمبے والا نامے صادر ہوا کرتے تھے! اب وہ دن ہی خواب و خیال ہیں۔ اور ان خوش نصیبیوں کی جگہ صرف اُن کی یاد اور ان کی حسرت لئے ہوئے ہے ؎

اب وفا ہے نہ جفا یاد وفا باقی ہے ۔۔۔ تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانوں کی

حضرت سے اعتقاد کامل رکھنے کے باوجود، جیسا کہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے، میں مقلد جامد نہ تھا۔ اور فقہیات و کلامیات دونوں میں کبھی کبھی اپنی کم نظری سے اپنی ہی بات پر قائم رہتا تھا۔ حضرت نے بھی اِس ڈھٹائی کی خوب اجازت دے رکھی تھی۔

مراسلت کا عام دستور یہ تھا کہ عریضہ نگاری کی ابتداء اِس طرف سے ہوتی، اُدھر سے اُسی خط کے اُوپر حاشیہ وغیرہ میں جوابات لکھ کر وہ خط واپس آجاتا۔ لیکن از راہ کرم و التفات مزید کبھی کبھی اِس دستورِ عام کے خلاف حضرت خود مکاتبت میں ابتدا فرما دیتے، اور ایسا اتفاق عموماً ہر سال ایک آدھ بار ہو جاتا تھا۔ پچھلے والا نامہ کو آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا ہوگا کہ ۲۱ دسمبر کو (۱۹ دسمبر کا چلا ہوا) والا نامہ موصول ہو گیا:۔

"ایک مضمون جواب معہود کے متعلق اور ذہن میں آیا۔ بس میرا اصلی مذاق یہ ہے۔ ازالۂ غلط فہمی کے لئے بڑھایا گیا ہے، اطلاع کے لئے آپ کی خدمت میں بھی لکھنے کو دل چاہا۔

تشریح[1] الجواب علیٰ اصول التصوف۔ جواب بالا مع اپنے کُل اجزاء کے درجہ منع میں ہے۔ یعنی فتویٰ مذکورہ پر جو شبہات تھے، اُن کا جواب ہے۔ جواب بالا خود فتویٰ نہیں۔ چونکہ سرسری نظر میں اس کو فتویٰ سمجھا جا سکتا تھا اس لئے تسہیل امر کے لئے اپنی تحقیق خاص اِس باب میں معروض ہے۔ اور یہ تحقیق باعتبار اپنی حقیقت کے فقہ اور کلام ہی میں داخل ہے۔ مگر باعتبار صورت کے اس کو تصوف سے خاص قُرب و مناسبت ہے۔ اِس لئے عنوان میں اس کا لحاظ رکھا گیا۔ وہ تحقیق یہ ہے کہ اگر کِسی خاص کے متعلق یا کسی خاص جماعت کے متعلق حکم بالکفر میں تردّد ہو خواہ تردّد کے اسباب علماء کا اختلاف ہو، خواہ قرائن کا تعارض ہو یا اصول کا غموض ہو تو اسلم یہ ہے کہ نہ کُفر کا حکم کیا جائے نہ اِسلام کا۔ حکم اوّل میں تو خود اُس کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے اور حکم ثانی میں دُوسرے مُسلمانوں کے معاملات کے اعتبار سے بے احتیاطی ہے، پس احکام میں دونوں احتیاطوں کو جمع کیا جائے گا، یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے نہ اس کی اقتداء کریں گے نہ اس کا ذبیحہ کھائیں گے، اور نہ اُس پر سیاسیات کا فرانہ جاری کریں گے۔ اگر تحقیق کی قُدرت ہو تو اُس کے عقاید کی تفتیش کر لیں گے اور اُس تفتیش کے بعد جو ثابت ہو ویسے احکام جاری کریں گے۔ اور اگر تحقیق کی قُدرت نہ ہو تو سکوت کریں گے۔ اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے۔ اس کی نظیر وہ حکم ہے جو اہل کتاب کی مُشتبہ روایات کے متعلق حدیث میں وارد ہے لاتصدقوا اھل الکتاب ولا تکذبوا ھم وقولوا اٰمنا باللہ وما انزل الینا روا ہ البخاری۔ دوسری فقہی نظیر احکام خنثیٰ کے ہیں۔ یوخذ فیہ بالاحوط والاوثق فی امور الدین وان لا یحکم بثبوت حکم وقع الشک فی ثبوتہ واذا وقف خلف الامام قام بین صف الرجال والنساء ویصلّی بقناع ویجلس فی صلاتہ جلوس المرأۃ ویکرہ لہ فی حیاتہ لبس الحلی والحریر و یخلو بہ غیر محرم من رجل اوامرأۃ اویسافر من غیر محرم من الرجال وان مات لم یغسلہ رجل ولا امرأۃ وتیمم بالصعید ویکفن کما یکفن الجاریۃ "

---

[1] تسہیل (قاموس)

وہ بحث تو ابھی چل ہی رہی تھی، گو اُسے اب اپنی طرف سے ختم کر رہا تھا ——— بزرگوں کے ساتھ اپنا ایک معمول، خود اِن ہی بزرگوں سے سیکھا ہوا یہ بھی رہا ہے کہ وہ ایک بار کے ردّ و بدل کے بعد او باً خود ہی خاموشی اختیار کر لیتا ہوں ——— ایک سیاسی بحث کا بھی ایک نیا پہلو سامنے آ گیا اور کچھ اثر اس کا بھی پڑا کہ حضرت اب اپنے وقت موعود کو بہت قریب محسوس فرما رہے ہیں۔ یہ سارے تاثرات ملے جُلے ہوئے سال کے آخری عریضہ ۳۲ دسمبر ۳۲ء والے میں نظر آئیں گے :-

م۔ گرامی نامہ نے سرفراز کیا۔ اِس شفقت بزرگانہ[۵۱] پر دل خاص طور پر سپاس گذار ہوا۔ ایک علیحدہ پیکٹ میں ایک شیعی عالم کا رسالہ اِس مبحث[۵۲] پر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

ا۔ اب کی بار جواب میں خلاف عادت قدرے دیر ہوئی۔ جس کا سبب یہ تھا کہ ایک وزر رسالہ کے دیکھنے اور اتفاق سے مولوی حبیب احمد آ گئے تھے اُن کے دکھلانے میں صرف ہوا۔ پھر چونکہ اُن کی نظر اس جماعت کی کتابوں پر ہے میں نے اُن سے اِس کے متعلق رائے لکھنے کی فرمائش کی۔ اِس کی نقل میں ایک دن کی دیر ہوئی۔ چنانچہ وہ تحریر بھی ہمراہ ہے۔ اصل رسالہ بھی تطبیق مقامات کے لئے مُرسل ہے۔ مولوی حبیب احمد کی استدعا ہے کہ ایسا ہی رسالہ اگر ممکن ہو بقیمت یہاں بھجوا دیا جائے میں اطمینان سے مفصّل تنقید کر دوں گا۔ یہ اُن کا قول ہے۔ اب میرا قول ہے کہ اگر آ سکے تو اُس کی قیمت میرے ذمّہ ہے۔ مولوی صاحب کے عنوانات کو نہ دیکھئے، مضمون کو رسالہ پر منطبق کر کے دیکھئے اور میری نظر اُن کی کتابوں پر ہے نہیں، میں زیادہ مدد نہیں دے سکتا۔

م۔ جناب کا تو ایک خاص مسلک انزوا و عزلت کا ہے۔ مجھے زیادہ فکر و حیرانی دوسرے علماء سے متعلق ہے۔ خصوصاً حضرات فرنگی محل اور جمعیۃ العلماء، اور سب سے بڑھ کر خود اپنے مولانا کے متعلق۔ اِن حضرات کا شیعوں کا ساتھ سیاسی جلسوں میں برابر رہا کرتا ہے یہ شیعہ رئیسوں کی

---

۵۱ یعنی اب کی مکاتبت میں ابتداء کرنا، اور مسئلہ کا فیصلہ اپنے اصلی مذاق کے مطابق، مسلک تصوّف پر کرنا۔

۵۲ یعنی "تحریف قرآن کی حقیقت" از مولوی سیّد علی نقی صاحب (امامیہ مشن لکھنؤ)

مہمانداری قبول کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں ٹھہرتے ہیں، شیعہ اکابر کو جلسوں کا صدر بناتے ہیں[51]۔ غرض سارا خلا ملا بالکل مسلمانوں کا سا۔ فتوئ تکفیر کے ساتھ ان اعمال کا تطابق میری سمجھ سے باہر ہے۔

ا۔ ایسے برتاوے میں تو میں بھی مبتلا ہوں۔ میں اگر کہیں نہیں جاتا سو وہ تو میرے پاس آتے ہیں۔ میں بھی برتاؤ مسلمانوں جیسا کرتا ہوں صرف اس بناء پر کہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ اور حقیقت اس برتاؤ کی محض خوش اخلاقی ہے[52]۔

م۔ رسالہ استیاء[53] کے خاتمہ پر جو عربی عبارت درج ہوئی ہے اس سے دل بہت متاثر ہوا۔ پچھلے مہینہ زبانی میں نے جناب والا سے یہی مضمون سنا تھا، اس وقت بھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے[54]۔ بلاتشبیہ وہی کیفیت ہوئی جو آیۂ کریمہ الیوم اکملت لکم دینکم الخ کو سن کر حضرت صدیق رض کی ہوئی تھی۔

ا۔ آپ کی عین محبت ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔ میرا دل آپ کے اس تاثر سے متاثر ہوا، جس کا اجر دونوں کے لئے متوقع ہے۔ کیونکہ یہ اثر ہے حب فی اللہ کا۔

م۔ خدا جانے آپ کو کیا کچھ معلوم ہوا ہوگا جبھی تو آپ نے اپنی تصنیف کے خاتمہ کا اعلان فرما دیا۔

ا۔ صرف بڑھاپا اور کچھ نہیں۔

---

[51] چنانچہ رمز قبل لکھنؤ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جلسے بہت دھوم دھام سے ہوئے تھے، ان میں سُنی علماء نہ صرف شیعہ ممبروں کے ساتھ شیر و شکر تھے بلکہ متعدد علمائے کرام مشہور شیعی رئیس، راجہ احمد علی خاں (سلیم پور) کے برابر مہمان رہا کئے۔

[52] یہ یقیناً مولانا کی خوش اخلاقی تھی کہ اپنی مثال دوسرے علماء کے ساتھ پیش کر دی۔ دونوں کے طرز عمل میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔

[53] رسالہ کا پورا نام اب یاد نہیں، بہرحال مولانا نے اس میں یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اب تصنیف و تالیف کا دور ختم ہو گیا۔ [54] ملاحظہ ہو نمبر ۴۶۔

م۔ میں تو خالص اپنی خودغرضی کی بنا پر دُعا کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں، کم سے کم اُس وقت تک تو ضرور ہی جناب کو بھی زندگی عطا ہو۔

ا۔ اور اگر پھر کوئی یہی دُعا کرے تو میں کہاں تک کھنچتا چلا جاؤں۔ یہ دُعا کیجئے کہ وہاں سب مل جائیں۔

م۔ پنجاب سے ایک صاحب نے سچ میں سوال کیا ہے کہ اسلام تو عین سیاست ہے اور جہاد فرض۔ پھر یہ دیوبند والوں نے طلبہ کے لئے سیاسیات میں شرکت کیسے منع قرار دیدی[1]۔ اس کا جواب یہ لکھ رہا ہوں کہ دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایک تو نفس جہاد ہے۔ یعنی ظالم و غاصب بے دین اور دشمن دین حکومتوں سے بہ قدر استطاعت مقابلہ کرتے رہنا، سو یہ تو عین اسلام ہے۔ اور اس سے کسی کو اختلاف نہیں، اب اس کے آگے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اُمّت کے فلاں فلاں افراد، یا فلاں فلاں طبقہ، یا فلاں فلاں ادارے کے لئے خود مصالح اُمّت کے لحاظ سے اس میں شرکت مفید و مناسب ہوگی یا مضر و نامناسب، تو یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کے اندر مسالک و رائے کے اختلاف کی بڑی گنجایش ہے سرپرست مدرسہ و مہتمم مدرسہ کے تجربہ میں اگر طلبہ کی شرکت مضر و نامناسب ثابت ہوئی ہے تو یہ کچھ اس حکمِ عمومی کے منافی نہیں۔ اپنے اس جواب کی بابت رائے عالی چاہتا ہوں۔

ا۔ اپنے درجہ میں یہ بھی اچھی تحقیق اور اچھا فرق ہے خصوص ان مخاطبین کے لئے بالکل کافی ہے۔ مگر چونکہ ہم طالب علم لوگ[2] اپنے درسی اصول پر انطباق کے منتظر رہتے ہیں، اور ایسا انطباق میرے ذہن میں آیا نہیں اس لئے ایک تقریر میں نے لکھی ہے، وہ پیش کرتا ہوں۔ یہ بالکل منطبق ہے۔ محض آپ کی تفریح کے لئے لکھی ہے نہ کہ ان سائلین کے سامنے ظاہر کرنے کے لئے۔ لیکن اگر کوئی جملہ آپ کے مضمون میں داخل ہوسکے اور آپ جزو بنانا چاہیں تو میری طرف منسوب نہ

---

[1] حضرت مولانا اُس وقت تک مدرسۂ دیوبند کے سرپرست تھے۔ سرپرست اور مہتمم کی طرف سے بیان شائع ہوا تھا کہ طلبہ عملی سیاسیات میں حصہ نہ لیں۔

[2] مولانا کے محاورہ میں اس سے طبقۂ علماء مُراد ہوتا تھا۔

فرمایا جائے"۔

خوش تر آں باشد کہ سرِّ دلبراں — گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

دُوسرے پرچہ پر اصل تقریر حضرت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ وہو ہذا :-

تین رفیق سفر کر رہے ہیں۔ کسی مقام پر پہنچ کر دیکھا کہ عین راستہ پر ایک شیر کو تین چار بھیڑیئے لپٹ رہے ہیں اور راستہ بند ہے۔ اُن کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں۔ البتہ اُن کے سامنے اینٹیں اور پتّھر پڑے ہیں۔ ان تینوں میں اختلاف رائے ہوا۔ اور رائے کے اختلاف سے عمل میں اختلاف ہوا۔ ایک کی رائے ہوئی کہ شیر کی امداد کرنا مناسب ہے۔ اگر یہ غالب آ گیا تو طبعاً اس احسان سے متاثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کرے گا۔ اور میں اطمینان سے اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ یہ خیال کر کے اینٹوں سے بھیڑیوں کو مارنا شروع کیا۔ دُوسرے کی یہ رائے ہوئی کہ شیر اکیلا، بھیڑیئے متعدد ہیں۔ غالباً غلبہ ان ہی کو ہو گا۔ اگر ان کی نُصرت کی تو طبعاً یہ اُس احسان سے متاثر ہو کر مجھ سے مزاحمت نہ کریں گے۔ اور میں امن و امان کے ساتھ اپنے راستے چلا جاؤں گا۔ یہ خیال کر کے اینٹوں سے شیر کو مارنا شروع کیا۔ تیسرے کی یہ رائے ہوئی کہ اینٹیں نہ شیر کی مدافعت کے لئے کافی ہیں نہ بھیڑیوں کے لئے کافی ہیں۔ اور ایسی حالت میں اگر منصور مغلوب ہو گیا تو غیر منصور کو خواہ مخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنا لیا۔ اور اگر غالب بھی ہو گیا تب بھی جانور ہے جس کی طبیعت عقل پر غالب ہے، کیا توقع ہے کہ احسان سے متاثر ہو کر رعایت کرے گا، موقع پا کر وہ بھی طبعاً مزاحمت کرے گا۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ جب تک قابلِ اطمینان اپنے پاس مدافعت کا سامان نہ ہو کسی کی نُصرت نہ کی جائے بلکہ جس طرح ممکن ہو اپنی حفاظت کی کوشش کی جائے۔ پھر خواہ غلبہ کسی کو ہو۔ ممکن ہے کہ ہمارے عدمِ تعرض کے سبب یہ بھی تعرض نہ کرے۔ اور اگر تعرض بھی کیا تو اس کا افسوس تو نہ ہو گا کہ ہم نے خواہ مخواہ چھیڑ کر اپنا دشمن بنا لیا۔ اس لئے یہ دونوں سے علیحدہ ہو کر اپنی حفاظت میں مصروف ہو گیا۔ اور جس طرح بن پڑا اُن کی زد سے سکوت و سکون کے ساتھ نکل گیا۔ اور دُور سے چکر کاٹ کر اُسی راستہ پر جا پڑا۔ اب آگے اُس کی قسمت کہ وُہ شیر یا بھیڑیئے وہاں بھی پہنچ گئے۔

یہ تین جُدا جُدا طریقے ہیں جن کو ان تین شخصوں نے اپنے لئے اختیار کیا۔ اگر ان لوگوں نے صحیح قوانین عقلیہ کی مخالفت کی ہو اور نیت بھی کسی کی فاسد نہ ہو تو کسی شخص پر کوئی عقلی ملامت نہیں ہو سکتی اور اگر کسی شخص کو اس کے مجوزہ طریق کا مضر ہونا صحیح دلائل سے بتلا دیا جاوے اور اُس کے پاس کوئی معقول جواب بھی نہ ہو اور وہ پھر بھی اُسی پر مُصر رہے تو پھر وہ ضرور مُستحق ملامت ہوگا۔ یہ مثال ہے بعض خاص معاملات اور آراء کی واللہ اعلم۔ میزان کل مضمون بروایت بعض شعراء مجذون سے

جب کہ وہ مُونڈیوں میں ہو کھٹ پٹ ۔۔۔ اپنے بچنے کی فکر کر جھٹ پٹ''

سیاسیات حاضرہ سے متعلق حضرت کی اصل رائے یہی تھی، جو اس تمثیل کے پیرایہ میں بیان فرمائی گئی۔ یہ مسلک کہاں تک صحیح تھا، اس سے بحث نہ اُس وقت تھی نہ اب ہے۔ بہرحال مولانا کا اصل مسلک اسی تمثیل سے واضح ہو جاتا ہے ــــــ انگریزی حکومت اور کانگریس کے درمیان "رسّہ کشی" میں وہ مسلمانوں کو بالکل غیر جانب دار اور یکسو دیکھنا چاہتے تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خود اپنے اندر ریڑی قوت نہیں پیدا کر لیتے، اُن کا کسی فریق کے ساتھ شامل ہو کر عملی حصہ لینا خودکشی کے مرادف ہوگا۔ اور بار بار زور اسی پر دیتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنے میں قوت و نظم پیدا کریں۔

۱۹۳۳ء

(۵۰)

۳۲ء ختم ہو کر ۳۳ء شروع ہو چکا ہے اور جنوری شروع ہونے سے تین دن پہلے ہی ماہ رمضان المبارک ۵۱ھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ تفسیر بیان القرآن سے کام تو پہلے ہی سے لئے جاتا تھا، اب اور زیادہ لینے لگا ہوں۔ اور جتنا زیادہ کام لے رہا ہوں، گرویدگی بھی اُسی نسبت سے بڑھتی جا رہی ہے۔ عربی کی مشہور تفسیریں اکثر پہلے سے موجود تھیں۔ ایک رُوح المعانی البتہ اب تک نہیں ہے۔ اور اس کا اشتیاق بیان القرآن ہی میں اس کے بار بار حوالہ دیکھ کر بڑھتا جا رہا ہے اور دل میں کچھ نہ کچھ کُرید اب بھی اُسی مسئلہ تکفیر شیعہ کے متعلق باقی ہے۔ ۴ر جنوری (۷ر رمضان) کا عریضہ مع جواب حسب ذیل ہے:۔

م " والا نامہ مع مولوی حبیب احمد کی تحریر کے مل گیا تھا۔ میرے لئے تو خود جناب ہی کے ارشادات زیادہ موثّر رہے۔

ا۔ آپ کی محبت سے مجھ کو اِس کا یقین ہے۔ وہ چونکہ ان مباحث کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، آسانی کے لئے اُن سے لکھوا لیا۔ اور میرا یہی معمول ہے کہ کام کو مقصود سمجھتا ہوں خواہ کسی کی طرف منسُوب ہو۔

م۔ کتاب کئی روز ہوئے ارسال خدمت کر چکا ہوں۔ میرے پاس ایک دُوسرا نسخہ موجود تھا، اِس لئے قیمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ا۔ پہنچ گئی۔ آپ سے کیا انکار ہے۔

م۔ کچھ روز سے ترجمۂ کلام مجید پڑھانا شروع کیا ہے۔ زنانہ درس میں بیوی اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مردانہ درس میں تین چار ملنے والے ہوتے ہیں۔ اندر شیخ الہند کا ترجمہ کام میں رہتا ہے اور باہر آپ کی حمائل مترجم۔ درس سے قبل میں خود دو چار تفسیروں کا مطالعہ کر رکھتا ہوں۔ بیان القرآن سے کام تو عرصے سے لے رہا ہوں، لیکن اب اس ضرورت سے جو اس کو غور سے پڑھنا پڑا، تو اس کی پوری قدر اب جا کر ہوئی۔ ربط آیات میں تو ماشاء اللہ بے نظیر ہے۔ قصۂ ہاروت و ماروت پر جب پہونچا تو طبیعت پھڑک گئی۔ قدیم مفسرین نے تو خوش عقیدگی میں غلو کر کے فرشتوں کا مبتلائے فسق ہونا نقل کر دیا ہے، اور بعض مفسرین حال نے ان فرشتوں کو شیاطین قرار دے دیا ہے۔ افراط و تفریط سے الگ، توسط و اعتدال کی راہ تو بس آپ ہی کی تفسیر میں نظر آئی۔ سبحان اللہ و جزاک اللہ۔

ا۔ آپ کی دعا پر میں بھی دعا دل سے دیتا ہوں کہ جزاک اللہ۔

م۔ ہاں سورۂ یوسف میں اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِہِنَّ عَلِیْمٌ کے تحت میں کید سے مراد زنانِ مصر نہیں بلکہ جنس نسوانی کا کید لیا ہے۔ میرے دل کو تو یہی تفسیر لگی، لیکن یہ قول اور کہیں منقول نہیں دیکھا۔ روح المعانی میرے پاس نہیں، ممکن ہے اُس میں ہو۔ باقی ابن کثیر، معالم، خازن، کشاف، بیضاوی وغیرہ میں تو زنانِ مصر ہی سے مراد لی گئی ہے۔

ا۔ روح المعانی اس وقت دیکھی۔ اس میں ایک قول یہ بھی لکھا ہے۔ گو تضعیف کے ساتھ سو یہ اُن کا ذاق ہے، جو دوسروں پر حجت نہیں۔

م۔ تکفیر شیعہ کے سلسلہ میں ابھی ایک اندیشہ پیش کرنے سے رہ گیا تھا۔ وہ یہ کہ ہمارے محدثین نے اُن کی روایتیں قبول کی ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ دینی امور میں اہل صحاح نے شہادتیں اُن کی قبول کی ہوں جنھیں وہ کافر سمجھتے تھے۔

ا۔ وہ شیعہ اہل غلو نہ تھے۔ ورنہ اہل غلو کی روایت کو تصریحاً رد کیا ہے تمام اصول حدیث میں مسئلہ مصرح ہے۔ ایک عبارت نقل بھی کی لکھوا کر بھیجتا ہوں۔

م۔ دل میں ایک عرصہ سے پال رہا ہوں۔ حسبِ دستور اسے صاف صاف خدمتِ والا میں عرض کئے دیتا ہوں۔ ظناً تو ہر مسلم کو ناجی اور ہر غیر مسلم کو ناری سمجھتا ہوں لیکن بعض اوقات بے اختیار دل یہ چاہتا ہے کہ ایک قطعی جنّتی اور کسی ایک یقینی جہنمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، بیداری میں نہیں خواب میں سہی۔ اِس آرزو کے پورے ہونے کا کوئی امکان ہے؟

ا۔ "گر یقینی جنّتی یا یقینی دوزخی ہونا بدون وحی کے کیسے معلوم ہوگا اور وحی منقطع ہے، تو پھر اس کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

بعض بعض خطوط تمامتر ذاتی اور خانگی باتوں پر مشتمل ہوتے۔ مولانا تو میرے سب ہی کچھ تھے۔ ع

اسے تو افلاطون و جالینوس ما!

اِن میں سے جو خط جوابی کارڈ کی صورت میں ہوتے، اُن کے تو صرف جواب ہی محفوظ رہ گئے ہیں، اور اس کے جاننے کی صورت اب نہیں کہ اصل خط اِدھر سے کیا گیا تھا۔ وہ پوسٹ کارڈ شروع ۱۳۴۲ھ کے اسی قسم کے نکلے۔ ۱۹ رمضان المبارک (۱۳ جنوری) یوم جمعہ کی شام کو گھر میں لڑکی کی ولادت ہوئی۔ یقیناً دوسرے ہی دن حضرت کو اطلاعی کارڈ لکھا ہوگا، مع نام رکھنے کی درخواست کے۔ جواب ۱۷ جنوری کا کارڈ حسبِ ذیل ملا:۔

"تولدِ دُخترِ نیک اختر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ عُمر و صاحبِ علم و صاحبِ عمل و صاحبِ نصیب کرے۔ سوچنے سے سُمَیراء اچھا معلوم ہوا۔ ایک صحابیہؓ کا نام بھی ہے جو قیس کی بیٹی ہیں کذا فی القاموس۔ سُمرت کے معنی مشہور ہیں لونٌ بینَ البیاض والسواد جس کو گندمی رنگ کہتے ہیں۔ اور ایک نام عُفَیراء بھی ہو سکتا ہے۔ عفراء کے معنی بیضاء کے لکھے ہیں۔ اور ایک عورت کا نام بھی ہے کذا فی القاموس۔ باقی دُعا کرتا ہوں۔"

یہ دونوں نام اس مناسبت سے تھے کہ دو بہنوں کے نام حمیراء اور زہیراء موجود تھے۔ میں نے دوسرے خط میں یقیناً یہ عرض کیا ہوگا، کہ یہ نام عورتوں کے عام فہم نہیں معلوم ہوتے ایک دوسرا قافیہ خاندان میں عابدہ، کا بھی چل رہا ہے۔ اگرچہ گھر میں آپ سے اتنی عقیدت ہے کہ آپ کی

تجویز میں کسی ترمیم کو بھی وہ گوارا نہیں کرتیں۔ بہرحال ۱۱ر جنوری کا چلا ہوا کارڈ اس کے جواب میں یہ آیا :-

"میں تو اتنی عقیدت کو بھی پسند نہیں کرتا جس قدر آپ لئے ہوئے ہیں۔ تو اُن کی عقیدت کو تو کیا پسند کرتا۔ آپ کی عقیدت کو صغیرہ سمجھتا ہوں اُن کی عقیدت کو کبیرہ۔ آپ کبیرہ پر تعجب فرماتے ہیں مگر ناقص العقل سے مستبعد نہیں۔ میں اس سے زیادہ صغیرہ پر تعجب کرتا ہوں کہ کامل العقل سے وہ بھی مستبعد ہے۔ مگر خیر اس کا انتظام تو میں کیا کرتا، چند نام لکھے دیتا ہوں۔ ماجدہ، ساجدہ، راشدہ، شاہدہ، جو عام پسند ہو"

(اس کتاب میں خطوط عموماً صرف اپنے نام کے درج کر رہا ہوں۔ لیکن دو ایک خط اگر دوسروں کے (خصوصاً اپنے عزیزوں، قریبوں کے) نام کے بھی درج کر دئے جائیں، تو کوئی مضائقہ نہیں) معلوم ہوتا ______ حضرت کا معمول "سفارشوں" کے باب میں بھی بڑی احتیاط کا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اس بارہ میں صرف ایک پہلو کو دیکھتے ہیں، یعنی صاحب غرض کا کام کسی طرح نکل جائے۔ اور اس رُخ پر غور ہی نہیں کرتے کہ جس حاکم یا صاحب اختیار کے پاس سفارش جا رہی ہے، اُس کی طبیعت پر کیسا بار پڑے گا۔ فرماتے تھے کہ کسی کا کام نکال دینا ایک امر مستحب ہے لیکن مسلمان کو اذیت قلب سے بچانا تو درجۂ واجب میں ہے۔ استحباب کے لئے یہ ترک واجب کیسے جائز ہوگا۔

اُوپر ذکر آ چکا ہے کہ ان دنوں میرے بھائی صاحب سہارن پور میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے، اُن کے اجلاس میں ایک مقدمہ آیا۔ صاحب معاملہ لے جا کر حضرت کو گھیرا۔ ذیل کا مختصر و جامع سفارش نامہ (لفافہ پر مُہر ۱۵ر مارچ ۳۱ء کی ہے) حضرت کی اسی محتاط عادت اور حکیمانہ روش کا کیسا قابل تقلید نمونہ ہے :-

"از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی جناب ڈپٹی صاحب دام لطفہم۔ السلام علیکم۔
ایک صاحب میرے ملنے والے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں۔ اُن کے ایک عزیز کا مقدمہ آپ کے اجلاس میں

ہے۔ مجھ کو واقعہ معلوم نہیں۔ دُوسرے پرچہ پر مُجمل یادداشت[1] ..... کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میری عادت اپنے عنایت فرماؤں کو مجبور کرنے کی نہیں۔ لیکن جائز رعایت سے مُسلمان کو نفع پہونچانا مُستحسن ہے۔ یہ دونوں پرچے چاک فرما دیجئے۔ والسلام۔ از تھانہ بھون"

مارچ کے مہینہ میں طبیعت خراب ہوئی، اور بخار و نزلہ کئی دن تک برابر قائم رہا یہ معذوری اور نیم معذوری خود ایک سبب بن گئی ذیل کے مکتوب اشرف کا:۔

م۔ آج ایک ہفتہ سے مسلسل تپ میں مُبتلا ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عاجل عطا فرمائے۔

م۔ گو بحمد اللہ شدید نہیں لیکن قائم ہر وقت ہے، کبھی ہلکی، کبھی تیز۔

ا۔ سب رحمت ہے۔

م۔ دو ایک روز تکلیف زیادہ رہی۔ اب بحمد اللہ ہر تکلیف میں تخفیف ہے۔

ا۔ الحمد للہ۔

م۔ لیکن طبیعت تو فوری ازالہ چاہتی ہے، محض افاقہ پر کب قانع ہوتی ہے۔

ا۔ جب ہی تو مجاہدہ ہو سکتا ہے۔

م۔ اب زیادہ تکلیف دردِ سر کی ہے۔

ا۔ یہ بھی افتقار ہے جو مطلوب ہے۔

م۔ خصوصاً سجدہ کے وقت۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گُدّی کے اُوپر ہتوڑی کی ضرب پڑتی ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ راحت و سکون بخشے۔

م۔ شروع میں دو چار روز ہمّت کر کے وضو کرتا رہا۔ اب ہمّت چھوٹ گئی۔ تیمم پر گذر رہے۔

ا۔ وہ بھی عذر کی حالت میں وضو سے کم نہیں۔

م۔ مسجد بحمد اللہ جاتا ہوں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نماز بھی مجھی کو پڑھانا پڑتی ہے "جماعت"

---

[1] یہ یادداشت کُل چار سطروں سے بھی کم کی ہے!

میں دو ہی چار آدمی جو شریک ہوتے ہیں، بیچارے معمولی ناظرہ خواں تک نہیں۔ اب نہ ترکِ
جماعت کرتے بنتی ہے، نہ محض تیمم سے نماز پڑھانے پر دل آمادہ ہوتا ہے۔ عجب کشمکش رہتی ہے۔

ا۔ قانونِ شرعی کے ہوتے ہوئے کشمکش کی کیا ضرورت ہے جب متیمم کی امامت بلاکراہت
جائز ہے۔

م۔ ایک آدھ وقت تو کسی اور صاحب کو پکڑ بلایا، لیکن اب ہر وقت اس سے کیونکر کام چلے۔

ا۔ یہ کام نہ چلنا ہی زیادہ نافع ہے کہ امامت کی فضیلت نصیب ہوتی ہے۔

م۔ التماسِ دعا ظاہر ہی ہے۔

ا۔ دل سے دعا ہے۔

م۔ تعویذ صحت بھی مرحمت ہو جائے تو نورٌ علیٰ نور۔

ا۔ پیش کش ہے، اگرچہ اس کام کا نہیں ہوں۔ اس میں بخار اور درد سر دونوں کی
رعایت ہے۔"

(۵۱)

وسط اپریل کے لئے مختصر حاضری کا پروگرام تھا۔ اور حسب دستور خدمت والا میں اطلاع
کر دی گئی۔ ۱۱ر اپریل کے جوابی کارڈ میں صرف اتنا ملتا ہے۔

"مع اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملا دے۔ جو تجویز فرمایا ہے ویسا ہی عمل ہوگا۔
بھائی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔"

کب پہنچا، اور کب تک ٹھہرا، اور کیا کیا باتیں رہیں، یہ اب ذہن میں کچھ بھی محفوظ نہیں۔
اغلب یہ ہے کہ حسب دستور تین دن ٹھہرا ہوں گا۔ ایک دن کا صرف ایک ملفوظ سن لیجئے
——— یہ یقینی نہیں کہ یہ ملفوظ اسی مرتبہ کی حاضری میں حاصل ہوا۔ ممکن ہے اس سے پہلے کی
کسی حاضری میں ہو چکا ہو۔ بہرحال یہ کوئی اہم فرق نہیں۔ اور یاد تو اسی موقع پر پڑ گیا ہے
——— گفتگو مرد کی دو بیویوں یا دو شادیوں پر چلی۔ ارشاد ہوا کہ دو بیویوں کو نباہنا

سلطنت کے چلانے سے زیادہ مشکل ہے۔ اِس پہ ذرا حیرت ہوئی، کہ یہ کیا فرمایا جارہا ہے۔ معاً آگے ارشاد ہوا کہ یہ اس لئے کہ سلطنت کے انتظامات محض ضابطے سے ہوتے ہیں، اور میاں بیوی کے معاملہ میں تعلق دل کا بھی ہو جاتا ہے۔ اس کو سنبھالنا سلطنت کے سنبھالنے سے نازک تر اور دشوار ہے۔

اتنا حکیمانہ کلمہ حکیم الامت ہی کی زبان سے نکل سکتا تھا۔

واپسی کے بعد خدا معلوم خط ڈاک میں کہاں ضایع ہو گیا، کہ تین چار ہفتہ تک کچھ خیریت دریافت نہ ہوئی۔ مضطرب ہو کر جوابی کارڈ لکھا۔ جواب ۱۷ رمئی کا چلا ہوا یہ موصول ہوا:۔

"تعجب ہے خط کہاں رہا اور یہاں نہیں پہونچا۔ ورنہ میں تو عموماً سب کو التزام سے جواب دیتا ہوں اور خصوصاً احباب کو زیادہ التزام کے ساتھ۔ میں بفضلہ تعالیٰ بالکل خیریت سے ہوں اطمینان فرمائیں۔ آپ کی اِس محبت کا جس سے دوسرے احتمالات پیدا ہوئے ممنون ہوں"۔

اِس درمیان میں، یعنی مئی کی کوئی تاریخ تھی، کہ چھوٹی بچی کو معمولی آشوبِ چشم کی شکایت ہوئی، اور سوءِ اتفاق کہ اسی میں اُس کی ایک آنکھ کے دیدہ میں سفیدی آگئی، اور اُس کی بصارت جاتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ اختلاج زدہ ماں بدحواس ہو گئیں۔ اور مجھ سے اسی وقت حضرت کی خدمت میں خط لکھوایا۔ وہ خط تو میرے ذخیرہ سے کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد کا میرا خط ۲۰ رمئی کا لکھا ہوا ہے۔ حکیم مصطفےٰ بجنوری میرٹھی مرحوم کا نام تو آپ کو یاد ہو گا، ذکر ابھی قریب ہی کے کسی نمبر میں آچکا ہے حضرت کی کتاب الانتباہات المفیدہ کی شرح حل انتباہات کے سلسلہ میں ایک حاذق ترین طبیب تھے، خصوصاً آنکھ کے معالجات میں۔ ان کا تذکرہ آگے بار بار آئے گا۔ اب وہ ۲۰ رمئی کا عریضہ مع جواب ملاحظہ ہو:۔

م۔ میری حماقت کہ پچھلے جوابی کارڈ کے اوپر اپنا پتہ لکھنا خیال ہی نہ رہا۔

ا۔ رنج کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے۔ خدا نہ کرے حماقت ہوتی تو یاد آنے کا افسوس ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ افسوس نتیجہ ہے ادراک کا، اور حماقت مضاد ہے ادراک کے۔

م۔ جب خط ڈاک میں جا چکا تو خود ہی یاد پڑا، لیکن اب بے سود تھا۔

ا۔ ہو سکتا تھا کہ ایک غیر جوابی کارڈ پر پتہ لکھ کر بھیج دیا جاتا مگر رنج کے غلبہ میں اکثر ایسے امور بھی ذہن میں نہیں آتے۔

م۔ حسب ارشاد والا جناب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب کے لئے لڑکی کا حال عرض کرتا ہوں۔

ا۔ وہ پرچہ اُتار کر یادداشت میں رکھ لیا ہے مع پتہ کے۔ وہ آئیں گے تو پیش کر کے جواب لکھ کر بھیجوں گا۔

م۔ ایک طبیب حاذق میرے عزیز قریب بھی ہیں، انھوں نے آنکھ دیکھ کر کہا کہ اتنی کمسنی میں مرض کا ازالہ ہو جانا اور بصارت کا پوری طرح عود کر آنا دشوار نہیں۔

ا۔ جی کو تو لگتا ہے۔ خدا کرے یہاں بھی یہ خیال صحیح ہو۔

م۔ عورتیں کہتی ہیں کہ دیدہ کے باقی حصہ میں چمک تندرست آنکھ ہی کی طرح ہے۔ والامر بید اللہ

ا۔ تسلی ہوئی۔ مجھ کو جب بھی خیال آجاتا ہے تجدید دعا کرتا ہوں۔

م۔ مولانا مدظلہ[1] نے ارشاد فرمایا ہے کہ بچی کی ماں ہر نماز کے بعد آنکھ پر سات بار آیۂ کریمہ فکشفنا عنک غطاءک الخ دم کر دیا کریں، نیز صبح و شام سات سات بار سورۂ فاتحہ و معوذتین۔

ا۔ میں اکثر ایسی شکایات کے لئے بتلایا کرتا ہوں کہ بعد نماز پنجگانہ یا نور ۱۵۰ بار آنکھوں پر دم کر دیا جاوے اور چونکہ آیاتِ قرآنی نہیں۔ اس لئے زمانۂ ناخیر نماز میں بھی جائز ہے۔"

مکتوب کا موضوع کیسا ہی ذاتی اور خانگی قسم کا ہی، لیکن ہر جواب کے اندر کوئی نہ کوئی تعلیم موجود۔ اس کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا ہوگا، اور اب تازہ نمونہ مل گیا۔ جب ہی تو ایک اور عارف[2] نے کہا ہے۔ ؎ میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

---

[1] یعنی مولانا حسین احمد صاحب [2] یعنی خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب صاحب (شرف السوانح)

وہ ذاتی موضوع مکاتیب کا اب بھی چل رہا ہے۔ لیکن اب اُس میں کچھ اَور غیر ذاتی چیزیں بھی شامل ہوگئیں۔ ۸ رجون کے مکتوب میں ہے:۔

م ۔ حکیم صاحب اُمید ہے اس وقت تک خدمتِ والا میں پہنچ چکے ہوں، اور بچّی کی آنکھ کا تذکرہ اُن سے آچکا ہو۔

ا ۔ انتظار رہتا ہے مگر ابھی نہ خود آئے نہ کوئی خط آیا۔ لڑکی کے حالات کا پرچہ رکھا ہوا ہے، آنے پر پیش کردوں گا۔

م ۔ خُدا کے فضل سے یُوں بھی علاج سے افاقہ ہی معلوم ہو رہا ہے۔

ا ۔ الحمد للہ۔ میری رائے میں اگر افاقہ ہو رہا ہے تو علاج بدلنا مناسب نہ ہوگا۔

م ۔ حال میں اُن حکیم صاحب کے منجن کا ایک عجیب وغریب تجربہ مجھے ہوا۔ کسی اَور کے سامنے تو زبان سے نکالا نہیں، جناب ہی کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ دانتوں کی تکلیف اِدھر بہت بڑھ گئی تھی۔ اُن کے ہاں سے منجن موسوم بہ سنون مستحکم کو شب کے وقت استعمال کیا، اور حسبِ ہدایت بغیر کُلّی کئے سو رہا۔ اصل مرض میں تو خیر نفع ہوا ہی، عجیب تر یہ کہ تینوں بار رویائے صالحہ نصیب ہوئے[1] ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے تینوں بار اتّفاق ہی ہو، بہ ظاہر تو کوئی تعلق قریب منجن اور رویائے صالحہ میں نظر نہیں آتا۔ بہرحال اب تو چاٹ سی پڑ گئی ہے۔ اور جی چاہتا ہے کہ روز ہی اُسے لگاتا رہوں۔

ا ۔ مناسب ہے۔ اِس میں احتمال دونوں ہیں۔ اتّفاق ہونے کے اور ایک قاعدہ کے تحت میں سنون کے اثر ہونے کے ہیں۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ مقبولین کے تلبس کی اشیاء میں بھی برکت ہوتی ہے سنون کا تلبس حکیم صاحب سے ظاہر ہے کہ اُن کا تجویز کیا ہوا اور بنایا ہوا ہے۔ اور رویائے صالحہ کا برکت ہونا بھی ظاہر ہے۔ یہ تعلق ہو سکتا ہے لیکن ہر حال میں مقاصد میں سے نہیں۔ بعد تحریر ہٰذا ایک اور تعلق خیال میں آیا۔ وہ یہ کہ ملائکہ کو نجاسات و روائح کریہہ سے نفرت

---

[1] آگے خط میں جو تفصیل تھی، وہ عام ناظرین کے لئے غیر ضروری ہے۔

ہے اور طہارات ونظافات سے رغبت۔ اور منجن سے مقاصد مسواک کے حاصل ہیں کہ ازالۂ ریح کریہہ میں دونوں شریک ہیں۔ تو ممکن ہے کہ اس سے جو طیب نکہت پیدا ہوتی ہے اس لئے ملائکہ سے قرب ہوتا ہو اور قرب ملائکہ سے عالم ملکوت کے انکشاف کا تعلق ظاہر ہے اور خواب بھی انکشاف ہے ملکوت کا۔

م۔ زمینداری زکوٰۃ کے احکام کیا ہیں۔ ایسے سادہ مختصر لفظوں میں جان لینا چاہتا ہوں۔ فقہ کی کتابیں دیکھیں، کوئی بات صاف سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔ بہ قول مفتیٰ بہ زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ یعنی عُشر زمیندار کے ذمہ نہیں۔ کاشتکار کے ذمہ ہے۔ البتہ اگر بٹائی کا معاملہ نہ ہوا ہو یعنی کوئی اُجرت معیّن نہیں نہ غلّہ نہ نقد۔ بلکہ جو پیدا ہو جس نسبت سے معاہدہ ہو جائے پیداوار تقسیم کر لیں اس صورت میں دونوں کے ذمہ اپنے اپنے حصّہ میں عُشر واجب ہے۔"

اس کے ۱۲ روز بعد یہ ضمیمہ بہ شکل کارڈ صادر ہوا۔

"حکیم صاحب ابھی تک نہیں پہنچے۔ میرٹھ سے خط آیا تھا کچھ عوارض کو سبب تاخیر لکھا تھا آپ کا لفافہ رکھ لیا۔ خدا کرے جلدی آجائیں تو اُن کو دکھلا کر جواب لے کر آپ سے سُرخرو ہوں۔ میں خیریت سے ہوں۔ بچی کے لئے دعائے شفا کرتا ہوں۔"

حکیم صاحب پھر بھی وہاں نہ پہنچ سکے، تو چند روز بعد یہ دوسرا ضمیمہ والا نامہ کی شکل میں موصول ہوا:۔

"اب تک حکیم صاحب کا انتظار کیا، مگر شب کو دفعۃً خیال ہوا کہ ضرورت معالجہ متحمل توقف نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ڈاک ہی سے مشورہ کر لیا جائے۔ میں خط یہاں ہی سے بھیج دیتا مگر خیال ہوا کہ شاید مرض کی کیفیت میں کچھ تغیّر و تبدل ہوا ہو، اس لئے آپ کے پاس اپنا رقعہ اُن کے نام کا بھیجتا ہوں۔ مرض کی حالت معہ اس رقعہ کے اُن کے پاس بھیج دیجئے۔ اُن کا پتہ یہ ہے ......"

اب وہ سفارشی رُقعہ بھی حکیم صاحب کے نام کا مُلاحظہ ہو:۔

"از اشرف علی۔ مُشفقم مولوی حکیم محمد مُصطفےٰ صاحب سلّمہ اللہ تعالیٰ۔ السلام علیکم۔

آپ جناب مولوی عبدالماجد صاحب کو تو جانتے ہوں گے اور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ مجھ کو اُن سے کیسا تعلّق ہے۔ مولوی صاحب موصوف کی ایک بچّی کو کچھ شکایت آنکھ کی ہوگئی جس کی مفصّل کیفیت مولوی صاحب کے پرچہ ملفوفہ سے واضح ہوگی۔ مَیں نے بھی مشورہ دیا کہ آپ سے بھی مشورہ فرمالیں، چُنانچہ پرچہ حالاتِ مرض کا میرے پاس آگیا اور اب تک آپ کے انتظار میں رکھا رہا۔ چُونکہ زیادہ دیر کرنا مناسب نہ تھا اِس لئے مصلحت معلوم ہوئی کہ آپ کے پاس ڈاک ہی سے بھیج دیا جائے چُنانچہ مع جوابی لفافہ کے جس میں مولوی صاحب موصوف کا پتہ لِکھا ہے مُرسل ہے۔ توجہ و تامل سے مشورہ سے مدد دیجئے۔ اور جو حالات قابلِ تحقیق ہوں، مولوی صاحب سے براہِ راست پُوچھ لیجئے۔ اور دُعا بھی کیجئے کہ اِس کو شفا ہو۔ مَیں بھی دُعا کر رہا ہوں۔ مولوی صاحب کی وجہ سے اِس بچّی کا مجھ کو خاص خیال ہے۔ والسلام

از تھانہ بھون"

اپنے نیاز مندوں اور متوسلین کے ساتھ شفقت و التفات کے تعلّقات اِس درجہ کے قائم رکھنا، ایسے کثیر الاشغال بزرگ کے لئے بجائے خود ایک کرامت ہے ———— اور کچھ خوش فہم ایسے بھی ہیں جو اِس خدمتِ خلق کو ولایت و کمالاتِ رُوحانی کے منافی سمجھے ہوئے ہیں! اُن کے نزدیک ولایت شاید معنی ہیں جنگل میں تنہا جا بیٹھنے کے۔

(۵۲)

مولیٰ کے خاص خاص کرم کبھی کبھی اپنے نااہل سے نااہل بندہ پر بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے شیخ یا مُصلح کے سامنے تو اُن کے پیش کر دینے میں مضائقہ نہیں، لیکن دُنیا کے سامنے بلاضرورتِ شدید اُن کی پکار کرنا اپنی ہی کم ظرفی کو اُچھالنا ہے ———— ۸ جولائی کا مفصّل عریضہ ایک ایسے ہی انعامِ الٰہی سے متعلّق ہے۔ وہ دُنیا کی نظر سے مستُور رہے گا، حالانکہ اِس کے

سلسلہ میں بھی حضرت کے قلم سے جو ارشادات نکلے، انھیں مخفی رکھنا بھی یقیناً ایک طرح کا بخل ہے۔ بہرحال اس پر افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھیئے ——— شروع اگست کا کارڈ خدا معلوم کن مسئلوں سے متعلق تھا۔ محض جواب سے کچھ موٹا اندازہ ہر صاحب فہم کر سکتا ہے۔ اس جوابی کارڈ پر مہر ۲ راگست کی ہے :۔

"آپ کی خوشی سے خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ خوش رکھے۔ اور آپ کو ہمیشہ مفتاح خیر بنائے۔ مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ دست بردار ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ زبان سے یا عمل سے یہ کہدیا کہ ہم دست بردار ہو گئے، نہیں لیتے۔ دوسرے یہ کہ جس کے حق میں دست بردار ہونا چاہتے ہیں، اس کو وہ حصہ ہبہ کر دیا، یا اس کے ہاتھ بیع کر کے زرِ ثمن معاف کر دیا۔ اور ہبہ کی صورت میں سب شرائط کو جمع کر دیا۔ اِن دو صورتوں میں سے اوّل صورت میں وہ حصہ صاحب حصہ کی ملک سے خارج نہیں ہوا، کیونکہ وہ ابراء ہے اور ابراء دیون میں ہوتا ہے۔ اعیان میں نہیں ہوتا جب وہ حصہ ملک سے خارج نہیں ہوا تو اس کے ورثہ کو ہمیشہ اختیار ہے کہ اپنے حصہ کا مطالبہ کریں، اور دوسری صورت یعنی ہبہ و بیع میں اس کی ملک سے خارج ہو گیا، اس لئے پھر مطالبہ نہیں ہو سکتا۔ اُمید ہے کہ جواب صاف ہو گیا ہو گا"

اس کے بعد کے دو جوابی کارڈ جن پر مہریں ۱۳ راگست اور ۱۸ راگست کی ہیں، لڑکیوں کی بیماری سے متعلق ہیں ——— یہ تو اوپر بار بار گذر چکا ہے کہ خاندان والوں کی ہر بیماری میں پہلی خدمت معمولاً انہی دعاؤں کی طرف ہوتی تھی۔ منجھلی لڑکی (حمیرا سلمہا) کو معادی بخار آیا تھا، اور کسی طرح نہیں اُتر رہا تھا۔

"صمیم قلب سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو صحت کاملہ عاجلہ بخشے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو بعد صحت بھی مطمئن فرمایا جاوے"

یہ مضمون پہلے کارڈ کا تھا۔ دوسرے کارڈ میں شاید دوسری بچی کی بھی علالت لکھی تھی :۔

"بہت سا دل دکھا۔ دل سے کئی بار صحت کاملہ کی دعا کر چکا ہوں، اور انشاء اللہ تعالیٰ

کرتا رہوں گا۔ اور کیا عرض کروں"

اب دونوں بچیوں کو افاقہ ہوچکا ہے۔ اور نیت چند روز بعد سفر تھانہ بھون کے لئے اور کئی ہفتہ کے قیام کی ہوگئی ہے۔ آخر اگست کا کارڈ:۔

"بیحد تشویش بھی اور مضاعف تشویش تھی۔ اور الحمد للہ دونوں بچیوں کے افاقہ سے طمانیت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بقیہ تکلیف اور ضعف کو بھی رفع فرمادے۔ اچھا ہوا مولوی محمد شفیع صاحب[1] کی برکت بھی حاصل ہوگئی۔

مژدۂ قدوم سے مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملادے۔ گھر میں پوچھنے لگیں کہ گھر میں سے لانے کو تو نہیں لکھا، میں نے کہا نہیں"

میرے گھر میں دونوں پیرانی بیویوں سے تعلقات نیازمندی تھے، چھوٹی پیرانی صاحبہ سے اور زیادہ۔ اور مکتوب میں اشارہ اُن ہی کی جانب ہے۔

ستمبر کے پہلے عشرہ میں سفر تھانہ بھون کا ارادہ پختہ ہوگیا۔ یہ بھی طے کرلیا کہ زنانہ بھی ساتھ چلے گا، گو زنانہ کا قیام وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں، بلکہ کُل مدت قیام کا صرف نصف ہوسکے گا ——— اسی درمیان میں حضرت کے کسی مطبوع ملفوظات میں یہ مضمون نظر سے گذرا کہ صبح کی مجلس خصوصی اسی تباہ کار کی خاطر قائم فرمائی گئی۔ دل نے بڑی خجالت محسوس کی کہ یہ تو حضرت کے اوقات عزیز پر ایک خواہ مخواہ کا بار پڑا۔ ۱۲ ستمبر کا مُہری پوسٹ کارڈ حسب ذیل موصول ہوا:۔

"قرب زمانۂ ملاقات سے مسرت ہوئی۔ اور گھر میں زنانہ کے آنے سے بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ گو اُن کا قیام کم ہوگا، مگر للذکر مثل حظ الانثیین کے قاعدہ سے اُن کا نصف قیام بھی کافی ہے۔ مکان کی تجویز انشاء اللہ تعالیٰ بذریعہ شبیر علی کے کی جائے گی۔ وہ دہلی گئے ہیں، پانچ چھ روز میں انشاء اللہ تعالیٰ آجائیں گے۔ آپ کا کارڈ یادداشت میں رکھ لیا ہے۔ اس کے

[1] یہ جوار لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولوی حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بکھنڈری ہیں۔ جن کا ذکر چند نمبر قبل آچکا ہے۔ (متوفی ۱۹۵۱ء)

ذریعہ سے یاد رکھ کر کہہ دوں گا اور انتظام ہو جاوے گا۔ اللہ تعالیٰ سب موانع کو رفع فرمائے اور ملازم کو بھی صحت بخشے[1]۔

ترمیم نشست صباح کی اجازت سے ممنون ہوا۔ واقعی بناء تو اُس وقت کی مجلس کی یہی ہے۔ اور آپ کے رہنے تک تو مطلق بار کا احتمال ہی نہ تھا۔ بعد میں احتمال ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے مصالح ایسے مُشاہد ہوئے کہ ضرورت دائمی معلوم ہوئی۔ لیکن کسی روز ناغہ بھی کر دیتا ہوں۔ اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جس روز جو موقع ہوگا کروں گا۔"

وعدہ کتنا جامع اور رہنے جیتی تھا ـــــ ہوا یہ کہ مجلس صبح کا موقع ہر روز ہی حضرت کو ملتا رہا، اور ہر روز عمل اس مجلس کے وقوع ہی کا ہوتا رہا۔

۱۷ ستمبر کا عریضہ حسب دستور عام خاصہ مفصّل ہے اور ایک نہیں متعدد اہم پہلوؤں پر شامل:۔

"مولوی شبیر علی صاحب اس وقت تک واپس آگئے ہوں گے[1]۔ اور انشاء اللہ مکان کے لئے حسب معمول زحمت تلاش گوارا فرما رہے ہوں گے[2]۔

کانپور کے ایک نامور بیرسٹر خان بہادر حافظ ہدایت حسین ہیں۔ گورنمنٹ میں رسوخ یافتہ، اور ساتھ ہی بڑے مسلمان اور ملّت اسلامی کے ہمدرد و غمخوار۔ ولایت کئی بار رہ آچکے ہیں۔ اس پر بھی نماز کیا معنی، تلاوت کی پابندی میں فرق نہیں آتا[3]۔ مجھ سے ابھی ایک کمیٹی کے متعلق مراسلت کا اتفاق ہوا۔ میں نے لکھا تھا کہ "آپ کی کمیٹی اکتوبر میں ہوگی، اُس میں شریک نہ ہو سکوں گا، وطن سے دو روز تھانہ بھون حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ مولانا زیارت کے قابل ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ انھیں بدنام کر رکھا ہے۔" اُس کے جواب میں آج ہی اُن کا عنایت نامہ آیا لکھتے ہیں کہ "آپ مولانا کی خدمت میں ضرور جائیے۔ اُن کے ہاں کی حاضری خیر و برکت سمجھتا ہوں۔ میں خود بھی اُن کی خدمت میں وقف کمیٹی کے سلسلہ میں حاضر ہو چکا ہوں، اور دل میں اُن کی بزرگی کا گہرا اثر رکھتا ہوں۔ لیکن مولانا بدنام خود اپنے ہی مُریدوں کے سبب سے

---

[1] میں نے لکھا تھا کہ سفر میں ساتھ آنے والا ملازم بیچارہ بھی بیمار رہے۔

ہوتے ہیں" اُس کے آگے کانپور کے ایک مولوی صاحب کا نام لے کر لکھا ہے کہ اُنھوں نے یہ لکھا کہ حضرت حسینؓ کو سیّد الشہداء لکھنا ناجائز ہے۔ دُوسرے فریق نے جواب دیا، سلسلۂ بحث چل نکلا۔ اِس پر بیرسٹر صاحب نے اُس اخبار کو لکھا ہے کہ ایسی بحثیں اِس وقت بے محل و خلاف مصلحت ہیں، مخالفین اسلام اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اِس پر اُن مولوی صاحب نے ایک رسالہ شایع کیا، جس کے آخر کے ۱۵ صفحوں میں بھی بیرسٹر صاحب کی بھی بُری طرح خبر لی، اور اُن کے لئے سخت دِل شکن الفاظ استعمال کئے۔"[۴]

یہ خلاصہ ہے بیرسٹر صاحب کی تحریر کا۔ میں نے خود نہ وہ رسالہ دیکھا نہ اِس سلسلہ کا کوئی اور مضمون۔ بیرسٹر صاحب نے اپنے خط کے آخر میں لکھا ہے کہ "جب آپ وہاں جائیں تو مولانا سے میرا اسلام کہہ دیں، اور یہ بھی عرض کر دیں کہ خُدا کے لئے اپنے مُریدوں کو لہجہ کی درشتی اور خشونت اور دُوسروں کی نیّت پر حملہ کرنے سے روکیں"[۵] ان کا پیام ختم ہوا۔

اب اپنا ایک مرض عرض کرتا ہوں اور ایک استفسار۔

مرض مُزمن یہ ہے کہ بعض اوقات بہت ہی خفیف قصور پر ملازمین کو بہت سخت بلکہ کریہہ الفاظ کہہ بیٹھتا ہوں۔ سوچنے کا موقع ہی کہاں ہوتا ہے۔ اشتعال فوری ہوتا ہے، اور اسی میں یہ یک جھک جاتا ہوں چند ہی منٹ میں یہ کیفیت فرو ہو جاتی ہے، تو پچھتاتا ہوں، اپنے کو ملامت کرتا ہوں۔ اور آیندہ کے لئے عہد کرتا ہوں لیکن پھر وہ عہد ٹوٹ ہی جاتا ہے۔

یہ تو ہوا مرض۔ اب استفسار گھریلو موذی جانوروں کے اہلاک سے متعلق ہے۔ جیسے کھٹمل، مچھر، بھڑوں کا چھتّا، یا مکھیوں کی افراط۔ بعض دواؤں سے یہ فوراً مارے جاسکتے ہیں، یا چھتّے میں آگ لگائی جاسکتی ہے، کبھی کبھی وقت تو طبیعت جُھنجھلا کر ان تدبیروں پر آمادہ ہو جاتی ہے، لیکن پھر بعض وقت اپنے پر شُبہ شقاوت قلب کا ہونے لگتا ہے، اور دل کہتا ہے کہ یہ تو بے زبان مخلوق کا ستانا ہوا۔ اِس میں اکثر متردّد رہا کرتا ہوں"

جواب ہر ہر جزء کا نمبروار درج ہے:۔

(۱) آ گئے، مکان کی گفتگو بھی ہو گئی۔

(۲) ایک مکان جو نہ تنگ ہے نہ فراخ، نظر میں ہے۔ دوسرے وسیع مکان کے لئے بھی کوشش کی جاوے گی، شاید وہ مل جائے مگر پورا بھروسہ نہیں۔

(۳) میں بڑا بھی ہوں اور مجھ کو طبعاً اُن سے اُنس بھی ہے اور وہ بھی محبت سے پیش آئے تھے۔

(۴) یہ اُن کا خیال ہے جس کا سبب واقعات کی ناتمام اطلاع ہے۔ یہ تو استقراء سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محبین تو میری طرف ناگوار واقعات منسوب نہیں کرتے اور مخالفین ایسا بھی کرتے ہیں۔ اور اصل بدنامی ایسے واقعات سے ہے۔ باقی بعض دوستوں کا ایسی حرکت کرنا اوّل تو ایسے دوست کم ہیں۔ دوسرے یہ کون منصف سمجھے گا کہ یہ حرکت میں نے کرائی۔ اور اگر کوئی بلا دلیل ایسا سمجھے تو اس کا انتظام محال ہے۔ بعضے مسلمانوں سے اسلام بدنام ہو تو اسلام کیا تدبیر کرے۔

(۵) کچھ مضمون مجھ کو بھی دکھلایا تھا اور میں نے شفقت کے لہجہ میں اس سے اختلاف کیا تھا لیکن شفقت کا اثر ہونا میں نہیں سمجھتی اس لئے نہیں کرتا کہ کوئی امر کھلم کھلا شریعت کے خلاف نہ تھا۔ میں نے اُن کو جو لکھا تھا وہ یہاں موجود ہے دکھلا دوں گا۔ امر اجتہادی میں کیونکر کسی کو دبایا جائے اگر آج کوئی شافعی یا غیر مقلد مجھ سے بیعت ہو (اور ہیں بھی) میں اُن کو فروع اجتہادیہ میں کیسے مجبور کر دوں گو طبیعت کے بھی خلاف ہے۔ جیسے خود ترک تقلید میرے ذوق کے بالکل خلاف ہے اور طبعاً گراں بھی۔ مگر میں زور سے نہیں کہہ سکتا البتہ جو مخل تربیت ہو اُس میں سختی کرتا ہوں اور بدنام ہوں۔

(۶) میں اپنی تحریر اس باب میں دکھلاؤں گا جو روکنے سے بڑھ کر ہے۔ مگر جبر کا کیا حق ہے جیسا اوپر تفصیل عرض کی۔

(۷) تدبیر کی ضرورت ہے کہ بعد میں اُن ملازمین کے سامنے اپنی کمزوری کا اعتراف کیا جاوے پھر نفس مُصلح کر لے گا۔

(۸) مقصود ستانا نہیں، اُن کے ستانے سے بچنا ہے اور وہ بدوں اس صورت کے ممکن نہیں۔ اس لئے بادل ناخواستہ کیا جاتا ہے، اور ذبح کو گوارا کر لیا گیا حالانکہ وہ محض جلب منفعت ہے تو یہ تو

سلبِ مضرت ہے۔ بدرجۂ اولیٰ گوارا کی گئی۔

(۵۴)

اِدھر ستمبر کا مہینہ آخر ہو رہا تھا، اُدھر سفر تھانہ بھون کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی، روانگی سے قبل ایک اور کارڈ لکھا۔ اِس کا کیا مضمون تھا، یہ بالکل خیال میں نہیں۔ حضرت کے جواب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کی کوئی ضروری چیز ہوگی۔ اور عجب نہیں کہ حضرت کی شرح مثنوی مولانا روم کلیدِ مثنوی کی داد لکھ بھیجی ہو[1]۔ بہرحال وُہ جواب حاضر ہے۔

"سب اہلِ جلسہ مضمون خط پر مطلع ہو کر مسرور ہوئے۔ باقی میں سو آپ کو میری اصابت رائے سے مسرت ہوئی، اور مجھ کو واقعی آپ کی مسرت سے مسرت ہوئی۔ دو وجہ سے۔ ایک تو اپنے دوست کی مسرت، دُوسرے ایک قدر دان کی مسرت۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسرور رکھے۔ بجز دُعا کے اور کیا عرض کروں، باقی مثنوی کا سمجھنا میرا کیا منہ ہے، مگر گاہ باشد کہ کودکے نادان کی مثل صادق ہو جاتی ہے۔"

لذیذ کھانے آپ نے بارہا نوش فرمائے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی اتفاق ہوا ہوگا کہ اُس کھانے کو آپ نہ پہچان سکے، اور یہ نہ بتا سکے کہ وُہ کھانا تھا کیا، لیکن باوجود اِس کے اُس کا خوش ذائقہ پُوری طرح محسوس ہوا، اور اس کی لذت زبان کو کسی طرح نہ بھُولی۔ بس کچھ ایسا ہی حال مولانا کے اِس قسم کے خطوط کا بھی ہے۔ موضوع و مفہوم متعین طور پر سمجھے ہوئے بغیر بھی ایک حلاوت و لذت موجود!

اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی کہ لمبے قیام کے ارادہ سے تھانہ بھون حاضر ہو گیا۔ اب کی مکان خوش قسمتی سے وُہ ملا، جو خود حضرت کا آبائی مکان تھا۔ حضرت کا بچپن اُسی مکان میں گذرا تھا، اور اب یہ مکان حضرت کے سوتیلے چھوٹے بھائی خان بہادر محمد مظہر صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ملک تھا۔ اِس مکان کی برکتوں کا کیا کہنا۔ مادّی اعتبار سے بھی ہر طرح وسیع آرام دِہ۔ سوا اس کے کہ

---

[1] اِس کا ذکر بھی کسی پچھلے باب میں گذر چکا ہے۔

جابجا سے مرمت طلب تھا ـــــــ اب وہی معمولات قدیم شروع ہوگئے۔ یعنی بعد ظہر کی مجلس عام کے علاوہ وقت چاشت کی مجلس خاص بھی۔ اور وہی علوم و معارف کی بارش۔

ایک روز صبح کی مجلس میں حضرت کی زبان سے لکھنؤ کے بنے ہوئے بالائی کے پانوں کی تعریف سُننے میں آئی۔ دل نے کہا کہ یہ حضرت کی ایک مرغوب غذا کا خوب پتا چل گیا۔ اسی وقت چُپکے سے ایک دوست کے نام خط لکھ کر ڈال دیا کہ لکھنؤ سے ان پانوں کا پارسل آجائے۔ پارسل آیا، لیکن اب خدا معلوم مجھ سے لکھنے میں غلطی ہوئی یا اُن صاحب سے سمجھنے میں کہ پان بجائے بالائی کے، دُودھ کے نکلے، جو اُس سے مختلف چیز ہی ایک بالکل دوسری تھی۔ بہر حال وہی دُودھ کے بنے ہوئے سبز رنگ کے پان اس پرچہ کے ساتھ خدمت والا میں بھجوا دیئے کہ لکھنؤ کا بنا ہوا ایک حقیر ہدیہ حاضر خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ شرف قبول سے سرفراز کیا جائے گا۔" جواب معاً آیا کہ "وہ لُطف کا جامع ہدیہ موجب فرحت و حلاوت ہوا، بجائے سر آنکھوں کے کام و دہن میں رکھا۔ اللہ تعالیٰ فرحت بخشے۔"

تحفوں اور ہدیوں سے متعلق بھی حکیم الامّت کے ہاں خاص خاص آداب اور قاعدے تھے، سب حکیمانہ۔ فرماتے تھے کہ ہدیہ پیش کرنے والے اپنے مذاق کا اتباع کرتے ہیں حالانکہ پیش نظر اس شخص کا مذاق رکھنا چاہیئے، جس کے سامنے ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بہتر تو یہ ہے کہ کسی طریقہ سے اس کا عندیہ پہلے سے لے لیا جائے، اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ اُسے ضرورت یا رغبت آج کل کس چیز کی زیادہ ہے۔ یہ بھی فرمایا کرتے کہ ہدیہ مقدار تعداد میں یا قیمت میں بہت زائد نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیشہ پیش کرنے والے کی حیثیت کے اندر ہی ہو۔ اگر بہت زائد یا بالکل بلا ضرورت ہوگا تو قبول کرنے والے پر ایک بار رہ جاتا ہے ـــــــ حکیم الامّت کے ہاں کی کون سی چیز حکیمانہ نہ تھی؟

خود تو حسب پروگرام پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ڈیڑھ دو ہفتہ بعد زنانہ کو بھی سہارنپور سے بُلا لیا۔ مکان اس حیثیت سے بھی خوب تھا، کہ مولوی شبیر علی صاحب کے زنانہ مکان کا راستہ اندر ہی اندر تھا، وہاں آمد و رفت ہر وقت بہ آسانی ممکن۔ بانی حضرت کے بھی دونوں گھروں کا فاصلہ کچھ زائد نہیں۔ خانقاہ بھی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ ـــــــ ہمارے ہاں کی بیویوں (عافاکنّ و مومنات کُنّ) کی

سادہ دلی بھی بعض وقت قابلِ رشک ہوتی ہے۔ گھر میں مدت سے تمنا یہ تھی کہ حضورِ رسالت کا زمانہ اگر نصیب ہوتا، تو فلاں اور فلاں کھانے میں اپنے ہاتھ سے پکا کر پیش کرتی۔ گویا مثنوی کے اُس چرواہے سے ملتی ہوئی کہانی، جس نے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں یہ آرزو کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کہیں مل جائیں، تو انھیں اپنے خیمہ میں لاکر رکھوں، اُن کی خدمت میں اپنے ہاں کے جانوروں کا خالص دودھ پیش کر دوں، اُن کے پیر دابوں، اُنھیں موزہ پہناؤں وغیرہا۔ بہرحال انھوں نے ایک بار اپنی اِس کیفیت قلب کا اظہار حضرت کے سامنے کیا تھا۔ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ آرزو بہت مبارک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضوری تو اب ممکن نہیں۔ کسی نائب رسول کی خدمت میں وہ ہدیہ پیش کر کے آرزو پوری کی جاسکتی ہے۔ یہ بات کان میں پڑی ہوئی مدت سے تھی۔ اب کی جو اُن کا تھانہ بھون آنا ہوا، اور گھر کا کارخانہ جم کر کیا، تو خیال آیا کہ اس سے بہتر موقع اور کب ملے گا۔ موسم بھی معتدل و خوشگوار ہے۔ چنانچہ اکتوبر کی ۲۸ تھی کہ کئی کھانے، قورمہ مرغ، پلاؤ وغیرہ اور کئی قسم کے نوریات اپنے ہاتھ سے تیار کر کے حضرت کی خدمت میں روانہ کر دیئے۔ رسید میں پرچہ حسب ذیل موصول ہوا:۔

"ماشاء اللہ کل کھانا اتنا بھیجا کہ نصف کے قریب بڑے گھر بھیج دیا بقیہ چھوٹے گھر کے پورے خرچ کے لئے کافی ہو گیا اور کچھ بچ رہا حقیقت تو اس کی تالیف تھی مگر صورت اُس کی تکلف کی ہو گئی۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔"

جواب میں عرض کیا گیا:۔

"کھانا میں نے نہیں پیش کیا تھا۔ گھر میں محض اپنی خوشی سے اور بالکل اپنی مرضی کے مطابق تیار کیا تھا۔ جہاں تک میرے مشورہ کا تعلق تھا، میں برابر یہی کہتا رہا کہ نہ مقدار میں زیادتی ہونے پائے نہ تعداد و تنوع میں۔ میں تو اب کسی قدر مُلازمان والا کے مذاق سے واقف ہو ہی گیا ہوں۔ وہ ابھی بڑی حد تک ناواقف ہیں۔"

جواب الجواب میں ارشاد ہوا:۔

"کھانے کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا تھا اب اُن کی خدمت میں معروض ہے مع دعائے برکت۔"

مولانا حمید الدین الفراہی، مولانا شبلی نعمانی کے عزیز قریب، پھریا ضلع اعظم گڑھ کے ایک بڑے ذی علم و صاحب فکر بزرگ تھے۔ قرآن مجید کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے، اور کلام جاہلیت کے گویا حافظ و ماہر۔ تفسیر نویسی کا ایک خاص انداز رکھتے تھے، مسلک و طرز جمہور سے بالکل مختلف۔ تصنیف و تالیف عربی میں کرتے۔ اُن کی بعض تفسیروں کا ذکر حضرت سے اس کے قبل کر چکا تھا، اب اُن کی تفسیر سورۃ القیمہ ساتھ لیتا گیا تھا، اور ایک روز موقع پا کر پیش کر دی تھی۔ دوسرے روز رائے عالی ایک پرچہ لکھ کر آ گئی تھی۔ اور افسوس ہے کہ وہ پرچہ محفوظ نہ رہا۔ صرف اتنا ذہن میں ہے کہ رائے کچھ زیادہ موافقانہ نہ تھی۔ یہ بھی لکھا تھا کہ اچھا ہوا مولانا نے زبان تصنیف بجائے اُردو کے عربی رکھی، جس سے حلقۂ اشاعت صرف اہل علم تک محدود رہے گا۔ دو بعد کے رقعوں میں اس کا بھی ذکر ہے:۔

"مولانا حمید الدین صاحب کی تفسیر سورۂ قیمہ کے متعلق جو مضمون لکھا تھا، یا تو اصل بھیج دیجئے، میں نقل کرا کے واپس کر دوں گا، خواہ نقل کر کے اصل بھیج دیجئے پھر نقل کی ضرورت نہ ہوگی۔"

حضرت اُسے النور میں دینا چاہتے تھے، اور واقعی دینا تھا بھی ضروری۔ لیکن وہ پرچہ میرے پاس سے جُدا ہو چکا تھا، چنانچہ عرض کر دیا کہ

"تفسیر نظام القرآن کے متعلق وہ پرچہ میں نے اُسی روز مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس اُن کی اطلاع و واقفیت کے لئے بھیج دیا تھا، اور واپسی کو لکھ دیا تھا۔ لیکن وہ ایک طویل سفر پر نکلے ہوئے ہیں تو توقع نہیں کہ وہ پرچہ جلد واپس آ سکے۔"

جواب مرحمت ہوا کہ

"اس پرچہ کی واپسی کی جلدی نہیں، جب حاصل ہو جائے بھیج دیجئے۔ خواہ کتنی ہی مدت بعد ہو۔ بلکہ اگر محفوظ نہ رہے نہ سہی۔"

"مستشرقین" فرنگ کو کاربرملت اسلامی کی تفضیح میں خاص بالخاص لطف آیا کرتا ہے۔ عجب عجب قصے تصنیف کر کے شائع کرتے رہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا (بمبئی) میں اسی قسم کا

ایک گندہ افسانہ حضرت خالد بن ولیدؓ سیف اللہ کے متعلق نکلا تھا۔ معارف میں رفیق دار المصنفین مولوی شاہ معین الدین احمد نے اس کا مدلل و شافی جواب دیا۔ حضرت رسالے وغیرہ زیادہ کہاں پڑھتے تھے۔ میں نے اُس مضمون کا ذکر کیا اور رسالہ حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا۔ دستی پرچہ میں اس کا بھی ذکر تھا:۔

رسالہ معارف شب کو ساتھ لے گیا اور مضمون مقصود کا مطالعہ کیا۔ فارغ کر کے بھیجتا ہوں۔ بہت کافی بلکہ شافی وافی اور شبہات کا نافی لکھا ہے"

حضرت اِس سن تک رات کے وقت پڑھنے لکھنے کا کام بے تکلف بلا عینک کی مدد کے کر لیتے تھے۔

(۵۴)

تاریخ کوئی اکتوبر کی ہے یا شروع نومبر کی، سنہ وہی ۱۹۳۳ء عیسوی۔ برسات قاعدہ سے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن بارش سہارنپور و مظفر نگر کے اطراف میں اب بھی، نہ صرف ایک حد تک بے فصل کی ہو رہی ہے، بلکہ غیر معمولی شدت سے بھی۔ اور ایک دن تو نہ پوچھئے کہ کس شدت کی ہوئی! تھانہ بھون میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے مستقل بادل کے ٹکڑے پھٹ پھٹ کر زمین پر آ رہے ہیں۔ جل تھل سب بھر گئے۔ اُوپر سے مُوسلا دھار بارش، اور نیچے کھڑنجے کی سڑک پر پانی کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کھڑا ہوا۔ چلنے کا ارادہ کیجئے۔ تو گھٹنے سے اوپر تک پانی میں غرق! ایسے میں کس بشر کی ہمت تھی کہ عشاء کے وقت رات کے اندھیرے میں خانقاہ کی مسجد تک جانے کے لئے نکلتا! چنانچہ اس خاکسار نے تو مختصر سی جماعت گھر ہی پر کر لی۔ لیکن دیکھئے۔ وہیں ایک بشر ہے، ۷۲ سال کا بُوڑھا، وہ دو چار گز کی نہیں، ڈیڑھ دو فرلانگ کی مسافت طے کر کے اِسی عالم میں مسجد پہنچ رہا ہے! ——— آپ نے پہچانا؟ یہ ہے وہی شیخ طریقت۔ سب کے لئے رُخصت کی آسانیوں کا فتوےٰ دینے والا، لیکن خود اپنے لئے مقام عزیمت کی دُشواریاں اختیار کرنے والا!

رات بڑھے پانی کچھ دھیما ہوا۔ اِدھر فجر کا اوّل وقت آیا، کہ پھر وہی بے پناہ شدت! الامان والحفیظ! عین خانقاہ والوں کو سائبان کے نیچے نیچے بھی چند منٹ چل کر مسجد کے دالان تک پہونچنا

دُشوار! لیکن جوان ہمّت رات والا پیر مرد ہے کہ اس وقت بھی، لُنگ چڑھائے ایک مضبوط ڈنڈے کی مدد سے پانی کو چیرتا پھاڑتا مسجد کی طرف چلا جارہا ہے! ——— اہلِ طریق سچ کہتے ہیں کہ رسُوخ فی الدین اگر حاصل کرنا ہے تو محض کتابیں کافی نہیں، بزرگوں کی صحبت میں عرصہ تک رہ کر ان کے عملی نمونوں سے سبق حاصل کرنا ضروری ہے۔

یاد نہیں کہ قیام اب کی کُل کتنے دن رہا۔ پانچ ہفتے تو بہرحال رہا ہوگا، اغلب ہے کہ اس سے زائد ہی شفقتوں اور عنایتوں کی وہی بے پناہ بارش۔ حاضری دیتے اب ۵۔ ۶ سال تو ہو چکے تھے (ابتداء جولائی ۲۸ء سے ہوئی تھی) اور قیام مختصر اور لمبے ہر قسم کے بار بار ہو چکے تھے۔ عقیدت تو چھوڑ قائم ہوئی تھی پہلے ہی دن، پہلی ہی ملاقات میں قائم ہو چکی تھی۔ لیکن محبّت تھی کہ ہر آمد و رفت کے ساتھ برابر بڑھتی ہی گئی۔ اور اب تو مدّت سے مولانا "بزرگ" محض شیخ یا مصلح کے معنی میں رہے ہی نہ تھے، بلکہ بزرگ خاندان، یعنی باپ چچا کے معنی میں بھی بن چکے تھے۔ اور اس مرتبہ کے قیام نے اس نقش کو اور زیادہ گہرا کر دیا ——— بچی جو جنوری ۳۱ء میں پیدا ہوئی تھی (ملاحظہ ہو نمبر ۳۵) اور جس کا نام زہیراء بھی حضرت ہی کا رکھا تھا، اب کی ساتھ تھی، اگرچہ ابھی پُورے تین سال بھی پورے نہ ہوئے تھے۔ لیکن خیال آیا کہ مولانا کی سی مقدّس ہستی آسانی سے بار بار کہاں ملے گی، رسمِ بسم اللہ ابھی کیوں نہ کرا دی جائے۔ ایک روز عرض کیا۔ بڑی خوشی سے اُسے قبول فرمالیا گیا، اور ایک روز اپنی زبانِ مبارک سے اُس کی بسم اللہ کرا دی ——— غرض تعلّقات اب ہر جہت سے بالکل عزیزانہ ہوتے چلے گئے۔

حضرت کی نظر کتابوں پر بہت زیادہ نہیں رہتی تھی۔ علوم و معارف کے چشمے تو بس اندر ہی سے اُبلتے رہتے تھے "فی الحقیقت خود تو ئی اُمّ الکتاب"۔ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تصوّف، سب کا کتابی مطالعہ بس بقدرِ ضرورت و کفایت ہی رہتا تھا، اور آخر زمانہ میں تو اور بھی کم ہو گیا تھا۔ یہ بالکل نہ تھا کہ کُتب بینی کی ہوس ہو، نئی نئی مطبوعات کی آمد برابر جاری رہے، اور تاریخ، سیاحت، مناظرہ، محاضرہ کسی فن کی جو چھپی ہوئی کتاب بھی سامنے آ جائے، پڑھ ضرور لی جائے۔ ضائع کرنے کو

حضرت کے پاس اتنا وقت کہاں تھا۔ وہاں تو

صد کتاب و صد ورق در نار کن   سینہ را از نورِ حق گلزار کن

کا گلزار ہر وقت کھلا رہتا تھا، اور حضرت ہر وقت فرماتے رہتے کہ "آج کل رسالوں کے باعث لوگوں میں کتب بینی کا مذاق بہت پھیل گیا ہے، اور معمولی طالب علم بھی خوب خوب کتابیں پڑھنے لگے ہیں، لیکن نظر کی اس وسعت نے فکر کے عمق کو غارت کر دیا ہے۔ لوگوں کی نظریں پھیلی ہوئی تو بہت ملتی ہیں لیکن گہری نہیں ہوئیں، صرف سطح پر رہتی ہیں۔ اپنے مضامین، مقالات میں حوالے تو خوب دے دیتے ہیں کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ پر یوں لکھا ہے، لیکن فہم مسائل کی تعداد نہیں بڑھتی۔ سمندر سے موتی وہی نکال کر لا سکتے ہیں، جو گہری غواصی کر سکتے ہوں، محض سطح سمندر پر دور تک پیرتے ہوئے چلے جانے سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اگلے علماء مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہم کے پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت ہی کم تھا، لیکن نکتے کیسے کیسے ان حضرات نے پیدا کئے" ——— حضرت کی محفل میں ایک بے علم یہ خاکسار ہی تھا جو اکثر ذکر پرچوں، رسالوں، نئی کتابوں کا چھیڑ دیتا، اور حضرت شاید اس کی ہمت افزائی کے خیال سے ہر ذکر کو بڑی دلچسپی سے سنتے رہتے۔ خطیب بغدادی (المتوفی ۴۶۳ھ) کی تاریخ بغداد ۱۴ جلدوں میں اسی زمانہ میں مصر سے حسن طبع و تہذیب کے جملہ لوازم کے ساتھ چھپ کر نئی نئی آئی تھی۔ ایک روز اس کا ذکر کیا۔ حضرت نے بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنا خصوصاً حضرت امام ابو حنیفہؒ اور حسین بن منصور حلاج کے حالات کا تذکرہ و تبصرہ۔ حضرت تصنیف و تالیف کا سلسلہ اس وقت تک گویا چھوڑ ہی چکے تھے، لیکن اس وقت حلاج پر ایک رسالہ زیر تحریر تھا، اس لئے خطیب کے صفحات میں حلاج کے مفصل موافقانہ و مخالفانہ تذکرہ کا حال سن کر بہت خوش ہوئے۔ حضرت کی ہمدردیاں حلاج کے ساتھ تھیں، اور آپ اس کو مظلوم سمجھتے تھے۔

دورانِ قیام میں اب کی بھی اچھے اچھے اور قابل زیارت لوگوں سے ملاقات رہی۔ حضرت کے ہاں تو ایسے زائرین کا تانتا ہی لگا رہتا تھا۔ اب کی مولانا کے خلیفۂ خاص و قدیم اور ایک حاذق ترین طبیب حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری میرٹھی مرحوم سے بھی خوب ملاقات رہی۔ غائبانہ نیاز ان سے

اور ان کے کمالات سے عزت سے تھا اور پھر اچھا خاصہ رہا، شخصاً زیارت پہلی ہی بار ہوئی۔ دہلی کے بعض نامور اور خاندانی اطبّاء کو دیکھ کر جو نقشہ ذہن میں ایک حکیم حاذق کا قائم ہو جاتا ہے حکیم صاحب اُس معیار پر بالکل نہ تھے۔ نہ جسیم شحیم نہ خوب سُرخ و سفید۔ بلکہ دُبلے پتلے، منحنی جسم کے، یہاں جب دیکھا تو مسجد ہی میں کبھی نفلیں پڑھتے کبھی ذکر کرتے پایا۔ نامور و حاذق اطبّاء متعدد نظر سے گذرے ہیں، لیکن ایسے طبیب جنھیں مجتہد فن کہا جا سکے، کُل دو ہی اپنے تجربہ میں آئے۔ ایک حیدر آباد کے حکیم امتیاز الدین مرحوم، دُوسرے یہ حکیم صاحب۔ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری[لے] لکھنؤی کے بعض خوارق و کمالات بھی حکیم صاحب سے خوب معلوم ہوئے۔ حکیم صاحب اور وہ کانپور میں حضرت مولانا ہی کی شاگردی میں ہم سبق رہ چکے ہیں۔

مُلاقات تو اور حضرات سے بھی ہوئی۔ سب نہ اب یاد ہیں، اور نہ سب کا ذکر ہی ضروری۔ لیکن ایک صاحب سے تو بہر حال ملتے چلئے۔ جوان عُمر آدمی، چہرہ پر نرمی، اور اسی کے متناسب ریشم کے سے ملائم، چھوٹی سی ڈاڑھی کے بال۔ شرمیلے اور کم سُخن۔ الہ آباد کے انگریزی اسکول میں فارسی کے اُستاد۔ ذہین، سُخن فہم اور صاحب استعداد۔ اقبال کے مداح و شیدائی۔ خانقاہ کے عام رنگ سے ذرا الگ تھلگ (اقبال کا نام مدح کے ساتھ لینا اہل خانقاہ کے نزدیک خود ایک جُرم تھا) مہذّب، شایستہ۔ مجھ سے بڑھ کر ملے۔ اور برابر ملتے رہے ہفتوں سے خانقاہ میں مقیم تھے۔ اُن کی ملاقات کی کیا اہمیت تھی، یہ کسی قدر انتظار کے بعد آپ پر خود واضح ہو جائے گا۔

نومبر کا عشرۂ اوّل تھا کہ حضرت سے واپسی کی اجازت لی، اور سہارنپور ٹھہرتا ہوا وسط ماہ تک گھر پہنچ گیا۔ اور ۱۲ر نومبر کو یہ عریضہ حاضر خدمت کیا۔ جواب کے لئے الگ انتظار کیوں کیجئے۔ ساتھ ہی ساتھ پڑھتے چلئے:۔

مع۔ اب کی طویل قیام میں جو کرم خاص رہا اُس کا نقش دِل پر بالکل تازہ ہے۔

لے لفظ بجنوری، کے اشتراک سے دونوں صاحبوں کی ہم وطنی کا خیال نہ گذرے۔ حاجی صاحب کا بجنور ایک چھوٹا سا قدیم قصبہ ہے لکھنؤ سے متصل۔ اور حکیم صاحب کا بجنور شہر اور ضلع ہے علاقۂ روہیلکھنڈ میں۔

ا۔ ھٰذا مِن حُبّکم۔

م۔ ایک بات بالکل بے تکلفانہ بلکہ گستاخانہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو عقیدت و عظمت کا تعلق دل میں ہے اِس میں تو اس ۵-۱/۲ ۵ برس کے عرصہ میں اُتار چڑھاؤ رہا کیا اور رہا کرتا ہے، یعنی اکثر تو معارف و مسائل زبانِ گرامی سے سُن کر یا قلم سے دیکھ کر عقیدت بہت ہی ترقی کرجاتی ہے۔

ا۔ یہ جزو مطابق واقع کے نہیں۔ اِس میں تاویل کی ضرورت ہوگی کہ حبک الشیٔ یعمی و یصم۔ کیونکہ مسائل کو بناءِ عقیدت ٹھہرانا ہی غلط اصول کا ثمرہ ہے۔

م۔ اور کبھی بعض چیزوں کو دیکھ کر اور سُن کر دل یہ کہنے لگتا ہے کہ بس یہ بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔

ا۔ یہ بالکل مطابق واقع ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ واقع کے قریب ہے۔ اگر اس میں یہ قید ہوتی کہ "ہم ہی جیسے" تو مطابق واقع کے ہوتا اور اب قدرے واقع سے بُعد ہوگیا۔ کیونکہ واقع میں تو میں دُوسروں سے بھی کم ہوں، اور یہ کوئی تکلف نہیں۔ اِس پر حلف کرسکتا ہوں۔ کیونکہ اپنی حالت کا خود اوروں سے زیادہ مشاہدہ کرتا ہوں، چونکہ ایسا اعتقاد میرے اعتقاد کے مطابق ہے اِس لئے ایسے اعتقاد سے مسرور رہوں کہ اس میں میری موافقت ہے اور پہلے اعتقاد میں مخالفت۔

م۔ یہ معاملہ تو تعلق عقیدت و عظمت کے ساتھ ہوا۔

ا۔ دوستوں کے ساتھ تو جزو دوم مضر نہیں، لیکن اپنے شیخ کے ساتھ کم اعتقادی سے مضر ہے خواہ وہ کمی مطابق واقع ہی کے ہو مگر اس میں تاویل واجب ہے۔ کیونکہ اس اعتقاد کا اثر طالب کے عمل پر پڑتا ہے۔ جیسے طبیب پر اگر کمال کا اعتقاد نہ ہو تو علاج میں مخل ہوگا۔ اور راز اس میں یہ ہے کہ اعتقاد کی کمی سے اعتماد میں کمی ہوگی، اور اعتماد ہی مدار ہے اتباع کا اور اتباع ہی مدار ہے کامیابی کا۔

م - لیکن جو تعلق محبت کا ہے، اس میں بحمد اللہ اس ساری مدت میں برابر ترقی ہی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اب اس طرح کی محبت معلوم ہوتی ہے جیسے اپنے والد یا حقیقی چچا کے ساتھ ہوتی ہے چنانچہ اب اگر کوئی بات ایسی دیکھنے یا سننے میں آتی بھی ہے جو میری فہم ناقص میں آپ کے شایان کمال نہیں، تو معاً ذہن میں ایسی توجیہ بھی آجاتی ہے جو باپ چچا کے متعلق آتی۔

ا - توجیہہ کی بھی ضرورت نہیں، نقص متیقن بھی مخل محبت نہیں، اور یہ میرا عین فارق ہے۔ کہ محبت سے دل خوش ہوتا ہے اور عقیدت سے گرانی۔

(۵۵)

مکتوب پچھلے نمبر میں ختم نہیں ہوا تھا، ناتمام چھوڑ دیا گیا تھا۔ باقی حصہ اب ملاحظہ ہو:-

م - اب اپنا ایک مرض عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ اخلاص عمل قائم نہیں رہتا۔ ابتداءً جب کسی دینی کام کا خیال آتا ہے، تو بحمد اللہ کچھ ٹوٹا پھوٹا اخلاص ہوتا ہے، یعنی محض خدمت دین ہی مقصود ہوتی ہے لیکن جوں ہی عمل شروع ہوا، بس دوسرے مصالح و اغراض بھی ہجوم کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب یوں مقبول ہوگی، یوں بکے گی، وغیرہ وغیرہ۔ اللہ کا فضل و کرم ہے ارادۃً ان چیزوں کو بناءِ عمل نہیں رکھتا، تاہم دل یہ کہتا ہے کہ معصیت نہ سہی، جب بھی اخلاص تو نہ کا اجر تو گیا

شرکت اندر کار حق نبود روا   نیم بہر حق نشد وہ نیمے ہوا

ا - جیسے اخلاص اختیاری ہے اسی طرح اس کی ضد بھی۔ اور جو حالات تحریر فرمائے ہیں وہ غیر اختیاری ہیں لہٰذا وہ مزیل اخلاص نہیں۔ البتہ اگر ان کو مستحسن سمجھا جائے تو وہ بھی بوجہ اختیاری ہونے کے اخلاص کے مضاد ہیں۔

م - ایک روز مجلس میں حضرت عمرؓ کے فضائل کے ذکر میں ایک حدیث کا یہ مضمون ارشاد ہوا تھا کہ عمرؓ کی حق گوئی نے کوئی اُن کا دوست نہ باقی رکھا[۱]۔ اگر بلا زحمت و تردد تلاش خیال پڑ جائے، تو

---

[۱] حضرتؒ نے جس موقع پر یہ حدیث بیان فرمائی تھی، اس کا خاص اثر مجلس پر پڑا تھا، اور یہ نامہ سیاہ تو بہت ہی متاثر ہوا تھا آنکھوں کے سامنے ایک چلتے پھرتے پیمانہ پر مولانا محمد علی کی مثال تھی۔ آخر میں بیچارہ کا کوئی دوست باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اس حدیث کا ماخذ ارشاد ہو۔

ا۔ فی المشکوٰۃ۔ آخر باب مناقب العشرۃ بروایۃ الترمذی۔ عن علیؓ رحمہ اللہ عمرؓ یقول الحق وان کان مراً کہ الحق ما لہ من صدیق۔

م۔ گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں۔

ا۔ میری طرف سے بھی سلام فرمائیے۔

یاددہانی۔ تفسیر الفرقان بالفرقان کی نسبت جو رائے تحریری پیش کی تھی اس کی اصل یا نقل عطا ہو اگر محفوظ ہو، ورنہ تردّد نہ فرمائیں۔

کسی کو اُجرت دے کر ابن المنصور کے حالات تاریخ خطیب سے نقل کرا کے وی پی فرما دیجیے یا اُجرت سے مطلع فرما دیجیے۔ فوراً بھیج دوں گا"

تاریخ خطیب اور ابن المنصور حلاج کا ذکر ذرا ہی چار صفحہ اوپر نمبر ۵۴ میں آچکا ہے۔

اس مکتوب کے ورود کے گویا معاً بعد ۲۶ نومبر کو دوسرا مفصل عریضہ لکھا۔ لمبی حاضری کے بعد یہ نہیں ہوتا تھا کہ طبیعت سیر ہو جائے اور سوالات پیش کرنے کی ضرورت کچھ کم ہو جائے اکثر تو ضرورت کچھ بڑھ ہی جاتی تھی۔ یہ ۲۶ کا عریضہ خاصہ بڑا تھا۔ اس کا کچھ حصّہ تو متفرق امور پر تھا اور بڑا حصّہ ایک مستقل مسئلہ، اتباع شیخ پر۔ سمجھنے میں سہولت اسی میں ہو گی کہ دونوں حصّے الگ الگ نقل ہوں:۔

م۔ خطیب کی کتاب میں حلاج کے حالات پورے ۳۰ صفحوں میں آئے ہیں۔ ناقل کو عربی میں بھی استعداد ہونا چاہیئے۔ نقل کے بجائے مجھے یہ سہل معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب ہی خدمت والا میں ڈاک سے ارسال کر دوں۔ یا جیسا ارشاد ہو۔

ا۔ بہت اچھا۔ اگر محصول کا دیلو کر دیجئے تو جانبین کو سہولت ہو۔

م۔ شروع کی ۱۰ سطروں کی نقل اپنے ہاتھ سے الگ پرچہ پر ملفوف کرتا ہوں۔ اس کے بعد سے آخر تک مخالف و موافق دونوں قسم کے اقوال درج ہیں۔

ا۔ دیکھ لیا۔

م۔ مولانا حمید الدین کی تفسیر قرآن پر جو رائے عالی ظاہر فرمائی گئی تھی۔ وہ میں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو اعظم گڑھ بھیج دی تھی۔ کئی ہفتے ہوئے اُن سے واپس منگائی تھی، جواب نہ آیا۔ اب آج ہی کل میں پھر لکھوں گا۔

ا۔ اگر مل جاوے بھیج دیجئے، ورنہ زیادہ کوشش نہ کیجئے۔

م۔ بڑی لڑکی کے لئے چاہتا ہوں کہ کوئی معمر حافظ خاتون اگر مل جائیں تو اُسے کلام مجید حفظ کرادوں۔ محض تذکرۃً جناب والا کی خدمت میں عرض کر دیا۔ ممکن ہے کوئی نام اِس وقت یا کبھی ذہن میں آجائے۔ اس کے لئے کسی فکر کرنے یا اہتمام رکھنے کا بار ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔

ا۔ میں خیال رکھوں گا۔ مگر اس قصبہ میں یا گردوپیش میں اس کی توقع نہیں۔ البتہ پانی پت میں عورتوں کی عادت ہے حفظ قرآن کی۔ اگر کہیے وہاں تحقیق کروں۔"

خط کا جُزوِ قلیل تو یہ تھا۔ جُزوِ غالب اتّباع شیخ کے حدود کی بابت مفصّل استفسار تھا۔ جو ابھی درج ہو رہا ہے ——— اپنی درازنفسی کا احساس تھا۔ اِس لئے خط کے خاتمہ پر معذرت بھی تھی:۔

م "آپ نے سفرِ طاکرم سے مجھے جو آزادیاں دے رکھی ہیں، ان ہی کے بل پر گستاخانہ سب کچھ لکھ ڈالتا ہوں۔ اور سب کچھ بک جانے کے بعد یہ مصرعہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ع

خطا نمودہ ام وچشمِ آفریں دارم

ا۔ یہ گستاخی نہیں بہ قولِ مولانا ؎

گفتگوئے عاشقاں در کار رب   جوششِ عشق است نے ترکِ ادب

اب عریضہ کا وہ اصل حصّہ ملاحظہ ہو، تلخیص کے بعد:۔

"شیخ کے اتباع کامل سے متعلق جناب نے اِس والا نامہ میں بھی ارشاد فرمایا ہے[1]۔ اِس کے علاوہ بھی بارہا زبانِ مبارک سے سُنا۔ دوسرے بزرگوں کے ہاں بھی اس کی تاکید دیکھی لیکن اسے نفس کی

---

[1] ملاحظہ نمبر ۴۵۔

شرارت سمجھا جاوے یا جو کچھ، بہر حال پوری تشفّی اِس مسئلہ میں نہ ہوئی۔ شبہہ نفسِ اتباع میں نہیں، اتباعِ کامل میں بار بار پیدا ہوتا ہے۔ اور دل کہتا ہے کہ یہ صورت تو شرک فی النبوۃ کی سی ہے۔ آنکھ بند کرکے اتباع تو صرف نبی معصوم کا کیا جا سکتا ہے۔ باقی اور کوئی صاحب کیسے ہی بزرگ ہوں، بہر حال رائے میں بھی غلطی کریں گے اور عمل میں بھی۔ اور یہ نہ ہو تو پھر اُن میں اور معصوم میں فرق ہی کیا رہے گا؟ ہم ہزارہا غلطیاں کریں گے اور روزمرّہ، وہ بہت کم کریں گے اور کبھی کبھی، لیکن بہر حال جب حضرات صحابہؓ تک عملی معصیتوں سے محفوظ رہے نہ اجتہادی لغزشوں سے، تو دوسرے حضرات کا رُتبہ تو اُن سے بھی فروتر ہے۔ میرے دل کو تو سب سے زیادہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کا قول (جناب ہی کی روایت سے سُنا ہوا) لگتا ہے کہ مولانا محمد اسمٰعیل جب کسی خاص مسئلہ میں اُن سے گفتگو کرتے کرتے خلافِ ادب سمجھ کر رُک گئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو شرک فی النبوۃ ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے جو معاملہ اپنے مُرشد کے رسالہ فیصلہ ہفت مسئلہ سے متعلق کیا، وہ بھی عین اسی کی تائید میں ہے۔

اعتقادِ کامل اور اعتمادِ کامل اور انقیادِ کامل جس شئے کا نام ہے وہ زندہ بزرگوں کے ساتھ کیا معنی، کسی پچھلے بزرگ کے ساتھ بھی نہیں پیدا ہوتا۔ یعنی ایسا اعتقاد کہ اُن کا ہر قول، ہر عمل بلا استثناء واجب الاتباع سمجھنے لگوں، یہاں تک کہ مولانائے رومؒ سے بھی نہیں، جن کی مثنوی کا عاشق ہوں اور جن کو اپنا اصلی ہادی سمجھ رہا ہوں۔ حضرات صحابہ تک میں بعض کی قابلِ حبس اور بعض کی قابلِ رجم لغزشیں آخر روایاتِ صحیحہ سے ثابت ہیں یا نہیں۔ تو پھر دوسرے بزرگوں کے اتباعِ کامل کے معنی ہی کیا رہ جاتے ہیں؟"

جواب حسبِ معمول معنیً شافی وجامع آیا۔ اور اب کی لفظ و عبارت کے لحاظ سے بھی اتنا مفصّل کہ ایک پورا نمبر اسی کے لئے چاہیئے۔ مفید اتنا معلوم ہوا کہ حضرت کی اجازت سے سچ میں اسی وقت درج کیا تھا۔ (سچ ۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۳ء) رسالچہ کا نام بھی حضرت ہی کا تجویز کیا ہوا ہے ———

ورق اُلٹیئے، اور حضرت کا اصل مقالہ مع سچ کی تمہید اور توضیحی حاشیوں کے ملاحظہ میں لائیے۔

---

(۵۶)

الاعتدال فی متابعة الرجال

[اتباعِ شیخ کا مسئلہ، تصوف و سلوک کے مہمات مسائل میں ہے۔ اگلے اور پچھلے سارے مشائخ اور ائمۂ فن اِس پر زور دیتے اور اس کی تاکید کرتے چلے آئے ہیں۔ عام ذہنوں میں اس کی تعبیر یوں ہے کہ شیخ نائب رسُول ہوتا ہے، اور اس لئے مطاعِ مُطلق، جس کا ہر قول، ہر فعل، مُرید کے لئے بمنزلۂ حکم اس کی کسی رائے، کسی قول، کسی فعل میں مُرید کے لئے گُفتگو کی گُنجائش نہیں۔ نصوصِ صُوفیہ کا ظاہر بھی اِسی خیال کی تائید میں۔ لیکن یہ عقیدہ، اِس صورت میں، شریعت و عقل دونوں کے معارض ہے۔ شرعاً بعد انبیاء معصومین کے، کوئی بزرگ کیسا ہی کامل ہو، معصوم و غیر خاطی بہرحال نہیں۔ مشاہدہ بھی یہی ہے کہ تجربہ کی، عمل کی، علم کی، لغزشوں اور کوتاہیوں سے کیسر محفوظ کوئی بھی بشر نہیں، زلّات اور خطاء اجتہادی سے صحابہ تک خالی نہیں، چہ جائیکہ دوسرے بزرگ جو اُن سے بہرصورت کمتر ہیں۔ ایسوں کا اقتداء مُطلق کیونکر واجب ہوسکتا ہے۔ چند روز ہوئے یہی شُبہات ایک مفصّل مکتوب کی صورت میں، حضرت مولانا تھانوی کی خدمت میں پیش کئے گئے جو اپنی تدقیقات باطنی و معالجۂ امراضِ نفسی کے لحاظ سے اپنے وقت کے امام غزالیؒ ہیں۔ مولانا مدظلہ کا جواب اِس درجہ شافی، مفصّل، اور مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب کو حاوی ہے کہ بیچ کی برادری تک اُسے نہ پہنچانا ایک صریح بُخل معلوم ہوا۔ مولانا نے از راہِ کرم اجازت اشاعت بھی مرحمت فرمادی۔

مکتوب مذکور فخر و مسرت کے ساتھ درج ذیل ہے۔ انشاء اللہ اس سے بہتوں کی اُلجھن اور طریق کی طرف سے وحشت و بیگانگی رفع ہو جائے گی۔ بعض مُشکل فقروں پر حاشیے دیدیئے گئے ہیں اور بعض عبارتوں کو زیر خط کردیا گیا ہے۔ تبیح]

مکرمی سلّمہ السلام علیکم۔

غالباً میرے کُل معروضات اِس کے متعلّق ذہن میں جمع اس لئے نہیں رہے، کہ شاید ایک جلسہ میں مجتمعاً بیان نہیں کیئے گئے۔ اب اس کا مُلخص مجموعاً عرض کرتا ہوں۔ یہ اتّباع نہ عقائد میں ہے نہ کشفیات میں، نہ جمیع مسائل میں، نہ امور معاشیہ میں[1] صرف طرق تربیت و تشخیص امراض و تجویز تدابیر اور ان مسائل میں ہے جن کا تعلق اصلاح تربیت باطنی سے ہے۔ وہ بھی اُس وقت تک جب کہ اُن کا جواز مُرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو۔ اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا خلافِ طریق ہے۔ اور امتثال امر خلاف شریعت ہے[2]۔ ایسی صورت میں ادب جامع بین الادبین[3] یہ ہے کہ علماء سے استفتاء کرکے، یا اپنی تحقیق سے حکم متعیّن کرکے شیخ کو اطلاع کرے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے، مجھ کو کیا کرنا چاہیئے۔ اِس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اُس شیخ کو چھوڑ دینا چاہیئے، اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے۔ یہ معنی ہیں اتّباع کامل کے یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو، یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو، یا جو عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مُرید میں متفق علیہ ہو، تجویز کیا ہو اِن چیزوں میں اتباع کامل کرے، ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے، اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں۔ امید ہے کہ سب شُبہات کا جواب ہو گیا ہوگا۔ اگر کوئی جزو باقی ہو تو تعیین و تصریح کے ساتھ تحریر فرمائیے۔

---

[1] یعنی امور دُنیوی (ربیع) [2] مختلف فیہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ شیخ تو اُسے جائز سمجھ رہا ہے اور مُرید اپنی بصیرت ضمیر کے موافق، شرعاً ناجائز۔ ایسی صورت میں مولانا فرماتے ہیں کہ شیخ سے مناظرہ کرنا تو خلاف آداب طریقت ہے اور اپنی دیانت کے خلاف شیخ کا اتباع کرلینا ایک فعل ناجائز کا، خلاف شریعت کا ارتکاب کرنا ہے (ربیع) [3] یعنی آداب طریقت و احترام شریعت (ربیع)

خلاصہ بحث کا اس باب میں یہ ہے کہ اتباع کا محل معلوم نہ ہونے سے یہ سب شبہات پیدا ہوئے۔ میں اس کا محل مع قیود حیثیت متعین کئے دیتا ہوں۔ سو محل تو اس کا صرف شیخ کی تعلیمات قولیہ ہیں[1]۔ جن کا تعلق تربیت و اصلاح باطن سے ہے اور قید اس کی یہ ہے کہ وہ فعل جس کی تعلیم کی جا رہی ہے شرعاً جائز ہو، جس کا جواز طالب کے اعتقاد میں بھی ہو، اور حیثیت اس کی شیخ کا مصلح ہونا ہے، یعنی مصلح ہونے کی حیثیت سے صرف تعلیمات سلوک ہیں۔ اس کے اقوال پر عمل شرط نفع ہے۔ اب ان قیود کے فوائد احتراز یہ بتلاتا ہوں "تعلیمات قولیہ" کی قید سے خود شیخ کے افعال بھی نکل گئے، خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز ہوں جیسے شیخ پانچ سو رکعات نفل روزانہ پڑھتا ہو یا صوم دائمی[2] ہمیشہ رکھتا ہو۔ اس میں اتباع ضروری نہیں۔ اور خواہ وہ افعال طالب کے اعتقاد میں جائز نہ ہوں، خواہ مختلف فیہ ہونے کے سبب، جیسے شیخ فاتحہ خلف الامام پڑھتا ہو، اور طالب اس کو مکروہ جانتا ہو۔ خواہ شیخ غلطی سے کسی فعل ناجائز میں مبتلا ہو، جیسے غیبت کرتا ہے، اس میں اتباع جائز بھی نہیں۔

اور اسی قید سے شیخ کے کشفیات نکل گئے، خصوص جب کہ طالب کا کشف اس کے خلاف ہو۔ اسی طرح تمام مسائل اصولیہ و فرعیہ جن کا تعلق تربیت سے نہیں، خارج ہو گئے۔ البتہ ان میں جو امور شرعاً بھی ضروری ہیں، وہ لازم العمل ہیں، گو شیخ بھی نہ کہے۔ اور اگر شیخ حکم دے، تو یہ حکم امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حیثیت سے ہوگا مصلح ہونے کی حیثیت سے نہ ہوگا اور ان میں خلاف کرنا شریعت کی مخالفت ہوگی نہ کہ شیخ کی مخالفت۔ البتہ شریعت کی بناء پر شیخ ایسے طالب سے قطع تعلق کر سکتا ہے۔ اور یہ قطع تعلق شیخ کے ساتھ خاص نہیں ہر مسلمان کو اس کا حق حاصل ہے، اس کا تعلق مسئلہ متابعت شیخ سے کچھ نہیں۔ اسی طرح اس قید سے امور معاشیہ نکل گئے۔ مثلاً شیخ کسی طالب سے یہ کہے، کہ تم اپنی لڑکی کا رشتہ میرے لڑکے سے یا کسی اور سے کر دو۔ یہ بھی متابعت کا محل نہیں اور قید جواز کا فائدہ[3] یہ ہے کہ جس چیز کی تعلیم کرتا ہے وہ اگر شرعاً ناجائز ہو اس میں اتباع جائز بھی

---

[1] نہ کہ شیخ کی پوری زندگی (رتج) [2] ایک دن ناغہ کر کے برابر روزہ رکھنا (رتج)

[3] اوپر آ چکا ہے کہ جو فعل تعلیم کیا جا رہا ہو وہ شرعاً جائز بھی ہو (رتج)

نہیں، خواہ اجماعاً ناجائز ہو جیسے کوئی معصیت خواہ ناجائز اختلافاً ہو، جیسے مسائل مختلف فیہا کی کوئی خاص شق، جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔ اور اس تقریر میں ضمناً حیثیت کا فائدہ بھی مذکور ہو گیا۔[1] اب اس کے متعلق سب سوال حل ہو گئے۔ سو یہ تو طے ہو گیا کہ بعض امور ہی محل متابعت نہیں جن میں بعض میں تو متابعت واجب نہیں جیسے امور معاشیہ، اور بعض میں جائز بھی نہیں خواہ ان کا عدم جواز متفق علیہ ہو، جیسے معاصی، خواہ مختلف فیہ ہو۔ جیسے مسائل اختلافیہ جو طالب کے اعتقاد میں جائز نہیں۔ اب یہ بات باقی رہی کہ جو امور محل متابعت نہیں، ان میں اگر شیخ حکم دے، تو اگر وہ شرعاً جائز اور طالب کی قدرت میں ہیں تو مروت کا مقتضا یہ ہے کہ ان میں متابعت کرے، جیسے شیخ اپنا کوئی ذاتی کام یا کوئی خاص خدمت کرنے کی فرمائش کرے۔ اور اگر وہ شرعاً ناجائز ہے خواہ وہ واقع میں بھی خواہ اس کے اعتقاد[2] میں بھی ادب سے عذر کر دے۔ اور اگر وہ اصرار کرے تو اس سے قطع تعلق کر دے، مگر گستاخی یا ایذا کا معاملہ کبھی نہ کرے۔

یہ تو اس وقت ہے جب وہ خلاف شرع کا حکم دے۔ اور اگر طالب کو ایسا حکم نہ دے مگر خود کسی لغزش میں مبتلا ہو تو اگر اس میں تاویل کی گنجایش ہے تو تاویل کرے اور اس سے قطع تعلق نہ کرے۔ اور اگر تاویل کی گنجایش نہیں تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر احیاناً اس کا صدور ہو جاتا ہو تو بشریت و احتمال توبہ پر محمول کر کے تعلق قطع نہ کرے، اور اگر اصرار یعنی اعتیاد ہے تو اگر وہ صغیرہ ہے تو قطع تعلق نہ کرے اور جو کبیرہ اور فسق و فجور یا ظلم و خیانت کے درجہ میں ہے تو تعلق قطع کر دے۔ مگر ان سب حالات میں اس کے لئے دعائے صلاحیت کرتا رہے کہ حقوق احسان میں سے ہے۔ ارادہ تھا خلاصہ کو مختصر لکھنے کا، مگر وہ اصل سے بھی زیادہ مبسوط ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت بے ساختہ ذہن میں آیا کہ اس تحریر کا ایک لقب تجویز کر دیا جائے۔ الاعتدال فی متابعۃ الرجال۔

۹ رشعبان ۵۲ھ[3]

---

[1] ایسے شیخ کی حیثیت مصلحانہ کا ذکر آ چکا ہے (ج) [2] یعنی طالب کے (ج)

[3] مطابق ۲۸ر نومبر ۳۳ء

اس کے بعد کا عریضہ اس سے بالکل متصل ہی پڑھنے والا ہے مورخہ ۱۷ دسمبر:-

م- گرامی نامہ مسئلہ اتباع شیخ پر تو اس قدر شافی اور اتنا جامع موصول ہوا کہ میں تو پڑھ کر اچھل پڑا۔ دل بے اختیار یہ چاہتا تھا کہ سامنے ہوتا تو لکھنے والے کی انگلیاں اپنے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگاتا۔ سبحان اللہ۔ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ گو ساتھ ہی یہ خیال کر کے ندامت بھی ہوئی کہ میرے باعث اتنا طویل مضمون لکھنے کا تعب برداشت کرنا پڑا۔

ا- مجھ کو تو آپ کی خوشی سے خوشی ہوئی۔ رہا تعب، اوّل تو ہوا نہیں، پھر بضرورت دینیہ ہوا۔ پھر آپ نے بدل تو کر دیا۔ کیونکہ اچھلنے سے بھی تعب ہوتا ہے۔

م- اس تشریح و توضیح کے بعد اب نفس مسئلہ تو صاف ہو گیا۔ اب سوال صرف تعامل کا رہا۔ عمل اس کے مطابق کیوں نہیں ہوتا۔ جہاں تک دیکھا اور سُنا عمل اس کے خلاف ہی ہر جگہ پایا۔ ایک حاجی صاحبؒ کے ہاں عمل تو البتہ اسی تعلیم کے مطابق سُننے میں آیا ہے۔

ا- اس کا سہل جواب تو یہ ہے کہ اہل تعامل اس کے ذمّہ دار ہیں۔ اور تبرع کے درجہ میں جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں یا تو اُن کو حدود کا علم نہیں اور یا محبّت عظمت سے مغلوب ہیں۔

م- اب اجازت چاہتا ہوں کہ کوئی مصلحت اگر مانع نہ ہو، تو مقالۂ گرامی کو اپنی تمہید کے ساتھ سچ میں شائع کر دوں۔ انشاءاللہ بہت نافع ہوگا۔

ا- خوشی سے آپ کا ہم رائے ہوں، مگر تمہید میں مبالغہ نہ ہو۔ اگر اوّل میں دیکھ لوں تو احتیاط کی بات ہے۔

م- تاریخ خطیب آج ہی بذریعہ رجسٹری روانہ کی ہے۔ ارشاد ہوا تھا کہ محصول کا وی پی کر دیا جائے۔ اس ارشاد کی تعمیل پر اپنے کو کسی طرح آمادہ نہ کر سکا۔ عدم تعمیل کی معافی چاہتا ہوں۔

ا- ایسی عدم تعمیل کرنے والے کسے نصیب ہوتے ہیں کہ مجھ کو نفع پہنچائیں اور میرے پیسے خرچ نہ ہونے دیں۔

م۔ واپسی کا محصول اِسی لفافہ کے اندر ملفوف ہے۔ میری خوشی تو یہی ہے کہ انھیں ٹکٹوں کو کام میں لایا جائے۔

ا۔ بالراس والعین۔

م۔ باقی اگر اس کے قبول کرنے میں کچھ زیادہ گرانی محسوس فرمائی جائے تو زیادہ اصرار بھی نہیں کرتا۔

ا۔ زیادہ کیا کم بھی نہیں ہوئی۔ ایسے مُخلصین سے تو سوال بھی جائز ہے۔

م۔ تذکرۂ حلاج کتاب کے صفحہ ۱۱۲ پر ہے۔

ا۔ اِس وقت کتاب پہنچ گئی، جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ مُنشی ..... خیرآبادی[1] لکھنؤ سے یہاں ایک روز کے لئے آئے تھے۔ جناب والا سے اب انھیں بیحد محبت وعقیدت ہو گئی ہے۔ لیکن اندازہ کچھ ایسا ہی ہوا کہ شاید مقصود کی تعیین میں غلطی کر رہے ہیں۔ ہم لوگ جس طرح خشیت سے خالی ہیں، اُن کے ہاں اِس کی افراط ہے۔ بالکل فرشتہ ہی بن جانا چاہتے ہیں۔ مَیں نے اُنھیں مشورہ یہ دیا ہے کہ جناب کی تصانیف اور مواعظ کثرت سے پڑھیں، اور سمجھ سمجھ کر پڑھیں، اور اگر حالات مساعدت کریں تو خانقاہ میں جا کر خاموشی کے ساتھ طویل قیام رکھیں۔ اور اختلاج قلب کا طبی عِلاج بھی کرتے رہیں۔

ا۔ نیک مشورہ ہے۔"

وہی خط ابھی چل رہا ہے، ختم نہیں ہوا ہے:۔

م:۔ مذاق والا کے سمجھنے کا بہترین نُسخہ یہی طویل صحبت ہے۔ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ ہر مرتبہ کے قیام کے ختم پر یہی سمجھتا ہوں کہ جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا، جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا۔ لیکن ہر نئی حاضری کے بعد اپنے پچھلے خیال پر لاحول پڑھتا ہوں۔

ا۔ آپ کی محبت ہے۔ مَیں تو زیادہ باتیں کر کے خود شرمندہ ہوتا ہوں۔

---

[1] اصل مکتوب میں نام تھا، یہاں حذف کر دیا گیا۔

م۔ حافظ خاتون کے لئے میں تو اتنی جرأت نہ کرتا، آپ نے خود ہی غایت کرم سے پانی پت سے تحقیق کرنے کو فرما دیا ہے۔ لیکن اس مراسلت کا بار جناب پر کیوں ڈالوں۔ صرف وہاں کا پتہ ارشاد ہو جائے، مراسلت میں خود کرلوں گا۔

ا۔ آپ نے کام بہت ہی سہل فرما دیا۔ میرے چھوٹے گھر میں کے بھائی ہیں اُن کا پتہ لکھتا ہوں۔ وہ نہایت فہیم مستعد ہیں۔ انتخاب بھی صحیح کریں گے۔ کوشش بھی کریں گے، آپ کو جواب بھی اہتمام سے دیں گے۔ میرے حوالہ سے لکھ دیجئے۔ اور جواب کے لئے لفافہ رکھ دیجئے۔ پتہ یہ ہے۔ حافظ ناظر حسن۔ محلہ مخدوم زادگان۔ پانی پت۔

م۔ سورۃ الکھف میں ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا سے ایک نکتہ سننے میں آیا، مجھے تو بہت پسند آیا۔ تصویب کے لئے خدمتِ والا میں پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ تین سو کے عدد اور نو کے دونوں کے الگ الگ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ بحساب شمسی وہ مدت پورے تین سو سال کی تھی، اور بحساب قمری وہی مدت ۳۰۹ سال کی۔ تین سال کا فرق ہر صدی میں دونوں سنوں میں ہو جاتا ہے۔ امروہہ کے کوئی عالم تیس چالیس سال اُدھر مولوی محمد حسن نامی تھے۔

ا۔ اُن کو مدت سے جانتا ہوں۔ بالکل مجازفات اور تخمینیات سے کام لیا ہے۔ تحقیق سے مس نہیں۔ میں نے اُن کی تفسیر بھی دیکھی ہے۔ ناشافی، ناکافی، نادانی ہے۔

م۔ اُن کی نظر ہنود اور اہل کتاب کی کتابوں پر بہت تھی۔ اُن ہی نے اپنی تفسیر میں یہ لکھا ہے۔

ا۔ مجھ کو تو مدت سے یہ معلوم ہے مگر میں نے تفسیر میں اس لئے نہیں لیا کہ اس پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ سال شمسی تھے۔ اور بے دلیل قرآن میں جزماً دعویٰ کرنا بہت خطرناک امر ہے۔ ہاں غایۃ مافی الباب یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ بنا ہو واللہ اعلم۔

مولوی محمد حسن صاحب امروہوی کی پوری تفسیر دس جلدوں میں ہے۔ اور اس کا نام غایۃ البرہان فی تاویل القرآن ہے۔ اُس وقت تک میری نظر سے اصل تفسیر نہیں گذری تھی۔ بعد کو بڑھ کر حضرت کی

رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ حقیقت سنجی سے کہیں زیادہ اُس میں صفحہ صفحہ پر خیال آفرینی ہے ——— اور مجھے تو مرزا صاحب قادیانی بلکہ ان کے گروہ کے شارح و ترجمان مولوی محمد علی صاحب لاہوری بھی اِن کے اچھے خاصے خوشہ چین نظر آئے، مگر اِن غریب کا حوالہ شاید کوئی بھی نہیں دیتا۔

البتہ نفس اِس قول کے غیر محقق ہونے کے باب میں حضرت مولانا کے ارشاد سے ایک حد تک اختلاف ہے۔ اکابر سلف سے تو برابر یہ تفسیر نقل ہوتی چلی آرہی ہے، ملو را بن کثیر، معالم، بحر المحیط، جلالین، روح المعانی وغیرہ سب میں اِس کا ذکر موجود ہے، بلکہ بعض نے تو اُسے حضرت علیؓ کا قول بتایا ہے۔ وقد نقلہ بعضہم عن علیؓ (روح) مروی عن علیؓ الخ (معالم) یہ سب چیزیں بعد کو نظر سے گذریں۔ اِس وقت اگر علم میں آگئی ہوتیں تو ضرور حضرت کی خدمت میں اِن حلومات کو بھی پیش کرتا۔

"بڑی سخت ضرورت اہل سُنت کی طرف سے ایک انگریزی ترجمۃ القرآن کی ہے۔"

"پھر آپ ہی کیوں نہیں اِس کام کو شروع کر دیتے ہیں۔"

"اللہ پر بھروسہ کر کے شروع تو کیجئے، دُشواریاں حل ہوتی جائیں گی۔"

"ترجمہ بالکل نیا نہ ہو، نہ سہی۔ موجودہ ترجمے جو انگریزی میں ہیں، اُن ہی میں ترمیم و تنسیخ سے کام لیجئے۔ محمد علی لاہوری کا ترجمہ انگریز مترجمین سے تو بہرحال غنیمت ہے۔ اسی کو زمین بنا کر اِس میں کانٹ چھانٹ کر دینا کیا کافی نہ ہوگا؟"

"آپ ہمت کیجئے تو۔"

شاید شروع دسمبر، غالباً آخر اکتوبر کی کوئی تاریخ تھی، جب تھانہ بھون میں ایک کہنے والے نے مسلسل یہ افسون کان میں پھونکنا شروع کیا۔ یہ کہنے والا کون تھا؟ اِس کے لئے نمبر ۵ کا آخری پیراگراف ایک بار پھر ملاحظہ کر لیا جائے۔ مولوی حاجی سراج الحق مچھلی شہری (اُستاد فارسی، گورنمنٹ انٹر کالج الہ آباد) کا شمار اب بھی مشاہیر میں نہیں، اُس وقت تو بیچارہ بالکل گمنام سے تھے۔ لیکن اخلاص محض سے مشورہ دینے والوں کو اپنی ناموری اور گمنامی کی پرواہی کب ہوتی ہے؟ ——— اُدھر سے مکرر اصرار

اور ادھر سے اپنی نااہلی کی بنا پر قطعی انکار برابر جاری رہا۔ اور اسی پر گفتگو ختم ہوگئی۔

بات ختم کہاں ہوئی۔ ان کی زبان تو بیشک خاموش کر دی، لیکن اپنے دل میں کشمکش برابر جاری رہی۔ شروع ہی نہ کیوں؟ کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ بہ طور آزمائش پارہ آدھ پارہ کا تو کرہی ڈالوں؟ کاش مولانا محمد علیؒ زندہ ہوتے! اُن سے کتنی بڑی مدد مل جاتی۔ انگریزی پر اصلاح دینے والا اُن سے بہتر کون ہوسکتا تھا؟ مولانا حمید الدینؒ فراہی بھی تو آج زندہ نہیں! فہم قرآنی کے باب میں کیا نکتہ رس دماغ پایا تھا! اب ان لوگوں کو کہاں سے لاؤں؟ ہاں اِن لوگوں کی زندگی میں کبھی یہ خیال نہ آیا! یا اللہ کیسے اتنا بڑا کام ہوسکے گا؟ انگریزی آتی ہی کیا ہے، اور تھوڑی بہت جو کچھ آتی بھی تھی، اب تو اس کے بھی لکھنے کی مشق نہیں رہی۔ اور عربی استعداد تو اتنی بھی نہیں! لیکن نہیں، اُردو میں تو اچھے اچھے متعدد ترجمے موجود ہیں، اور عربی تفسیروں سے بھی بڑی مدد مل جائے گی۔ اور ترجمے انگریزی میں ایک دو نہیں، کئی کئی موجود ہیں۔ کوئی ایک ترجمہ تو بیشک بہت اچھا اور کافی نہیں، لیکن سب مل جُل کر ضرور کافی ہوجائیں گے۔ کچھ اس میں سے لیا، کچھ اُس میں سے انتخاب اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ کام کچھ تھیٹرا بہت ہی ہوجائے، تو کیسی زبردست خدمت ہوگی! ——

یہ خیالات تھے، اور اُن کی اُلٹ پلٹ، اُدھیڑ بُن۔ اس ترجمہ کی فرمائش تو اور بھی بعض صاحب اور نسبتہً زبردست شخصیتیں رکھنے والے صاحب پہلے کر چکے تھے۔ پہلے کبھی ذرا بھی اسے قابل اعتناء سمجھا تھا۔ پر اب کی یہ فرمائش کس منھ اور زبان سے نکلی ہے، کہ دل سے نکلے نہیں نکلتی کھٹک ہے کہ برابر ہوئے جاتی ہے! —— سچ کہا ہے ہمیشہ سچ کہنے والے نے کہ انسان کا قلب تو حضرت حق کی اُنگلیوں کے درمیان رہتا ہے۔ وہ جس طرف چاہے اُسے پھیر دے!

(۵۸)

ایسے اہم ترین منصوبے، زندگی کے اہم ترین منصوبے سے کیسے ممکن تھا کہ حضرت کو باخبر نہ کرتا۔ مشورے، ہدایتیں بہت کچھ وہیں سے حاصل کرتی تھیں ۸؍ دسمبر کا عریضہ رُملاحظہ ہو، سارے کا سارا پڑھیے:۔

م: تمہید کی عبارت حسب ارشاد والا ملاحظہ کے لئے ملفوف ہے[1]۔

ا۔ بہت مناسب ہے۔ بجز عزائی وقت وغیرہ الفاظ کے۔

م۔ ایک نہایت درجہ اہم معاملہ میں آپ کی توجہ، دُعا، ہدایت، ارشاد سب کا محتاج ہوں۔ خیال دو چار ہفتہ سے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کا برابر مسلط ہوتا جا رہا ہے۔

ا۔ میرے ذہن میں تو اس کی ضرورت سالہا سال سے ہے مگر دو چیزوں کی اس میں ضرورت ہے۔ کام کرنے والے آدمی اور کافی رقم غیبط کے اور طباعت کے لئے بھی، اس لئے دل کی دل میں رہ جاتی تھی کیا عجب ہے اب اس کا وقت آ گیا ہو۔

م۔ اب تک اہل سُنت کا کوئی ترجمہ انگریزی میں نہیں۔ یا تو انگریز مسیحیوں کے ہیں جنھوں نے جی بھر کر چوٹ کیا ہے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ اور یا پھر لاہوری مرزائی جماعت کا ہے، جو انگریزوں کے ترجموں سے تو بیشک بہت غنیمت ہے، تاہم اپنے مخصوص عقائد کا اتباع اس میں بھی ہے۔ صرف ایک ترجمہ اور ہے، جو مرزا حیرت دہلوی کی جانب منسوب ہے۔ خدا معلوم کس کا کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں اُسے خرید کر پڑھا۔ زبان کی لغزشوں کے علاوہ ادائے مفہوم میں بھی موٹی موٹی غلطیاں ملیں۔ میری انگریزی استعداد مُبتدیوں جیسی، اور عربی استعداد مُبتدیوں سے کمتر۔ اس لئے بار بار سوچتا ہوں، ہمت باندھتا ہوں، پھر ہچکچا کر رہ جاتا ہوں۔ مولانا نے بھی ایک بار دیوبند میں فرمایا تھا، اُس وقت صاف میں نے اپنی نااہلی کا عُذر کر دیا تھا۔ وُہ احساس تو اب بھی اپنی جگہ پر ہے، لیکن دوسری طرف ضرورت کا خیال دباتا چلا آتا ہے۔ بار ہا اس درمیان میں توفیق حق و شرح صدر کی دعائیں، نمازوں کے بعد کر چکا ہوں۔

ا۔ اللہ کا نام لے کر شروع تو کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ سامان بھی ہو جائے گا۔ اصل

---

[1] ملاحظہ ہوں نمبر ۵۵ و ۵۶۔

ضرورت ذمہ داری کی ہے تو آپ سے اچھا کون ملے گا۔ ایک بڑی بات یہ ہے کہ ہم سب کو اطمینان رہے گا۔ اور یہ بھی اطمینان رہے گا کہ آپ ہم لوگوں سے مشورہ لیتے رہیں گے۔ گویا ہم ہی لوگ کام کرنے والے ہوں گے۔

م۔ اگر کام شروع کر دیا تو بیچ کو کم سے کم ڈیڑھ سال کے لیئے بند رکھنا ہوگا۔

ا۔ اِس کی نسبت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اِس کو جیسے ناآشنا ہوں۔

م۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ قرآن مجید کی خالص خدمت کے ساتھ دوسرے کام جمع نہیں ہو سکتے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ پیش نظر تو متعدد تفسیروں اور ترجموں کو رکھوں گا لیکن اصل اعتماد جناب والا کے اور شیخ الہندؒ کے اُردو ترجموں پر رکھوں گا۔[1]

ا۔ کافی تو حضرت ہی کا ترجمہ تھا لیکن شاید کسی جگہ تفصیل مناسب ہو، اِس لیئے بیان القرآن بھی سامنے رہے تو اچھا ہے لیکن اگر کسی جگہ کچھ اختلاف ہو تو تقدیم حضرت ہی کے ترجمہ کی کیجئے۔

م۔ حیدر آباد کے عماد الملک سید حسین بلگرامی اگرچہ شیعہ تھے، لیکن برائے نام ہی شیعہ تھے آخر عمر میں اُنھوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر ہدایت انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا، انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی بہت ممتاز تھے۔ انشاء اللہ کئی پاروں تک اِس سے بھی مدد مل جائے گی۔

ا۔ مگر صرف زبان تک مدد محدود رہے۔ احکام وعقائد تک اثر نہ پہنچے۔

م۔ بزرگوں اور دوستوں میں تقریباً جناب ہی سے اِس کو پہلے پہل ظاہر کر رہا ہوں۔ اپنے کو تو اپنی ہر چیز ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اگر فی الواقع کوئی دینی خدمت ہے تو خاص طور پر دعا اور صرف توجہ فرمائیں۔

---

[1] یہ خیال اس وقت تھا۔ عملی تجربہ جوں جوں ہوتا گیا، حضرت تھانوی ہی کے کام کی افضلیت و شرفیت ظاہر ہوتی گئی۔

۱۔ دِل سے دُعا کرتا ہوں اور کروں گا۔

مشورہ نمبر۱۔ پاؤ پارہ لکھنے کے بعد مناسب ہے کہ معتمد عُلماء کو دکھلا کر ترمیم وغیرہ کے متعلق رائے لے لیجئے۔

مشورہ نمبر۲۔ اِس میں بھی غور کیجئے کہ تفسیر کے درمیان درمیان عقائد باطلہ کے رد سے تعرض مناسب ہوگا یا نہیں۔ خصوصاً جنھوں نے اِن عقائد کو مدلل بنانے کی کوشش کی ہے۔"

مولانا کا مکتوب اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ حوصلا افزا اور کیا ہوتا۔ لیکن کام درحقیقت حضرت کے جواب کے اور آغاز رمضان کے انتظار کے بغیر ہی کچھ نہ کچھ شروع کر دیا۔ کم سے کم مختلف ترجموں اور تفسیروں کا غور سے پڑھنا، اور کچھ آیتوں کو بالکل ابتدائی مشق کی طرح انگریزی میں منتقل کرنا۔ اور جب نظر غائر سے پڑھنا شروع کیا، تو جن ترجموں اور تفسیروں کی عبارتوں کی داد دیا کرتا تھا، اب ان ہی پر سوال پیدا ہونے لگے۔ کام کا ایک پورا خاکہ ذہن میں رکھ لیا تھا۔ ۲۱ر دسمبر کے عریضہ سے بہت سے اُمور کھل جائیں گے:

"انگریزی ترجمہ قرآن سے متعلق جناب والا کی ہمت افزائی نے دِل کو بڑی ہی تقویت پہنچا دی۔ انشاء اللہ رمضان سے کام شروع کروں گا۔ مولانا[۱] پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ آج ادھر ہی سے سلہٹ کے لئے گذرنے والے بھی ہیں۔ زبانی بھی عرض کروں گا[۲]۔ ماہ مبارک سلہٹ میں بسر فرماتے ہیں۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ رات میں استراحت برائے نام ہی کرتے ہیں۔ نوافل وغیرہ میں بڑی کثرت فرما دیتے ہیں[۳]۔"

دَوران ترجمہ میں حضرات عُلماء سے ہدایات حاصل کرتے رہنا تو شروع ہی سے ذہن میں تھا۔ جناب والا، اور حضرت مولانا کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی یہ اصحاب اربعہ تو پیش نظر ہی ہیں۔ اِن کے علاوہ اور جو نام ارشاد ہوں[۴]، لیکن درحقیقت مدد ان ہی حضرات سے زیادہ مل سکتی ہے، جو انگریزی بھی جانتے ہوں[۵]۔ طبقۂ عُلماء میں اس طرح کے کوئی صاحب خیال میں نہیں آتے۔ ندوہ میں مراقش کے ایک مالکی اُستاد تقی الدین الہلالی ہیں، عربی کے

ادب بھی اور انگریزی سے واقف بھی۔ لیکن اُن کے عقائد اور قرآن فہمی پر پورا اعتماد نہیں[6]۔ غیر انگریزی دانوں کو انگریزی عبارت سمجھانی مشکل ہے۔ ترجمہ در ترجمہ سے مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے[7]!

جناب والا نے مصارف کے باب میں جو فکر ظاہر کی ہے، تو اس میں تو شبہ نہیں کہ طباعت کے کُل مصارف ہزارہا ہزار کے ہوں گے، کاغذ اعلیٰ، جلد نفیس، یہ سب اگر نہ ہوا، تو انگریزی خواں طبقہ کتاب کو چھوئے گا بھی نہیں لیکن اس کا انتظام تو ان شاء اللہ اعلیٰحضرت نظام دکن کے خزانہ سے ہو جائے گا۔[1] میری ہر کتاب کے لئے مصارف طبع کی منظوری اب کی ہی سال وہاں سے ہوئی ہے[8]۔ اب تک یہ نہ تھا۔

البتہ دوسرے انگریزی تراجم، عربی تفاسیر، عربی انگریزی لغات وغیرہ کی فراہمی، نیز اور چند ابواب مصارف جو شروع ہی میں پیش آئیں گے؛ اُن کے لئے میرا تخمینہ ۴۰۵ سو کا ہے۔[2] اس کی بھی ان شاء اللہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی[9]۔

جناب والا کے ترجمۂ قرآن میں جزاء المحسنین وغیرہ کے موقع پر جزاء کا ترجمہ 'پاداش' سے فرمایا گیا ہے، آج کل بیان القرآن کی نظر ثانی جاری ہے۔ بہ ادب گزارش ہے کہ اس لفظ پر بھی مکرر نظر فرمالی جائے۔ پاداش فارسی میں تو بیشک مطلق جزاء کے معنی میں ہے۔ لیکن اُردو میں اس کا استعمال، میری فہم ناقص میں، عموماً موقع ذم ہی پر آتا ہے۔ اگر خیال والا میں بھی یہ تحقیق طلب ہو، تو کسی صاحب زبان سے مشورہ فرمالیا جائے[10]"

---

[1] بعد کو مہربانوں نے اگرچہ یہ فیض کا دروازہ بند کرا کے چھوڑا، لیکن اُس وقت یعنی ۴۳ء میں نواب اکبر یار جنگ بہادر (مرحوم سکریٹری) نے یہ منظور کرا دیا تھا کہ اس خاکسار کی ہر کتاب سرکار عالی کے مصارف سے طبع ہوا کرے گی۔

[2] اب اپنی سادہ دلی پر حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت اتنا مختصر تخمینہ کیسے ذہن میں آیا تھا۔ ہزارہا کی رقم محض کتابوں کی خریداری میں صرف ہو گئی۔

جواب نمبر وار پڑھیئے:-

(۱) اِس خبر سے میری تو رمضان ہی میں عید ہو گئی۔

(۲) خدا کرے دُعا بھی لی ہو۔

(۳) مجھ کو اپنے حال پر تاسف ہوتا ہے کہ رمضان میں کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔[۱]

(۴) اِس وقت تو کوئی نام ذہن میں نہیں۔ اگر یاد آ گیا تو عرض کر دوں گا۔ مگر میرا مذاق تو یہ ہے،

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

(۵) خیر، اگر ایسا کوئی جامع نہ ملے تو تیسرا شخص جو دونوں کو جمع کر سکتا ہے آپ سے بہتر اس وقت دُوسرا نہیں۔

(۶) تب تو میں بھی عرض کروں گا کا تقربا ھذہ الشجرۃ۔

(۷) میں تو آپ کے فیصلہ کو کافی سمجھتا ہوں۔

(۸) الحمد للہ۔ مبارک۔

(۹) احسان ہو گا میری بھی شرکت منظور فرما لیجئے۔ پچاس سے کم نہیں۔ سَو سے زیادہ نہیں۔ اور اگر یہ ذخیرہ وقف رہے تو کسی کو شبہہ نہ ہو۔

(۱۰) میں کس کو ڈھونڈتا پھروں گا، میرے جی کو تو یہ مشورہ لگ گیا۔ لفظ صلہ بدل دیا گیا۔ اور یہ معلوم نہیں کہ آیا ہر جگہ یہی ترجمہ ہوا ہے، یا صرف اِسی آیت میں۔ اگر دو چار مواقع ذہن میں ہوں اطلاع فرمانے سے تلاش سے بچ جاؤں گا۔

(نوٹ) یہ ایک امر طے ہونا باقی رہا کہ اہلِ باطل کے تمسکات کا بھی تفسیر کے درمیان درمیان جواب ہو گا یا نہیں۔"

---

[۱] یہ حضرت کی محض تواضع ہے ورنہ جتنا اہتمام حفظ اوقات کا حضرت کے ہاں سال کے سال رہتا تھا، اِس پر کسی اضافہ کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

طویل عریضہ کا ایک جزو ابھی رہ گیا۔ جواب کے ساتھ اب حاضر ہے:-

م: ایک ندوی عالم نے جو کتابوں پر نظر رکھتے ہیں، لیکن تصوف سے مس نہیں، ایک مضمون معمولاتِ صوم سے متعلق صدق میں اشاعت کے لئے بھیجا ہے۔ ملفوف ہے۔ آخر کا ٹکڑا پنسل سے نشان زدہ ملاحظہ فرما لیا جائے۔ عجب نہیں یہ تعریض جناب والا کے ہاں کے معمولات پر ہو۔[51]

ا۔ اگر اُن کی یہ مُراد ہے تو بالکل ہی بے اصل ہے۔ یہاں تو اس واقعہ کا نشان بھی نہیں۔

م۔ میں اس مضمون کو نیم تائیدی نیم تردیدی نوٹ کے ساتھ چھاپنے کا ارادہ کر رہا ہوں، تھانہ بھون کے معمولات کا حال معلوم ہو جاتا تو مجھے اپنے حاشیہ میں بڑی سہولت ہو جاتی۔

ا۔ یہاں کوئی بات نئی نہیں ہوتی۔ عام عادت یہ ہے کہ نماز سے پہلے معمولی طور پر فرداً فرداً کھانا کھا لیتے ہیں۔ جس میں اجتماع ہوتا ہے نہ اہتمام ہوتا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر اپنے کام میں یا آرام میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نہ چائے کا دَور ہوتا ہے نہ اَور کسی قسم کا اہتمام ہوتا ہے۔ اپنے طور پر کسی کو چائے کی عادت ہو تو وہ انتظام کر لیتا ہو گا جس کی کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

میں بعض اہل علم کو یہ خط سُنا رہا تھا کسی نے کہا کہ شاید مولانا[52] پر تعریض ہو سکے۔ میں نے یہ پُوچھنا اچھا نہ سمجھا کہ تم کہاں سے کہتے ہو۔ آپ سے نقل کر دیا کہ شاید حاشیہ میں اس کی رعایت ہو سکے۔ ندوی صاحب کا مضمون دیکھ کر جی چاہا کہ اِس باب میں اپنے معلومات بھی پیش کر دوں جس میں ان کو خطاب مقصود نہیں، آپ کا شوقِ تحقیق یاد آ کر اس تحریر کا باعث ہوا۔ مقصود اس کے بھیجنے سے اشاعت نہیں، صرف آپ کو معلوم کرانا ہے۔ پھر خواہ اپنے تک رکھیئے، یا دوسروں کو پہنچا دیجیے، پھر خواہ زبان سے خواہ قلم سے۔

اطلاعِ مُستقل: مسئلہ تقلیل طعام فی رمضان میں میرا ایک مُستقل وعظ ہے۔ میرے پاس کوئی نسخہ نہ تھا۔ ایک صاحب سے عاریت لے کر بھیجتا ہوں۔ شاید معلومات میں اضافہ ہو کر

---

51 اصل عبارت مولانا ندوی کے مضمون میں، آئندہ نمبر میں، ختم مضمون سے ذرا قبل ملاحظہ ہو۔

52 یعنی مولانا حسین احمد صاحب۔

حاشیہ میں کچھ مدد ملے۔ یا نفس مضمون ہی کو فی المحال ملتوی کر دینے کی رائے ہو جائے۔ اگر دل چاہے بعد ملاحظہ واپس کر دیجئے صفحہ ۹ ہم خصوصیت سے دیکھئے۔

معذرت۔ مضمون ہمراہی ہیں بہ وجہ دردِ سر و قلت فرصت کے دیر لگ گئی۔ تکلیف انتظار معاف فرمائیے۔

مشورت۔ ایک صاحب جامع انگریزی و عربی کے یاد آئے۔ بعض چیزوں کا ترجمہ ان کی نگرانی میں ہوا بھی ہے مولوی محمد عیسیٰ۔ ماسٹر انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد۔ اگر فرمائیے ان سے پوچھوں۔

(۵۹)

حضرت نے توغایت کرم سے پورا رسالہ ہی حکمت صوم پر تحریر فرما دیا۔ ندوی عالم کا اصل مضمون، اس پر سچ کا مختصر حاشیہ، اور پھر حضرت کا اصل مقالہ، یہ سب جس طرح سچ جلد ۹ نمبر ۵۰ (۲۹ دسمبر ۳۳ء) میں شایع ہوئے تھے، آج ان صفحات میں بھی اسی طرح درج ہو رہے ہیں۔

ہمارے روزے

(از مولانا عبد السلام ندوی۔ مصنف "اسوۂ صحابہ" وغیرہ)

مکرمی۔ السلام علیکم۔

صوم رمضان کے متعلق ایک نہایت ضروری اصلاح کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ جہاں تک مجھے یاد ہے، آپ نے اب تک اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول نہیں فرمائی ہے۔

یہ مسلّم ہے کہ رمضان کے روزوں کا اصلی مقصد قوت بہیمیہ کو مغلوب اور قوت ملکیہ کو غالب کرنا ہے، اسی لئے شارع نے ان ہیجانات و محرکات سے چند دنوں کے لئے روکا ہے، جس سے قوت بہیمیہ میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یعنی کھانا، پینا، عورتوں سے متمتع ہونا، اور ان تینوں

چیزوں کے چھوڑ دینے کے بعد مادّی حیثیت سے روزہ کی حقیقت مکمل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم اسرار الدین کے ماہرین نے روزہ کی تکمیل کے لئے جو باتیں ضروری قرار دی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ غذا میں جہاں تک ممکن ہو کمی کی جائے۔ چنانچہ امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں :-

"روزہ کی تکمیل کی پانچویں شرط یہ ہے کہ افطار کے وقت حلال کھانا بھی اس قدر نہ کھایا جائے کہ پیٹ میں امتلاء پیدا ہو جائے۔ کیونکہ خدا کے نزدیک کوئی ظرف اس پیٹ سے زیادہ مبغوض نہیں جسے حلال کھانے سے بھر لیا جائے۔ درحقیقت روزہ سے خدا کے دشمن کی شکست اور خواہش نفسانی کی مغلوبیت کیونکر ممکن ہے؟ جب کہ روزہ دار اپنے افطار کے وقت اس کمی کی تلافی کرے جو دن میں کی گئی ہے، بلکہ بسا اوقات طرح طرح کے کھانوں سے وہ اس پر اضافہ کر لیتا ہے، یہاں تک کہ یہ ایک مستقل عادت ہو گئی ہے کہ رمضان کے لئے ہر قسم کے کھانے مہیا کئے جاتے ہیں۔ اور اس میں وہ وہ کھانے کھائے جاتے ہیں، جو اور مہینوں میں نہیں کھائے جاتے۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ روزہ کا مقصد بھوکا رہنا اور خواہش نفسانی کو شکست دینا ہے تاکہ نفس کو تقویٰ حاصل کرنے کی قوت حاصل ہو، لیکن جب معدہ کو صبح سے شام تک خالی رکھا جائے، یہاں تک کہ اس کی خواہش طعام میں ہیجان پیدا ہو جائے اور اس کی رغبت غذا کی طرف بہت زیادہ ہو جائے، پھر اس کو لذیذ کھانے کھلا کر آسودہ و سیر کر دیا جائے۔ تو اس کی لذت طلبی بڑھ جائے گی، اس کی قوت دوگنی ہو جائے گی اور خواہشیں ابھر جائیں گی، جو تقریباً دبی ہوئی تھیں۔ غرض روزہ کی روح، ان قوتوں کو ضعیف کرنا ہے، جو برائی کی طرف میلان پیدا کرنے میں شیطانی آلے ہیں اور یہ غرض صرف تقلیل غذا سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ روزہ دار صرف وہی کھانا کھائے جو رمضان کے علاوہ معمولاً کھاتا تھا لیکن اگر صبح و شام دونوں وقت کا کھانا ملا کر کھائے تو اس کو روزہ سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ آداب صوم میں یہ ہے کہ روزہ دار دن کو بہت نہ سوئے تاکہ اس کو بھوک اور پیاس کا احساس ہو اور اپنی قوت کا ضعف معلوم ہونے لگے۔"

(احیاء العلوم۔ جلد اوّل مطبوعہ مجتبائی پریس صفحہ ۱۴۰)

احادیث کے مطالعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ عہد نبوت اور عہد صحابہ میں رمضان کے کھانے کا کوئی مزید اہتمام نہیں کیا جاتا تھا بلکہ معمولی غذا رمضان میں بھی کھائی جاتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور یا پانی سے افطار کرتے تھے، سحر میں بھی، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صرف کھجوریں کھائیں۔ بعد کو بعض صحابہ ستو گھول کر الئے تو ستو بھی پی لیا، اس سے زیادہ مجھے اس مبارک عہد میں غذاؤں کی رنگینی اور بوقلمونی نظر نہیں آتی، لیکن اس وقت مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟ رمضان نے ایک تہوار یا تقریب کی صورت اختیار کر لی ہے معمولی آدمی کے لئے بھی افطار کے وقت گھنگنی یا پھلوڑی تو لازمی ہے۔ سحر کے لئے دودھ بھی ایک اہم چیز فرض کر لی گئی ہے۔ کھانے میں بھی جو شخص دال روٹی کھاتا تھا وہ کم از کم ترکاری کا تو اضافہ کر ہی لیتا ہے۔ اہل مقدرت کے لئے دسترخوان تو رمضان میں گویا رنگین غذاؤں کا گلدستہ بن جاتے ہیں۔ دعوتوں کا ہنگامہ گرم ہو جاتا ہے۔ روزہ کشائی کی رسم تو خاص شادی کی تقریب بن جاتی ہے۔ یہ حالت معمولی دنیاداروں کی نہیں ہے، علماء و صوفیہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ رمضان میں بجائے اس کے کہ حدیث و قرآن کا درس دیا جائے، راحت طلبی کے لئے ہمارے عربی مدارس میں تعطیل ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک خاص تصوف کے مرکز کے متعلق ایک مضمون پڑھا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مغرب سے سحر کے وقت تمام لوگ جو اس مرکز سے روحانی فیض اٹھاتے ہیں، بیدار رہتے ہیں اور زیادہ تر عمدہ غذاؤں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ تراویح سے پہلے، تراویح کے بیچ میں اور تراویح کے بعد تین بار چائے کا دور چلتا ہے۔ چونکہ آپ نے زیادہ تر علماء و صوفیہ کا فیض اٹھایا ہے اس لئے براہ کرم مجھ کو اور ناظرین سچ کو اس معاملہ میں اپنی معلومات سے فائدہ پہنچایئے، اور یہ بتایئے کہ اس کی سند کیا ہے، اور یہ حالت مقاصد صوم کے منافی ہے یا نہیں"؟

سچ۔ مولانا کا مضمون بالا حضرت محقق تھانوی مدظلہ کی خدمت میں بجنسہ بھیج دیا گیا۔ حضرت موصوف نے غایت کرم سے اس پر پورا مقالہ قلمبند فرما دیا، جو تحقیق مطالب جامعیت بیان کے لحاظ سے اپنا نظیر آپ ہے۔ آگے اسے بصد مسرت و افتخار درج کیا جاتا ہے۔ موجودہ

مسرفانہ "افطار پارٹیوں" اور دھوم دھام کی دعوتوں کی تائید حضرت مولانا تھانویؒ کے مقالہ سے ہرگز نہ سمجھی جائے۔ حضرت نے صرف اصولی حیثیت سے گفتگو فرمائی ہے، باقی ان صحبتوں کی جو خرابیاں مشاہدہ ہو چکی ہیں ان کے بعد ان تقریبوں کی تائید کر ہی کون سکتا ہے۔

کلمۃ القوم فی حکمۃ الصوم

(از حضرت حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہٗ)

بعد الحمد و الصلوٰۃ، تحقیق مقصود کے قبل مبادی کی ضرورت ہے۔

۱ احکام باعتبار ثبوت کے تین قسم ہیں۔ منصوص[1]۔ اجتہادی[2]۔ ذوقی[3]۔ اجتہادی میں اجتہاد سے مُراد وہ ہے جس کو فقہاء اجتہاد کہتے ہیں۔ اور ایسے اجتہاد سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں وُہ واقع میں نص ہی سے ثابت ہوتے ہیں۔ اجتہاد سے صرف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اِسی لئے کہا جاتا ہے اَلْقِیَاسُ مُظْهِرٌ لَا مُثْبِتٌ۔ اور ذوقی وہ احکام ہیں جو نص کا مدلول نہیں، نہ بلا واسطہ جو منصوص کی شان ہوتی ہے نہ بواسطہ۔ جیسے اجتہادیات کی شان ہوتی ہے بلکہ وہ احکام محض وجدانی ہوتے ہیں۔ اور اس ذوق و اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ احکام اجتہادیہ مدلول نص ہیں اور یہ مدلول نص نہیں۔ اِسی واسطے مجتہدین سے ایسے احکام منقول نہیں نہ کسی پر اِن احکام کا ماننا واجب ہے۔ محض اہل ذوق کا وجدان اِن احکام کا مبنیٰ ہوتا ہے۔ البتہ اُن میں بعض احکام ایسے ہوتے ہیں کہ اشارات کتاب و سُنّت سے اُن کی تائید ہو جاتی ہے تو اِس صورت میں ان کا قائل ہونا جائز ہے۔ اور اگر کتاب و سُنّت کے خلاف ہو تو اس کا رد ہونا واجب ہے۔ اور اگر کتاب و سُنّت سے نہ متائید ہوں نہ اس کے خلاف ہوں تو اس میں جانبین میں گنجائش ہے۔ اِسی طرح اگر ایک صاحب ذوق کو متایَد معلوم ہوں اور دوسرے کو خلاف تب بھی اس میں جانبین میں گنجائش ہے اور یہ اجتہادیات[1] جزء فقہ ہیں اور ذوقیات[2] جزء تصوف۔

---

[1] و [2] اجتہادیات، ذوقیات، دونوں کی تشریح ابھی اُوپر ہو چکی ہے۔ (ح)

۲۔ احکام اجتہادیہ کا مبنیٰ علت ہوتی ہے جس سے حکم کا تعدیہ کیا جاتا ہے اور ذوقیات کا مبنیٰ محض حکمت اور وہ بھی غیر منصوص جس سے حکم متعدّی نہیں ہوتا، نہ حکم کا وجود و عدم اس کے ساتھ دائر ہوتا ہے۔ (اور یہ عدم دَوران حکمت منصوصہ میں بھی عام ہے جیسے طواف میں رمل کہ اس کی بناء ایک حکمت تھی مگر وہ مدارِ حکم نہیں رہی) مگر تمام مسائل تصوّف کو اس شان کا نہ سمجھا جائے ان میں بھی بعض اجتہادی ہیں اور بعض منصوص بھی ہیں مقصود یہ ہے کہ ان میں جو ذوقیات ہیں اُن کی یہ شان ہے جو مذکور ہوئی۔

۳۔ ایک دوسرے اعتبار سے احکام کی اور دو قسمیں ہیں مقاصد اور مقدّمات۔ یہ احکام ذوقیہ صرف مقدمات ہوتے ہیں مقاصد نہیں ہوتے۔ مقاصد صرف منصوص ہوتے ہیں یا اجتہادی۔[1]

۴۔ احکام منصوصہ و اجتہادیہ شریعت ہے۔ احکام ذوقیہ شریعت نہیں، البتہ اسرارِ شریعت اُن کو کہا جا سکتا ہے اور یہ سب مبادی ماہرِ قواعد شرعیہ کے نزدیک ظاہر ہیں۔

اب مقصود عرض کرتا ہوں۔ مسئلہ زیرِ بحث نہ منصوص ہے نہ اجتہادی۔ صرف ذوقی ہے اور جو کچھ اس باب میں احیاء العلوم میں فرمایا ہے وہ اسی ذوق پر مبنی ہے۔ اور ان کے نزدیک کچھ رمضان کی تخصیص نہیں مطلق جوع کے باب میں وہ اسی کے قائل ہیں، اور بعض کا ذوق اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ علی قاری شرح شمائل ترمذی میں ابن الجوزی سے نقل کرتے ہیں "ومن جهلة الصوفية من يقلل المطعم ويكثر الصوم حتى ييبس بدنه ويعذب نفسه بلبس الصوف ويمتنع من الماء البارد وما هذه طريقة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا طريق صحابته واتباعهم وانما كانوا يجوعون اذا لم يجدوا شيئاً فاذا وجدوا اكلوا الخ ومن حاشية تقليل الطعام بصورة الطعام" اور حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب الصوم میں فرماتے ہیں:

ثم ان تقليل الاكل والشرب طريقان احدهما ان لا يتناول منهما الا قدراً يسيراً والثاني ان تكون المدة المتخللة بين الاكلات زائدة على القدر المعتاد والمعتبر في الشرائع هو الثاني لانه

[1] یعنی مقاصد میں شمار صرف وہی احکام ہوتے ہیں جو ثابت یا تو نص سے ہیں، اور یا ائمہ فقہ کے اجتہادات سے۔ (ر ح)

يخفف وينقه ويذيق بالفعل مذاق الجوع والعطش ويعرف البهيمية حيز وحشة ويأتي عليها إيلاماً محسوساً والأول لا يأتي تحت التشريع العام إلا بجهد فإن الناس على منازل مختلفة جداً الخ۔

اس سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ مسئلہ متکلم فیہا میں ذوق مختلف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سا ذوق اقرب الی الکتاب والسنت ہے۔ اس کا موازنہ دونوں ذوق کے مؤیدات میں غور کرنے سے ہو سکتا ہے سو ذوق اول کے یہ مؤیدات ہو سکتے ہیں (الف) کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ای کے تحذروا المعاصی فإن الصوم یقمع الشهوة التي امها ویکسرها۔ (ب) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فإنه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فإنه له وجاء رواه الشیخان (ج) احادیث فضیلت جوع وذم شبع۔

مگر ان سب استدلالات میں شبہات ہیں۔ (الف) میں یہ کہ یہ تفسیر متعین نہیں، دوسری تفسیر بھی محتمل ہے، چنانچہ ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے تتقون من الطعام والشراب والنساء مثل ما اتقوا قبلکم اور تفسیر نیشاپوری میں ہے لعلکم تتقون بالمحافظة علیها لقدمها وعظم شأنها او لعلکم تنتظمون فی سلك اهل التقوی فان الصوم شعارهم اور اگر وہی تفسیر مان لی جاوے تب بھی دلالت علی المقصود میں یہ شبہ ہے کہ کسر قوت بہیمیہ تقلیل طعام پر موقوف نہیں۔ کما مر قریباً عن حجة اللہ البالغة وسیأتی ایضاً اور (ب) میں یہ کہ اس میں صوم کی خاصیت بیان کی گئی ہے تشریع صوم کی حکمت بیان نہیں کی گئی اور یہ خاصیت موقوف نہیں ہے تقلیل اکل پر کیونکہ تجربہ ہے کہ باوجود تمتع من اللذات کے رمضان میں ضعف معتد بہ ہو جاتا ہے۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ عادت تھی دو وقت رغبت کے ساتھ کھانے کی اور اب رغبت کے ساتھ صرف ایک وقت کھایا جاتا ہے یعنی شام کو اور سحر کے وقت بوجہ عادت نہ ہونے کے رغبت سے نہیں کھایا جاتا۔ اس لئے وہ جزو بدن اور بدل ما یتحلل نہیں بنتا۔ پھر جب وقت آتا ہے عادت کے سبب طبیعت کو اشتیاق ہوتا ہے اور باوجود اشتیاق کے کھانا نہیں ملتا، اس لئے طبیعت ضعیف

ہوجاتی ہے۔ چنانچہ یہ ضعف عشرۂ وسطیٰ میں کمی کے ساتھ اور عشرۂ اخیرہ میں زیادتی کے ساتھ بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے۔ البتہ اگر کئی مہینہ کے روزے ہوتے تو چند روز میں کھانے کے اوقات معتادہ بدل جاتے، پھر رغبت سے دونوں وقت کھانا کھایا جاتا اور جزو بدن بنتا اور ضعف نہ ہوتا اور قوت شہویہ میں انکسار نہ ہوتا۔ اور اسی راز سے صوم دہر پسند نہیں کیا گیا اور صوم داؤدی میں عادت قدیمہ نہیں بدلتی، اس لئے اس کی اجازت مع بیان الفضیلت دی گئی۔

اور یہی تقریر (و الف) میں بھی ہوسکتی ہے کہ اگر اس تفسیر کو متعین بھی مان لیا جائے تب بھی صوم ہر حالت میں قوت شہویہ کا کاسر ہے۔ وھذا ھو الذی وعدناہ قریباً فی بناو سیاتی ایضاً (و ح) میں یہ کہ احادیث فضل جوع و ذم شبع[1] میں یہ احتمال ہے کہ جوع سے مراد جوع اضطراری ہو۔ یعنی اگر میسر نہ ہو تو اس کی فضیلت کو یاد کرکے صبر کرے جیسے نصوص میں بیماری کے فضائل بیان کئے گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمداً بیمار ہوجایا کرے۔ چنانچہ آیت ولنبلونکم الخ میں جوع کو مصائب میں شمار فرمایا ہے اور سب مصائب مذکورہ آیت غیر اختیاری ہیں تو جوع سے وہی مراد ہوگا جو غیر اختیاری ہو۔ اسی طرح شبع مذموم میں یہ احتمال ہے کہ شبع مفرط[2] یعنی فوق الشبع مراد ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں اکثرہم شبعاً[3] فرمایا ہے من شبع منہم نہیں فرمایا۔ سو ایسے شبع کو فقہاء نے بھی حرام فرمایا ہے۔ کذا فی الدر المختار و رد المحتار کتاب الکراہیت۔ یہ تو ذوق اول کے مؤیدات پر کلام تھا اب ذوق ثانی کے مؤیدات عرض کرتا ہوں۔

(د) حدیث میں ہے شہر یزاد فیہ رزق المومن کذا فی المشکوٰۃ من البیہقی تو گویا یہ امر مستقل ہے کہ رزق زائد تو رمضان میں دیا جائے اور اس سے منتفع ہونے کے لئے شوال کے انتظار کا حکم دیا جائے (ہ) افطار کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قول منقول ہے ذھب الظمأ وابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ تعالیٰ رواہ ابو داؤد ظاہر ہے کہ

---

[1] شکم سیری (م ح) [2] خوب ٹھونس ٹھونس کر کھا لینا (م ح) [3] حدیث کے پورے الفاظ یہ ہیں اکثرھم شبعاً فی الدنیا اطولھم جوعاً یوم القیامۃ (م ح)

ذھاب ظماء[1] اور ابتلال عروق[2] بدوں سیراب ہو کر پانی پینے کے نہیں ہو سکتا اور باوجود اس کے وہ منقص اجر نہیں ہوا۔ چنانچہ ثبت الاجر اس میں نص ہے اور کھانے اور پانی میں کوئی معقول فرق نہیں کہ ایک سے سیری پسندیدہ ہو دوسرے سے ناپسندیدہ ہو (۵) حدیث میں اشباع[3] صائم کی فضیلت اور ثواب وارد ہے (مشکوٰۃ عن البیہقی) اگر شبع ناپسندیدہ ہوتا۔ کان مقدمۃ الشیئ ملحق بہ نہ کہ موجب ہوتا (۶) شبع اور ری تو مقدمات شہوت سے ہیں اور جماع خود قضائے شہوت ہے۔ اگر شبع اور ری مفوت روح صوم[4] ہے تو جماع بدرجۂ اولیٰ اس کا مفوت ہے مگر اس کی تقلیل کی کہیں ترغیب نہیں دی، بلکہ اس کی اجازت وسیعہ کو موقع امتنان میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ قال فَالْاٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ اور اس کے ساتھ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا کو بھی مقرون فرمایا ہے اور سب کے لئے غایت فرمائی۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (ے) اگر تقلیل طعام فی رمضان کوئی امر مقصود ہے تو فضائل صوم کے ساتھ اس کی فضیلت اور منکرات صوم کے ساتھ شبع کی مذمت نصوص میں یا مجتہدین کے کلام میں کیوں وارد نہیں ہوئی۔ کیا اس سے اُحِلَّ لَكُمْ دِيْنِكُمْ میں اشکال وارد نہیں ہوتا۔ یہ پانچ مؤیدات ہیں ذوق ثانی کے جو اس وقت ذہن میں حاضر ہو گئے۔ اگر اہل ذوق اول ان تائیدات میں بھی کوئی خدشہ نکالیں ہم کو مضر نہیں۔ کیونکہ احکام مختلف فیہا میں جانبین میں گنجائش ہوتی ہے اس لئے اس کا بھی مطالبہ کیا جاوے گا کہ اہل ذوق اول بھی اہل ذوق ثانی پر طعن و تشنیع اور ان کی تحقیر و تقبیح سے باز رہیں۔ کیونکہ ذوقیات میں ایسا اختلاف کوئی امر منکر نہیں ہے چنانچہ قوم میں دعا و ترک دعا کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور مباشرت اسباب و ترک اسباب کا مسئلہ مختلف فیہ ہے اور بہت مسائل ایسے ہی ہیں، اسی طرح یہ مسئلہ فقہی نہیں جس کا اتنا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ فقہاء نے باوجودیکہ مستحبات تک کی تدوین فرمائی مگر اس سے کہیں تعرض نہیں فرمایا اور اگر فقہی بھی

---

[1] پیاس کا بجھنا۔ (ریچ) [2] رگوں کا تر و تازہ ہو جانا۔ (ریچ) [3] روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلانا (ریچ)
[4] روح صوم کو ضائع کرنے والا۔ (ریچ)

ہوتا تو مختلف فیہ ہونے کی صورت میں پھر بھی یہی حکم ہوتا۔ اِس تقریر سے اُمید ہے کہ اصل اجزاء مسئول عنہا کا جواب ہوگیا ہوگا باقی زوائد کے متعلق بھی کچھ مختصر عرض کئے دیتا ہوں۔

(۱) صحابہؓ کے وقت میں اہتمام نہ ہونا حجت نہیں کیونکہ ان کے یہاں ہر چیز میں سادگی تھی اُسی عادت کے موافق یہاں بھی عمل تھا۔

(۲) اور اس کو تقریب بنالینا اگر حدود کے اندر ہو تو کیا حرج ہے خود حدیث میں ہے کہ رمضان کے لئے جنّت کی زینت سال بھر تک ہوتی رہتی ہے۔ (مشکوٰۃ عن البیہقی) تو اگر اس کی تقلید میں یہاں بھی کچھ اہتمام ہو تو کیا حرج ہے۔

(۳) دعوتوں کا ہنگامہ یہ فرد ہے مواساۃ کی۔ حدیث میں اس کو شہر المواساۃ فرمایا گیا ہے (مشکوٰۃ عن البیہقی)

(۴) روزہ کشائی کی تقریب بھی ایک فرد ہے، فرح عند الفطر۔ اولاد کی توفیق دین سے فرح کیوں مذموم ہو۔

(۵) تعطیل مدارس کی راحت اور اعمال رمضان کے لئے کیوں منکر ہے اور وہ عادۃً درس کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

(۶) صوفیہ کی طرف سے جواب دینا خود صوفیہ کے مذاق کے خلاف ہے۔ وہ بیچارے خود ہی اپنے کو سب سے اخس وادنیٰ سمجھتے ہیں اور اپنی نصرت کو خود اس طرح منع کرتے ہیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اِس احقر کو صوفیہ کے اوراعمال میں تو ان کی تقلید کی توفیق نہیں ہوئی، مگر یہ رسم سُن کر جواب تک نہ سُنی تھی حرص ضرور ہوئی کہ واقعی جاگنے کا دَور جاگنے کی تو اچھی تدبیر ہے مگر حرص ہی ہو کر رہ گئی اس لئے کہ پھر نیند سے محرومی ہوجائے گی جس کا میں اس سے زیادہ حریص ہوں۔ اور جس طرح تقلیل طعام میں وہ ذوق پسند آیا جس میں شبع بھی ہاتھ آوے اِسی طرح تقلیل منام میں وہ مسلک پسند ہے جو مخل نوم نہ ہو۔ وہ مسلک یہ ہے۔ حدیث من صلی العشاء فی جماعۃ فکانما قام نصف اللیل ومن

صلى الصبح في جماعة فكانما صلى الليل كله لمالك ومسلم تفسير عن انس تتجافى جنوبهم عن المضاجع قال ما بين المغرب والعشاء وعنه ايضاً نزلت في انتظار الصلوة التي تدعى العتمة وعنه ايضاً في قوله تعالى كانوا قليلاً من الليل ما يهجعون قال يتيقظون يصلون ما بين هاتين الصلاتين ما بين المغرب والعشاء عن محمد بن علي قال لا ينامون حتى يصلوا العتمة وعن ابي العالية قال لا ينامون بين المغرب والعشاء (تفسير ابن جرير وفي الدر المنثور كانوا لا ينامون الليل كله فالقليل لا يقابل الكثير بل يقابل الجميع في معنى البعض (كذا في بيان القرآن) -اش. قال سعيد ابن المسيب من شهد العشاء من ليلة القدر فقد اخذ بحظه منها (موطاء الامام المالك) قلت فكانه تفسير المرفوع من حرم خيرها فقد حرم فالذي شهد في جماعة لما يحرم خيرها۔

اس لزوم کی پسندیدگی سے وہ چائے کی غرض بھی جاتی رہی اور اپنے جی کو یوں سمجھا لیا کہ اللہ تعالیٰ ناکاروں کو بھی بخش ہی دیں گے۔ اب اسی امید مغفرت پر کلام کو ختم کرتا ہوں اور چونکہ اس کی مقدار معتد بہ ہوگئی اس لئے ایک لقب بھی تجویز کئے دیتا ہوں، یعنی کلمۃ القیم فی حکمۃ العدیم

کتبہ اشرف علی ۲۵ شعبان ۱۳۵۲ھ ہجری

ضمیمہ- یہ بھی محتمل ہے کہ امام غزالیؒ کے ارشاد کو اختلاف ذوقی پر محمول نہ کیا جاوے بلکہ اپنے زمانہ کے قویٰ کو دیکھ کر بطور مجاہدہ اسی طریق کو تجویز فرمایا اور مجاہدہ زمانہ کے اختلاف سے بدل جاتا ہے۔ اب قویٰ ایسے ضعیف ہیں کہ اتنی تقلیل یقیناً طاعات مقصودہ میں مخل ہو جاوے گی۔ باقی یہ کہ حضرت امام نے عنوان تاکید سے کیوں فرمایا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرات صوفیہ پر بعض حالات کا یا بعض اصطلاحات کا غلبہ ہوتا ہے اس میں اس قسم کا عنوان بیساختہ صادر ہو جاتا ہے اور اس مقام پر ایک اور نکتہ قابل سمجھنے کے ہے گویا قواعد طریقت سے وہ روح ہے مسئلہ کی۔ وہ یہ کہ مقصود سالک کا حسب تصریح ائمہ تشبہ ہے او رملائکہ کے ساتھ اور یہ تشبہ جس طرح شبع مفرط سے فوت ہوتا ہے اسی طرح جوع مشوش سے بھی، کیونکہ ملائکہ دونوں سے منزہ ہیں اور یہ سب تحقیق

اِس تقریر پر ضروری ہے کہ صوم میں حکمت کسر قوت شہویہ کو مان لیا جاوے ورنہ اگر وہ امر تعبّدی ہو جیسا کہ خود روزہ کا عدد کہ اِس میں کوئی حکمت معلوم نہیں تو اس تمامتر سوال و جواب ہی کی گنجائش نہیں اور بعض الفاظ حدیث سے یہ احتمال تعبد کا ظاہر تر ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

من صام رمضان ایماناً واحتساباً۔ رواہ الشیخان حیث جعل الباعث علیہ الایمان وطلب الثواب لا شیئاً من الحکمۃ والمصلحۃ وھذا ھو التعبد۔ فقط

(۶۰)

ترجمہ کا کام ابھی باضابطہ اور مسلسل شروع نہیں ہوا، اور تفسیر کا تو ابھی خیال بھی پورا نہ تھا۔ تاہم کچھ نہ کچھ ابتدائی مشقیں بے قاعدہ طور پر شروع ہو گئیں، اور ضروری مطالعہ تو پوری طرح جاری ہو گیا ـــــ ایک بڑی دقت اوّل اوّل یہ محسوس ہو رہی تھی کہ مذہبی خیالات کے اظہار کے لئے انگریزی میں الفاظ کہاں سے ملیں گے؟ اب تک انگریزی میں سارا مطالعہ علمی و ادبی، غرض غیر مذہبی ہی رنگ کا تھا۔ اب پہلی بار انگریزی بائیبل اور اس کے متعلقات کو پڑھنا شروع کیا تو آنکھیں کھل گئیں۔ اور نظر آیا کہ چند مخصوص اسلامی اصطلاحات کو چھوڑ کر باقی عام طور پر مذہبی خیالات کی ترجمانی میں انگریزی زبان ہرگز تنگ نہیں۔ ۱۲ر دسمبر ۳۳ء (مطابق ۲ر رمضان المبارک ۵۲ھ) کا عریضہ اسی دور کا ترجمان ہے:-

م ۲۔ انگریزی ترجمہ شروع کرنے کی ابھی نوبت نہیں آئی۔ ایک ہفتہ ان شاء اللہ دوسرے مشاغل ختم کر کے اور یکسوئی کے ساتھ اس کے لئے وقت نکالوں گا۔

ا۔ بیحد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے کہ عموماً وخصوصاً نافع ہو۔

م۔ طریق کار ذہن میں یہ ہے کہ روز، بعد دُعا اور اگر ہمت نے ساتھ دیا تو بعد دو رکعت نفل کے[1]، ایک رکوع کا مفہوم پہلے بیان القرآن، نیز ترجمۂ شیخ الہند کی مدد سے سمجھ لیا کروں گا، اور اس کے بعد اُسی مفہوم کو انگریزی میں ادا کر دیا کروں گا[2]۔ دُوسرے انگریزی ترجمے بھی سامنے ہوں گے

---

[1] ہمت نے چند ہی روز بعد جواب دیدیا۔ [2] اِن التزامات سے بعد کو رجوع کرنا پڑا۔

ایک نظر اُن پر بھی کر لیا کروں گا۔ عربی، انگریزی لُغات جو اہل یورپ تیار کر چکے ہیں، اُن میں سب سے بہتر اور مفصل مدّ القاموس، ۸ ضخیم جلدوں میں ہے[1]۔ بیان القرآن ہی کی طرح انگریزی میں حتی الامکان پیرایۂ ادا ایسا رکھوں گا کہ انشاء اللہ اشکالات وارد ہی نہ ہوں۔ کہیں کہیں حسب ضرورت توضیحی الفاظ قوسین کے اندر، اور کہیں حاشیئے بھی دینے پڑیں گے۔ اہل باطل کے جوابات انشاء اللہ اِس سے ضمناً خود ہی نکلتے آئیں گے۔

ا۔ طریق کار نہایت مفید ہے۔ دوران کتاب میں حسب ضرورت مفید طریقے قلب پر وارد ہوتے رہیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

میرے خیال میں اتنی اور ضرورت ہے کہ اِس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں نے قرآن مجید سے اپنے مسلک باطل پر استدلال کیا ہے۔ جیسے محمد علی لاہوری نے مرزا کے دعووں کی قرآن مجید سے تائید کی ہے جس کی تفصیل اُس کی تفسیر دیکھنے سے (کہ اُس کا نام بھی بیان القرآن رکھا ہے) معلوم ہوسکتی ہے۔ اِس کا مُستقل طور پر جواب دیا جائے۔ اِن جوابوں میں مولوی شبیّر احمد دیوبندی نے حضرت مولانا دیوبندی کے ترجمہ پر حال میں جو فوائد لکھے ہیں جو مطبع مدینہ بجنور میں عنقریب طبع ہونے والے ہیں اُن سے بہت مدد ملے گی۔ یہ مجھ کو ثقات کے ذریعہ سے ابھی معلوم ہوا۔ اوّل تو وہ انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوں گے وہ ذہین آدمی ہیں۔ اور اگر پھر بھی کہیں ضرورت رہ جاوے ہم سب خدمت کے لئے حاضر ہیں، اِن فوائد کے بھیجنے کے لئے مطبع کو فرمایش لکھ دی جاوے۔ البتہ اگر یہ دیکھا جاوے کہ انگریزی دان طبقہ اِس مولویانہ بحث کو پسند نہیں کرے گا تو علٰحدہ رسالہ کے طور پر ساتھ ساتھ لکھ دیا جاوے، جو شائق ہو وہ جُداگانہ خرید لیگا۔ لیکن یہ جزو ہے ضروری۔ کیونکہ یہ لوگ اِس تفسیر سے بگڑ چکے ہیں۔

م۔ ابھی تو ذرا انگریزی انجیل و توریت کا مطالعہ شروع کرتا ہوں۔ اس کی زبان بڑی مستند

---

[1] انگریزی میں پُورا نام Lane مصنّف Arabic-English Lexicon
کتاب گویا تاج العروس (زبیدی بلگرامی) کا ملخص ہے،

اور ٹکسالی سمجھی جاتی ہے۔ یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آسمانی کتابوں کے لئے انگریزی زبان میں کیسے کیسے محاورات لائے جاتے ہیں۔

ا۔ نہایت مستحسن ہے۔

م۔ مولوی عیسیٰ صاحب کی انگریزی دانی کا علم اب تک نہ تھا، اب آپ کے فرمانے سے ہوا۔ کام کے مشورے ایسا ہی شخص دے سکتا ہے۔ ضرور انھیں تحریر فرما دیا جائے۔ اس کے بعد خود بھی اُن سے مراسلت کرتا رہوں گا۔

ا۔ میں آج ہی لکھتا ہوں۔ اُن کا پتہ ہے، مولوی محمد عیسیٰ صاحب۔ محلّہ محتشم گنج۔ الٰہ آباد۔

م۔ کبھی موقع ہوا تو الٰہ آباد ہو بھی آؤں گا۔

ا۔ مگر آنے کے متعلق اوّل اُن سے مشورہ لے لیا جاوے۔

م۔ کتابوں کے متعلق مالی امداد کا جو مشورہ ارشاد ہوا ہے، اس پر کیا عرض کردں۔ نذر پیش کرنے کا منصب تو میرا تھا، نہ کہ اُلٹا اُدھر سے کوئی عطیۂ نقد کی شکل میں قبول کروں۔ اُدھر سے تو صرف دُعاؤں کا محتاج اور برکتوں کا منتظر رہا کرتا ہوں۔ بہر حال میرے جذبات ابھی تک تو اس ارشاد کی تعمیل میں دُشواری ہی محسوس کر رہے ہیں۔

ا۔ یاد نہیں کیا لکھ گیا ہوں گا۔ اتنی ہمّت و وسعت کہاں۔ البتہ ننا ۱ ۔ ۳ اکی ہمّت کر کے اپنے کو اس بُڑھیا کے حواشی میں ضرور شمار کر سکتا ہوں جو سُوت کی انٹی لے کر حضرت یُوسف علیہ السلام کو خریدنے آئی تھی۔ اگر گرانی نہ ہو تو اس معروضہ کی مجھ کو اطلاع فرمائی جاوے۔ شاید کوئی اور بات ذہن میں آجاوے۔

م۔ وعظ تقلیل الطعام موصول ہوا۔ انشاء اللہ عنقریب واپس کر دوں گا۔ سب سے بڑھ کر شکریہ اُس مقالہ پر عرض کرتا ہوں، جو خاص اِس مبحث پر تحریر فرما دیا گیا ہے، جامع و محققانہ، تمام اطراف بحث پر حاوی۔ اجازت ہو تو پورے مقالہ کو سچ میں شایع کر دوں۔

ا۔ اجازت چہ معنی، میرے لئے فخر ہے۔

اطلاع جدید۔ ندوی مولوی صاحب کے مضمون حکمت صوم میں تصنیف کے جس مرکزیہ پر تعریض تھی ایک دوست کا گمان یہ ہے کہ یہ مولوی وارث حسن صاحب کی طرف اشارہ ہے[51]۔ واللہ اعلم۔
ایک خط مولانا کا مع اپنے جواب کے ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لفافہ پر انگریزی لکھ کر ڈاک میں ڈلوا دیجئے۔ ایک غایت ملاحظہ کرانے کی نادانوں کے اس خیال کا دفع کرنا ہے کہ مولانا کی سیاست مولویت پر غالب آ گئی ہے[52]۔

عین اسی زمانہ میں ایک بے ادب مولوی اور اخبار نویس نے "رحلت مصطفیٰ" کے سلسلہ میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے حضور انور کے جسد اطہر کے متعلق ایک آدھ بات ایسی لکھ دی تھی، جو علاوہ بدتمیزی کے سرتاسر خلاف واقعہ بھی تھی سچ میں بحمداللہ اس کی تردید تقدیس رسول کے زیر عنوان ایک مفصل مضمون سے کر دی گئی تھی۔ چند روز کے بعد جو رسالہ النور آیا، اس میں بھی ایک مضمون اسی بحث پر تھا۔ خیال آیا کہ اس کے بعض حصے جو ذرا تشنہ رہ گئے، ان کی تکمیل بھی ہو جائے۔ چنانچہ اسی عریضہ میں یہ بھی تھا:۔

م۔ النور بابت ربیع الاول تا جمادی الاولیٰ ۵۳ھ میں فتاویٰ کے ذیل میں ایک مضمون محفوظیت جسم اطہر بعد وفات پر نکلا ہے۔ اس سلسلہ میں، جسد اطہر کے غسل کے موقع کی، عبارت ذیل سیرت ابن ہشام میں مل گئی۔ ولم یر من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیئ مما یُری من المیت اب صراحت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی؟

اور پھر بہ لحاظ استناد سیرت ابن ہشام کا پایہ طبقات سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ طبقات تو

[51] اور غالباً یہی صحیح تھا۔ مُلّا شاہ وارث حسن صاحب اس وقت کے ایک مشہور شیخ طریقت تھے جنہیں بڑی مرجعیت و مقبولیت حاصل تھی، خصوصاً انگریزی خواں طبقہ میں تعریض کے سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہوں ۵۹ و ۵۸

[52] مراد مولانا حسین احمد صاحب ہیں۔ اب اس مراسلت کی پوری تفصیل تو ذہن میں نہیں صرف اتنا خیال ہے کہ رنگون میں بعض اہل بدعت نے حضرت تھانوی کے خلاف بڑی یورش کر رکھی تھی۔ مولانا حسین احمد صاحب نے اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ مجھے آپ اپنا مختار و نمایندہ بننے کی اجازت مرحمت کریں میں آپ کی طرف سے دفاع و جواب کرونگا۔ حضرت نے اجازت بمسرت مرحمت کر دی تھی۔

دراصل صحابہ و تابعین کی تاریخ ہے، اور سوانح نبوی اُس میں محض ضمناً آگئے ہیں۔ سیرت ابن ہشام خاص سیرت نبوی ہی پر تحقیق کر کے لکھی گئی ہے۔

اسی سیرۃ ابن ہشام میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ غسل دیتے جاتے تھے، اور یہ الفاظ کہتے جاتے تھے (علی یقول بأبی انت وامی الطیبٌ حیاً ومیتاً۔

ایک روایت تو خود صحاح ہی میں موجود ہے۔ عن علی ابن طالب قال لما غسل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذهب یلتمس منه ما یلتمس من المیت فلم یجدہ فقال بابی الطیب طبت حیاً وطبت میتاً

غرض اب تو اس لغو روایت کی لغویت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مناسب ہو تو ان معروضات کو بھی بہ طور اُس مضمون کے ضمیمہ کے الندوہ میں درج فرما دیا جائے۔

۱۔ اسی وقت نقل لے کر انتظام کر دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب شائع ہو جائے گی مہینہ نہیں بتلا سکتا یہ مدیر سے متعلق ہے۔"

اس کے بعد سے خط و کتابت کا بڑا حصہ قدرۃً تفسیر و ترجمہ اور اس کے متعلقات ہی کی نذر رہنے لگا۔ سال کا آخری خط انگریزی سال کے آخری دن ۳۱ دسمبر مطابق ۱۳ رمضان کا ہے۔ اس سے ضمناً میرے باقاعدہ کام شروع کرنے کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے پہلے عریضہ ملاحظہ ہو، پھر اُس کا جواب:۔

"مولانا مدظلہ کی مراسلت ارسال فرما دینے کا نہایت درجہ شکر گذار رہا۔ ایک تو میرے دونوں محبوب و مطاع بزرگوں کا باہمی اخلاص وارتباط، اور پھر جناب والا کا میرے متعلق یہ خیال سبحان اللہ۔ نور علی نور (۱) ڈاک میں روانہ کر دینے کے بعد خیال آیا کہ یہ دونوں مکتوبات تو نقل کر لینے کے قابل تھے (۲)۔

ہدایات متعلق ترجمہ سے مستفید ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی پہلے سے بھی ذہن میں تھے۔ مگر ابھی تو اصل مصحف زیر طبع ہے۔ صرف پارۂ عم شائع ہوا ہے۔ بجنور لکھ دیا ہے، کتاب پریس سے نکلتے ہی میرے پاس انشاء اللہ آجائے گی۔ مولوی محمد علی لاہوری کی انگریزی کا

واُردو تفسیروں سے خوب واقف ہوں۔ اِن میں قادیانیت یا مرزائیت تو بس کہیں کہیں ہے، البتہ نیچریت بڑی کثرت سے ہے۔ یعنی معجزات کی ایسی تاویل کہ معجزہ باقی ہی نہ رہے۔

فَاضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ کے معنی	اپنی جماعت کو لے کر پہاڑ کی طرف سفر کرو۔
فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ کے معنی	پرندوں کو پال پرورش کر کے اپنے سے ہلالو۔
نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ کے معنی	وہ لوگ دامن کوہ میں آباد تھے۔
آتشِ نمرود میں پڑنے کے معنی	گزندِ نمرود سے محفوظ رہنے کے۔ وقس علیٰ ھذا

چنانچہ اسی عادت کی بنا پر ان لاہوری صاحب نے حضرت مسیحؑ کی معجزانہ ولادت سے بھی انکار کر دیا ہے، حالانکہ خود مرزا غلام احمد اس کے قائل تھے۔ بس اتنا غنیمت ہے کہ سرسید کی طرح فرشتوں کے وجودِ خارجی سے انکار نہیں کر دیا ہے۔ اپنے ترجمہ میں انشاء اللہ ان سب پہلوؤں پر نظر رکھوں گا بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ شیعہ تراجم پر بھی ایک نظر کر لوں۔ لیکن طریقہ مولوی مرتضیٰ حسن صاحب کا سا مناظرانہ نہیں رکھوں گا۔ (جس کا انگریزی خوانوں پر اُلٹا اثر پڑتا ہے) بلکہ آپ کے بیان القرآن کی طرح محققانہ (یہ لفظ ظاہر ہے کہ اپنے لئے نہیں آپ کے لئے استعمال کر رہا ہوں)، یعنی تقریرِ ترجمہ ایسی ہو کہ شبہات خود بخود ساقط ہوتے جائیں۔

کام بحمد اللہ پرسوں سے شروع کر دیا ہے۔ پرسوں سورۃ الفاتحہ اور کل پہلا رکوع بقرہ کا ہو گیا مع مختصر حواشی کے۔ میں نے اپنے تجربہ میں ترجمہ کو تصنیف سے ہمیشہ مشکل تر پایا، اور پھر یہ تو کلامِ الٰہی کا ترجمہ ہے۔ ایک ایک لفظ کے لئے گھنٹوں اُلجھا رہا۔ لفظ اللہ کا ترجمہ ممکن نہ تھا۔ اُسے یونہی رہنے دیا۔ الرحمٰن والرحیم کے لئے جی چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مادّہ ملے جس سے ترجمہ کے بھی دونوں لفظ مشتق ہوں، نہ ملا۔ پھر یوم الدین پر رُکا۔ بعض نے اس کا ترجمہ یوم الحساب سے کیا ہے، بعض نے یوم البعث سے، اور بعض نے یوم الآخرۃ سے۔ میں چاہتا تھا، ٹھیک ٹھیک یوم الجزاء کا مفہوم آجائے: بحمد اللہ، ہو گیا۔ پھر المستقیم پر رُکا۔ اُردو میں تو آپ حضرات کو مناسب لفظ "سیدھا" مل گیا۔ انگریزی میں اگر مستقیم کا لفظی ترجمہ لایا جائے تو اُس کے معنی صرف 'سیدھے' یا غیر مُضی بہ اصطلاح

مساحت واقلیدس کے پیدا ہوتے ہیں، تشریعی مطلوبیت و مقصودیت کا پہلو نہیں نکلتا۔ اور اگر مفہومی ترجمہ یعنی لفظ صحیح، لایا جائے، تو اصل عربی لفظ سے فوراً بُعد ہوا جاتا ہے۔ بس اللہ ہی اپنے فضل خاص سے دستگیری فرمائے، ورنہ ظاہراً تو کوئی صورت اِن مُشکلات سے عُہدہ برآ ہونے کی نظر نہیں آتی۔ دُعاؤں کا شدید حاجتمند ہوں[3]۔ مولوی عیسیٰ صاحب کو تو جناب غالباً لکھ چکے ہوں[4]۔"

جواب :-

(۱) "اِس سے مجھ کو بڑا علیٰ سرور ہوا۔

(۲) یہاں مولوی جلیل احمد صاحب نے نقل کر لی ہے۔ فرمائش کے وقت حاضر ہو سکتی ہے۔ نقل پر یاد آگیا کہ تفسیر الفرقان[5] پر جو میں نے لکھا تھا بعض احباب اُس کی نقل چاہتے ہیں اگر بہ سہولت آ سکے۔

(۳) سب تفصیلات پڑھ کر آپ کے اِس اہتمام پر بھی دل خوش ہوا۔ اور خوشی میں حاضرین کو سُنا دیا جن میں عُلماء بھی کافی تعداد میں تھے۔ سب بہی مسرور ہوئے۔ اور دُعا دی۔ اور اُمید ظاہر کی کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب ہو جاوے گا اور بہت اچھا ہو جاوے گا۔

بعض نے یہ رائے دی کہ طرز تو مناظرانہ نہ ہو لیکن بعد تقریر کے جو شبہہ رفع کیا گیا ہو اس کے رفع کی تصریح ہو جاوے کہ اس تقریر سے فلاں شُبہہ رفع ہو گیا۔

(۴) لکھنے بھی دیا۔ جواب بھی آگیا۔ اظہار مسرت کے ساتھ ہر لائق خدمت کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ یہ رائے بھی دی کہ انھوں نے بیان القرآن کے متعلق کچھ لکھا ہے شاید تلخیص کے طور پر۔ وہ بھی شایع ہونے والا ہے۔ لکھا ہے کہ اس کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہت سہولت ہو گی۔ آپ اگر دل چاہے اس کی تفصیل پُوچھ لیجئے۔ باقی بجز دُعا کے کیا عرض کروں۔ مالی وسعت ہوتی تو اور بھی کچھ کہتا اب تو یہی کہوں گا۔

لا خیل عندك تهدیها و لا مال   فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال "

---

[5] یہی مولانا فراہی کی عربی تفسیر مراد ہے، جس کا ذکر اُوپر کئی بار آ چکا ہے۔

سنہ ۱۹۳۴ء

(۶۱)

اب مراسلت کیا ہوتی تھی، گویا حضرت کے ہاں سے تفسیر کے درس تحریری (Correspondence Course) کا سلسلہ کھل گیا تھا، اور ہر ہفتہ عشرہ اِدھر سے استفادہ اور اُدھر سے افادہ برابر شروع ہو گیا تھا۔ ۴ر شوال ۵۲ھ (جو جنوری ۳۴ء کے ۲۳، ۲۴ر کے مطابق ہوگی) کا عریضہ اپنا ترجمان آپ ہے:۔

م: بحمد اللہ پارۂ اوّل کا ترجمہ ختم ہو گیا۔

ا۔ مبارک باد قبول ہو۔

م۔ نظرِ ثانی و حواشی کا کام بھی انشاء اللہ دو چار روز میں ختم ہو جائے گا۔[۵۱]

آپ کی بیان القرآن کی پوری قدر رفتہ ہی رفتہ جا کر ہوتی ہے۔ جب شروع شروع اُسے کئی سال ہوئے میں نے دیکھا تھا تو ایک اوسط درجہ کی کتاب نظر آئی تھی۔ پھر جب بعض لوگوں کو میں نے ترجمۂ قرآن اِس کی مدد سے پڑھانا شروع کیا، تو اِس کی قدر بڑھی، اور پوری قدر تو اب جا کر ہو رہی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفسّر نے ایک ایک لفظ تول تول کر کے رکھا ہے۔

---

۵۱ اپنی اُس وقت کی سادہ دلی پر آج ہنسی آ رہی ہے۔ نظرِ ثانی، ترمیم و اضافہ کا کام دنوں نہیں، ہفتوں بھی نہیں، برسوں جاری رہا۔ اور پھر بھی مسودہ کو مطبع میں دیتے وقت دِل بہت ہی غیر مطمئن رہا۔

ا ۔ مَیں تو اتنا بھی معتقد نہیں ۔ لیکن آپ کی قدر دانی سے مسرت ہوئی بے تکلف یہ بھی اطلاع کرتا ہوں کہ اوّل منزل میں التزامات کم ہوئے ہیں ۔ انشاء اللہ تعالیٰ جوں جوں آگے بڑھیے گا، زیادہ خوش ہو جیئے گا۔[1]

م ۔ میرے پیش نظر تو عربی کی متعدد تفسیروں کے علاوہ شیخ الہندؒ کا اُردو ترجمہ بھی تھا لیکن مدد سب سے زیادہ بیان القرآن ہی سے ملی۔ شیخ الہندؒ کا ترجمہ، شاہ صاحب دہلویؒ کے ترجمہ کی طرح صرف پُختہ مُسلمانوں کے لئے ہے ۔ یہ کرامت آپ کی بیان القرآن ہی میں دیکھی کہ پُختہ مُسلمانوں کے لئے تو ہے ہی، لیکن ساتھ ہی بدمذہبوں اور مذبذبین سب کی رعایتیں موجود۔ آپ کے تفسیری مطالب کا بیشتر حصّہ تلخیص کرکے اپنے حواشی میں لیتا جاتا ہوں۔

لیکن بایںہمہ ابھی چار مقامات میں جناب کا اتباع نہیں کر سکا ہوں ۔ ممکن ہے آگے چل کر سمجھ جاؤں وُہ مقامات حسب ذیل ہیں :۔

(۱) بقرۃ کا ترجمہ مَیں نے 'بیل' سے نہیں 'گائے' سے کیا ہے ۔ لُغت سے جُھکتا ہوا پلّہ مجھے گائے ہی کا معلوم ہوا۔

(۲) مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا میں جمہور مفسّرین کے اتباع میں مَیں نے حنیفاً کو ابراہیم سے متعلق کیا ہے نہ کہ مِلّۃ سے

(۳) ایک اور مقام ، جو اس وقت بالکل یاد نہیں آتا، صرف اتنا یاد ہے کہ ایسا ہی کوئی لفظی اختلاف ہے۔

(۴) چوتھا مقام معنوی حیثیت سے سب سے زیادہ اہم ہے ۔ یہاں مَیں آپ ہی کے نہیں اکثر مفسّرین کے اتباع سے ہٹ گیا ہوں ، اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ الخ میں مَیں نے زمخشری وغیرہ کا اتباع کرکے متن ترجمہ میں سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ الخ کو حال قرار دیا ہے، یعنی ایسے کافر (معاند) کہ جن کے لئے انذار و عدم انذار سب برابر ہیں وہ ایمان نہیں لانے کے ، البتہ

---

[1] یہ ارشاد بالکل مطابق واقعہ نکلا۔

حاشیہ یہ د بارہا ہے کہ جمہور اہلِ سُنّت کا ترجمہ اس کے برعکس یُوں ہے۔

۱۔ اِن مقامات کے متعلق اوّلاً اجمالاً لکھا تھا پھر قدرے بسط مناسب معلوم ہوا۔ اخیر میں لکھ دیا گیا ہے۔ خواہ خود فیصلہ کر لیجئے یا دوسرے بزرگوں سے مشورہ فرمائیے۔

(۱) لُغت اور نقل میں تو دونوں برابر ہیں، اِس لئے دونوں کا اختیار کرنا جائز ہے۔ لیکن مجھ کو بَیل کا ترجمہ اس لئے راجح معلوم ہوتا ہے کہ آگے آیت میں لَاذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ اور ظاہر ہے کہ گائے میں یہ وصف عادی مثل فطری کے ہے، تو اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ بدوں نفی کے منفی تھا۔ بَیل میں البتہ نفی قصدی کی ضرورت تھی اور بقرہ کا مذکر و مؤنث دونوں میں استعمال مصرح ہے۔ لیکن اگر کسی کے ذہن میں دوسرے ترجمہ کو ترجیح ہو گنجایش ہے۔

(۲) آپ کے مختار میں ایک ترجیح ہے کہ قرآن مجید میں ابراہیم علیہ السلام کو حنیف فرمایا ہے۔ یہ ترکیب اُس کے موافق ہے اور میرے مختار میں ایک ترجیح ہے کہ ملّۃ سے حال بے تکلف بنتا ہے، اور ابراہیم سے بہ تکلف یعنی بہ واسطۂ جواز قیام مضاف الیہ مقام مضاف کما صرحوا بہ۔

(۳) جب یاد آجاوے اطلاع فرما دیجئے۔

(۴) یہاں کشاف موجود نہیں، ورنہ اُس کی عبارت اور وجہ اُس کے اختیار کرنے کی دیکھتا۔

اب آپ کی تحریر سے جو سمجھا ہوں اس کی بناء پر عرض کرتا ہوں۔ حال ہونے کی تقریر تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ کفروا میں جو ضمیر فاعل کی ہے راجع موصول کی طرف وہ ذوالحال ہے اور جملہ سواء علیھم الخ اس کا حال ہے۔ اور ذوالحال اس حال سے مل کر فاعل ہے کفروا کا اور کفروا ہے موصول کا اور موصول اسم ہے اِنَّ کا۔ اور لَا يُؤْمِنُونَ خبر ہے اِنَّ کی۔ بعض دوسرے مفسرین نے بھی لَا يُؤْمِنُونَ کو اِنَّ کی خبر کہا ہے مگر سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ الخ کو جملہ معترضہ یہاں علت کے لئے کہا ہے جس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ حال ہونے کی صورت میں آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیئے کہ یقیناً جن لوگوں نے ایسی حالت میں کفر اختیار کیا ہے (غایت عناد کے سبب) کہ اُن کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے (یعنی کسی حالت میں عناد سے باز نہ آئیں گے) ایسے لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ اِس

ترجمہ سے حال ہونا صراحتہً مفہوم ہوتا ہے۔ یہ تو ترکیب کی تقریر ہوئی۔ باقی وجہ اس کے اختیار کرنے کی ظاہراً ایک اشکال کا جواب دینا ہے۔ وہ اشکال یہ ہے کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ کافر ہوئے وہ ایمان نہ لاویں گے، حالانکہ نزول آیت کے بعد بھی بہت سے کافر ایمان لائے، تو آیت کے کیا معنی ہوئے۔ صاحب کشاف اِس ترکیب میں جواب دیتے ہیں کہ یہ مطلق کفّار کے حق میں نہیں بلکہ معاندین کے حق میں ہے، پس وہ اشکال نہ رہا۔ لیکن ذرا غور کیا جاوے تو اشکال باقی ہے، کیونکہ نزول آیت کے وقت بہت سے معاندین بھی تھے اور بعد میں وہ ایمان لائے۔ اگر یہ جواب دیا جاوے کہ جب عناد نہ رہا تب ایمان لائے تو ایسا جواب تو بدون اختیار قیدِ عناد کے بھی اشکال مذکور کا ہو سکتا ہے۔ یعنی کفّار جب تک کفر پر رہیں گے ایمان نہ لاویں گے اور جب کفر سے باز آگئے تو مومن ہو گئے۔ تو دفع اشکال میں اِس ترکیب کو کوئی خاص دخل نہ ہوا۔ علاوہ اِس کے جملہ معترضہ ماننے میں بھی کشاف کی ترکیب کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جملہ معترضہ میں علت کی طرف اشارہ مانا گیا ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ کفّار ایمان نہ لائیں گے کیونکہ وہ معاند ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ آیت کفّار معاندین کے حق میں ہے۔ تو ترکیب کشاف میں کیا ترجیح ہوئی۔

اِس کے علاوہ جمہور نے اشکال کا اور جواب بھی دیا ہے وہ یہ کہ موصول عہد کے لئے ہے، یعنی خاص خاص کفّار کے شان میں ہے جیسے ابوجہل، ابولہب وغیرہما۔ اِس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ خبر ہو اور لَا يُؤْمِنُونَ اِس کی تفسیر ہو۔ یا خبر بعد خبر ہو۔ لیکن اگر باوجود اس کے دفع اشکال کسی کو ترکیب کشاف میں ذوقاً سہل معلوم ہو اُس کے اختیار کرنے کا مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جمہور کی تراکیب میں اشکال دفع نہ ہوگا۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود سب کا مشترک ہے یعنی دفع اشکال اور اسی دفع اشکال کا مبنیٰ کوئی مسئلہ مختلف فیہ اہلِ سُنّت و معتزلہ میں نہیں۔ اِس لئے حاشیہ میں اِس اختلاف پر تنبیہ خصوص اہل سنت کے عنوان سے ناظرین کو خلل میں ڈالے گا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

م۔ اپنی کم استعدادی کی بناء پر ایک ایک لفظ پر اُلجھتا رہتا ہوں۔ بحمد اللہ آپ حضرات کے

فیضِ صحبت سے اپنی جہالت سے جاہل نہیں رہا ہوں۔ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ پر جب پہنچا تو پہلی رو میں مِنْ کا عمل صرف اَھْلِ الْکِتٰبِ پر سمجھا اور اَلْمُشْرِکِیْنَ کا عطف بجائے اَھْلِ الْکِتٰبِ کے اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا پر کیا۔

ا۔ یہ تو محال ہے۔ کیونکہ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مرفوع ہے بہ وجہ فاعل ہونے کے اور الْمُشْرِکِیْنَ مرفوع نہیں، اگر اس پر عطف ہوتا تو الْمُشْرِکُوْنَ ہوتا۔

م۔ اُردو کے بعض مترجمین کے علاوہ انگریزی کے کُل مترجمین (بشمول مولوی محمد علی لاہوری) نے بھی کیا ہے۔

ا۔ حیرت ہے ایسی موٹی غلطی۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ دعویٰ تحقیق کا اور علماء کو حقیر سمجھنے کا۔ اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کی اصلاح فرمائیے۔

م۔ آپ کا اور شیخ الہند کا ترجمہ اِس کے برعکس دیکھا، اُسے کافی نہ سمجھا، متعدد تفسیریں، ان تفسیروں کے حاشیے اُلٹ پلٹ ڈالے۔ مدارک کے ایک حاشیہ پر ترکیب نحوی درج پائی جب اپنے اُوپر لاحول پڑھی، اور آپ ہی حضرات کا اتباع کیا۔ یہ ایک نمونہ اپنی کم سوادی کا میں نے پیش کر دیا۔

ا۔ مگر اس تجربہ کے بعد تو سخت ضرورت ہے ایسے زلات سے بچنے کی تدبیر کی میں بے تکلفی اور دلسوزی اور اپنی خیرخواہی سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے حفاظت کی صورت صرف واحد ہے کہ مولانا کے پاس یا اِس ناکارہ کے پاس رہ کر ترجمہ کیا جائے۔ اور اگر دشواری ہو تو ایسے مُشتبہہ مواقع میں خطوط سے احتیاطاً تحقیق فرمالی جائے لیکن شاید بعض دفعہ مُشتبہہ ہونے کی طرف بھی ذہن نہ جائے اِس کا کیا انتظام ہوگا۔

م۔ بیان القرآن (پارۂ اوّل) میں دو مقامات مجھے بالکل بے نظیر نظر آئے۔ ایک تخلیق آدمؑ کے موقع پر فرشتوں کی گفتگو، دوسرے تعلیم سحر ہاروت و ماروت کی زبان سے۔ دونوں مقامات بڑی اُلجھن کے ہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کے قلم سے انھیں ایسا سُلجھا دیا کہ اب کوئی

سوال ہی نہیں باقی رہ جاتا۔

ا۔ آپ کی خوشی سے مجھ کو خوشی ہوئی۔ یہ سب بزرگوں کی دُعا کی برکت ہے۔

م۔ بحمداللہ اب تک معمول یہ رہا ہے کہ تازہ وضو کے ساتھ دو رکعت نفل کے بعد پہلے حضرت موسیٰ کلیم والی دُعا رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي کسی قدر الحاح کے ساتھ کر لیتا ہوں جب ترجمہ کا کام شروع کرتا ہوں[1]۔ دُعاؤں میں اکثر حضرت امام بخاریؒ کا بھی واسطہ دیدیتا ہوں کہ اللہ اللہ، عرب سے صدہا میل دُور بخارا و ترکستان کا ایک شخص، بودھ مت ماننے والوں کی اولاد، کہاں پڑا ہوا تھا اُسے کہاں سے کھینچ کر کہاں پہنچا دیا گیا کہ آج کتاب اللہ کے بعد گویا اُسی کی کتاب دین کی بنیاد ہے۔ اُسی کریم سے دُعا ہے کہ اُس مخلص اور مقبول کے اخلاص کا ایک شمہ اِس سیاہ باطن کے اندر بھی پیدا کر دے!

ا۔ یہ دُعا الہامی ہے جو مصداق ہے ہم دُعا از تو اجابت ہم ز تو کا تو اس کے ساتھ ہی اجابت تامہ کی کامل توقع ہے[2]۔

م۔ زلزلہ ایک نمونہ قہر الٰہی تھا۔ صوبہ بہار میں تو گویا قیامت برپا ہو گئی[3]۔ بڑی فکر مجھے مولانا مناظر احسن کی لگی ہوئی ہے، تعطیل رمضان میں اپنے وطن آئے ہوئے تھے۔ خدا کرے بالکل محفوظ ہوں۔

ا۔ آمین۔ اگر خیریت کی خبر آئے، ایک کارڈ سے مجھے بھی مطمئن کیجئے۔

م۔ ارادہ ہے کہ انشاءاللہ اسی ہفتہ عشرہ کے اندر سہارنپور اور وہاں سے چند گھنٹوں

---

[1] یہ کوئی بھی معمولات اپنی بدہمتی کے باعث، کچھ روز سے زیادہ نہ چل سکے۔

[2] اشارہ ہے مثنوی کے اِس شعر کی طرف

ہم دُعا از تو اجابت ہم ز تو　　　ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

[3] یہ وہی جنوری ۳۴ء یا آخر رمضان ۵۲ھ والا ہولناک زلزلہ ہے جس کی یاد، خصوصاً صوبۂ بہار میں اب تک بہتوں کے دلوں میں تازہ ہوگی۔

کے لئے نھانہ بھون حاضر ہو جاؤں۔ اطلاعی کارڈ لکھ دوں گا۔

ا۔ خدا تعالیٰ بخیریت ملادے۔"

(۶۲)

ارادہ یہ تھا کہ اِن اَوراق میں سب ہی کچھ لکھ دیا جائے گا، اور آپ بیتی کے باب جتنے بھی ہوں گے، سب بے تکلف کھول کر پیش کر دیئے جائیں گے، لیکن ارادہ پر عمل بلا استثناء کی صورت ممکن نہیں۔ مولیٰ کی سرفرازیاں جس نااہل بندہ کی جو اور جس طریقہ پر ہو جائیں اُسے سب کے ساتھ بیان کر دینے کی کم ظرفی کیسے گوارا کر لی جائے۔ شیخ مصلح کا تو مرتبہ ہی دُہرا ہوتا ہے لیکن پھر اتنا بیان کرنے کی بھی کیا ضرورت؛ ضرورت یہ کہ اس کے بغیر شیخ کی تعلیم و ہدایت، درجۂ اجمال میں بھی کیا سمجھ میں آئے گی۔ بہرکیف، اِسی ماہ مبارک کی ایک آخری تاریخ میں سجدہ میں ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، جس کا تعلق سورۃ زُمر کی آیت اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ سے تھا۔ تفصیل حضرت کی خدمت میں، اُسی ارشاد والے عریضہ میں عرض کی۔ جواب حسب ذیل موصول ہوا :۔

"بڑی دولت نصیب ہوئی یہی بشارت ہے عطاءِ اخلاص کی۔ غیر مُخلص کو یہ تنبیہ اور اور توجہ کہاں۔ اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ اخلاص فعل اختیاری ہے۔ ذرا سی حرکت قلب میں پیدا کرنے سے اخلاص ہی اخلاص۔"

ترجمہ کا کام اب مُستعدی و سرگرمی سے جاری تھا۔ اور ترجمہ اب رفتہ رفتہ تفسیر بنتا جا رہا تھا۔ اور خطوط عموماً ان ہی مذاکروں سے لبریز رہتے تھے۔ دوسری مصروفیتیں بھی بہرحال کسی نہ کسی حد تک دامنگیر رہتی ہی تھیں۔ اور خطوط بھی اِن کے تذکروں سے خالی نہیں رہتے تھے۔ ۴ر فروری کا عریضہ مُلاحظہ ہو :۔

مخدومی والانامہ کئی روز ہوئے مِل گیا تھا۔ میں لکھنؤ میں ایک ترک کی خلیفہ زادہ، یعنی سُلطان عبدالعزیز خان کے پوتے اور سُلطان عبدالحمید خاں کے مُنہ بولے بیٹے کی خدمت میں ایسا لگا رہا کہ اور

سارے کام بند رہے۔ بیچاروں کی حالت عبرت کے قابل تھی۔[1]

ا۔ آپ کو تو دیکھ کر کیا اثر ہوا ہو گا۔ سُننے سے میرا کلیجہ مُنھ کو آ گیا۔

م۔ آیۂ کریمہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا الخ کے متعلق ارشاداتِ گرامی سے مُستفید ہوا۔ اس کا ترجمہ اگر یُوں کیا جائے، تو کیسا ہے:۔

"جن لوگوں نے کُفر اختیار کیا (ضِد و عناد سے) ان کے لئے آپ کا انذار و عدم انذار دونوں برابر ہیں" اور قوسین کے اندر کے لفظ "ضِد و عناد سے" بجائے متن کے حاشیہ پر دیدیئے جائیں۔

ا۔ اِس ترجمہ میں حال ہونا ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہی مشہور ترکیب معلوم ہوتی ہے کہ اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِسم ہے اِنَّ کا اور سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ خبر ہے اِنَّ کی۔ زمخشری کی ترکیب پر دلالت نہ ہوئی۔

م۔ اِتنے عرصہ تک کام رُکا۔ اب کل سے اِسی پارۂ اوّل پر نظرِ ثانی شروع کی ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ آسان فرما دے۔

م۔ اِس اثناء میں غالی قادیانیوں کا ترجمۂ پارۂ اوّل ہاتھ آ گیا۔ اپنے عجائب کے لحاظ سے زعفران زار ہے وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ کے ذیل میں لکھا ہے، کہ یہ اَلْاٰخِرَۃ، مِنْ قَبْلِکَ کے مقابل ہے۔ یعنی اَلْمُتَّقِیْنَ وہ لوگ ہیں جو وحی محمدیؐ سے قبل والی وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور وحی محمدیؐ کے بعد والی وحی پر بھی ایقان رکھتے ہیں۔ وَغَیْرُ ذَالِکَ مولوی محمد علی لاہوری کے ترجمہ میں اِس درجہ کی لغویت کوئی نہیں۔ اصلی عیب اِس میں وہی نیچریت کا ہے۔

ا۔ ایک کانا، ایک اندھا، عیب دار سب ہیں۔

م۔ پہلے حواشی بہت کم اور مختصر لکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن ایک انگریز پادری کے حواشی کو دیکھ کر غصّہ نہ روک سکا۔ حضورؐ کے حق میں اُس نے گندہ ذہنی سے کام لیا ہے وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ پر حاشیہ دیا ہے کہ (نَعُوْذُ بِاللہ)

---

[1] یہ مفلوک الحال شہزادے ایک مختصر سے قافلہ کے ہمراہ آئے ہوئے تھے، اور کلکتہ کے بعد لکھنؤ کو بھی مشرف کیا تھا۔ اُن کی مہمانداری کے انتظامات زیادہ تر اِس خاکسار ہی کے سپرد تھے۔

"یہود نے کبھی نبی کو بھی قتل نہیں کیا تھا۔ یہ پیمبر عرب کی غایت جہالت ہے"۔

اس پر تڑپ کر میں نے خود انجیل کا مطالعہ کیا، تو اِس جاہل اجہل کے علیٰ رغم انف اس میں خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے یہود پر لعنت آئی ہے کہ تم وہ لوگ ہو جو زکریا نبی اور یحییٰ نبی اور دوسرے انبیاء کو قتل کر چکے ہو۔

ا۔ واقعی اِس نقل کی ضرورت ہے۔

م۔ ایک اور خوش خبری بھی اِس سلسلہ میں ہے۔ اٹلی کے ایک بیرسٹر نے چند سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی، جس کا نام تھا "مقدمۂ یسوع"۔ ہندوستان میں کہیں ملتی نہ تھی۔ بڑی تلاش سے لندن میں ملی۔ ابھی پرسوں میرے پاس آئی۔ سوا تین سو صفحہ کی خاصی ضخیم کتاب ہے۔ یہود کے قانون، رومی حکومت کے قانون، حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری، فرد جرم، شہادت استغاثہ، فیصلہ وغیرہ سب پر مفصل معلومات یکجا کر دیئے ہیں۔ اور آخر میں خلاصہ یہ نکالا ہے کہ سزائے موت کسی معیار سے اور کسی قانون کے اعتبار سے بھی جائز نہ تھی۔ "درحقیقت یہ قتل عمد تھا جسے صورت ایک عدالتی فیصلہ کی دیدی گئی تھی"۔ قرآن مجید نے جو بنی اسرائیل کے ہاتھوں قتل انبیاء کو بغیر الحق بار بار کہا ہے۔ اُس کی یہ کتنی بہتر تفسیر نکل آئی۔ سُبحان اللہ وبحمدہ۔

ا۔ اِس توجیہہ کے بعض الفاظ باوجود غور کے پڑھے نہیں گئے۔ اِس لئے میں سمجھا نہیں۔

م۔ مولانا مدظلہ[1] کے ایک تازہ والا نامہ کا اقتباس بصد مسرت وانبساط درج ذیل کرتا ہوں:۔

"آنجناب کی توجہات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ یہی ہے کہ یہ ناکارہ تو حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تنظیم واحترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اُن کی قابلیت اور ان کے کمالات کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جو کہ طفل دبستان کو افلاطون سے ہو سکتی ہے۔ البتہ تحریک حاضرہ سے متعلق جو چیزیں وہاں سے شائع کرادی جاتی ہیں

---

[1] یعنی مولانا حسین احمد صاحب۔

اور وہاں کے متوسلین جو کچھ گاتے ہیں وہ نہایت دل خراش ہیں۔ میں مولانا کو اپنا مقتدا اور اپنے اکابرین میں سے سمجھتا ہوں۔"

فالحمد للہ ثم الحمد للہ۔

ا۔ میں تو اس قابل نہیں۔ خود اُن کی بزرگی ہے۔ مگر بزرگی پر نظر کرکے یوں جی چاہتا ہے کہ میری سوانح عمری میں دوسروں کی اشاعت اور دل خراشی کا ذکر نہ فرمایا جاوے۔ اور اگر اُس میں بھی حصہ لیتا ہوں بخواہ فعلاً یا رضاءً تو خود میری اصلاح فرمائی جاوے اور میری ہی طرف منسوب فرمایا جاوے کیونکہ متوسلین کے آثار متعدیہ دونوں طرف مشترک ہیں۔ مگر میں اپنے جمود ذہن کے سبب ایسے آثار سے متاثر نہیں ہوتا۔ بہرحال میں خود کسی کا شاکی نہیں اور سب کی شکایات سر پر رکھتا ہوں۔ اور باعث ان سطور کی تحریر کا محض انبساط اور مناسبت تکلفی ہے آپ کی خدمت میں بھی اور مولانا کی خدمت میں بھی حسب ضرب المثل اذا جاءت الالفۃ رفعت الکلفۃ نہ کہ شکایت یا حکایت یا روایت۔

م۔ مولانا مناظر احسن صاحب کا خیریت نامہ آگیا، بحمد اللہ محفوظ ہے۔

ا۔ "مجھے بھی مسرت ہوئی۔ آپ کو بھی مبارکباد دیتا ہوں۔"

اس کے بعد کا خط آٹھ ہی روز بعد ۱۲ ار فروری کا ہے۔ تفسیری مضمون تو اس میں ہوتا ہی، اور ایک آدھ چیز اور ناشنات متفرقات کے قسم سے ہے۔

م۔ "سورۃ البقرۃ (پ۱) آیت نمبر ۶۱ کے اس جزو ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ پر ایک مسیحی مورخ کا اعتراض ابھی نظر سے گزرا کہ جس وقت کا یہ ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی عہد موسوی، اُس وقت تک یہود نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا تھا۔ میں اس شبہہ کے پیش نظر آیت پر حاشیہ دے رہا ہوں کہ ذلت اور مسکنت اور مغضوبیت کا، اور اسی طرح کفر بایات اللّٰہ اور قتل انبیاء کا تعلق عہد موسوی کے ساتھ مخصوص و محدود نہیں۔ یہ قوم بنی اسرائیل کی عام شرارتوں اور ان کے نتائج کا بیان ہے۔ جناب والا کے خیال میں یہ جواب صحیح اور کافی ہوگا؟

۱۔ بالکل کافی ہے، اور اگر دعویٰ اِس عیسائی کا بابت عدم قتل تا عہد موسوی صحیح ہے تو جواب متعیّن ہے۔ شاید اس معترض کو اُوپر کی متصل آیت وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ اِلٰی قولہٖ تعالیٰ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ سے دھوکہ ہوا ہو اِس بناء پر کہ یہ سب ایک ہی سلسلہ کا کلام ہے۔ مگر سلسلہ کے اتساق سے سب اجزاء کے عہد کا اتّحاد لازم نہیں۔ مَا سَاَلْتُمْ تک واقعہ اُن کی شوخی کا بیان فرما کر مجموعہ واقعات کے پاداش کو بیان فرماتے ہیں۔ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی مجموعہ قوم کے ساتھ اُس پاداش کا جو تعلّق ہے اس کے بعض اسباب کو۔ گو اُن اسباب کے وقوع کا زمانہ عہد موسوی سے متاخر ہو، بیان فرمایا ہے۔ یہ آپ کے جواب کی گویا شرح ہے جس کی حاجت معترض جیسے غبی کے لئے اِس وجہ سے ہے کہ شاید وہ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی سے تمسّک کرتا ہے۔

م۔ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری[1] حج پر روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ انشاء اللہ اُن کا تیرھواں حج ہوگا۔

۱۔ مَاشَاءَ اللّٰہ تعالیٰ۔

(۶۳)

اِس عریضہ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ایک شبہہ جو خود حضرت کی ذات پر بہ حیثیت شیخ کے پیدا ہو رہا تھا، اِس کو بھی حضرت کی خدمت میں نقل کر دیا گیا تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں اِس نامہ سیاہ کے حدود حضرت کے عام مریدین، معتقدین، مسترشدین سے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات ایسی چیزیں زبان پر لانا ہی (دوسروں کی نیابت و ترجمانی میں بھی) سوء ادب میں داخل سمجھتے تھے۔ یہ عاجز ایک غیر معصوم بزرگ پر خود ایسے شبہات کے ایراد میں کوئی مضائقہ نہیں پاتا، چہ جائیکہ دوسروں کی ترجمانی میں، بہرحال مکتوب کا یہ جزو اور اس کا جواب دونوں ہی

---

[1] اِن بزرگ کا ذکر پیشتر کئی بار آچکا ہے۔ ماشاء اللہ اِن سطور کے پریس میں جانے کے وقت (اپریل ۱۹۵۰ء) تک لکھنؤ میں سلامت باکرامت ہیں۔ (طبع اوّل) ستمبر ۱۹۵۱ء ۸ ذی الحجہ کو مکہ میں رحلت فرمائی (طبع ثانی)

ملاحظہ ہوں:-

معارف میں جناب کا مقالہ الاعتدال فی متابعۃ الرجال پڑھ کر متعدد اشخاص نے مجھے بانی بھی مبارکباد دی اور خطوط بھی آئے۔ ایک صاحب کا خط ایک خاص قسم کا آیا۔ وہ جواب کے طالب مجھ سے ہیں۔ لیکن میں تو جناب والا کی رہنمائی کے بغیر انھیں کچھ نہیں لکھ سکتا۔ حلّی این نکتہ ہم از روئے نگار آخر شد" کے مصداق اُن کے مکتوب کے بیشتر حصّہ کی نقل خدمتِ والا میں کئے دیتا ہوں۔ وہو ہٰذا۔

"حضرت مولانائے محترم کا مضمون نہایت شوق سے پڑھا۔ الحمدللہ۔ دل سے بے ساختہ دُعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی عُمر اور دل و دماغ میں بہت بہت وسعت اور برکت دیں اور مسلمانوں کو اُن کے ملفوظات و افادات سے مستفید ہونے کی توفیق۔ آمین ثم آمین۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت کو اللہ نے عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی ہے۔ بر کفِ جامِ شریعت الخ یہ مولانا ہی کی شان ہے۔ شریعت اور طریقت دونوں کا سررشتہ کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اور دونوں کے واجبی احترام میں ذرا بھی فرق نہ آنے پائے ..... اس معاملہ میں ناظرینِ سچ کی طرف سے زیادہ شکریہ کے مستحق آپ ہیں کہ آپ کے حُسنِ سعی سے حضرت مولانا کے اس عالمانہ و حکیمانہ افادہ اور فنی تحقیق سے ہم سب مستفید ہوئے، کئی بار پڑھ چکا ہوں اور پھر پڑھنے کو جی چاہتا ہے .....

لیکن حضرت ایک خلش ابھی باقی رہ گئی، جو اگر دُور ہو سکتی ہے تو آپ ہی کی وساطت اور توجہ سے۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ خود حضرت مولانا کا طرزِ عمل اپنی اس تعلیم سے مختلف کیوں نظر آتا ہے۔ آپ کے علم و مشاہدہ میں متعدد واقعات ایسے ہوں گے کہ ادنیٰ سے اختلاف پر مولانا سخت ناخوش ہو گئے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انقباض اور تکدر محض طبعی رہا، بلکہ اس کا اثر تعلقاتِ طبیعت پر پڑا۔ ایک آدھ مثال میرے علم میں ایسی ہے کہ حضرت نے ایک صاحبِ علم و فضل اور بغایت درجہ معتقد سے محض اتنی بات پر قطعِ تعلق فرما دیا کہ انھیں ایک اجتہادی فرعی مسئلہ بلکہ اس کے ایک جزئیہ میں دیانتہً مولانا سے اختلاف تھا۔ ایسے واقعات کی کیا توجیہ کی جائے۔ اگر میری ہی سمجھ کا پھیر ہو تو از راہِ شفقت و کرم آپ مجھے تفصیل سے سمجھا دیں"

تفصیلی جواب تو اُن صاحب کو میں خود ان شاء اللہ دے لوں گا، میری امداد صرف اجمالی نکات سے فرما دی جائے۔

۱۔ اصل میں تو میرا مذاق ایسے سوالات کا جواب دینے کا نہیں، کیونکہ اپنی ذات کے متعلق جواب دینا مرادف ہے کہ ہم اِس نقص سے بری ہیں۔ سو ایسا دعویٰ کرنا خود فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ کے خلاف ہے، اِس لئے اُن کو اتنا ہی جواب کافی ہے۔ مگر آپ بر کشف واقعہ کی غرض سے اتنا جواب کافی اور دے سکتا ہوں کہ گول بات کا جواب ہو نہیں سکتا۔ نہ مجھ کو کوئی واقعہ ایسا یاد۔ اگر اُن سے اِس صاحبِ علم و فضل کا نام اور اس اجتہادی فرعی مسئلہ کی تعیین اور نوعیتِ اختلاف کی تحقیق فرما لیجئے اور مجھ کو یاد بھی آجاوے تو بے تکلف عرض کر دوں گا خواہ اُن کی غلطی ہو خواہ میری غلطی ہو۔"

آگے بڑھنے سے قبل اب کی ذرا پیچھے ہٹ لیجئے۔ کئی نمبر قبل تکفیرِ شیعہ کے باب میں حضرت سے مراسلت درج ہو چکی ہے۔ میرے حلق سے یہ تکفیر علی الاطلاق کسی طرح نہیں اُتر رہی تھی۔ حضرت مولانا بھی کوئی کھُلا ہوا فتویٰ کفرِ شیعہ کے حق میں نہیں دے رہے تھے۔ البتہ میرے شبہات کو رد فرما رہے تھے۔ مولانا کی یہ تحریریں رسالہ النور میں چھپ گئیں۔ رسالہ کی اشاعت بہت ہی محدود تھی۔ مخصوص اہلِ خانقاہ کے سوا کوئی اُسے جانتا ہی نہ تھا۔ النجم[۵۱] کو ایک نعمتِ خداداد ہاتھ آگئی گئی کالم کی شاہ سُرخی اور کئی کئی جلی سُرخیاں دے کر مضمون کو خوب چمکایا۔ اور گویا یہ ظاہر کیا کہ علامہ تھانوی جیسے محتاط محقق بھی تکفیرِ شیعہ ہی کے حق میں ہیں ——— صحافتی پروپگنڈا کو اِس سے کیا بحث تھی کہ مولانا خود اس کی تصریح فرما چکے تھے، کہ اُن کی وہ تحریریں مستقل فتویٰ کا حکم نہیں رکھتیں، صرف مسائل متشکک کے سوالات پر بطورِ منع کے ہیں۔ بہرحال آب تاب سے وہ "حکیم الامت کا فتویٰ" نکلا، اور جس نسبت سے اُس کی اخباری اشاعت ہوئی، اُسی نسبت سے اپنی ناگواری بڑھتی رہی ——— شخصاً بھی اور مفادِ ملّت کے لحاظ سے بھی۔ جھنجھلاہٹ اس پر بھی'

۵۱؎ لکھنؤ کا اُس زمانہ کا ایک ہفت روزہ جس کا مسلک ہی ردّ شیعہ تھا۔

کہ اگر اس بحث کو پبلک میں چھیڑنا خلافِ مصلحت نہ جانتا تو آخر تیج ہی میں کیوں نہ چھیڑ دیتا۔

اِس پسِ منظر کو سامنے رکھ کر اب ۲۴ر فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م: "تازہ النجم کا ایک ورق مرسلِ خدمت ہے۔ میں جناب والا کے خدمت میں جو معروضات پیش کرتا رہتا ہوں اُن کی حیثیت بالکل خانگی ہوتی ہے۔ جیسے مریض صرف طبیب ہی کے سامنے پوری طرح کھلتا ہے۔ دوسروں کو سنانا اُسے مقصود نہیں ہوتا۔

ا۔ اِس کو معلوم کر کے میں خجل ہوا۔ مجھ کو عام طور پر اس کا احساس نہیں ہوا۔ میں آپ کی تحریرات کی دو قسمیں سمجھتا تھا۔ ایک تو وہی جو آپ نے تحریر فرمائی ہے، اس کے ساتھ تو یہی طرزِ عمل تھا۔ دوسرے علمی مضامین اس کو عام سمجھتا تھا جیسے اتباعِ شیخ کا مضمون تھا۔ میں اس کو اسی قسم میں سے سمجھا۔ اب انشاء اللہ زیادہ احتیاط کروں گا۔

م۔ النجم نے جس صورت کے ساتھ اس کی اشاعت کی اِس سے مجھے تکلیف ہی ہوئی۔

ا۔ میں نے دو روز قبل دیکھا مجھ کو بھی گرانی ہوئی۔ اِس کے بعد آپ کی تکلیف معلوم کر کے اور زیادہ گرانی ہوئی۔ یہ تو میری تکلیف میں کماً زیادتی ہوئی کہ دو گرانی مجتمع ہو گئیں۔ ایک زیادتی کیفاً ہوئی، کیونکہ آپ کی تو صرف یہی مصلحت فوت ہوئی کہ آپ پر یہ شبہ ہو گا کہ اپنے اکابر کی تحقیق میں تردد ہوا، مگر یہ واقع میں نقص نہیں بلکہ کمالِ احتیاط اور غیر جانب داری ہے اور میری مصلحت بہت بڑی فوت ہوئی کہ عامہ ناظرین میرے مضمون کو جو کہ فتویٰ نہیں فتویٰ سمجھیں گے۔

م۔ یہاں تک مضائقہ نہ تھا کہ صرف جناب کا جواب یہ لکھ کر شائع کر دیتا کہ ایک سائل کے شبہات کے جواب میں یہ لکھا گیا۔ لیکن موجودہ صورت کے ساتھ شائع کرنا تو خود النجم کے مقاصد کے لئے مضر ہوا شیعہ جماعت کم از کم یہی کہہ کر فائدہ اُٹھائے گی کہ خود اہلِ سنت اِس باب میں مختلف ہیں۔ اور مجھ عامی کا نام سند میں بطور عالم کے پیش کریں گے۔ اپنے خیال کی اشاعت ہی مجھے منظور ہوتی، تو میں تیج ہی میں کیوں نہ کرتا۔ اب تک تو میرا طریقہ یہ رہا ہے کہ جن مسائل میں میرا قلب اپنے اکابر کے مسلک سے پوری طرح متفق نہیں، اُن کا ذکر بھی تیج میں نہیں کرتا، بلکہ

لوگ سوال کرتے ہیں، جب بھی صاف جواب نہیں دیتا۔ بہرحال اب یہ تیر تو کمان سے نکل ہی چکا۔
۳۔ تیر جستہ باز گرداند ز راہ، کے متعلق بھی ایک مشورہ پُشت پر مرقوم ہے۔
۴۔ البتہ آیندہ کے لئے بہ ادب درخواست ہے کہ میری جتنی بھی گذارشیں ہوا کریں انھیں جناب والا اپنی ذات تک محدود کیا کریں، ورنہ لوگ خدا معلوم کیا کیا معنی لیا کریں گے۔
۱۔ بہ سر و چشم۔ لیکن اِس عموم میں ایسے مضامین بھی آجائیں گے جن کی شان مضمون اتباع شیخ جیسی ہوگی اس کا کیا معیار ہوگا۔ اِس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، یا تو آپ خود فرما دیا کریں کہ یہ مضمون عام ہے یا میں پُوچھ لیا کروں[1]۔ جو طریقہ قلب پر خفیف ہو بے تکلف فرما دیں۔ ہاں ترجمۂ قرآن کے متعلق جو سوالات آئیں، اُن کو عام سمجھوں یا خاص۔
اضافہ بر جواب خط۔ مَیں نے اِس خط کا اسی طرح اپنے جواب کا ایک حرف بھی کسی کو نہیں دکھلایا۔
مشورہ موعودہ صفحہ اوّل۔ مَیں نے ایک مضمون بہ غرض تدارک احتمال غلط فہمی ناظرین اخبار النجم لکھا ہے۔ بعد ملاحظہ اگر مشورہ ہو شائع کر دیا جائے۔ پھر کہاں شائع ہو النجم میں بھیج دوں یا سچ میں یا النور میں۔ اِس کی نقل بھی یہاں نہیں رکھی ہے۔ شاید کسی کی نظر پڑ جاوے۔ اب تو مَیں ڈر گیا۔ مار گزیدہ از ریسمان می ترسد"

اب اس کے آگے حضرت کا وہ مضمون موعود ملاحظہ ہو:۔

تنبیہ ضروری

مَیں نے ایک مضمون جو ایک مُفتی صاحب کے ایک فتویٰ بابت اسلام یا عدم اسلام اہل تشیع پر بعض شُبہات کا جواب تھا۔ ۸ ذی قعدہ ۵۲ھ مطابق ۲۳ فروری ۳۴ء کے اخبار النجم میں دیکھا جو رسالہ النور سے نقل کیا گیا ہے۔ اشاعت کا تو مَیں مخالف نہیں، کیونکہ رسالہ مذکورہ میں اس سے پہلے میری مرضی سے شائع ہو چکا ہے، لیکن اخبار میں اِس کی اشاعت مجھ کو پسند

[1] کیا جاتا ہے اِس اخلاق اور رواداری کی، کہ خود اپنے اوپر یہ سارا بار لینا گوارا کر لیا!

نہیں آئی۔ کیونکہ رسالہ کے اکثر ناظرین اہل علم و اہل فہم ہوتے ہیں۔ اور اخبار کے اکثر ناظرین کم علم و کم فہم ہوتے ہیں، جن میں حدود سے متجاوز ہونے کا احتمال قریب ہوتا ہے۔ اِس احتمال کے سبب احتیاطاً اِس مضمون کی اور اُسی مضمون کی اخیر سُرخی سے نقل کرنا مصلحت معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضمون میرا کوئی فتویٰ نہیں بلکہ اصل صاحب فتویٰ کے جواب پر جو شُبہات تھے درجۂ منع میں ان کا جواب ہے۔ یعنی بر تقدیر ثبوت مقدمات۔

ایک طالب علمانہ بحث ہے، فتویٰ نہیں ہے۔ باقی اس فتویٰ کے اور بناء فتویٰ کے ذمہ دار خود صاحب فتویٰ ہیں۔ مجھ کو اِن مباحث پر تبحر نہیں ہے۔ اِسی طرح صاحب شُبہات نے اِس مسئلہ میں کوئی رائے نہیں قائم کی۔ صرف بعض تردداتِ فتویٰ کے متعلق ظاہر کئے ہیں۔ لہٰذا ناظرین کسی خاص خیال کو میری طرف یا صاحب شُبہات کی طرف منسوب نہ فرمائیں وہ نسبت غلط ہوگی۔ والسلام۔

۱۱ ذی قعدہ ۵۲ھ۔ اشرف علی۔ تھانہ بھون"

(۶۴)

اِس چھوٹے سے بیان نے مولانا کی طرف سے تو بہترین صفائی پیش کر ہی دی، ساتھ ہی خود میری یعنی سائل کی حیثیت کی بھی کتنی اچھی ترجمانی کر دی! اور حضرت نے النجم کے اِس اقدام کو جس ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، وہ تو بالکل ظاہر ہے ——— سچ تو اس زمانہ میں خدمتِ قرآن کے سلسلہ میں عارضی طور پر بند تھا، اور النجم نے بھلا اُسے کیوں چھاپا ہوگا، یقین ہے کہ النور میں ضرور نکل گیا ہو۔ یہی میں نے اس وقت مشورہ دیا ہوگا۔ مگر اب اتنی مدت ہو گئی، خوب خیال نہیں پڑ رہا ہے۔

عریضہ ابھی تمام نہیں ہوا۔ ایک جزو باقی رہ گیا تھا، جواب ملاحظہ ہو۔

م: بحمد اللہ پہلا پارہ تیار ہو گیا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما دیں۔

م۔ جی میں آتا ہے کہ اُسے بجنسہٖ اُردو میں منتقل کر کے جناب کے مُلاحظہ کے لئے بھیج دوں۔ گو اِس میں وقت صرف ہوگا لیکن بہرحال نفع بھی اُسی قدر ہو کر رہے گا۔

ا۔ جی تو میرا بھی چاہتا ہے اور مصلحت بھی ہے۔ مگر کیا عرض کروں۔ قویٰ ضعیف ہو گئے اور ہوتے جاتے ہیں، مشاغل بڑھ گئے کس طرح کام کروں۔ اب تو پنشن کے دن ہیں۔ مگر سرکاری ملازمت کے وقت پنشن خوار بھی بُلا لئے جاتے ہیں۔

م۔ آپ کی بیان القرآن تو قدم قدم پر پیشِ نظر رہی ہے۔ عربی تصانیف میں بڑی مدد اتقان[1] سے مل رہی ہے۔

ا۔ واقعی جامع کتاب ہے"

اِس والا نامہ کا جواب اللہ جانے کیا لکھا۔ پوسٹ کارڈ پر لکھا تھا۔ اِس لئے ظاہر ہے کہ وہ واپس نہ آیا، اور اب محفوظ نہیں ـــــ النجم کی اُن پھڑکتی ہوئی سُرخیوں کا اثر تدریجاً یہ نکلا کہ اُدھر سے شیعوں نے جوابی مضمون لکھا، اور اُس میں خود حضرت کی تکفیر کی! ـــــ ایک لطیفہ اس زمانہ میں یہ ہوا کہ وطن کے ایک صاحب بدعات میں غرق، محض اتفاق سے تھانہ بھون میرے ہمراہ چند گھنٹے کے لئے پہنچے، اور حضرت کو تعویذ دیتے ہوئے دیکھا۔ وطن پہنچ کر اپنے مجمع میں فرمایا کہ "مولوی اشرف علی کو خواہ مخواہ لوگ وہابی بتاتے ہیں۔ میں تو خود جا کر دیکھ آیا۔ وہ تعویذ دے رہے تھے۔ اور مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے"۔ اِس کا ذکر بھی میں نے اس عریضہ میں کر دیا تھا۔ بہرحال جواب حسبِ ذیل آیا:-

رائے کا انتظار تھا، معلوم ہو گئی، آپ کی پند سے مسرت ہوئی۔

میرا ارادہ النجم کو بند کر دینے کا ہے۔ یعنی یہاں نہ آوے۔ اِس سے دوسرے پرچہ میں اپنے متعلق شیعہ کی طرف سے تکفیر کا فتویٰ دیکھا۔ اِن صاحبوں نے اپنے اغراض کے لئے میرا علمی

[1] یعنی الاتقان فی علوم القرآن از جلال الدین سیوطیؒ۔ لیکن یہ خیال صرف اُس وقت تھا بعد میں سب سے زیادہ مدد امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور پھر قرطبی کی تفسیر احکام القرآن سے ملی۔

مضمون شائع کر کے خواہ مخواہ گالیاں دلوائیں۔

ترجمہ اُردو میں کر دیا بہت ہی اچھا کیا۔ اگر کوئی محقق ذی ہمت دیکھتا تو نفع بھی تھا۔ اب میرا دماغ متحمل نہیں رہا۔ خیر تعمیل حکم کروں گا۔ کہیں کہیں سے دیکھ کر اپنا خیال بُرا بھلا ظاہر کر دوں گا۔

دریاباد والے صاحب کا خوش جانا یہ اُن کی دریا دلی ہے ورنہ میرے اسباب بدنامی تو سب کے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو خوش رکھے"

حضرت کی صحت، کیا جسمانی اور کیا دماغی، خدا کے فضل سے مدتوں بہت اچھی رہی۔ یہ اب ۱۹۳۴ء (۵۲ھ) میں پہلی بار حضرت کے زبان و قلم پر اپنے قویٰ، خصوصاً قوائے دماغی کے متعلق ایسے الفاظ آنے لگے جیسے کہ اس والا نامہ اور اس سے قبل والے میں تھے —— ہم مسترشدین کے غم و حسرت میں اضافہ کے لئے یہی بہت تھا۔

اِس کے بعد کا جو عریضہ ہے، اُسے بڑے حیص بیص، توقف و تذبذب کے بعد یہی درج کر رہا ہوں۔ میری آپ بیتی کا بیشک وہ ایک اہم باب ہے۔ لیکن سوال دیر تک سامنے یہ رہا کہ آیا اُسے اِس کتاب کا بھی جُزو بنایا جائے؟ آخر اثبات کا پہلو نفی پر غالب آیا۔ اِس اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے یا اِس فیصلہ میں اگر نفس کی آمیزش ہے، تو اللہ اُسے معاف فرمائے —— خط پر تاریخ ۱۳ر مارچ (۵ار ذی الحجہ ۵۲ھ) کی ہے، اور خط کا مضمون ہر شرح و حاشیہ سے بے نیاز ہے:۔

م" والد ماجد مرحوم کا انتقال ۱۳۳۰ھ میں ۱۴ر ذی الحجہ کو عین بعد فراغ حج مکہ معظمہ میں ہوا۔ ۱۲ر کو صبح ہوتے ہوئے منیٰ میں ہیضہ ہوا۔ مکہ لائے گئے، ۱۴ر کو اذان فجر سن کر جیسے نماز کی نیت کرتے ہیں ہاتھ باندھ لئے، اور روح پرواز کر گئی۔

ا۔ سبحان اللہ۔

م۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے قطعۂ تاریخ کہا تھا، آخری شعر یہ تھا ؎

اِس قدر مصروف ذکر و شغل تھے "شغل" ہی میں نکلی تاریخ وفات

(یعنی ۱۳۳۰ھ)

۱۔ عجیب ۔

م ۔ پرسوں جب ۱۲ ذی الحجہ آئی تو دن بھر مجھے اُن کا خیال لگا رہا۔ دُعائیں بار بار کیں سوتے وقت بھی اُن کا خیال غالب رہا۔ سویا تو ایک بڑا لمبا خواب دیکھا۔ تفصیل تو اب کچھ یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ اپنے کو بہت اچھی حالت میں، ارواح ابرار و صالحین کی مجلس میں پایا۔ اتنے میں کسی حجاب سے فرشتہ کی آواز آئی کہ "آپ کے آنے میں بھی دیر نہیں۔ بس ایک ہفتہ کی مہلت ہے بہ آسانی بلا کسی دقت کے آجائیے گا"۔ الفاظ یاد نہیں رہے، مفہوم یہی تھا۔ اس آواز میں تخویف و تہدید کا شائبہ تک نہ تھا، تمام تر لینت و ملاطفت تھی، جیسے کسی کو بشارت دی جا رہی ہو۔

آنکھ کھلی۔ جب سے دل میں گوناگوں خیالات و جذبات پیدا ہیں۔ کبھی کہتا ہوں کہ خواب کا اعتبار ہی کیا۔ کبھی یہ آتا ہے کہ یہ تو بڑی بشارت مل گئی۔ ایسی آسانی سے یہ بیڑا پار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن جب بیوی، بچیوں، والدہ ماجدہ وغیرہ، کا خیال آتا ہے، کہ ان پر کیا گذرے گی، اور خود اپنے اعمال یاد پڑ جاتے ہیں، تو طبیعت گھبرانے بھی بہت لگتی ہے۔ کبھی یہ بھی کہتا ہوں کہ اس موت سے یہی عُرفی موت کیوں مُراد لی جائے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ خواب کی لسان تمثیلی میں اس سے کیا مراد ہے۔

کل کا سارا دن اسی ردّ و بدل، اُدھیڑ بن میں گزرا۔ کسی سے ابھی تک بیان بھی نہیں کیا۔ بجز اس کے کہ جناب ہی کو لکھ بھیجوں، کوئی اور صورت تشفّی کی ذہن میں نہیں آئی۔ گھر میں یا والدہ ماجدہ سے ذکر کر دوں تو ابھی سے جزع فزع شروع ہو جائے۔ اتفاق سے وہ لوگ اس وقت یہاں ہیں بھی نہیں بالکل تنہا ہوں۔

میعاد ابھی ۴ - ۵ دن باقی ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں جمعرات کی شام سے خود میرے اُوپر یہ خیال نہ مسلّط ہو جائے، اور حرکتِ قلب اسی دہشت سے نہ بند ہو جائے۔

۱۔ مبارک خواب ہے۔ جو کچھ بھی مراد ہو۔ اور پوری حقیقت تو اللہ ہی کو معلوم کہ تحقیق ہے یا تاویل۔ مگر دل کو یہی لگتا ہے کہ صورت مراد نہیں معنی مراد ہیں۔ باقی یہ کہ کون سے معنی، اس میں بھی جی کو

یہ لگتا ہے کہ خدمتِ قرآنیہ سے کوئی درجہ ملنے والا ہے۔ شاید اُس کی تکمیل کے لئے یہ میعاد ہو اور کیا عجب کہ اس کی کوئی ضروری خدمت اِس میعاد تک مکمل ہونے کو ہو اور اجرت کی تکمیل عمل کی تکمیل سے ہوتی ہے۔ پس موت سے مُراد قُربِ الٰہی ہے اور قرآن مجید کی خدمت کی وجہ سے وہ قُرب بھی قُربِ خاص ہوگا آگے اللہ کو معلوم۔ کسی سے کہنا بالکل مناسب نہیں جب تک کہ وہ میعاد نہ گذر جائے۔ باقی دُعائے خیر مَیں بھی کرتا ہوں۔ آپ کے انتظار کے خیال سے واپسی کی ڈاک میں عجلت کے ساتھ جواب دے رہا ہوں۔ مَیں بھی محتاجِ دُعا ہوں۔"

جواب اِس سے زیادہ حکیمانہ اور کیا آتا۔ توقع بھی حکیم اُمّت سے ایسے ہی جواب کی تھی، ہر پہلو کو جامع۔ میعاد جُوں تُوں گذر گئی ——— طبّی اور غیر طبّی ماہرین اور کیا کیا اختیار کیں، اور اِس درمیان میں ضغطۂ قلب کے قسم کی کیا کیا تکلیفیں پیش آتی رہیں، اُن کے تذکرہ کو حکیم الامّت کے اوراق سے کوئی تعلق نہیں ——— بہرحال اِس مدّت کے ختم پر، اور کچھ دوا علاج کر کے، لکھنؤ سے مَیں دریا آباد واپس آگیا، اور آتے ہی مختصر خیریت نامہ (جوابی کارڈ کی شکل میں) ۱۷ یا ۱۸ اپریل کو لکھ بھیجا۔ جواب حسبِ ذیل عنایت ہوا:-

"انقضاءِ میعاد جو آپ کے خیال کے اعتبار سے حیاتِ ثانیہ ہے اور میرے خیال کے اعتبار سے بقاءِ حیاتِ اولیٰ ہے، مبارک ہو۔ واقعی احتمال بعید بلکہ ابعد کی بناء پر دل تو لگا ہوا تھا۔ ذکر بھی کرتا تھا۔ مَیں ممنون ہوں کہ مطمئن فرمادیا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعائے برکت فی العمر و فی العلم و فی العمل کی کرتا ہوں۔ یہ جبر کا عجب نہیں اُسی احتمال موہوم کے اثر سے ہو۔ ایسے آثار کبھی مشغولی سے رہتے ہیں کبھی فراغ سے۔ خدا کرے اب کوئی شکایت نہ رہی ہو۔ زیادہ مصلحت چندے رہ کر راحت و سکون اختیار کرنے میں تھی۔ دُعائے حفاظت کرتا ہوں۔ اپنے لئے بھی دُعا چاہتا ہوں۔"

(۶۵)

علالت اِتنی جلد اور ایسی آسانی سے جانے والی نہ تھی۔ ابھی قسمت میں حضرت سے اور تسلّی نامے وصول ہونے باقی تھے ——— مبارک ہے وہ بیمار جسے ایسے تیماردار نصیب ہوں

صحتیں لاکھوں ہوں اُس بیماریٔ غم پر نثار   جس میں آئے بار ہا اُن کی عیادت کے مزے

اور خوش نصیب ہے وہ مریض جسے سابقہ ایسے طبیب سے پڑے، ع

خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

۱۴ اپریل کو حسب ذیل عریضہ لکھا:۔

م: کل لکھنؤ سے دریاباد یہ سمجھ کر آ گیا تھا کہ اب طبیعت اچھی ہو گئی۔

ا۔ میری رائے تو جلد واپس ہونے کی نہ تھی۔ مگر میں دریاباد کیسے اطلاع دیتا۔

م۔ لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ شب میں نیند بڑی مشکل سے آئی۔ بے چینی بھی رہی قلب بعض وقت اس زور سے اُچھلتا ہے کہ گویا سارا جسم اُچھلنے لگتا ہے۔ غشی کی آمد کا دھڑکا ہر وقت رہتا ہے۔ دل میں کئی کئی بار یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرکت قلب اب رُکا ہی چاہتی ہے۔

ا۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ آثار پیش آتے ہیں اور نہایت آسانی سے زائل ہو جاتے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد یہ شکایات زائل ہو جاویں گی۔

م۔ نمازوں میں حضوری پہلے ہی کب نصیب تھی، اور اب تو بالکل ہی تشریف لے گئی۔

ا۔ یہ غیبت اور تشویش اُس حضوری سے بھی انفع ہے۔ اصل طریق مجاہدہ ہے۔ یہ کیفیت مجاہدہ ہے۔ اور جس حضوری کو اس پر ترجیح دی جاتی ہے، وہ حظ نفسانی کے ساتھ مخلوط ہے۔ خدا تعالیٰ بندہ کو جو عطا فرماتے ہیں انفع و اصلح ہی ہوتا ہے۔

م۔ کوئی ذرا بڑی سورت تو پڑھ ہی نہیں سکتا ہوں، خصوصاً نماز عشاء میں۔ حد یہ ہے کہ بار بار نیت توڑ دینے کو جی چاہتا ہے، گو بحمد اللہ کبھی اس کی نوبت نہیں آئی۔

ا۔ یہ سن کر آپ کو تسلی ہو گی کہ آج کل ایک شکایت بدنی کے سبب میرے معمولات کا بھی یہی رنگ ہے۔ مگر میں خوش ہوں کہ طبیب اگر بدمزہ دوا تجویز کرے وہی مصلحت ہے۔

م۔ خدا جانے کیا انجام ہونے والا ہے۔

ا۔ بالکل اچھا ہونے والا ہے۔ بہت جلد ظاہر ہو وے گا۔

م۔ آج لکھنؤ پھر واپس جا رہا ہوں، آج بہشتی زیور میں دیکھ کر اختلاج کا تعویذ اپنے ہاتھ سے نقل کر کے پہن لیا ہے۔ لیکن جناب والا کے ہاتھ کی برکت ہی کچھ اور ہوتی۔

ا۔ ملفوف ہے۔ خدا تعالیٰ نافع فرماوے۔

م۔ اِس تعویذ کے علاوہ بھی دُعا یا جو تدبیر خیال مبارک میں آئے اس کا اس وقت شدید محتاج ہوں۔

ا۔ ۱؎ مفرحات قلب و مقویات قلب کا استعمال۔

۲؎۔ کتاب الرجاء کا مطالعہ بلکہ استماع خواہ احیاء سے یا کیمیائے سعادت سے یا اربعین غزالی سے۔

۳؎ ہر وقت ایسے شخص کو پاس رکھنا جس سے اُنس ہو اور وہ دانشمندی سے آپ کو دِل خوش کُن مقالات میں مشغول رکھ سکے۔

۴؎ کسی وقت طبیعت حاضر ہو تو اپنے قلب پر چاند کا تصور اور یہ خیال کرنا کہ قلب پر باریک باریک پھوار پڑ رہی ہے۔

۵؎ جب آسانی سے ممکن ہو دُرود شریف پڑھ کر قلب پر دم کرنا۔

یہ سب تدابیر اکسیر اعظم ہیں۔ اور اگر کسی خادم سے فرما دیا جاوے تو وہ تیسرے چوتھے روز حالات سے مجھ کو مطلع کرتا رہے۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ بالالتزام دُعا کرتا رہوں گا۔ ع

من غم تو می خورم تو غم مخور

م۔ بعض اوقات بالکل یاس کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ا۔ اِس میں بھی حکمت ہے کہ نعمت امید کی قدر ہو۔"

حضرت کو جو غیر معمولی شفقت اپنے اِس ناکارہ نیاز مند کے ساتھ تھی، وہ اُوپر کے صفحات میں تکرار و صراحت کے ساتھ خوب اچھی طرح واضح ہو چکی۔ اِس کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت کا

۱؎ مولانا کی مشہور اور مقبول کتاب مسائل فقہ پر۔

دل برابر خیریت نامہ کے انتظار میں لگا رہتا۔ آخر ۲۴ یا ۲۵ اپریل کو اپنی خیریت اور بقیۂ سلسلۂ علالت دونوں کا ذکر ایک کارڈ میں کیا، اس کے جواب میں ذیل کا شفقت نامہ موصول ہوا:۔

"مجھ کو کئی روز سے دریافت خیریت کا سخت انتظار تھا، حتیٰ کہ مولانا حسین احمد صاحب جو یہاں بسلسلۂ ترمیم وقف بل مع دیگر حضرات دیوبند و سہارنپور تشریف لائے تھے، میں نے اُن سے آپ کے خط آنے کے متعلق پوچھا بھی تھا، مگر مفصل حال معلوم نہ ہو سکا، الحمدللہ آج مژدۂ صحت سُنا۔ اللہ تعالیٰ بقیۂ اعتلال و اضمحلال بھی دفع فرمائے، آپ پر اور گھر میں جو اثر ہوا، یہ سب ناشی ہے محبت سے[1]۔ اللہ تعالیٰ دونوں صاحبوں کو جزائے خیر عطا فرماوے۔ واقعی میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ مگر انا عند ظن عبدی کے چشمہ سے محبین کے پاس کچھ پہنچ جاتا ہے۔

مولانا کی تشریف آوری کے وقت آپ ایک خاص حیثیت سے بہت یاد آئے کہ ہمارے مجمع کا اختلاط و ارتباط و انبساط و رعایات مراتب و مناصب دیکھ کر آپ کو خاص مسرت ہوتی جیسا مجھ کو معلوم ہے۔"

یہ آخری سطریں جس شرافت نوازی کی مظہر ہیں، اس کا ظہور ایسے ہی قلب و قلم سے ممکن ہے جو سرچشمۂ شرافت ہو۔

حکیم مطلق کا ایک ایک فعل کتنی حکمتوں کا جامع ہوتا ہے! علالت کے سلسلہ میں خوب خوب حکمتوں کا مشاہدہ ہوا۔ اور لطیفہ یہ ہوا کہ علالت شروع جس طرح ایک خواب سے ہوئی تھی، ختم بھی اُسی طرح ایک خواب ہی پر ہوئی۔ یکم مئی کا لکھا ہوا عریضہ ان ساری کیفیات کا شارح و ترجمان ہے:۔

مرض شاید ہو مرض تو آپ کے تعویذ کی برکت سے بحمداللہ اُسی وقت جاتے رہے تھے لیکن طبیعت فی الجملہ صاف نہ تھی۔ کبھی سر میں تیز چکر، کبھی دل کی تیز دھڑکن، یہ کیفیات پرسوں شام تک رہیں۔ کام کاج بالکل چھوٹا ہوا۔ بعد عشا اپنی صحت کے لئے ذرا الحاح کے ساتھ دُعا کی۔ دُعائیں تو

---

[1] یقیناً میں نے اپنے عریضہ میں کوئی مضمون اس قسم کا لکھا ہوگا کہ "جناب کے اس درجہ تعلق خاطر اور نیز شفقت تاثر سے ہم دونوں بہت ہی زیادہ متاثر ہوئے۔"

پہلے بھی بارہا کی تھیں۔ مگر اُس وقت کچھ دِل لگ سا گیا۔ غرض یہ کرتا رہا کہ بُری بھلی جو کچھ بھی خدمت تیرے دین کی بن پڑی ہے، اُس کے لئے صحت و عافیت نصیب کر دے۔ دُعا کرتے وقت یہ معلوم ہوا کہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔ قشعریرہ سا محسوس ہونے لگا۔ اور یہ بارہا کا ذاتی تجربہ ہے کہ عموماً یہ علامتیں قبولیت دُعا کی ہیں۔ سو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گنوار قسم کے ہندو مسلمانوں پر حملہ آور ہیں اور مجھ پر خصوصاً۔ باقی تو غائب ہو گئے، ایک حملہ آور میری طرف بڑھا۔ میں نہتّا ہوں لیکن خائف و ہراساں ذرا سا بھی نہیں۔ البتہ بجائے اس سے مقابلہ کے معاً دُعا میں مشغول ہو جاتا ہوں کہ یا الٰہی کیا تُو اِس کافر کو میرے اُوپر غالب کر کے اپنے ہی دین کی رُسوائی اور اپنے ہی ماننے والوں کی مغلوبیت کا سامان کر دے گا؟ یہ دُعا کرتے ہی آناً فاناً وہ مُشرک اِس طرح معدوم ہو جاتا ہے کہ جیسے نمک پگھل گیا، یا پانی بخار بن کر اُڑ گیا۔ معاً آنکھ کھُل جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ تعبیر بھی جزم کے ساتھ گویا ذہن میں القاء ہو جاتی ہے کہ مرض گیا، اور خدمت دین کے لئے مجھے مُہلت مل گئی۔ چُنانچہ صُبح سویرے ہی میں نے گھر میں کہہ دیا کہ اب انشاء اللہ بالکل اچھا ہوں گا۔ اور بحمد اللہ اُس وقت سے یعنی کل صُبح سے آج اِس وقت تک ہوں بھی بالکل صحیح، اور طبیعت حسب سابق چاق اور بشاش ہے۔

میرے لئے یہ ماجرا عجیب و غریب سا ہوا۔ اِس لئے جناب والا کی خدمت میں من وعن عرض کر رہا ہوں۔

ا۔ واقعی ظاہراً عجیب ہے۔ اور اگر حق تعالیٰ اور بندہ کے تعلقات پر نظر کی جائے تو عجیب بھی نہیں۔ بلکہ ایسا نہ ہونا عجیب ہے، جس کا سبب ہماری کوتاہی ہوتی ہے، اُدھر سے کوئی کمی نہیں ہے

انچہ ہست از قامت کوتاہ و ناموزون ماست ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک صحت بدنی دُوسری صحت رُوحانی کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق میسّر ہوا۔

لطیفہ۔ خواب ہی سے مرض شروع ہوا تھا خواب ہی پر ختم ہوا۔ ع۔

درد از یار است و درماں نیز ہم

اطلاع۔ میں نے النجم بھیجنے کو منع کر دیا، اب نہیں آتا۔ جی بُرا ہو گیا۔

م۔ بھائی صاحب کا تبادلہ سہارنپور سے سیتاپور ہو گیا۔ گویا وطن کے قریب آ گئے، لیکن تھانہ بھون گویا چھوٹ گیا۔ بس اسی کا افسوس ہے۔ خود میرے لئے بھی حاضری میں جتنی سہولتیں اب تھیں، ان میں فی الجملہ کمی آ گئی۔

ا۔ مجھ کو بھی طبعاً افسوس ہوا، اور مجھ کو کیا گھر میں بھی، مگر دوسرے عنوان سے کہ اب آپ کے گھر میں ملنا مشکل ہو گا، اور خود ڈپٹی صاحب کے اخلاق کو بھی یاد کیا کہ محبت سے آتے تھے اور اس قدر رعایت کرتے تھے کہ کھانا ساتھ لاتے تھے۔ مگر خود ممدوح کی توقع راحت سے عقلاً مسرت ہوئی۔ ایک قرب وطن سے، دوسرے غالباً سیتاپور کی آب و ہوا بہ نسبت سہارنپور کے مزاج کے موافق آ جائے اور شکایت لاحقہ میں کمی ہو جاوے۔ باقی جو روحانی علاقہ اُن سے ہے اُس میں قرب و بعد متفاوت نہیں۔ والسلام۔

مکتوب گرامی کے جزو اوّل کا حکیمانہ ہونا بالکل ظاہر ہے، اور حکیم الامت کے معیار کے بالکل مطابق۔ لیکن جزو اخیر جو ایک جج کے اور خانگی معاملہ سے متعلق ہے، وہ بھی شریفانہ ہونے میں اپنی نظیر آپ ہی ہے ——— حکیم الامت کے قریب رہ کر دوسروں نے ذکر، شغل وغیرہ عناصر "بزرگی" کی جو بھی تعلیم کی ہو، اس عامی کو تو سب سے بڑا سبق حضرت کی ہمہ وقتی زندگی سے آدمیت، انسانیت، حسن معاشرت و کمال اخلاق ہی کا ملا۔ آخرت تو ملتی ہی، دُنیوی زندگی بھی "طریق اشرف" ہی پر چلنے سے بہترین اور خوشگوار ترین بسر ہو سکتی ہے۔

(۶۶)

خط ختم ہو گیا۔ خط کا حاشیہ رہا جاتا ہے۔ حاشیہ خود مولانا کا نہیں، اُن کے عاشق صادق اور مُرید باصفا، خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب کے قلم سے ہے ——— اپنے جذبۂ عشق کے لحاظ سے اپنے مُرشد ہی میں گم، اور "من تو شدم تو من شدی" کے مصداق!

"حاضر الوقت احقر عزیز الحسن بعد سلام مسنون صحت پر دل سے مبارکباد عرض کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔ دیوان حافظ سے دیکھ کر اس شعر کو جو حضرت نے آپ کو پشت پر تحریر فرمایا ہے، لیکن پہلا مصرعہ حضرت کو صحیح یاد نہ آیا تھا میں مکرر لکھتا ہوں۔

ع ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست

حضرت اکثر آپ کو یاد فرماتے رہتے ہیں اور ذکر خیر کرتے رہتے ہیں"

علالت قلب کا وہ سلسلہ تو خیر خدا خدا کر کے ختم ہو گیا، اور میں اس بیماری کے دوران ہی مثنوی کا یہ مصرعہ اکثر گنگناتا رہتا تھا۔ ع

نیست بیماری چو بیماری دل[1]

لیکن کوئی نہ کوئی علالت جاری ہی رہی، کبھی نزلہ کبھی بخار، وغیرہا۔ بہت ہی چاہا کہ ایک مرتبہ ایک ہی دن کے لئے سہی، اس درمیان میں تھانہ بھون حاضری دے آؤں۔ کوئی صورت نہ بن پڑی۔ ۵، یا ۶ مئی کو پھر حسرت کا کارڈ لکھا، جواب میں حسب معمول تشفی نامہ موصول ہوا:۔

"حضرت مرشدی سے سنا ہے کہ کبھی لطف بصورت قہر ہوتا ہے۔ اس کے آثار میں سے آپ کی علالتیں ہیں کہ طرق قرب ہیں۔ یہ بھی حضرت سے سنا ہے کہ جس طرح عمل طریق قرب ہے اُسی طرح مرض دوسرا طریق قرب ہے[2]۔ عبادت بالتفویض یہ ہے کہ جو خاص مدت شروع کی تھی، اس میں تعجیل کا ذہن سے نکال دیجئے اور مفوض بحق کیجئے۔ ان کی حکمت میں جب مصلحت ہوگی اس میں لگا دیں گے۔ باقی دعا و تدبیر میں مشغول رہئے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں۔ علیٰ ہذا ملاقات کو بھی حوالہ بخدا کیجئے۔

کہ اینچہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف ست

مجھ کو خشک مزاج کہنے والے ایسے معذور ہیں جیسے غریق شناور کو خشک کہے یعنی فستہ۔ اور اصل تو یہ

---

[1] صاحب مثنوی معنوی کا پورا شعر، اور ظاہر ہے کہ بالکل دوسرے سیاق میں، یوں ہے ؎

عاشقی پیدا ست از زاریٔ دل　　　نیست بیماری چو بیماریٔ دل

[2] کیسی حکیمانہ وجامع تعلیم چند مختصر لفظوں کے اندر ارشاد فرما دی گئی ہے، سبحان اللہ!

ہے کہ جو شخص اِن لوگوں کا تابع نہ ہو وہ خشک و بدخلق ہے[1]۔

گھر میں صحیح کہتی ہیں۔ لیکن جتنی دیر میں مستورات باہم ملیں گی اتنی ہی مسرت کامل ہوگی، یہ بھی حکمت ہے[2]۔ اب مکرر دُعائے صحت پر ختم کرتا ہوں۔"

تفویض و تسلیم کی کیفیت (جو عین تقاضائے عبدیت ہے) اگر دل میں راسخ ہو جائے تو یہی دُنیا میں نمونۂ جنّت بن سکتی ہے ——— خوب کہا ہے محمد علی جوہر نے ؎

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ　　دُنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنّت کی فضا دیکھ

صحت بحمد اللہ درست ہوئی، لیکن رفتہ ہی رفتہ۔ اور ہمّت و حوصلہ کے مطابق قوت اب بھی نہ لوٹی۔ بہرحال یہ غنیمت ہوا کہ کام کا ٹوٹا ہوا سلسلہ کسی حد تک از سرِ نو شروع ہوگیا۔ تھانہ بھون کی حاضری کی حسرت ہی بدستور قائم رہی۔ ۲۴ رمئی کا عریضہ تمام و کمال پڑھنے کے قابل ہے:۔

م: اب بحمد اللہ کئی دن سے اچھا ہوں۔

ا۔ الحمد للہ۔

م۔ اور کچھ کام بھی کرنے لگا ہوں۔

ا۔ زیادہ نہ کیجئے۔ کہیں پھر خدانخواستہ کوئی مجبوری نہ ہو جائے۔

م۔ گو جتنی محنت کا دِل چاہتا ہے اُس کی نصف بھی ابھی نہیں کرتا۔

ا۔ دِل کے چاہنے پر عمل نہ کیا جاوے عقل کے فتویٰ پر عمل کیا جاوے۔

م۔ دِن میں سونے کا کبھی پابند نہ تھا، اب لازمی سا ہو گیا ہے۔ اطبّاء نے بھی بتایا ہے، اور خود تجربہ سے بھی نافع ثابت ہوا۔

ا۔ بلکہ ضروری۔

---

[1] حضرت کی ذاتی شفقتوں اور عنایتوں کی تازہ مثالوں سے متاثر ہو کر میں نے لکھا تھا کہ کیسے ظالم اور بیدرد وہ لوگ ہیں جو ایسے سرچشمۂ لینت کو خشک مزاج بتاتے ہیں۔

[2] گھر میں یہ کہا تھا کہ اب پیرانی صاحبہ سے جلد جلد ملاقات کی کیا صورت ہے۔ کہیں مدتوں میں شاید نوبت آسکے۔

م۔ تھانہ بھون حاضری کی، کیا عرض کروں، اس درمیان میں کیسی کیسی کوششیں کیں۔ پختہ ارادہ تھا کہ بھائی صاحب جس روز سہارنپور سے روانہ ہو رہے ہوں، اس کے دو روز قبل گھر میں ساتھ نے کر وہاں پہنچ جاؤں اور ایک شب و روز کے لئے تھانہ بھون حاضری دے لوں جناب والا کو زحمت انتظام سے بچانے کے خیال سے یہ سوچ لیا تھا کہ شب کو گھر میں لے کر خواجہ صاحب[1] یا جلیل احمد خاں صاحب[2] کے ہاں آجاؤں گا۔ اور دونوں حضرات اسے یقیناً بمسرت منظور فرما لیتے۔

ا۔ میں ان حضرات کی سی مسرت کا دعویٰ نہیں کرتا مگر خدمت لینے میں میری مسرت بھی کچھ زیادہ کم نہ ہوتی۔ اور خدمت نہ لینے میں اسی طرح حسرت میں بھی کمی نہ ہوتی۔

م۔ یہ ساری تجویزیں دھری رہ گئیں۔ عین وقت پر تیز بخار آگیا۔ سارے منصوبے غارت ہوگئے۔ اور دل تڑپ کر رہ گیا۔

ا۔ مجاہدہ کا اجر مشاہدہ سے زائد ہے۔

م۔ انگریزی کے کام کو سردست روک کر پارۂ اوّل کو اردو میں لا رہا ہوں، اور اسے صاف بھی کرتا جا رہا ہوں۔ اب کوئی مانع نہ پیش آیا تو انشاءاللہ اسے آئندہ ہفتہ خدمت والا میں پیش کر دوں گا۔"

ا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ مگر دیکھنے کے متعلق مشورہ لیجئے۔ کل دیکھنے کی اور غائر نظر سے دیکھنے کی تو ہمت نہیں رہی، پھر کس صورت سے دیکھوں۔

م۔ تاریخ، جغرافیہ، اور کتب یہود و نصاریٰ وغیرہم کا مطالعہ کثرت سے کرنا پڑ رہا ہے۔ اور لکھنے سے کہیں زیادہ وقت پڑھنے ہی میں صرف ہو رہا ہے۔ یوم السبت کے سلسلہ میں مسخ ہو کے جس واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ہے، مفسرین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایلہ میں پیش آیا۔

---

[1] جو آج کل تھانہ بھون میں مع گھر بار کے مقیم تھے، اور اشرف السوانح کی تسوید و ترتیب میں مشغول۔

[2] حافظ جلیل احمد خاں شروانی علی گڈھی۔ جو مہاجر کی حیثیت سے یہیں آباد ہو گئے تھے۔

لیکن یہ نام موجودہ نقشہ میں کہیں نہیں ملتا۔ کئی دن اس میں حیرانی رہی۔ آخر توریت میں اس کا ذکر محض ضمناً ملا۔ وہاں مقام کا نام ایلات درج تھا۔ اب تلاش ایلات کی ہوئی۔ بالآخر پتا یہ چلا کہ اس کا نام بار بار بدل چکا ہے، اور جدید جغرافیہ میں اس کا نام عقبہ ہے، جو شام کے جنوب میں، اور عرب کے شمال و مغرب میں، لب ساحل بحر قلزم پر واقع ہے۔ اور وہاں کا سمندر خلیج عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ زمانہ کا بھی اجمالاً تعین ہو گیا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے وقت کا واقعہ ہے ———— یہ ایک مثال عرض کی گئی۔ دل چاہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ اقوام غیر کے جتنے بھی واقعات و عقائد قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، سب کی سندیں خود ہی ان کتابوں سے مہیا ہو جائیں۔ البتہ اس کے لئے بڑے وقت کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی فراہمی انبار کتب کے لئے بڑے سرمایہ کی۔

ا۔ اللہ تعالیٰ آسان فرمائے۔ مگر لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

م۔ حضرت دعا فرماتے ہیں۔

ا۔ دل و جان سے۔

م۔ سنا تھا پچھلے دنوں خود جناب والا کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تھی۔

ا۔ زیادہ تو نہ ہوئی تھی۔ نکسیر جاری ہو گئی تھی۔ کئی گھنٹے کے بعد رکی۔ ایک وقت سے ضعف بھی رہا۔ پھر وہی بیجیائی کی زندگی گذار رہا ہوں۔ اطمینان فرمائیں۔

م۔ خدا کرے اب بالکل صحیح ہو گئے ہوں۔ خیر و عافیت سے ضرور مطلع فرما دیں۔

ا۔ الحمد للہ بالکل خیریت سے ہوں۔"

بیچ بیچ میں جو لطیف و حکیمانہ ٹکڑے عقاید صحیحہ کے استحضار اور اخلاق کی اصلاح کے ساتھ ساتھ آتے گئے ہیں، اُن پر اگر توجہ دلائی جاتی رہے، تو کتاب کی ضخامت دگنی ہو کر رہے ———— لیکن اُن نکتوں اور چٹکلوں کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہی کیا۔ کتاب کے پڑھنے والوں میں کون سا ایسا بھی ہو گا، جس پر وہ از خود عیاں نہ ہوں۔

مراسلت اب عموماً تفسیر قرآن ہی پر رہا کرتی۔ لیکن کبھی کبھی خواب وغیرہ بھی موضوع مراسلت بن جاتے۔ خواب تنہا اپنے ہی نہیں، بیوی کے بھی، جنھیں شاید رویائے صالحہ سے کوئی خاص مناسبت بھی کم سے کم اس زمانہ میں تو تھی۔ ۳ر جون کا لمبا نیاز نامہ بیوی ہی کے لمبے اور بڑے ہی دل خوش کن خواب سے بھرا ہوا ہے۔ اصل خواب کا ان اوراق میں نقل کرنا تو کچھ زیادہ بامحل نہ ہوگا۔ البتہ حضرت کے جواب کو چھوڑتے نہیں بنتا، صرف وہی ملاحظہ ہو:۔

"تعبیر تفصیلی سے تو مجھ کو مناسبت نہیں، اجمالاً اتنا جی کو لگتا ہے کہ آپ کی خدمت قرآنیہ کی طرف خاص ارواح کو توجہ ہے۔ وہی ارواح خاص ان قالبوں کی صورت میں متمثل نظر آئیں۔ اور مستقل قیام کے معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ ابھی وہ توجہ مستمر رہے گی تکمیل خدمت تک واللہ اعلم۔"

اور میری اس حسرت کے جواب میں، کہ کاش اس خواب کا کوئی جزو بیداری میں بھی نصیب ہوتا! یہ ارشاد ہوا کہ

"انشاء اللہ تعالیٰ سب نصیب ہوگا اگرچہ بالمعنی سہی۔"

(۶۷)

اصلاً اب مستقل موضوع تفسیر قرآن ہی تھی۔ ۲۳ر جون کے نیاز نامہ میں تو سوا اس کے کوئی اور مضمون ہی نہیں ——— اور اس سلسلہ میں یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ادھر کے معروضات اور ادھر کے ارشادات تمام تر عام فہم اور عامۃ الناس کی دلچسپی ہی کے ہوں۔ کوئی حصہ آخر طالبان علم کے لئے بھی تو مخصوص رہنا چاہیئے۔ سورہ بقر (پ۲) آیت ۱۹۲ میں بہ سلسلۂ قتال ارشاد ہے فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ "اگر وہ لوگ باز آجائیں، تو اللہ بھی بڑا مغفرت کرنے والا ہے، بڑا مہربان ہے" سوال یہ ہے کہ کافر کس چیز سے باز آجائیں؟ قتال سے، یا اعتقاد کفریہ سے؟ سوال ایک معرکۃ الآرا سوال ہے۔ ذیل میں سوال اور بہت مفصل جواب دونوں ملاحظہ ہوں:۔

فَاِنِ انْتَهَوْا کی تفسیر میں نے تو آپ حضرات کی اتباع میں عن الکفر سے کی ہے۔ لیکن

ایک گروہ کا اصرار ہے کہ محض عن القتال سے کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم ملا ہی اس لئے تھا کہ ابتداء اُدھر سے کر دی گئی تھی، اب جب وہ لوگ خود ہی لڑنا بھڑنا ختم کرتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی رُک جانا چاہیئے۔

اس کے آگے وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ کی تفسیر میں یہ گروہ کہتا ہے کہ اس سے مقصود صرف اس قدر ہے کہ لوگوں کو اسلام لانے اور اس پر قائم رہنے کی آزادی حاصل ہو جائے، نہ یہ کہ ملک میں صرف اسلام ہی اسلام رہ جائے۔ اور یہ گروہ دلائل ذیل پیش کرتا ہے:۔

(۱) قرآن مجید کی دوسری آیات اسی مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مثلاً وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وغیرہ۔

(۲) تعامل نبوی بھی اسی کی تائید میں ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے حدیبیہ میں کافروں سے اُن ہی کے شرائط پر صلح کر لی فتح مکہ کے وقت اہل مکہ کو ان کے عقائد کفر کے باوجود معاف کر دیا، اور پھر آخر زمانۂ حیات نبوی تک مشرکین کے وفود آتے رہے۔ اور یہود و نصاریٰ تو عرب میں وفات شریف کیا، اُس کے بعد تک بھی باقی رہے۔

اگر جناب والا کے اوقات پر بار نہ پڑے تو گذارش ہے کہ مختصر اشارات سے رہنمائی فرمائی جائے۔"

رہنمائی فرمائی گئی۔ لیکن شاید میری عبارت پر نظر کر کے مختصر اشارات سے نہیں بلکہ مفصل و مدلل تصریحات سے اور گویا ایک پورا مقالہ ہی اس مبحث پر سپرد قلم فرما دیا گیا:۔

"الجواب۔ غالباً اس گروہ اہل اصرار کو ائمہ مجتہدین کا مذہب معلوم نہیں۔ اَنْتَہَوْا کی تفسیر میں عن الکفر دیکھ کر غلط سمجھ گئے کہ شاید اہل حق بدون اسلام کے ترک قتال کے قائل نہیں، حالانکہ ائمۂ اسلام کا یہ مذہب نہیں۔ وہ قتال کی غایت اور حد دو چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ ایک اسلام ایک استسلام یعنی انقیاد بقبول الجزیۃ۔ اور ان کا انتہوا کی تفسیر میں عن الکفر کہنا اس بناء پر نہیں کہ بدون اسلام کے ترک قتال نہ کریں گے کہ یہ تو اُن کے مذہب کے خلاف ہے جیسا ابھی گذرا۔ بلکہ اس بناء پر ہے کہ یہ آیات خاص ایک جماعت عرب کے باب میں ہیں جن سے معاہدہ

ترک قتال کا ہو گیا تھا۔ اور مسلمانوں کو اُن کی طرف سے نقض عہد کا اندیشہ تھا۔ تو خاص اُن کے حق میں فرماتے ہیں کہ معاندین سے تم خود تو ابتداء بہ قتال مت کرو لیکن اگر وہ نقض عہد کر کے ابتداء کریں تو قتال کی اجازت ہے لیکن اگر وہ کُفّار بعد نقض عہد وابتداء بہ قتال کے اسلام قبول کریں جس کے لوازم سے ہے ترک قتال۔ تو اللہ تعالیٰ اُن کو بخش دیں گے اور تم بھی قتال سے ترک جاؤ اور غفور رحیم کہنا اِس تفسیر کا مرجح ہے، کیونکہ محض انتہاء عن القتال موجب مغفرت نہیں۔ مگر اِس تفسیر کے اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ بدون انتہاء عن الکُفر کے قتال جاری رکھا جائے گا۔ مقصود یہ ہے کہ اس جگہ یہ تفسیر مناسب ہے۔ باقی اگر انتہاء عن الکُفر نہ ہوا، مگر انتہاء عن القتال ہو گیا تو اس تفسیر پہ بصورت اِس آیت میں مسکوت عنہ ہے۔ اِس کا حُکم اپنے موقع پر دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔ وہ یہ کہ انتہاء عن القتال اگر اسلام کے طور پہ ہوا ہے تو قتال سے رُک جائیں گے۔ اور اگر بقاء علی الکُفر و بقاء علی التمرد کے ساتھ ہوا ہے تو قتال کے جاری رکھنے کی اجازت ہے۔ اور اس کے بعد جو قتال کی غایت حتیٰ لا تکون فتنۃ فرمائی ہے چونکہ سبب نزول ان آیات کا خاص عرب تھے جیسا کہ روایات میں ہے۔ وہی مذکورۃ فی بیان القرآن۔ اِس لئے امام صاحب کے مذہب پر فتنہ کی تفسیر کُفر کے ساتھ صحیح ہے کیونکہ اُن کے نزدیک کُفّار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا، بلکہ اما الاسلام واما السیف۔ باقی مطلق کُفّار کے لئے امام صاحب حُکم نہیں فرماتے اور دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتنہ کی تفسیر قوت مقاتلہ ہے، جس کی نفی کی ایک صورت قبول جزیہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف ترک قتال کُفّار وجوب ترک قتال مُسلمین کے لئے کافی نہیں جیسا کہ اِس گروہ مفسرین کی رائے معلوم ہوتی ہے جو بہ وجہ مخالفت نصوص و مخالفت اجماع کے باطل ہے۔ اور اسی رائے باطل پہ یکون الدین للہ کی تفسیر کو متفرع کیا ہے جو بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ آزادی جس کو وہ بھی ضروری مانتے ہیں محض ترک قتال سے حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُن کی قوت زائل نہ کر دی جائے ورنہ ہر وقت اندیشہ لگا رہے گا اپنی قوت سے کام لینے کا اور سلب آزادی اہل اسلام کا۔ اور آیت ان جنحوا للسلم سے جو

شبہ کیا ہے، اگر یہ امر وجوب کے لئے ہے تو آیت منسوخ ہے، اور اگر منسوخ نہ کہا جائے تو اباحت کے لئے ہے اور مقیّد ہے رعایت مصلحت کے ساتھ اور تعامل سے جو استدلال کیا جاتا ہے امام صاحب کے مذہب پر تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ اُن کے نزدیک بدون توطن و استیلاء کے کفار کا جزیرۂ عرب میں داخل ہونا جائز ہے۔ اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ کی وصیت "اخراج الکفار عن جزیرۃ العرب" اِس تعامل کی ناسخ ہے۔ بہرحال اِس پر اجماع ہے کہ اہل اسلام کی قدرت اور مصلحت ہوتے ہوئے بدون اسلام یعنی قبول جزیہ کے کف عن القتال نہ واجب نہ جائز۔ تو اس گروہ کا مدعا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور اس گروہ کے نزدیک جب ائمۂ دین کی تحقیق کافی نہیں تو اُن کو اپنی تحقیق کے کافی ہونے کے دعویٰ کا کیا حق ہے۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ آیت فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ میں اگر انتہوا کی تفسیر عن الکفر کے ساتھ اِس بناء پر ہو کہ کف عن القتال موقوف ہے اسلام پر تو صحیح نہیں کیونکہ اسلام کے مثل قبول جزیہ بھی اسباب کف عن القتال سے ہے۔ اور اگر اس بناء پر ہے کہ اسلام بھی منجملہ اسباب عن القتال کے ہے تو سب ائمہ کے نزدیک صحیح ہے۔ اور اگر اس بناء پر ہے کہ گو علی الاطلاق کف عن القتال اسلام پر موقوف نہیں لیکن آیت جس جماعت کے باب میں ہے خاص اُن کے باب میں کف عن القتال موقوف ہے اُن کے اسلام پر تو صرف امام ابو حنیفہ کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک کفار عرب سے جزیہ قبول نہیں۔ یہ تو تفصیل ہے انتہوا کی تفسیر عن الکفر میں۔ اور اگر عن القتال کی جاوے تو اگر اس بناء پر ہے کہ صرف ترک قتال بدون قبول جزیہ پر کف عن القتال واجب ہوگا تو بوجہ مخالفت نصوص و اجماع صحیح نہیں اور اگر اس بناء پر ہے کہ ترک قتال بہ قید قبول جزیہ کف عن القتال واجب ہے تو صحیح ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جو مسائل نصوص و اجماع بسیط یا مرکب سے ثابت ہیں اُن کے محفوظ رہتے ہوئے دونوں تفسیروں کی گنجائش ہے اور اُن کی نفی میں کوئی تفسیر صحیح نہیں۔"

وقت کے اہم فتنوں میں سے ایک فتنہ یہ بھی بہت پھیلا ہوا ہے کہ مسلمان عورت شوہر کی

بدسلوکیوں سے تنگ آکر اُس سے مخلصی حاصل کرنا چاہتی ہے، اگر حکومت اپنی نہیں، خلع ہو کیسے۔ یہ سوچ کر وہ مرتد ہو جاتی ہے، اور اس طرح وہ اس کے نکاح سے از خود خارج ہو جاتی ہے۔ آزادی حاصل کر لینے کے بعد پھر وہ دوبارہ بیشک قبول اسلام کر سکتی ہے۔ لیکن یہ راہ جتنی خطرناک ہے، بالکل ظاہر ہے۔ ارتداد، کسی وجہ سے بھی ہو، ایک مسلمان کے لئے اس کا تصور ہی ہولناک ہے۔ اور پھر ارتداد کے بعد دوبارہ واپس آنے میں خدا معلوم کیسے کیسے مانع پیش آجائیں ———

مولانا کی نظر دین اور دینی ضروریات کے ایک ایک گوشہ پر رہتی تھی۔ ایک مستقل رسالہ بڑی تلاش و تفحص کے بعد خاص اس مبحث پر تصنیف فرما دیا، حالانکہ اب تصنیف و تالیف کے کام سے دست بردار ہو چکے تھے۔ ایسے موقع پر عورت ظالم یا ناقابل شوہر سے مخلصی کیونکر حاصل کرے، اس کے فقہی طریقے اس میں تفصیل سے درج کئے۔ رسالہ میرے پاس بھی ارسال ہوا اس فرمائش کے ساتھ کہ ممکن ہو تو اس پر تصدیقی دستخط علمائے ندوہ سے کرا دوں۔ افسوس ہے کہ یہ والا نامہ ضائع ہو گیا۔ ورنہ یہ چیز بھی دیکھنے کے قابل تھی کہ حضرت اپنے ایک نیاز مند سے اس قسم کی تحریک کن الفاظ میں کرتے ہیں۔

۲۸ رجون کا طویل نیاز نامہ شروع یوں ہوتا ہے:۔

م۔ کتاب الحیلۃ الناجزہ موصول ہو گئی۔ آج اپنے پاس اور رکھ کر کل انشاء اللہ اسے اپنے خط کے ساتھ لکھنؤ روانہ کر دوں گا۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ ھذہ العنایۃ۔

م۔ ندوہ میں دو صاحبوں کا شمار ممتاز علماء میں ہے۔ ایک صدر دار العلوم مولانا مفتی حیدر حسن خاں ٹونکی، دوسرے فقیہ اوّل مولانا محمد شبلی۔ یہ دونوں تو انشاء اللہ تصدیق کر ہی دیں گے۔ ممکن ہے اور مدرسین بھی دستخط کر دیں۔

ا۔ مگر کسی پر زور نہ دیا جائے۔ تصدیقات کا خیال صرف اطمینان عوام کے لئے ہے ورنہ اصل مقصود اس پر موقوف نہیں یعنی اطلاع احکام۔

م۔ البتہ آج کل مدرسہ میں تعطیل ہے، اور مدرسین اپنے وطن میں ہیں، اِس لئے تاخیر ناگزیر ہے۔

ا۔ اِس کا مضائقہ نہیں۔

م۔ ایسی خدمات اپنے لئے باعثِ فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور شکر گذار ہوں کہ بے تکلف اِس خدمت کے لئے مجھے ارشاد فرما دیا گیا۔

ا۔ اِس مبحث پر دُعائے خیر کرتا ہوں۔

م۔ کتاب سرسری نظر سے دیکھ گیا۔ مسائل پر رائے تو مجھ سا عامی کیا دے سکتا ہے لیکن اِس میں ذرا شبہ نہیں کہ کتاب وقت کی بڑی اہم ضرورت پر لکھی گئی، اور تلاش و تفحص کی جانفشانی کا تو کیا ہی کہنا۔ اللہ ہی آپ کو جزائے خیر دے کہ دینی ضروریات کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر آپ کی نظر رہتی ہے۔

ا۔ نظر پہنچنا تو خاص انعام خداوندی ہے، مگر کام کی تکمیل میرے بس سے باہر تھی۔ ایک جماعت نے مدد دی جن کا نام نامی اُس رسالہ میں متفرق جگہ متفرق عنوان سے مذکور ہے۔

(۶۸)

مراسلت کا اصل موضوع تو اب تفسیر و ترجمہ ہی رہتے تھے۔ خط کا باقی حصہ ان ہی کے متعلق ہے:

م۔ ترجمہ پارہ اوّل کا مسودہ اب کہیں صاف ہو کر ملا ہے، فوراً حاضر خدمت کر رہا ہوں۔

ا۔ بہت ہی حسین لکھا ہے۔ صورت دیکھ کر باقاعدہ دیکھنے کی طرف دل کو کشش ہوتی ہے۔

م۔ میری اصلی خوشی تو یہی تھی کہ اسے اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرما لیا جاتا۔

ا۔ یہ پارہ تو جس طرح بن پڑا حرفاً حرفاً ہی دیکھوں گا اِس کے بعد ہمّت نہیں۔

م۔ مجھے اطمینان جبھی ہوتا، اِس لئے کہ جن جن باریکیوں پر آپ کی نظر پہنچ جاتی ہے دوسرے حضرات کے خیال میں بھی وہ باتیں نہیں آتیں۔ بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری۔

ا۔ اِس خیال کا منشا تو محض محبت ہے جس میں زیادہ واقعیت لازم نہیں، لیکن خود محبت کی

برکت سے بعض اوقات کوئی چیز کام کی مل جاتی ہے ۔
م۔ لیکن جناب والا کی مشغولی اور کثرت کار کا بھی علم رکھتا ہوں، اس لئے اپنی اس گذارش پر اصرار ہرگز ہرگز نہیں ۔
ا۔ اس وقت اپنی تفسیر پر نظر ثانی کرا رہا ہوں جو قریب ختم ہے ۔ انشاء اللہ تعالیٰ آغاز ربیع الثانی سے اس کا سلسلہ شروع کروں گا ۔
م۔ بس جس قدر حصہ اور جتنے روز میں بھی بہ سہولت و بلا زحمت ممکن ہو اُسی کو کافی سمجھوں گا اور اس پر راضی ہو جاؤں گا ۔ سادہ کاغذ اظہار رائے عالی کے لئے الگ ملفوف ہے ۔
ا۔ یہ آپ کی رعایت ہے مگر میرے نزدیک اس کی ضرورت ضرور ہے کہ کوئی محقق اوّل سے آخر تک پورے قرآن کا ترجمہ دیکھے ۔ سرسری نظر سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی ۔
م۔ یہ بھی عرض کردوں کہ سردست اسے جناب والا ہی کے ملاحظہ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں ۔
ا۔ میں ابھی کسی کو ہوا بھی نہ لگاؤں گا ۔ جب کبھی آپ کی اجازت ہو گی دیکھا جاوے گا ۔
م۔ جو اُمور میرے پیش نظر رہے ہیں، انھیں بھی عرض کئے دیتا ہوں ۔
(۱) جہاں تک مسائل شرعی کا تعلق ہے، خواہ وہ عقائد ہوں یا اعمال و احکام، اپنے نزدیک میں نے تمامتر آپ ہی کا اتباع کیا ہے ۔ اور بیان القرآن کی ایک ایک سطر سے مقابلہ کرتا گیا ہوں ۔ بلکہ ترجمہ میں تو متعدد ٹکڑے لفظاً لفظاً آپ کے ہاں سے نقل کرلئے ہیں ۔ اس پر بھی اگر کہیں سہواً یا بلا قصد اس سے انحراف ہو گیا ہو، تو تنبیہ ہوتے ہی اُسے انشاء اللہ درست کردوں گا ۔ اور اپنے ترجمہ کو مسلک اہل سُنت کا ترجمان اسی اعتبار سے کہہ سکتا ہوں ۔
(۲) لُغت اور نحو میں بھی بالعموم اور اکثر آپ ہی کا اتباع کیا ہے ۔ کہیں کہیں حاشیہ شیخ الہندؒ یا دوسرے اکابر سے موافقت کی ہے، وہاں بھی آپ کے اختیار کردہ پہلو کو حاشیہ میں ظاہر کر دیا ہے، مثلاً لفظ " بقرہ" کے ترجمہ میں یا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا کی ترکیب میں ۔
ا۔ بہت مناسب مسلک ہے ۔ اس لئے میں اس پر زیادہ نظر نہ کروں گا کیونکہ آپ پر

اعتماد ہے۔

م۔ اپنے ذاتی مطالعہ پر بھروسہ صرف ایک چیز میں کرنا پڑا ہے، اور وہ اِس لئے کہ اس کے لئے کوئی دلیل راہ موجود نہیں یعنی تاریخ، جغرافیہ اور عقائد غیر کے مباحث میں۔ کتاب کو اصلاً یہود و نصاریٰ، ملاحدہ ہی کے سامنے جانا ہے، جب تک ان کے مسلمات سے استدلال نہ ہوگا کتاب بے اثر رہے گی۔

ا۔ بالکل صحیح ہے، ایسا ہی کرنا ضرور تھا۔ اب تفصیلی مطالعے کے وقت اِن التزامات کو پیش نظر رکھوں گا۔ کہیں شبہہ ہو گا صحیفہ اظہار رائے میں ظاہر کر دوں گا۔

م۔ منکرین کے صرف ایک اعتراض کا جواب مجھے اب تک نہیں ملا ہے۔ تلاش برابر جاری ہے۔ آجکل کے یہود یہ کہتے ہیں کہ ہم عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہی نہیں، یہ ہماری توحید پرستی پر اتہام ہے۔ اِس کا جواب مجھے اِن ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر نکالنا ہے۔

ا۔ خدا کرے نکل آئے۔ تفسیر حقانی خبر نہیں پیش نظر ہے یا نہیں۔ اِس میں ایسے امور سے بہ کثرت تعرض ہے۔ اگر کہیں نہ ملے تو سہل جواب یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کوئی جماعت ایسی رہی ہوگی جس کے خلاف کی کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں"

حضرت کا یہ جواب تو مجھے اُس وقت بھی دِل کو نہ لگا، اور اب بھی اِس کو ناکافی سمجھتا ہوں۔ اپنی تفسیر میں میں نے یہ عرض کر دیا ہے، کہ ابن اللہ کا مفہوم ولد اللہ سے الگ ہے، اور محاورۂ قرآنی میں ابنؔ ولد مرادف نہیں۔ ولد سے مُراد صُلبی بیٹا ہی ہوتا ہے، بہ خلاف اس کے ابنؔ عام ہے، ہر چہیتے ولاڈلے کو ابنؔ کہہ سکتے ہیں، جیسے قرآن کی اِس آیت میں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآءُهٗ یہاں ظاہر ہے کہ "ابناء" سے مُراد صُلبی بیٹے نہیں، بلکہ صرف چہیتے اور لاڈلے مُراد ہیں۔ مسیحیوں کا شرک دُوہرے قسم کا تھا۔ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا "ولد" اور "ابن" دونوں سمجھنے لگے تھے۔ یہود کا شرک وہاں تک نہیں پہنچا، وہ عُزیر کے ہر لفظ کو وحی الٰہی کا آخری لفظ قرار دینے لگے، اور توریت کی گمشدگی کے بعد جب حضرت عُزیر کے نوشتے اُنھیں ہاتھ آگئے، تو اب بعد کے کسی ہادی

ورسول کی ہدایت سے اپنے کو مستغنی سمجھنے لگے۔ اور یہی معنی ہیں اُن کے عُزیر کو ابن اللہ ماننے کے۔

۱۴ر جولائی کا نیازنامہ گویا اسی مکتوب بالا سے بالکل متصل ہے۔ اِس کے فوراً ہی بعد پڑھنے کے قابل ہے:۔

م۔ اِس ارشاد سے کہ پورے پارہ پر اوّل سے آخر تک نظر فرمالی جائے گی دِل باغ باغ ہوگیا۔ مجھے اتباع، اطاعت، تقلید وغیرہ کا دعویٰ تو خاک نہیں، لیکن اتنا بلا تصنع عرض کرتا ہوں کہ آپ کی تنقید و تغلیط تک دوسروں کی تائید و تصویب سے میرے دل کو کہیں عزیز تر اور میری نظر میں کہیں وقیع تر ہے۔

ا۔ یہ محبت ہے جیسا خلوف فم صائم عند اللّٰہ مسک اطیب ہے۔ اور جیسا ماں کو اپنے بچّہ کا پیشاب دوسروں کے گُلاب وکیوڑہ سے زیادہ محبوب ہے۔

م۔ جن ارشادات کے قبول کرنے میں اپنے میں شرح صدر نہیں پاتا، سچ عرض کرتا ہوں کہ اُن کے بھی سُننے اور پڑھنے میں لُطف اور نفع دونوں ہی حاصل کرتا ہوں۔

ا۔ بچّہ کی فرمائش گو پوری نہ کی جائے مگر پھر بھی فرمائش میں لذّت ہوتی ہے، اور یہ سب آثار اسی تمکّن محبت کے ہیں۔

م۔ واپسی میں عُجلت کے خیال سے جناب کے اوقات عزیز پر بار ہرگز کسی طرح کا نہ ڈالا جائے، جب کبھی بھی بہ اطمینان ہو، واپس فرمایا جائے۔

ا۔ انتظار تو اسی کا تھا مگر اس سے یاس تھا اِس لئے اِس کا پاس نہیں کیا۔

م۔ جناب نے تحریر فرمایا کہ سارے کلام مجید میں کسی محقق سے استفادہ کرو۔ یہ تو میں خدا سے چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کے سوا کوئی اور لاؤں کہاں سے؟

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

اِن تین چیزوں کی جامعیت جو آپ میں ہے، وہ کسی اور میں نہیں ملتی۔ یعنی ایک طرف تدین، دوسری طرف عمق نظر، تیسری طرف ضروریات وقت پر نظر۔ میرے بے تکلّف کرم فرما مولانا

مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ اِن دونوں پر جناب کے معیار سے محقق کا اطلاق غالباً صحیح نہ ہو۔ پھر آخر کن صاحب سے استفادہ کریں۔

ا۔ اگر یہ مقدمات تسلیم کر لئے جائیں تو اِس صورت میں دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو آپ جن بزرگ کو محقق سمجھیں ان کو منتخب فرمالیں گو وہ دوسروں کی رائے میں محقق نہ ہوں، کیونکہ ہر رائے کا قبول کرنا تو واجب نہیں۔ اور یا آپ یہاں قیام فرمائیں اور جو تردد ہو ساتھ ساتھ فیصل ہوتا رہے، تو بدوں خاص وقت صرف کئے ہوئے اِس خدمت کو بجالا سکتا ہوں۔

م۔ کسی قدر ذہن مولانا ..... صاحب کی طرف بھی جاتا ہے، گو اُن سے رسم برائے نام ہی ہے۔

ا۔ اِس کا تو تدارک سہل تھا مگر میں آپ کے لئے اُن کا ممنون ہونا طبعاً پسند نہیں کرتا۔ نیز اُن میں استقلال بھی نہیں۔

م۔ تفسیر حقانی[1] میں بیشک ایک حد تک میرے کام کی چیزیں مل جاتی ہیں، لیکن مجھے ضرورت اس سے بہت زاید کی ہے۔

ا۔ صحیح۔ مگر جو بھی مل جائے۔

م۔ موجودہ ملاحدہ نے معقولات و فلسفہ کا قدیم مورچہ تو بڑی حد تک چھوڑ دیا ہے۔ اب ان کا اصلی حملہ تاریخ وغیرہ علوم نقلی کے رُخ سے ہو رہا ہے۔ مثلاً کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ پر پہنچ کر جھٹ سے کہہ بیٹھتے ہیں کہ قدیم مذاہب میں تو روزہ فرض نہ تھا۔ اب اِس کے جواب میں ضرورت کسی عقلی بحث کی نہیں، بلکہ صرف اِس کی ہے کہ یہود، مجوس وغیرہ کی مذہبی کتابوں سے اِس کے حوالے نکال کر دکھا دیئے جائیں۔

ا۔ بیشک یہی چاہیئے۔ میری رائے میں اگر آپ صرف یہی کام اپنے ذمہ رکھیں کہ معترضین کا جواب اضافہ فرما دیں خواہ وہ عقلی اصول پر اعتراض ہو خواہ نقلی اصول پر۔ باقی میں احقر اور حضرت مولانا کا ترجمہ اور تفسیر بعینہٖ نقل فرما دیں خواہ زبان درست فرما دیں تو غالباً آپ کا کام بھی

---

[1] مطبوعہ دہلی۔ از مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی۔

آسان ہو جائے اور دیکھنے والے کا کام بھی۔ پھر آپ کے نقلِ مکانی کی بھی ضرورت نہیں اور آپ کو تعب بھی کم ہو گا۔

م۔ علیٰ ہذا واقعات فرعون کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ تاریخ مصر سے اِس کا ثبوت نہیں ملتا۔ صرف تاریخ اسرائیل میں ذکر ملتا ہے، وہ ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ ممکن ہے اسرائیلیوں نے اپنے دشمنوں کے بدنام کرنے کو یہ گڑھ لیا ہو۔ اب اِس کے لئے ضرورت ہے کہ مصر قدیم کی تاریخ پر گہری نظر ہو اور قدیم کتبات وغیرہ جو حال میں برآمد ہوئے ہیں، اُن سب سے واقفیت ہو۔

ا۔ اس کی بھی واقعی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ کام ایسا ہو گا کہ قیامت تک اُمّت آپ کی منت کش اور یہ کوشش آپ کے لئے جنّت کش ہو گی۔"

(۶۹)

پارۂ اوّل چند ہی روز میں واپس آ گیا۔ پُورا تو نہیں، البتہ اس کا ایک معقول و معتدبہ حصّہ مولانا کا دیکھا ہوا۔ اور جو سادہ کاغذ اس غرض سے بھیج دیا گیا تھا، اِس پر مفصّل تنقید لکھی ہوئی۔ تنقید کا کچھ حصّہ بجنسہٖ آگے آئے گا۔ ابھی اِس کے ساتھ کا والا نامہ ملاحظہ ہو۔ تاریخ اِس پر درج نہیں، اندازہ یہ کہ ۲۸ ار ۲۵ رجولائی کا ہو گا:۔

شعر ؎ زدستِ کوتہ خود زیرِ بارم — کہ از بالا بلنداں شرمسارم

جو خدمت آپ نے سپرد فرمائی تھی وہ پورے طور سے انجام نہ پا سکی۔ نیّت تو تھی پورا سیپارہ دیکھوں۔ مگر کام زیادہ تھا، لُغت کو دیکھنا، تفاسیر کو دیکھنا، غور و خوض کرنا اور قوی جواب دے رہے ہیں اس لئے بمشکل آدھا سیپارہ دیکھ سکا جس کی یادداشت ملفوف ہے۔ چونکہ طرز معلوم ہونے کے لئے یہ مقدار کافی تھی اِس لئے بھی زیادہ کا اہتمام نہیں کیا۔ خیال تو تھا ربیع الاوّل ختم ہونے کے بعد دیکھتا۔ مگر طبیعت پر تقاضا ہوا، دُوسرے کاموں کو مؤخر کر دیا۔ مفصّل رائے اِس یادداشت کے مفصّل مطالعہ سے ظاہر ہو گی۔ میرے نزدیک اگر یہی طرز رہا تو دیکھنے والے پر زیادہ تعب ہو گا جس کا شاید کوئی تحمّل نہ کر سکے، بعض کم فرصتی کے سبب بعض کم ہمّتی کے سبب۔

اور بدوں دیکھے ترجمہ لوگوں کے نزدیک بھی مستند نہ ہوگا اور فی نفسہٖ بھی اِس میں خدشات رہ جائیں گے۔ اِس لئے مشورۃً عرض کرتا ہوں کہ آپ ترجمہ تو صرف مولاناؒ کا اور احقر کا لیں، اور توضیح کے لئے احقر کے فوائد سے بڑھائیں۔ اب صرف ایک چیز رہ جاوے گی۔ وہ یہ کہ اگر توریت و انجیل کا کوئی مضمون مؤیّد ہوا بڑھا دیجئے، اگر کوئی خلاف ہو اُس سے تعرض کرکے تطبیق یا ترجیح قرآن کو دیجئے اور کوئی شبہ ملحدین کا یا عیسائیوں کا یا اہلِ سائنس کا ہو اس کو دفع کر دیجئے۔ اور صرف یہ حصّہ کسی کو دکھلا دیا جائے۔ کام بہت ہلکا ہو جائے گا آپ کو بھی اور دیکھنے والے کو بھی۔ آیندہ جیسی رائے ہو۔ باقی دُعا کرتا ہوں۔ والسلام ؎

اِس والا نامہ کے جواب میں ۱۹ رجولائی کو جو کچھ عرض کیا، وہ مع جوابات ملاحظہ ہو ———

درس تفسیر القرآن اب تحریراً تو گویا جاری ہی ہے :۔

م۔ دونوں والا نامے موصول ہوئے اور ترجمہ بھی واپس مل گیا۔ جو زحمت مطالعہ و تنقید میں برداشت فرمائی گئی، اللہ ہی اس کی جزائے خیر دے گا۔ میں تو صرف چند سطروں کے ملاحظہ فرما لینے پر قانع ہو گیا تھا، چہ جائیکہ آپ نے تو معتد بہ حصّہ فرما لیا۔

ا۔ اپنی قدرت میں جو خدمت ہو اُس کو عام مسلمانوں کا اپنے ذمہ حق سمجھتا ہوں چہ جائے خواص۔

م۔ ارشادات گرامی حسب توقع مبصّرانہ و ماہرانہ ہیں، مستفید ہوا۔ بیشتر حصّہ بسر و چشم قبول کئے لیتا ہوں۔ اور مناسب ترمیم بھی کئے دیتا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ البتہ صرف دو چار مقامات پر کچھ عرض کرنے کی بھی جرأت کرتا ہوں، سہولت کے لئے اُسی کاغذ پر حاشیہ دے کر۔

ا۔ میں نے بھی سادگی سے مکرر عرض کر دیا ہے۔ بس بے تکلفی سے دل خوش ہوتا ہے۔

م۔ اِس ارشادِ والا نے تو میری راہ میں بڑی آسانی پیدا کر دی کہ ترجمہ اور عام تفسیری حصّہ

ؔ مراد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ ہے۔

بیان القرآن اور ترجمۂ شیخ الہند ہی سے لیا جائے۔ ایک بڑی حد تک تو اس پر عمل شروع ہی سے تھا، اور جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہوں، خود بخود بیان القرآن کا سہارا زیادہ پکڑتا جاتا ہوں،
چنانچہ پارۂ اوّل سے کہیں زیادہ پارۂ دوم میں اس کا پابند رہا ہوں۔ اب ارشادِ گرامی کے بعد انشاء اللہ اور زیادہ اہتمام رکھوں گا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ رُشد و خیر کا القاء فرمائے۔

م۔ اس وقت پارۂ سوم زیرِ ترجمہ ہے۔ ایک طرف بیان القرآن برابر کھلی ہوئی رہتی ہے، اور دُوسری طرف انگریزی کے بعض تراجم۔ الفاظ عموماً ایک نومسلم انگریز کے ترجمہ سے لیتا ہوں[1]، اور مطالب تقریباً تمامتر بیان القرآن سے۔ کہیں بعینہٖ اور کہیں ملخصاً۔

ا۔ مَاشَاءَ اللہُ تَعَالیٰ جَزَاکُمُ اللہُ تَعَالیٰ کہ آپ مجھ کو بھی اجر میں شریک فرماتے ہیں۔

م۔ البتہ ایک اصولی سوال استفادۃً عرض کرتا ہوں۔ یہ تو صحیح ہے کہ ترجمۂ تفسیر اہلسنّت ہی کے مسلک پر ہونا چاہیئے۔ اس کا شروع سے پابند ہوں، اور انشاء اللہ آخر تک ہوں گا۔ لیکن خود اکابر اہلِ سنّت کے اندر بھی تو اچھے خاصے اختلافات موجود ہیں۔ ابن جریرؒ ایک ایک آیت کی تفسیر میں، بعض اوقات آٹھ آٹھ بالکل مختلف اقوال، سب صحابہ و تابعین ہی کے نقل کر دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے ترجموں میں، شیخ الہند اور جنابِ والا کے ترجموں میں باہم اچھا خاصہ اختلاف موجود ہے۔ ایسی صورت میں حصر و تعیین کے ساتھ کسی ایک ہی بزرگ کا اتباع کیونکر ممکن ہے؟ اور اس میں آخر کیا ضرر ہے، کہ مثلاً لفظ "کرسی" کے ترجمہ میں شاہ عبدالقادر کا لفظ چھوڑ کر شاہ ولی اللہ کا لفظ "بادشاہی" اختیار کر لیا جائے؟

ا۔ جیسا اختلاف نقل فرمایا ہے، یہ مضر نہیں۔ اس میں جس کا قول چاہے لے لیا جائے مگر ماخذ کی تصریح لازم ہے۔ مثلاً کرسی کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ صاحب کا قول لیا جائے تو ایسی

---

[1] مُراد مارما ڈیوک پکھتال مرحوم کے ترجمہ سے تھی۔ آگے چل کر یہ قید باقی نہ رہی۔

عبارت بین القوسین بڑھا دی جائے (کذا قال الشاہ ولی اللہؒ) کیونکہ ناظرین کو ماخذ ہر وقت محفوظ نہ رہنے سے بعض اوقات شبہ تفرد یا اختراع کا ہوتا ہے۔ اختلاف وہ مضر ہے جس کا اثر اعتقاید پر پڑتا ہو۔ سو اول تو اہل حق میں ایسا اختلاف نہیں۔ اور اگر کسی سے لغزش ہو گئی ہو تو جمہور کا قول معتبر ہوگا اور تفرد کے قول کو ماول کہیں گے یا باطل کہیں گے۔

م۔ یا کم از کم حاشیہ ہی پر ضمناً اس کا ذکر کر دیا جائے۔ کیا بس اتنی احتیاط کافی نہیں کہ معانی اپنے دل سے گڑھ کر نہ لکھے جائیں اور اقوال کسی ایسے ویسے غیر ثقہ کے نقل کر دیئے جائیں۔

ا۔ بالکل کافی ہے۔ مگر ایسے مقام پر ماخذ کا حاشیہ میں ذکر کر دینا کافی ہے۔

م۔ قدیم مفسرین کا تو بالعموم طرز یہ ہے کہ مختلف بلکہ متضاد اقوال نقل کر دیتے ہیں، اور کبھی محض نقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں، ترجیح بھی نہیں دیتے۔ بہ ظاہر تو یہی طریقہ دیانت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ اُسی تفصیل کے ساتھ جواُوپر عرض کی گئی۔

م۔ آپ کی شفقت و کرم نے ہر طرح کے سوالات میں دلیر و بیباک بنا رکھا ہے۔

ا۔ مجھ کو تو حظ ہوتا ہے۔ اور بدوں اتنی بیباکی کے بحث کی بیباقی نہیں ہوتی۔

م۔ اس لئے ایسی باتیں بے محابا پُوچھ ڈالتا ہوں، اور جواب سے ہمیشہ نئی نئی بصیرتیں حاصل کرتا ہوں۔

ا۔ خود مجھ کو ضروری باتوں کی طرف متوجہ ہونے سے نفع ہوتا ہے جس کے باعث آپ ہوتے ہیں۔"

زبان کی اجنبیت اور محاورہ کی مغائرت عجب عجب مغالطے پیدا کر دیتی ہے، جو کبھی افسوس ناک ہوتے ہیں اور کبھی مضحک۔ لیکن بہر حال ترجمہ در ترجمہ سے مغالطے پیدا ہونا ناگزیر ہی ہیں میرا اصل ترجمہ ظاہر ہے کہ عربی سے انگریزی میں تھا، اب انگریزی سے جب اُسے اُردو میں منتقل کیا تو غلطی ہوئی کہ ترجمہ ہی کیا، عربی کے مطالب کو مستقلاً اُردو میں نہ لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

حاشیہ انگریزی لفظ پر تھے، وہ بھی اُردو لفظ سے متعلق سمجھ لئے گئے۔ اپنی اِس غلطی کا احساس اُس وقت ہوا، جب مولانا کی تنقید پڑھ لی۔ اگر براہ راست عربی سے اُردو میں مطالب لے لئے گئے ہوتے، تو متعدد مقامات پر مولانا کے ایرادات اُن عبارتوں پر واقع ہی نہ ہوتے ———— مولانا کی اصلاحوں کا بیشتر حصّہ تو ہم نے قبول ہی کر لیا، اور اُن کے مطابق ترمیم بھی کر دی۔ البتہ چار پانچ مقامات پر مزید گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں پیش کر دیا، اور مولانا کے ہاں سے اُن کا جواب بھی آیا۔ یہ سارے سوال جواب اگلے نمبر میں آ رہے ہیں۔ باقی حصّے حضرت کی تنقید کے نئے چھوڑ دیئے گئے۔

حضرت کی زبان سے یہ دو کلمے بڑے ہی کام کے نکلے، جو ابھی اُوپر درج ہو چکے ہیں یعنی یہ کہ نفس اختلاف مضر نہیں، مضر صرف وہ اختلاف ہے جس کا اثر عقائد پر پڑتا ہے ———— قدیم طرز کے عُلماء جن کے ہاں بالعموم تحقیق کے معنی صرف تقلید سلف کے ہیں، اور جو سمجھتے ہیں کہ حق مخصر و محصور ہو کر رہ گیا ہے صرف اقوال متقدمین کے اندر، وہ اگر متاخرین کو اتنی بھی آزادی دیدیں تو بہت غنیمت ہے ———— کیا مصیبت ہے! "وسعت نظر" جب آتی ہے تبدیلی کے مرادف ہو کر، اور احتیاط کا عزم جب پیدا ہوتا ہے، جمود و تنگ نظری کا جامہ پہن کر! کوئی صاحب کیسے ہی بڑے سے فاضل محقق اور امام عصر سہی، بہرحال یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مطالب قرآن سے متعلق آخری حرف صرف اُن ہی کے دماغ سے نکل سکیں۔ اور اُن کے بعد کے آنے والے محض اِس جُرم میں کہ وہ اُن سے متاخر ہیں، قرآن پر لکھنے لکھانے کے حق سے محروم کر دیئے جائیں۔

(۷۰)

اصل حاشیہ۔ ربّ العلمین۔ لفظ رب کا بھی صحیح ترجمہ مُشکل ہی ہے۔

۱۔ کیا لفظ مربّی اس کے مفہوم کے ادا کرنے کے لئے کافی نہیں؟

م۔ حاشیہ اُردو لفظ پر نہیں، انگریزی لفظ "لارڈ" پر تھا، جس کا مفہوم رب کے مقابلہ میں بہت تنگ اور پست ہے۔

ا۔ تو لفظ ترجمہ کے ساتھ انگریزی بھی بڑھا دیا جائے۔

اصل حاشیہ۔ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ۔ یہ سزائے دردناک اُن کے نفاق پر ہوگی، نہ کہ مطلقاً کفر یا تکذیب رسول پر، جیسا کہ ایک مشہور انگریز مترجم نے سمجھا ہے۔

اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ کفر یا تکذیب رسول پر سزائے دردناک کا استحقاق نہیں۔ حالانکہ بہت آیتوں میں مطلق کفر و تکذیب رسول پر وعیدیں وارد ہیں۔ اور اجماعی مسئلہ ہے کہ ایسی سزا اتفاق کے ساتھ مخصوص نہیں۔ معلوم نہیں اُس انگریز نے کیا اعتراض کیا ہے، اور یہ اس کا جواب کس طرح ہوا۔

م۔ تکذیب رسول پر سزائے دردناک کا ہونا تو ایک کھلا ہوا مسلم مسئلہ ہے۔ اِس میں مجھے کیا اشتباہ ہو سکتا تھا۔ انگریز مترجم نے يَكْذِبُونَ کو يُكَذِّبُونَ پڑھ کر آیت کا ترجمہ یہ کیا تھا کہ "سزائے دردناک اِس پر ہے کہ وہ رسول کو جھٹلاتے تھے"۔ میں نے حاشیہ میں خاص اِس آیت کے اِس مفہوم کی تردید کی تھی۔ اب انشاء اللہ مزید توضیح کر دوں گا۔

ا۔ بدون توضیح کے دیکھا جائے تو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ غالباً اِس عنوان سے لکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک انگریز مترجم نے اِس کو يُكَذِّبُونَ باب تفعیل سے پڑھا جو بالکل غلط،

اصل حاشیہ۔ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ...... بعض کا قول ہے کہ یہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا۔ صوری نہ تھا۔

ا۔ اِس قول کو تمام اہل حق نے غلط کہا ہے، کیونکہ بناء اس کی انکار خوارق ہے بس یا تو اِس قول کو حذف کیا جائے اور یا اس کا غیر مقبول ہونا ظاہر کیا جائے۔

م۔ یہ قول تو حضرت مجاہدؒ کا ہے، اور اُن کا شمار، آپ ہی حضرات سے سنا ہے کہ ممتاز مفسر تابعین میں ہے۔ اور اس قول کو ابن جریر طبری سے لے کر حافظ ابن کثیر بلکہ قاضی شوکانی تک اکثر ثقات نے نقل کیا ہے۔ اب انشاء اللہ یہ بڑھا دوں گا کہ یہ قول غیر مقبول و غیر معتمد و خلاف جمہور ہے۔

ا۔ کافی ہے[ف]

اصل حاشیہ۔ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ ۔۔۔۔۔۔ بہ قول بعض صوفیہ و محدثین ایک مدت طویل کے بعد بالآخر اہل جہنم کو بھی نجات ہو جائے گی۔ اور جہنم کو فنا کر دیا جائے گا۔

ا۔ یہ قول کس مستند صوفی یا محدث کا ہے۔ البتہ بعض اہل باطل فنائے نار کے قائل ہیں۔ پھر خلود کے معنی مطلق پڑے رہنے کے نہیں ہیں۔

اصل حاشیہ۔ خلود کی تعبیر غیر منقطع مدت اور ہمیشگی سے حسب مسلک جمہور ہے۔

ا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کے خلاف جس نے کہا ہے وہ اختلاف بھی معتد بہ ہے۔

م۔ بعض محدثین سے میری مراد حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ سے تھی۔ ابن قیمؒ کی کتاب شفاء العلیل (مطبوعہ مصر) دار المصنفین اعظم گڑھ میں عرصہ ہوا میری نظر سے گذری تھی۔ اس میں حافظ نے کتاب، سنت و آثار سے کوئی ۲۵ دلیلیں فنائے جہنم پر قائم کی ہیں۔ اور زور و شور سے دعویٰ کیا ہے کہ گنہگار جوں جوں پاک و صاف ہوتے جائیں گے، نکل نکل کر جنت میں آتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جہنم فنا ہو جائے گی۔ کتاب میرے پاس موجود نہیں۔ ارشاد ہو تو اعظم گڑھ سے منگا کر حاضر خدمت کر دوں۔ اس میں ابن تیمیہ کا بھی یہی مسلک درج تھا۔

ا۔ کتاب بھیجنے کی ضرورت نہیں البتہ وہ عبارت مع سباق و سباق اس عبارت کے جس میں ان بزرگوں نے اس کو اپنا مسلک بتایا ہے اگر نقل ہو کر آجائے تو میں نقل کی اجرت حاضر کر دونگا اور اگر کتاب کا زیادہ محصول نہ ہو اور مجھ سے قبل کر لیا جائے تو وہ کتاب بھی بھجوا دیجئے پھر میں اس کے درج کرنے نہ کرنے اور اس کی صورت و طریق کے متعلق عرض کر دوں گا۔

بعد تحریر سطور ہذا اسی پر رائے قائم ہوئی کہ وہ کتاب ہر حالت میں بھجوا دیجئے اگرچہ کتنا ہی محصول ہو میں ادا کر دوں گا۔

ف حضرت کے اس جواب کو اب پڑھتا ہوں تو ذرا حیرت سی ہوتی ہے۔ یہ قول ایسا ہی غیر مقبول و غیر معتد بہ تھا تو ان سب حضرات کو آخر اس کے نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی، اور پھر نقل بھی بلا تردید و تغلیط؟

م۔ صوفیہ میں یہ مسلک شیخ محی الدین ابن العربی کا مختلف کتابوں میں منقول دیکھا۔ اور سب سے زیادہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی زبان سے سُنا۔ مولانا سے گھنٹوں اس موضوع پر مذاکرہ رہا ہے۔ وہ شیخ ہی کے اتباع میں اپنا یہ مسلک بیان کرتے ہیں کہ جن کے لئے خلودِ نار کا حُکم ہے وہ بھی بالآخر جہنّم میں رہتے رہتے اُسی میں راحت محسوس کرنے لگیں گے۔

ا۔ اِس جزو کی تو کوئی دلیل ہی نہیں، اگر مولانا کے علم میں ہو تو مجھ کو بھی مُستفید فرمائیں۔

م۔ اِس کے علاوہ تفسیر ابن جریر (سورہ ہُود، زیر آیت اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ) میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے، لیاتین علی جھنم زمان تخفق ابوابھا لیس فیھا احد (ذلك بعد ما یلبثون فیھا احقابا) ابن جریر وابن کثیر وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو العاصؓ وغیرہ صحابہ، نیز ابن زید، شعبی، وغیرہ تابعین کے اقوال اسی کی تائید میں نظر سے گذرے ہیں۔

خَالِدِیْنَ فِیْھَا میں خلود کے معنی یہ گروہ صرف دوام عرفی یا مکث طویل کے لیتا ہے، اور ابداً کی بھی تاویل کر لیتا ہے، میں حق پر اس مسلک کو نہیں بلکہ اسی مسلک جمہور ہی کو سمجھتا ہوں، لیکن اگر حاشیہ پر ضمناً ایک مذہب یہ بھی درج ہو جائے کہ بعض اہلِ حق ادھر بھی گئے ہیں، تو اس کا ضرر مجھ پر واضح نہیں۔

ا۔ کیا ان بزرگوں تک سند پہنچانے کی ضرورت نہیں[1]۔ ضرور ہے۔ تو اسماء الرجال کو دیکھئے۔ شاید ایک روایت بھی ثابت نہ ہو[2] پھر ظاہر قرآن کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے[3]۔ بیان القرآن سورۂ ہود بھی مُلاحظہ فرمائی جائے۔

اطلاع۔ (لفافہ پر) خط بند کرنے کے بعد یاذبین کے متعلق خیال ہوا کہ شاید کسی کی قرأت

---

[1] لیکن یہی سوال تو ابن جریر، ابن کثیر اور دوسرے مفسرین سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ (م)

[2] محدثین کے معیار پر کتنی تفسیری روایتیں پوری اُتریں گی۔ (م)

[3] ظاہر قرآن کو چھوڑا تو ان لوگوں نے بھی نہیں، البتہ اس کی ایک نوع تاویل کر لی۔ (م)

تفصیل سے ہو۔ کتب قرأت میں دیکھنے سے ثابت ہوا کہ ابن کثیر و نافع و ابن عامر و ابی عمرو کی قرأت ہے۔ اب اُس حاشیہ کو بالکل کاٹ دیا جائے۔ نیز جہاں میں نے دوسرے مفسرین کے قول کے لینے کی اجازت دی ہے یہ شرط بھی بڑھا دی جائے کہ قرأت میں خلط نہ ہو اور احکام فقہیہ میں تلفیق نہ ہو۔ اِس سے شرائط مکمل ہو جائیں گی۔ اگر مثالوں کی ضرورت ہو بے تکلف فرمایش کر دیجئے پیش کر دوں گا تلفیق کی بھی اور اختلافِ قرأت سے خلط کی بھی۔

حضرت کے بعض ارشادات پر جرح و جواب دِل میں پیدا ہو رہی ہے، لیکن اُس وقت ذہن میں بجائے کسی جرح کے اُلٹے شکر گذاری ہی کے جذبات موجزن ہوئے۔ اور عریضہ تمام تر شکریہ ہی کا لکھا۔ خط کی تاریخ ۲۸ رجولائی ہے:۔

م: والا نامہ مل گیا۔ دِل بہت بہت شکر گذار رہا۔

ا۔ اور میں آپ کی شکر گذاری کا شکر گذار ہوں کیونکہ آپ ایسے شخص کے شکر گذار ہوئے جو قابلِ شکر گذاری نہیں، کیونکہ میں نے ایسا کام ہی کون کیا۔

م۔ آپ تو اِس قدر سہولت پیدا کر دیتے ہیں اور دوسروں کے نُقطۂ نظر کا لحاظ کرکے ایسی رعایتیں اُن کے مصالح کی کر دیتے ہیں کہ تجربہ کئے بغیر اس کا یقین آنا مُشکل ہے۔ لوگ آپ کو "سخت" مشہور کئے ہوئے ہیں۔

ا۔ وہ بھی جھوٹے نہیں، مُنکر نکیر میں بھی اختلاف ہے کہ نرم ہیں یا سخت۔ اور دونوں روایتیں سچی۔ باقی سہولت پسندی یہ میرا امر فطری ہے۔ اگر سبب اِس کا سلامت فطرت ہوتا تو عین اتباعِ سُنّت تھا۔ کما فی جمع الفوائد عن مالک والشیخین وابی داؤد عن عائشۃ رض ما خیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین قط الّا اخذ ایسرھما ما لم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منہ الحدیث لیکن مجھ کو اپنے متعلق یہ شُبہ ہے کہ شاید اس کا سبب کم ہمتی ہے، مشقت کا تحمل نہیں، اس لئے یہ قاعدہ المرء یقیس علیٰ نفسہٖ دوسروں کے لئے بھی غیر شاق کو تجویز کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے یہ مبدل ہو جائے اتباعِ سُنّت کے ساتھ۔

م۔ میں کہتا ہوں یہ اُلٹی بات ہے۔ آپ کی نرمی، میانہ روی اور رعایت شعاری کی نظیر تو طبقۂ علماء میں ڈھونڈے سے بھی مشکل سے ملے گی سختی جو کچھ ہے وہ مخصوص حالات میں اور مخصوص اشخاص کے لئے ہے۔

ا۔ میں تو قابل مدح کے نہیں مگر آپ کی ہر رائے سے فرحت ہوتی ہے۔

م۔ شفاء العلیل کے لئے میں نے اعظم گڈھ خط لکھ دیا ہے۔ انشاء اللہ براہ راست وہیں پہونچے گی۔ غالباً حادی الارواح بھی پہونچے۔ وہ بھی ابن قیم ہی کی ہے، اور اعلام الموقعین کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔ عدم ابدیت جہنم کی بحث اس میں بھی ہے۔

ا۔ بیحد اشتیاق ہے۔ خدا کرے دونوں کتابیں آجائیں، محصول دونوں کا میں دیدوں گا۔ وہ حضرات اگر قبول فرمالیں میں ممنون ہوں گا۔"

(۷۱)

۵ راگست کا عریضہ خاصہ طویل ہے، اور دلچسپیوں کا ایک کشکول۔ ۴۰ برس کے بعد آج بھی پڑھنے میں ایک نیا لطف آیا:۔

م "کتابیں اعظم گڈھ سے بھجوانے میں دقت معلوم ہوئی، اس لئے ندوہ سے وہ کتابیں بھجوادی ہیں۔ مہتمم کتب خانہ کا خط تو میرے پاس آیا، لیکن بجائے میرے نام کے خط کے جناب کے نام والا خط میرے لفافہ میں رکھ گئے۔ بہرحال اس سے یہ پتہ نہ چلا کہ پارسل ریل سے گیا یا ڈاک سے۔

ا۔ ابھی ڈاک سے خط ملا جس میں بلٹی بھی ہے مگر خط تو آپ کے نام کا اور بلٹی سہارنپور اسٹیشن کی۔ اس وقت سہارنپور بلٹی بھیجی ہے۔ دیکھئے کتاب کب دیکھنا ملے۔ معلوم ہوا کہ مُلّا نے صرف ہم ہی بدانتظام نہیں، ندوہ کے حضرات بھی اس دولت سے مشرف ہیں۔ خیر ہماری تو خوشی کی بات ہے۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔

م۔ محصول آمد و رفت سے متعلق عرض ہے کہ یہ کام نہ جناب کا ذاتی ہے نہ ندوہ کا۔ صلاً میرا کام ہے۔ اس لئے یہ خدمت بھی میرے ہی ذمہ رہنے گی۔ ندوہ والوں کو تو لکھ دیا ہے، اب

جناب سے بھی عرض کئے دیتا ہوں۔

ا۔ میں استخارہ کرتا ہوں۔ اگر میری تائید میں آ گیا امید ہے کہ آپ بھی اس کو قبول فرمالیں گے۔
اب استفسار کرتا ہوں کہ فارغ ہو جانے کے بعد کتابیں آپ کی خدمت میں واپس کر دوں پھر آپ کسی کے ہاتھ لکھنؤ بھیج دیں گے کیونکہ ڈاک کا صرف مکرر بیکار ہے۔ یا لکھنؤ بھیج دوں تو کس پتہ سے۔

م۔ خیر اصل مسئلہ کی تحقیق تو ہوتی رہے گی، البتہ بعد غور میں نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ ان فقروں کو اپنے حاشیہ سے نکال ہی دوں۔ جب میرا خود بھی وہ عقیدہ نہیں، اور آپ جیسے بزرگ کو بھی پسند خاطر نہیں، تو خواہ مخواہ ایسے ایسے اُلجھاوے میں پڑوں کیوں۔ اور پھر اختلافی اقوال تو صدہا مسائل میں نکلیں گے، سب کو بلا ضرورت کہاں تک نقل کرتا رہوں گا، پڑھنے والوں کے خیالات میں انتشار الگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ا۔ بیحد مسرت ہوئی، واقعی اُمت کی خیر خواہی اس کو کہتے ہیں۔

م۔ ایک اپنا ذاتی تجربہ بھی اسی لپیٹ میں آج عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے جب کبھی کسی مسئلہ پر ٹوکا ہے تو، یا یہ ہوا ہے کہ اُس وقت مجھے اپنی ہی رائے صائب معلوم ہوئی لیکن کچھ روز بعد عموماً اُس رائے سے ہٹ ہی گیا ہوں، اور آپ ہی کی فرمائی ہوئی بات دل میں اُتر کر رہی۔ کوئی ایک آدھ مثال ہو، تو اُسے اتفاق پر محمول کروں لیکن جب کثرت سے یہی تجربہ ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا نام رکھوں۔

ا۔ میرے نزدیک تو اتفاق۔ اتفاق کثرت سے بھی ہو سکتا ہے عقلی مسئلہ ہے، بہت حکماء اس کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک اس کا نام تناسب طبائع ہے جس کی تائید الارواح جنود مجندۃ سے ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ کوئی صاحب غلو یا صاحب علو یہ رائے قائم کریں کہ محبت کی وجہ سے مجھ کو موافقت کی خواہش ہوتی ہے، آپ کے قلب پر اثر ہو جاتا ہے، اب ہر شخص کو ایک رائے قائم کرنے کا اختیار ہے۔"

طویل خط کا باقی حصہ پڑھنے سے قبل ایک چھوٹی سی تمہید ضروری ہے۔ النجم ہفتہ وار لکھنؤ سے نکل رہا ہے، اور ردِّ شیعہ میں خاص شہرت حاصل کئے ہوئے ہے۔ ۳ راگست کی اشاعت میں ایک لمبا مضمون مسئلہ متعہ پر شایع ہوا۔ حیدرآباد سے کسی صاحب نے حرمتِ متعہ کے خلاف چند شبہات لکھ کر بھیجے، اور اسی سلسلہ میں مسلم و بخاری کی بھی بعض حدیثوں سے جواز متعہ پر استدلال کیا۔ النجم نے اپنے جوابی مقالہ میں جہاں اور پہلو اختیار کئے، وہاں ان احادیث کے بعض راویوں کو بھی خوب مجروح کر ڈالا۔ یہ شئے مجھے بہت گراں گذری۔ اب آگے اصل ملاحظہ ہو:۔

مدیر النجم کا ایک تازہ مضمون ملفوف ہے۔ نفس مسئلہ میں مجھے کلام نہیں، متعہ کو میں بھی مطلقاً ناجائز تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن مضمون میں جہاں بخاری و مسلم کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے، اس سے دل کو تکلیف ہوئی۔ اگر صحیحین کے رجال بھی مطرود و مردود قرار پا جائیں گے، تو پھر حدیث میں ہمارے پاس رہ ہی کیا جائے گا، یہ تو منکرین حدیث کے ہاتھ میں ایک بڑا حربہ دے دینا ہوا۔ یحییٰ بن معین ہوں یا حافظ ذہبی، کس کے ذوق کو امام بخاری کے ذوق کے مقابل لایا جائے؟ میں تو جس طرح فقہ میں سب سے بڑی حجّت یہی سمجھتا ہوں کہ فلاں قول امام ابو حنیفہ کا ہے، اسی طرح حدیث کی بھی سب سے بڑی سند یہی خیال کرتا ہوں کہ امام بخاری کے ذوق نے اُسے قبول کر لیا۔ اسماءالرجال کے ائمہ کیا کوئی صاحبِ وحی تھے؟ لے دے کے بس وہی مہارتِ فن۔ تو مہارتِ فن میں امام بخاری کو کس سے کمتر سمجھا جائے۔

ا۔ سب ٹھیک ہے۔ دوسرے، جارحین تو رواۃ کا حال بیان کر رہے ہیں، اُن کی روایت کا تو حال بیان نہیں کرتے۔ اگر ان کی کوئی روایت کثرت طرق سے یا تلقی اُمت سے قوی ہو جائے تو اس کا تو ان کو انکار نہیں۔ چنانچہ یہ روایت ایسی ہی ہے۔ چنانچہ کثرت طرق ظاہر ہے۔ اور تلقی اُمت بھی ظاہر ہے۔ کیونکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ پہلے حلال تھا۔ اس کا انکار اکابر اُمت کی تجہیل اور تقلیل ہے اور بلا ضرورت۔ کیونکہ جب دلائل حرمت مؤیدہ کے موجود ہیں تو نسخ سے مدعا حاصل ہے۔

ان ہی تشددات کے سبب میں نے اُس رسالہ کو یہاں بھیجنے سے روک دیا ہے۔ ان حضرات کی نظر ایک پہلو پر چلی جاتی ہے، دوسرے پہلو نظر سے غائب کر دیئے جاتے ہیں۔"

حضرت کی تصدیق و تصویب سے تو یُوں بھی ہر دینی مسئلہ میں خوشی ہوا کرتی تھی۔ اِس خاص مسئلہ میں اتّفاق رائے حاصل ہو جانے سے بہت زیادہ اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔

بیان القرآن اب جو دیدہ ریزی سے دیکھنی شروع کی، تو چھوٹی چھوٹی بہت سی چیزیں اِس میں نظرثانی کی محتاج نظر آئیں۔ بے تکلف سب مولانا کی خدمت میں عرض کرنے لگا پہلی قسط اِسی خط سے شروع ہو گئی:۔

م۔ بیان القرآن جلد اوّل، ص۱۶۱ س ۱۔ اِلیٰ اجلہٖ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔ یہ سہواً رہ گیا، یا اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

ا۔ چھوٹا ہو یا بڑا ہو جو اپنی میعاد تک مقرر ہے الخ اِس میں کئی بار کانٹ چھانٹ اِس لئے ہوئی کہ ترجمہ ترکیب کے موافق نہ بنتا تھا مختلف تراجم دیکھے سب میں یہی کمی تھی۔ ڈپٹی صاحب[1] کا ترجمہ البتہ اس سے منزہ تھا مگر وہ ترجمہ ہی نہ رہا تھا، صرف حاصل رہ گیا تھا۔ کئی بار کے بعد ترجمۂ موجودہ پر رائے قرار پائی۔

م۔ صفحہ ۵۱ پر مِنْ رَّبِّکُمْ کا ترجمہ بھی مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اِس امر کو کہ تم کو تمھارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری۔ الخ

اطلاع۔ آج کل مولوی شبّیر علی بیان القرآن کی کاپی لکھوا رہے ہیں۔ اِن دونوں مقاموں کو کاپی میں بنانے کو کہہ دیا ہے۔ یادداشت لکھوادی ہے۔

م۔ ص ۴۲۔ ۴۳ پر آیۂ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ عَلَیْنَا کی تفسیر" بہ واسطہ حضرت موسیٰ و توارۃ" سے کی گئی ہے۔ میری فہم ناقص میں یہ آتا ہے کہ اگر اس میں ذرا اور توسع سے کام لے کر "بہ واسطہ انبیائے بنی اسرائیل و صحف بنی اسرائیل کر دیا جائے، تو تاریخ پورے

---

[1] یعنی شمس العلماء مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی۔

زیادہ مطابقت پیدا ہو جائے۔

۱۔ مگر اس میں ایک خلجان رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا یہود کا قول ہے تو مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا سے وہی مراد ہو سکتا ہے جس پر ایمان لانے کے وہ مدّعی تھے۔ اور انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، اور وہ اُن کی کتاب کا انکار کرتے تھے تو اِس عموم کو اُن کی طرف منسُوب کرنا معارض ہو گا۔"

۵ راگست کا عریضہ اب جا کر ختم ہوا ـــــ بیان القرآن کے متعلّق عرض معروض کرنے کا سلسلہ جو اس عریضہ سے شروع ہوا، خیال بھی نہ تھا کہ یہ بہت زیادہ پھیلتا جائیگا، اور مہینوں کیا معنی برسوں تک جاری رہے گا ـــــ اللہ بالکل اِس پر قادر ہے کہ جس چھوٹے سے چھوٹے بندہ سے چاہے، کوئی کام چھوٹا یا بڑا لے لے۔

(۴۲)

مولانا تو انتظام مجسّم تھے۔ زندگی کے ہر ہر جزئیہ میں دوسروں کی بھی راحت و انتظام کی فکر و اہتمام رکھتے، اور اپنے لئے بھی راحت و انتظام کے متوقع رہتے۔ ندوہ سے کتابوں کے پارسل کے جانے میں، جو بدانتظامی ہوئی، قُدرۃً خیال ہوا کہ حضرت کو اس سے اچھی خاصی اذیت ہوئی ہوگی۔ اور اس سے اپنے کو بڑی ندامت محسوس ہوئی ـــــ جوابی کارڈ میں اپنی اِس ندامت کا اظہار کر دیا اور یہ ندامت تو خیر تھی ہی، بڑی فکر اس کی لگی ہوئی تھی کہ ابن قیّم وغیرہ کے جو حوالے اپنی پچھلی تحریروں میں عدم خلودِ نار کے متعلّق لکھ کر بھیجے تھے، دیکھا چاہیئے کہ حضرت کے تحقیقی مطالعہ میں وہ صحیح بھی ثابت ہوتے ہیں یا نہیں! نفس مسئلہ پر حضرت کی رائے اب بھی جو کچھ رہے، یہ تو نہ ہو کہ میرے دیئے ہوئے حوالے ہی غلط نکلیں ـــــ اِس کا ذکر خط میں تو خیر کیا کرتا۔ لیکن دِل اندر ہی اندر اِس سے ڈرے جا رہا تھا۔ بارے وہی ایک دن بعد حضرت کا پوسٹ کارڈ خوب مفصّل موصول ہو گیا۔ ڈاک خانہ کی مُہر اس پر تھانہ بھون سے چلنے کی ۱۲ اگست کی ہے۔ مُلاحظہ ہو:-

"جمعہ کے روز کتابیں صحیح و سالم پہنچ گئیں۔ اُن حضرات کے لئے کہ محسن ہیں اور آپ کے لئے کہ
واسطۂ احسان ہیں دل سے دُعا کرتا ہوں[1]۔ اُن کے احسان کے اثر سے اِس خفیف سی بے ترتیبی کا مجھ پر
کوئی اثر نہیں ہوا[2]۔ خصوصاً جب پارسل تھانہ بھون ضلع سہارنپور لکھا ہوا ملا تو شکایت بالکل معدوم
ہوگئی۔ سہارنپور کا لفظ زائد لکھا گیا، معلوم ہوتا ہے جلدی میں اُس پر نظر پڑی اور بلٹی میں وہی
لکھ دیا۔ میں اعتراض کر کے خود نادم ہوں اور آپ کی ندامت کی خبر سے اس اطلاع پر نادم ہوں۔
بہرحال میری راحت کے غلبہ نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے دیا، آپ بالکل مطمئن رہیئے۔

میں نے دونوں کتابوں میں دیکھا[3]۔ حیرت ہوگئی کہ جو بزرگ اوروں پر ظاہر نصوص سے عدول کا
الزام صحیح سے لگاتے ہیں انھوں نے ظاہر کو کیسے چھوڑ دیا۔ بہت غور کیا۔ آخر میں اِس پر شرح صدر ہوا
کہ ان کے جیسے اور اقوال بدعیہ ہیں جیسے طلقات ثلٹ کے مسئلہ میں یا شدّ رحال و توسّل میں ایسا ہی
یہ ایک قول بدعت ہے کیونکہ آج تک کسی اہلِ حق کا یہ قول نقل نہیں کیا، بلکہ ایسے اقوال اہل
بدعت سے نقل کر کے اِن کو رد کیا جاتا ہے۔ اور خود انھوں نے جو بعض سلف سے نقل کیا ہے وہ
موقوف ہے صحت سند پر۔ علاوہ اس کے بہ تقدیر ثبوت ضعیف کو قوی کی طرف راجع کیا جاتا
ہے۔ پھر اجماع متاخر رافع ہوتا ہے خلاف متقدّم کا۔ اور جن آیات سے تمسّک کیا گیا ہے وہ دلالت
میں نہ نص ہیں نہ محکم۔ غرض کسی پہلو سے اِس قول میں جان نہیں۔

رہے صوفیہ تو اوّل ان مباحث میں ان کا قول کوئی وزن نہیں رکھتا۔ دوسرے محققین نے
تصریح کی ہے کہ یہ شیخ اکبر پر افتراء ہے اور ان کے کلام سے اس کے خلاف تصریحات نقل کی
ہیں۔ الیواقیت والجواہر میں اس کی تصریح ہے۔ یہ تو مسئلہ کی حقیقت ہے۔ اب خاصیّت کے
متعلق کچھ عرض ہے، کہ مثل مضرادویہ کے اس میں ایک ضرر بھی ہے اور ایک نفع بھی۔ ضرر تو یہ

---

[1] کیسی تعلیم حضرت کے معمولی معمولی فقروں سے بھی نکلتی رہتی ہے۔ [2] ایضاً۔

[3] مولانا کام کے حق میں حریص تھے۔ آج کا کام کل پر اُٹھا رکھنا تو جانتے ہی نہ تھے، کام کا تقاضا
گویا حضرت پر سوار رہتا۔ کتابیں پہونچتے ہی انھیں دیکھ ڈالا۔

ہے کہ اس عقیدہ کے بعد عقاب سے وہ خوف نہیں رہتا جو اس کے خلاف میں ہے۔ بے فکری ہو جاتی ہے کہ اگر کفر تک بھی نوبت پہنچ گئی اس سے بھی ایک مخلصی ہے۔ اور ایک نفع بھی ہے کہ اگر شق معروف میں کسی کو وساوس کا ہجوم ہو جس سے اندیشۂ تکذیب یا اعتراض کا ہو اس کے لئے یہ بدعت وقایہ ہے کفر کا۔ جیسا بعض علمائے امت نے اس سے کام بھی لیا ہے۔ باقی میں اس مضمون کو نقل کرا کر کتاب جلد واپس کردوں گا۔ پھر اطمینان سے کچھ لکھنے یا لکھوانے کا خیال ہے۔

مولانا مناظر احسن صاحب تشریف لائے۔ بخیر و خوش تشریف لے گئے۔" ظاہر ہے کہ اس والا نامہ کے آجانے سے بڑی تسکین ہو گئی۔

خطوط یاد کر لیجئے کہ اب عموماً تفسیر قرآن مجید ہی سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ ۱۴ راگست کا نیاز نامہ مع جواب ملاحظہ ہو:۔

م۔ بیان القرآن، جلد ۲، ص۵۳ خالدین فیہا کا ترجمہ چھپنے سے رہ گیا ہے۔

ا۔ اسی وقت بڑھا دیا، مطبوع میں بھی اور کاپی میں بھی جو کہ لکھی جا رہی ہے۔

م۔ فرنگی محققین کا سرتاج نولڈیکی جرمن کو سمجھا جاتا ہے۔ اس کی عربیت کی دھوم مچی ہوئی، اس کا ایک ضخیم مقالہ قرآن مجید پر حال میں نظر سے گذرا[1]۔ اس ظالم نے اعتراضات تو متعدد کئے ہیں۔ ایک اعتراض نیا دکھلائی دیا، جو اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا تھا۔ خلاصۃً حسب ذیل ہے:۔

"پیروان عرب سے متعلق محمدؐ کی ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے ملک مصر کی سرسبزی کو قرآن میں بارش کا نتیجہ بتایا ہے، حالانکہ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ مصر کو بارش سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں کی شادابی تو تمامتر طغیانی نیل کے اثر سے ہوتی ہے"

اعتراض سورۂ یوسف کی آیت عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ پر ہے۔

میں اپنے حواشی میں جواب دے رہا ہوں کہ

---

[1] یہ مقالہ قرآن کے عنوان سے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع یازدہم) جلد ۱۳ میں موجود ہے۔

(۱) اوّل تو یغاث کے معنی لازمی طور پر بارش ہی قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا کہ بجائے غیث کے غوث سے ہو، اور معنی یہ ہوں کہ لوگوں کی فریاد رسی ہو، مصیبت سے نجات ملے۔ چنانچہ متعدد اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر اس طرف بھی گئے ہیں۔ اور راغب کے مشہور لُغت مفردات قرآن میں دونوں معنوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ قولہ (ان یستغیثوا) فانہ یصح ان یکون من الغیث ویصح ان یکون من الغوث وکذٰلک یغاثوا یصح فیہ المعنیان۔

(۲) دُوسرے یہ کہ تصریح اہلِ مصر کی نہیں۔ عام خلقت یا النّاس کی ہے۔ قحط صرف مصر میں نہیں اطراف و جوانب کے تمام ممالک میں پڑا تھا۔ یہ تاریخ سے بھی ثابت ہے اور قرآن بھی آخر شام فلسطین کے قحط کا ذکر کرتا ہی ہے۔ پس اگر بارش دُوسرے مُلکوں میں بھی ہو جائے تو مفہوم قرآنی کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔

(۳) تیسرے مُلک مصر سے نفی بارش کا بالکلیہ دعویٰ بھی صحیح نہیں۔ اِن ہی فرنگی جغرافیہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مصر کے فلاں علاقہ میں بہ کثرت بارش ہوتی ہے، فلاں علاقہ میں کمتر اور فلاں یعنی ریگستانی علاقہ میں بالکل نہیں۔ اور یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاں فراعنہ مصر کی حکومت تھی، وہ وہی اوّل الذکر یا بارش والا خطّہ تھا۔

یہ جوابات کافی نہ ہوں تو کچھ اور ارشاد فرما دیا جائے۔

ا۔ ماشاء اللہ نہایت کافی جواب ہیں۔ اوّل جواب میں اس قدر اور عرض ہے کہ روایات میں غیث ہی سے لیا گیا ہے۔ غوث کے قول کو کسی نے سلف سے نقل نہیں کیا۔ صرف رُوح المعانی میں قیل صیغۂ تمریض سے ذکر کیا ہے، لیکن جواب کے لئے احتمال بھی کافی ہے۔ اگر جی کو لگے ایک جواب اور بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید سے عادۃً مستمرہ تو معلوم نہیں ہوتی کہ مشاہدہ کا مصادم ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس سال بارش ہی سے پیداوار ہوئی ہو یا بارش سے نیل میں طُغیانی ہوئی ہو۔ اگر یہ اصول طبیعیہ کے خلاف نہ ہو اس کو بھی بڑھا دیا جائے، ورنہ حذف کر دیا جائے۔"

کیا زمانہ تھا! تفسیر قرآن پر ندا کرے تو کہنا چاہیئے کہ ہر ہفتہ بلا تکلف جاری ہی رہتے تھے۔ اِن کے علاوہ جس دینی، علمی موضوع پر جی چاہتا تھا بے دھڑک لکھ ڈالتا تھا۔ اور جوابات سے خوب خوب مُستفید ہوتا ——— گویا ایک شفیق و ماہرِ فن اُستاد دُور بیٹھا ہوا برابر تحریر کے ذریعہ درس دے رہا ہے۔

۲۵ اگست کا معروضہ آج بھی پڑھتا ہوں تو دنگ سا رہ جاتا ہوں کہ اُس وقت یہ باتیں کیسے سُوجھ گئی تھیں، اور شُکر بھیجتا ہوں کہ اللہ نے حلِ اشکالات کے لئے کیسے کیسے موقع دیدیئے تھے ——— ختمِ نبوّت کے مسئلہ پر گفتگو ایک نئے پہلو سے اپنے اسی معروضہ میں نظر آئی۔ حیرت ہوئی کہ اپنے جس ناکارہ بندہ سے جو کام چاہے، لے لے۔ عریضہ کے آخر میں ایک خواب کا بھی ذکر ہے اور ایسے خوابوں کی اُس زمانہ میں کثرت تھی۔ بہرحال پُورا عریضہ مع جواب آئندہ نمبر میں نذر ہو رہا ہے۔

(۷۳)

مرمتِ بیان القرآن، جلد ۲ صفحہ ۵۳ سے لے کر دُور تک قصّہ اُحد چلا گیا ہے، اور جا بجا منافقین کا ذِکر آتا گیا ہے صفحہ ۵۳ پر تفسیر کی پہلی ہی سطر میں یہ مضمون ہے کہ سرغنہ منافقین مع اپنے تین سو ساتھیوں کے میدانِ جنگ سے واپس چلا گیا۔ اِس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ اب لشکر میں کوئی منافق نہ تھا محض مومنین مُخلصین ہی تھے۔ لیکن آگے چل کر بار بار منافقین کا ذِکر خاص میدانِ جنگ ہی کے سلسلہ میں آتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۶۱ سطر اوّل، صفحہ ۶۲ پر مکرّر۔ نیز صفحہ ۶۴۔"

ا۔ منافقین کا تین سو ہی میں منحصر ہونا نہایت مُستبعد ہے۔ یہ منافقین اکثر یہود تھے۔ اور مدینہ میں اُن کی کثرت معلوم ہے، تو تین سو کا جُدا ہو جانا مُستلزم اس کو نہیں کہ کوئی منافق باقی نہ رہا ہو، چنانچہ قطع نظر روایات کے خود قرآن مجید کی بعض آیات سے اُن کی شرکت معلوم ہوتی ہے۔ لقولہ تعالیٰ انزل علیکم من بعد الغم امنۃً نعاساً یغشیٰ طآئفۃً منکم وطآئفۃ قد اھمتھم انفسھم الایۃ۔ باقی یہ کہ یہ لوگ جُدا کیوں نہیں ہوئے یا تو اُن کو اتفاقاً موقع نہ ملا یا عمداً اس مصلحت سے رہ گئے ہوں کہ مسلمانوں کو موقع موقع بُرے مشورہ دیں یا اُن کے اسرار اپنی جماعت کو پہنچائیں

جیسا دوسری آیتوں میں اُن کی معیت بھی اور معیت کی یہ مصلحت بھی مصرح ہے۔ قال تعالیٰ فی سورۃ النساء اِنَّ اللّٰہَ جَامِعُ الْمُنَافِقِیْنَ وَالْکَافِرِیْنَ فِیْ جَھَنَّمَ جَمِیْعًا اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ الآیۃ وقال تعالیٰ فی سورۃ التوبۃ وَفِیْکُمْ سَمّٰعُوْنَ لَھُمْ۔ اِس لئے اجزائے قصہ میں کوئی تعارض نہیں۔

م ۔ صفحہ ۳۳۱ متن کی سطر آخر۔ ثُمَّ صَرَفَکُمْ کے قبل اس لئے اللہ تعالیٰ نے آیندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کر دیا " یہ پورا فقرہ شرح و تفسیر کے اعتبار سے تو بیشک ضروری اور ہر طرح با محل ہے، لیکن اس کا جزو ترجمہ ہونا، صفحہ ۴۶ کے حاشیہ کے باوجود پوری طرح دلنشین نہ ہوا۔ جو مقصد آنجناب کا ہے، وہ تو شاید اُسے محض تفسیر رکھنے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

ا ۔ میں نے مکرر غور کیا۔ اوّل وہلہ میں جزئیت کی ضرورت اس بناء پر معلوم ہوئی کہ ترجمہ سے حذف کر دینے کے بعد ترجمہ سے مطلب واضح نہ ہوگا۔ مگر پھر یہ رائے ہوئی کہ اکابر دہلی کا ترجمہ دیکھ کر اس کا اتباع کیا جاتا ہے۔ سو ان سب حضرات نے یہ مقدر نہیں نکالا، لہٰذا میں نے اپنے ترجمہ کے مسودہ میں بھی اور موجودہ کاپی میں بھی اِس عبارت کو بجائے ترجمہ کے تفسیر بنا دیا۔ اور اُوپر کے حصۂ ترجمہ سے اس کو کاٹ دیا۔ اور عربی حاشیہ میں سے بنائے توجیہ کو کاٹ دیا، اور آپ کو دعا دی۔

م ۔ یہ عریضہ اصلاً ایک خاص غرض سے لکھ رہا ہوں۔ ختم نبوت پر عقلی حیثیت سے لکھنے کی بڑی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس ہو رہی ہے۔ متعدد انگریزی خواں ہندوؤں اور نیم ملحد مسلمانوں نے بیان کیا کہ اسلام کی خوبیوں کے ہم معتقد اور رسول ؐ کی صداقت کے بھی قائل۔ لیکن دل اسے قبول نہیں کرتا کہ ان کے بعد کبھی کوئی پیمبر نہ آئے، اور سلسلۂ ہدایت ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔ درآنحالیکہ نئے نئے مسائل اور نئی نئی ضرورتیں روز پیدا ہوتی رہتی ہیں اور اب تو دُنیا کی گمراہی اُسی حد تک پہنچ چکی ہے، جو آغاز اسلام کے وقت تھی۔ اب تو بدرجۂ اولیٰ ضرورت ایک نئے پیغمبر کے ظہور کی ہے ——— یہ لبِّ لباب ہے اس گروہ کے خیالات کا۔

ضرورت ہے کہ اس گروہ کی ہدایت کے لئے سلیس وعام فہم زبان میں کوئی رسالہ شایع کیا جائے۔ اگر جناب والا کی کسی تحریر میں اِس جانب کچھ اشارہ ہوا اور وہ یاد بھی پڑجائے تو ازراہ کرم مطلع فرمایا جائے۔

ا۔ یاد نہیں آیا۔ اگر بعد میں خیال آگیا اطلاع دیدوں گا۔

م۔ ضابطہ کا جواب کھلا ہوا تو یہی ہے کہ جب رسولؐ کو صادق مان لیا تو اُن کے دعویٰ ختم نبوت کی تصدیق بھی لازمی ہے۔ لیکن اتنے سے اِن لوگوں کی تشفی نہ ہوگی۔ میری فہم ناقص میں دلائل ذیل آتے ہیں :۔

(۱) نبی کی حیثیتیں دو ہیں۔ ایک شخصی، اور ایک تعلیمی یا تبلیغی۔ شخصی یا ذاتی حیثیت سے تو آپؐ ۶۳ سال کی عمر میں اِس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ تعلیمی یا تبلیغی حیثیت سے آپؐ بدستور زندہ ہیں، اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اِس لئے اب کسی جدید تعلیم وارشاد کی حاجت ہی نہیں۔

(۲) اتمام نعمت اور اکمال دین کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس دین کے مستقبل کی جملہ ضروریات کی کفالت ہوگئی، اور احکام و قواعد قیامت تک کے لئے مدّون ہوگئے۔ اب جو بھی نیا مسئلہ پیش ہوگا اُس کا حل اُسی سے نکل آئے گا خواہ صراحۃً خواہ استنباطاً۔

ا۔ چنانچہ حوادث جدیدہ پر علماء کے فیصلوں سے یہ امر مشاہد ہے) یہ عبارت آپ کی اعانت کے لئے بڑھائی۔ جزو عبارت بنانے کی خواہش مقصود نہیں۔

م۔ (۳) اگلے انبیاء کی تعلیم۔

ا۔ (خداوندی خاص حکمتوں کے سبب) ایضاً مثل بالا۔

م۔ ایک تو جامع نہیں ہوتی تھی، مخصوص اقوام وممالک تک محدود رہتی تھی۔ دوسرے اُس کی محفوظیت کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا۔ اب جب ایک ایسی کتاب موجود ہوگئی جس کی جامعیت و محفوظیت دونوں مسلّم ہیں، تو پھر کسی جدید ہدایت کے کوئی معنی نہیں۔

(۴) علم الٰہی میں اِس کا اندازہ ہوگا کہ اب دُنیا کی اصل کسی زندہ شخصیت کے ذریعہ سے

نہیں بلکہ محض تعلیم کے ذریعہ سے ہوسکے گی اور وہ تعلیم جُوں کی تُوں اور برقرار ہے۔

ا۔ جیسے قانون ساز حکماء کی کوئی جماعت کسی مصلحت جامعہ سے کوئی قانون استمراری تجویز کر دیتی ہے جو بقائے سلطنت تک منسوخ نہ ہوگا، جیسے بنگال و پنجاب کے متعلق بعض قانون زمینداری کہ باوجودیکہ حالات میں کسی قدر تغیر و تبدل ضرور ہوتا ہے، مگر بہ مقابلہ مصلحت کلیہ کے ایسے تغیرات کو معتد بہ و مؤثر نہیں سمجھا گیا)

حاشیہ مثل بالا۔

م۔ ان کے علاوہ اور جو امور مفید و ضروری ہوں اُن سے بھی رہنمائی فرمائی جائے۔

ا۔ ماشاء اللہ نہایت شافی و کافی تقریر ہے، جب اعتراض پڑھا تھا یہی جواب ذہن میں آیا تھا مگر عنوان ایسا عام فہم نہ تھا جو آپ کی تقریر میں ہے۔

م۔ یہاں ایک صاحب نے خواب میں دیکھا کہ آپ دریا باد تشریف لائے ہیں اور میرے ہاں بیٹھے ہوئے میرے کسی ضخیم مسودہ کو غایت غور و انہماک سے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اور میں نے اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی شخص اُس پاس بھی نہ آنے پائے تاکہ یکسوئی میں کسی طرح کا خلل نہ واقع ہو۔ اور گھر میں تو عرصہ ہوا خواب دیکھ چکی ہیں کہ جناب نے دریاباد میں مستقل قیام فرمالیا ہے۔

ا۔ آپ کی مجھ پر جو عنایت خاص ہے یہ سب خواب اُس کی صورت مثالی ہیں، اللہ تعالیٰ اِس عنایت کا آپ کو صلہ عطا فرماوے۔

بوجہ ہجوم مشاغل جواب میں ایک روز کے انتظار کی آپ کو تکلیف ہوئی ہوگی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے ورود تھانہ بھون کا ذکر ابھی پچھلے ہی نمبر میں حضرت کے قلم سے گذر چکا ہے۔ اب اُدھر سے اپنے حسب معمول البیلے انداز میں میرے خط میں جو کچھ لکھ کر آیا نا ممکن تھا کہ اُسے میں حضرت کی خدمت میں نہ پیش کر دیتا ___ خط بیکار تو کوئی بھی نہیں، لیکن میرا یہ کم سخن بزرگ کا عریضہ کچھ امتیازی سی حیثیت رکھتا ہے۔ واردات قلب کا تذکرہ مؤثر و اثر انگیز کب نہیں ہوتا، بعض مرتبہ اور زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اور پھر وارد جب وقت نزع سے متعلق ہو، تو اس کی اثر انگیزی کا

کہنا ہی کیا؟

اسی خط میں ایک فقہی جزئیہ کا بھی ذکر ملے گا، اور کتابوں کے پارسل سے متعلق ایک جزئی سی بات پر حضرت کی سیرت عالی پر ایک کُلّی روشنی پڑ جاتی ہے ——— پھر میرے سفر ماہ ستمبر سے متعلق ایک لفظی لطیفہ! مولانا تو لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی اور مزاح لطیف کے بادشاہ تھے۔ افسوس کہ ایک دُنیا نے اندھے پن سے ایسے لطیف المزاج کو خُشک مزاج و خشن قرار دیا!

اس مفصّل عریضہ سے دو ہی چار دن قبل اب خدا معلوم کس ضرورت سے ایک کارڈ بھی خدمت والا میں بھیجا تھا۔ اس کارڈ کا مضمون کیا تھا، اس کے علم کا جواب کوئی ذریعہ نہیں۔ البتہ اس کی آخری سطر یہ تھی "مصارف پارسل کے باب میں خدا کرے استخارہ میرے موافق آیا ہو"[1] اس پر حسب ذیل جواب لکھ کر اس کارڈ کا تراشہ میرے مفصّل عریضہ کے ساتھ لفافہ کے اندر رکھا ہوا موصول ہوا:۔

"موافق ہی آیا مگر بہ واسطہ۔ اس طرح سے کہ میں اور آپ ایک ہیں۔ جب میرے موافق آیا، تو آپ ہی کے موافق آیا۔ یہ نکتہ ہے جس کا منشاء محبّت ہے۔ دوسری وجہ جو واقعات پر مبنی ہے، خط میں ہے۔"

(۲۷)

م۔ مولانا مناظر احسن صاحب کے تازہ عنایت نامہ کا ایک حصّہ اس قابل نظر آیا کہ بے تعلق اُس کی نقل خدمت والا میں بھیج دینے کو جی چاہا۔

ا۔ اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔

م۔ نہ ہو پایا۔

"دیوبند اور تھانہ بھون میں حاضری دی ...... تھانہ بھون کا حال کیا عرض کروں۔ رات کو ۱۱ بجے پہنچا۔ ایک دُوسری مسجد میں اُترا۔ صبح بعد نماز اُس پیر محبوب کے آگے آیا، جو

---

[1] ملاحظہ ہو نمبر ۲۷۔

یہ ایں شیخ وقت اپنے ہر ہر انداز میں صرف مظہر جمال تھا۔ عنایتوں کا عجیب و غریب سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ بڑی بڑی مہربانیاں، بڑی بڑی سرافرازیاں رہیں۔ کچھ علمی و قرآنی معاملات بھی پیش پڑے۔ غرض ادب نے حافظہ خراب کر دیا۔ بولنا چاہتا تھا مگر نہ بولا گیا، پھر بھی بہت کچھ تو پوچھ ہی لیا۔"

مولانا نے ہمارے الفاظ گویا میری زبان سے چھین لئے۔

ا۔ وہ ایک بات لکھنا بھول گئے وہ سب سے زیادہ مزہ دار ہے۔ وہ یہ کہ میں نے اُن سے چلتے وقت تعریضاً عرض کیا تھا کہ اب تو اُمید ہے کہ بھوت کا ڈر نکل گیا ہوگا۔ یہ اشارہ ہے اُن کے اس والہانہ ارشاد کی طرف کہ جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

م۔ حاضری کو بہت زمانہ ہو گیا۔ انشاء اللہ اِس ماہ کے اندر مختصر حاضری کا قصد رکھتا ہوں۔

ا۔ خدا تعالیٰ بخیریت ملاوے۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو حتی الامکان اِس مصرع کو پیش نظر رکھئے۔

ع ستمبر[1] ضعیفاں مسکین کن

م۔ آج اپنی ایک اندرونی کیفیت عرض کر دوں۔ مدت سے سوچا کرتا تھا کہ بعد موت ہزار عیش و راحت سہی، لیکن خدا نخواستہ رُوح کی گھڑی کس قدر سخت ہوگی۔ نفس کا یہ احساس کہ اب جان نکل رہی ہے بجائے خود کس قدر مولم ہوگا۔ اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ مدتوں یہ خیال غالب تھا۔ ابھی دو چار دن کی بات ہے کہ حالت نوم میں ایک غیبی آواز یہ سُنائی دی کہ "کیا ہم اِس پر قادر نہیں کہ احساس موت سے قبل ہی وقوع موت طاری کر دیں، اور جس وقت کے احساس سے گھبرا رہے ہو قبل اس کے کہ اس کا احساس ہو وہ وقت ہی گذر جائے" خواب ہی میں بے حد مسرت ہوئی، اور ہنستے مسکراتے ہوئے آنکھ کھل گئی۔

ا۔ بالکل اصول شرعیہ کے موافق جواب ہے اور بالکل باصواب ہے۔ مبارک ہو[2]

[1] ستمبر کا مہینہ عموماً شدید بارشوں اور سیلابوں کا زمانہ ہوتا ہے۔

---

[2] اور اب یہ شعر اکبر الہ آبادی کا، عاشقانہ و عارفانہ رنگ کا، یاد آتا ہے ؎

احساس ہی ایذا کا نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا — آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے جس وقت یہ خنجر ہاتھ لگا

م - اب یہ بات موٹی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قبل اس کے کبھی ذہن میں نہیں آئی تھی۔ یورپین ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ بجلی سے موت اِس سُرعت سے واقع ہوتی ہے کہ جسم کے جو اعصاب اذیت کا احساس دماغ تک پہنچاتے ہیں وہ ابھی اپنا کام کرنے بھی نہیں پاتے کہ احساسِ اذیت کا مادہ یعنی خود حیات ہی ختم ہو جاتی ہے۔ خیر، اِن لوگوں کی بات کا کیا اعتبار[۱]
وُہ کتابیں تو اب غالباً ناظم ندوہ کے نام واپس جا چکی ہوں۔ واپسی کے محصول کے بابت میں مُنتظر ہی رہا۔

ا۔ واپسی میں دیر اس لئے ہوئی کہ مَیں نے وہ مضمون نقل کرالیا، ناقل نے دیر کی۔ مگر الحمد للّٰہ اب کتابیں واپس ہو گئیں۔ محصول کچھ زیادہ نہ تھا۔ دونوں طرف کا مَیں نے ادا کر دیا۔ یہاں سے تو پیڈ پارسل گیا اور وہاں جو محصول دیا گیا تھا خط میں اِس کی اطلاع تھی کہ عہ؍ خرچ ہوا۔ مَیں نے بلٹی کے ساتھ عہ؍ کے ٹکٹ بھیج دیئے۔ واقعی یہ خرچ اُس نفع کے مقابلہ میں ہیچ تھا جو اُس مضمون سے ہوا یعنی انھوں نے اپنے مدعا کے لئے جن مقامات سے کام لیا ہے ان مقامات سے وہ مدعا تو ثابت نہیں ہو سکا بلکہ مَیں نے جا بجا بطور نوٹ کے اِس کا جواب بھی مجملاً لکھ دیا ہے جس کی تفصیل خواہ میں کر دوں یا کسی اور سے کرا دوں لیکن خود مقامات کے مضامین اِس قدر نافع ہیں کہ اُن سے رحمت کا استحضار، تطہیر اعمال کا اہتمام، بجائے ہیبت و قبض کے اُنس و بسط ایسا نصیب ہوا کہ واقعی اُن کے مقابلہ میں لاکھ روپیہ بھی کم نہیں۔ مَیں آپ کا اور حضرات ندوہ کا دل سے شکر گذار ہوں۔

م - ایک جوان عمر عزیز کا کان بچپن میں چھدا تھا، غسل کرتے وقت وہ سوراخ میں بھیگی ہوئی سینک ڈال لیا کرتے تھے۔ اب اِس قصد سے کہ سوراخ رفتہ رفتہ بند ہو جائے گا انھوں نے وہ سینک ڈالنا چھوڑ دی ہے۔ البتہ پانی کی دھار اہتمام سے ڈال لیتے ہیں۔ وہ دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ کافی ہے۔

ا۔ فی الدر المختار ولو لم یکن بثقب اذنہ قرط ند خل الماء فیہ اے الثقب عند مرورہ علے

---

[۱] یہ سارا ٹکڑا بغیر جواب کے رہا۔

اذنه اجزاه کسرة واذن دخلهما الماء ولا يدخل الاصبع ولو باصبعه ولا يتکلف بخشب وغيره والمعتبر غلبة ظنه بالوصول۔ فی رد المختار قوله ولا يتکلف ای بعد الا مرار کما ترهنا ه عن شرح المنية اس روایت سے معلوم ہوا کہ دھار ڈال لینا کافی ہے اور اگر دھار ڈالتے وقت انگلی سے بھی ذرا مل لیا کریں زیادہ احتیاط ہے۔ زیادہ وہم نہ کریں۔"

۱۴ر ستمبر کا عریضہ اصلاً تفسیر قرآن ہی سے متعلق ہے :-

م ۲۔ بیان القرآن، جلد اوّل، صفحہ ۱۲۹۔ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا۔ سِرًّا کا ترجمہ مجھے ترجمہ و تفسیر دونوں میں نہیں ملا۔

ا۔ سِرًّا کا ترجمہ نکاح سے کیا گیا ہے۔ اور یہ ترجمہ و تفسیر دونوں میں ہے۔ اور ماخذ اس کا عربی حاشیہ میں بیضاوی سے نقل کیا گیا ہے۔ سرًّا نکاحاً فانه عبر به او لا عن الوطی لانه يسیر ثم عن العقد لانه سبب فيه

م ۔ صفحہ ۱۳۰۔ مَتِّعُوهُنَّ اور مَتَاعًا کا ترجمہ "جوڑا دینے" اور "جوڑا" سے میری فہم ناقص میں نہ آیا۔ حواشی میں تو بیشک تصریحات فقہاء کا اتباع ہونا چاہیئے، لیکن سوال اس کے جزو ترجمہ بنانے کا ہے۔ متاع کا لفظ لغت میں عام ہے۔ راغب کے مفردات القرآن میں ہے۔ المتاع والمتعة ما يعطى المطلقة لتنتفع به مدة عدتها۔

اکابر مترجمین اردو نے بھی اسے عام ہی رکھا ہے۔

بہرہ دہند ..... بہرہ دادن ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔

فائدہ دو ..... فائدہ دینا حضرت شاہ رفیع الدینؒ۔

خرچ دو ..... خرچ حضرت شاہ عبدالقادرؒ

ایضاً حضرت شیخ الہندؒ

ا۔ میں نے مراد کے ساتھ ترجمہ کر دیا ہے۔ اس میں بھی گنجایش ہے۔ جیسا خرچ سے ترجمہ بھی حاصل ہے ترجمہ سے۔ خرچ اس کے لغوی معنی نہیں۔ ترجمہ بالحاصل ہی ہے۔ لیکن مجموعی ترجمہ

اولیٰ ہے۔ اب یوں بدل دینے کا ارادہ ہے۔

"اور اُن کے ساتھ (ایک خاص طور کا) کچھ سلوک کر دو (مراد ایک جوڑا دینا ہے) صاحب وسعت کے ذمہ اُس کی حیثیت کے موافق ہے اور تنگ دست کے ذمہ اُس کی حیثیت کے موافق ہے۔ (ایسا) سلوک کرنا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر۔"

اسی کے موافق تفسیر میں بنا دیا گیا اور تفسیر میں فائدہ کے مسئلہ دوم کے اخیر میں بعد "خود واجب ہوتا ہے" کے عبارت ذیل بڑھا دی گئی۔ قال الزیلعی فی نصب الرایۃ اخرجہ البیہقی عن ابن عباس۔

م۔ ارادہ ہے کہ انشاء اللہ آپ کی . . . . شانہ بھون ۱۱ بجے شب کو پہونچوں۔ شب اسٹیشن ہی پر مسافر خانہ میں گذاروں۔ ڈھائی دن حاضر خدمت رہ کر دو شنبہ کے سہ پہر کو اجازت چاہوں۔

ا۔ بہت مسرت ہوئی تشریف آوری کے وقت یاد رہنے کے لئے یہ پرچہ جدا کر کے پاس رکھ لیا۔ بدون اس کے بھول جانے کا قوی احتمال تھا۔ حافظہ قوی نہیں رہا۔ دُعا کیجئے یہ ضعف اس کام میں آئے کہ غیر مقصود کو بھول جاؤں۔

حکایت لطیفہ۔ ناظم صاحب ندوہ نے ۸ روپے کے ٹکٹ واپس فرمائے اور لکھا کہ مولانا عبدالماجد صاحب یہ مصارف پہلے ہی ادا کر چکے ہیں۔ حکایت تو ہو چکی۔ اور لطیفہ اس لئے ہے کہ میری طرح ناظم صاحب بھی باوجود شباب کے ضعیف الحافظہ ہیں کہ جب کتاب کی رسید کارڈ پر لکھی اُس وقت ٹکٹوں کا ذکر لکھنا یاد نہیں رہا حالانکہ ٹکٹ ہی کے لفافہ میں ٹکٹ گئے تھے۔ خیر۔ مجھ کو اپنے ضعف حافظہ کا افسوس نہیں رہا یا یہ آپ کی کرامت ہے۔ جو بھی ہو میرا عذر کا فائدہ

ل۵ یہ سطر جس میں دن تاریخ وقت سفر درج تھا، حضرت نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لی۔

۵۲ یہ گنج کا مسافر خانہ حضرت ہی کا تعمیر کرایا ہوا تھا۔

۵۳ سبحان اللہ! کیسی دعا آفرین یہ حکیمانہ دعا رفانہ دُعا ہے۔

ہوگیا، جو دو بزرگوں کا عطیہ ہونے سے متبرک بن گیا۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست

(۷۵)

اب چودہ برس کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ خیال تو کہاں، کہ روانگی کس تاریخ کو ہوئی اور واپسی کب۔ بہرحال ستمبر کے تیسرے یا چوتھے ہفتہ میں مختصر حاضری[1] حسب ارادہ جا کر دے آیا۔ اور نہ اب ملفوظات کا کوئی سا بھی جزو حافظہ میں ہے۔ لے دے کے خط ۲۹ ستمبر کا ہے ——— مدت سے خیال یہ تھا، اور توریت و انجیل کے مطالعہ کے بعد یہ خیال بہت قوی ہو گیا کہ توریت کی ابتدائی پانچ کتابوں میں تو خیر، لیکن عہد عتیق کا باقی حصہ اور عہد جدید تمامتر یقیناً تنزیل لفظی نہیں، صرف معنوی حیثیت سے انہیں منزل من اللہ کہا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی طرح اُن کی لفظی تنزیل کا عقیدہ خدا معلوم مسلمانوں میں کیسے پیدا ہو گیا۔ شاید قرآن ہی پر قیاس کر کے سمجھ لیا ہو۔ بہرحال حضرت کی خدمت میں اسی خط میں ڈرتے ڈرتے اپنے اس خیال کو بھی پیش کر دیا، علمائے اُمت کے جمہور پر نظر کر کے اس سے زیادہ کھل کر لکھنے کی اس وقت ہمت نہ ہوئی۔ بہرحال عریضہ حسب ذیل ہے:۔

م: بارہا کا تجربہ ہے کہ آدھ گھنٹہ کی بھی حاضری میں سارے سفر کی محنت وصول ہو جاتی ہے یہی معاملہ اب کی بھی رہا۔ اور یوں سیری تو مہینوں کے قیام سے بھی نہیں ہوتی۔

ا: میری بھی یہی حالت ہے۔

م: عام طور سے مسلمانوں میں یہ جو عقیدہ شائع ہے کہ توریت و انجیل وغیرہ بھی قرآن مجید ہی کی طرح کلام الٰہی ہیں؛ آخر اس کی شرعی بنیاد کیا ہے؟ اُن کے نفس منزل من اللہ ہونے میں گفتگو نہیں گفتگو صرف یہ ہے کہ مثل قرآن کے اُن کے بھی لفظ بہ لفظ منزل من اللہ ہونے کا

---

[1] صرف اتنا یاد ہے کہ پہنچنے پر شب کو قیام اسٹیشن پر نہیں ہوا تھا۔ حضرت کے ایک خادم آ گئے تھے اور اُن کی رہنمائی میں قیام جا کر حضرت ہی کے ایک مکان میں ہوا تھا۔

دعویٰ قرآن یا حدیث میں کہاں کیا گیا ہے؟ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ ان کا نزول صرف اجمالی حیثیت سے ہوا، یعنی بہ لحاظ معانی و مطالب، بجز توریت کے اُن احکام کے جن کے بہ صورت الواح نازل ہونے کی صراحت قرآن مجید میں آچکی ہے تفصیلی یعنی لفظی و حرفی تنزیل صرف قرآن مجید کی ہوئی ہے۔ مَیں نے یہ رائے مُستقلاً قائم نہیں کر لی ہے، لیکن اِن کُتب سابقہ کی شدید ترین کمزوریاں دیکھ دیکھ خیال یہی پیدا ہو رہا ہے اور استفادۃً یہ سوال خدمت والا میں پیش کر رہا ہوں۔

توریت وغیرہ تو پھر غنیمت ہیں، سب سے زیادہ کمزور اور بے سند تو مجھے انجیل نظر آتی ہے۔ اِس کے مطالعہ کے بعد یہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یورپ میں دہریت و مادیت کا زور اتنا کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسے بودے اور کمزور مذہب سے بغاوت تو لازمی تھی۔ اور افسوس ان بیچاروں پر ہوتا ہے کہ یہ مسیحیت کو نفس مذہب کا نمایندہ سمجھ کر اور قرآن کو انجیل پر قیاس کر کے تحقیق اسلام کی طرف سے بے فکر ہو گئے ہیں۔

۱۔ اِسی سوچ میں جواب میں بھی کئی روز کی تاخیر ہو گئی۔ آیات کو بہت سوچا، کوئی آیت ذہن میں نہیں آئی جو اس بات میں اثباتاً یا نفیاً نص ہو۔ تو جس طرح اثبات کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، اسی طرح نفی کا دعویٰ بھی نہیں ہو سکتا۔ دونوں احتمال برابر ہیں یہ ممکن ہے کہ الفاظ نازل ہوئے ہوں اور ممکن ہے کہ معانی نازل ہوئے ہوں اور الفاظ موسیٰ علیہ السلام و عیسیٰ علیہ السلام کے ہوں گو وہ محفوظ نہ رہے ہوں۔ تو اِس باب میں اُن کا درجہ حدیث کا سا ہو گا، اور اس کی بھی کہیں تصریح نہیں کہ الواح غیر ہیں تورات کے۔ بلکہ ظاہراً الواح میں تورات ہی تھی۔ اگر اس ظاہر کو

---

[۱] و بالظھور سیاق الروایات التی اوردھا فی الدر المنثور باسانید مختلفۃ فی تفسیر قولہ تعالیٰ فی الالواح من کل شیٔ موعظۃ وتفصیلا لکل شیٔ بعضھا تعداد التوراۃ والالواح اصرحھا ما اخرجہ عن ابن ابی حاتم عن ابن عباس قال اعطی موسیٰ التوراۃ فی سبعۃ الواح من زبرجد فیھا بیان کل شیٔ وموعظۃ الخ

کافی سمجھا جائے تو توراۃ کی تو لفظی تنزیل ایک درجہ میں ثابت ہو جائے گی۔ اگر کسی وقت اِس سے زیادہ کوئی بات ذہن میں آئے گی، عرض کروں گا۔"

بیسویں صدی عیسوی کے مفسر قرآن کو بعض ایسی ہوشیاریاں پیش آنے لگی ہیں جن کا اندازہ بھی قدیم مفسر حضرات کو نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے کلامی حیثیت سے ایک میدان فلسفہ یا معقولات کا تھا، اور اِس سے مُراد فلسفۂ یُونان ہوتا تھا۔ توحید، صفات باری، حشر و نشر، خرقِ عادت کے قسم کے مسائل اسی معیار سے زیرِ بحث رہا کرتے تھے۔ اب زمانہ نے نئے نئے معیار تاریخ جغرافیہ کے بھی پیدا کر دیئے۔ اب مفسر کو اگر کلامی حیثیت سے کامیاب ہونا ہے، تو تاریخ اور جغرافیہ دونوں پر اس کی نظر کا وسیع اور گہرا ہونا لازمی ہے۔ ۹ اکتوبر کے نیاز نامہ میں ایک تاریخی اشکال پر خاص طور پر توجہ دلاتا تھا۔ نیز توریت و انجیل کی نوعیت تنزیل پر بھی مزید معروضات پیش کرنے تھے۔ اور بعض دوسرے موضوع ان کے علاوہ۔ اب مکتوب ملاحظہ ہو:۔

م ۔ بیان القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۴، سطر ۲ سوف ینبئھم اللہ میں سوف کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ واقعی رہ گیا، اب بنا دیا ہے۔ ترجمہ میں تو بعد لفظ اوس کے عنقریب بڑھا دیا ہے، اور تفسیر میں آور کے بعد عنقریب، اور آخرت میں کے بعد یہ عبارت کہ وہ بھی قریب ہی ہے۔ بین القوسین بڑھا دیا ہے۔ اور چونکہ اِس جلد کی کاپی چھپنے گئی ہے اِس کو خاص یادداشت میں لکھوا دیا ہے۔ اخیر میں یہ حوالہ مقام لکھوا دیا جائے گا۔

م ۔ صفحہ ۲۰، سطر ۳ میں یہ عبارت ملی:۔

" تم کو صاحب مُلک بنا دیا چنانچہ فرعون کے مُلک پر ابھی قابض ہو چکے ہو"

اِس پر یورپ کا اعتراض ہے کہ قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بنی اسرائیل کو بادشاہ (ملوکا) کہلا دیا، حالانکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ بادشاہت انھیں اُس وقت نہیں، بہت بعد کو ملی تھی۔

میری فہم ناقص میں جعلکم ملوکاً کی تفسیر اگر آزاد و خود مختار ہو جانے سے کی جائے تو یہ اعتراض از خود ساقط ہو جاتا ہے۔ مصر پر اسرائیلیوں کا فی الفور قبضہ تاریخ سے بالکل ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ فرعونیوں کی غرقابی کے بعد انھوں نے اپنا سفر مشرق کی جانب بدستور جاری رکھا اور بجائے مصر کی طرف واپس ہونے کے وادی سینا ہی کی طرف بڑھتے گئے۔

ابن جریر نے کئی روایتوں کی تائید سے جعلکم ملوکاً کی تفسیر میں لکھا ہے۔ سخرلکم من غیرکم خدماً یخدمونکم اور میرے دل کو سب سے زیادہ یہ روایت لگی، عن سفیان بن وکیع قال کانت بنو اسرائیل اذا کان للرجل منہم بیت وامرأۃ وخادم عد ملکاً اس تفسیر پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ کشاف میں بھی ملک کے کئی معنی، علاوہ اصطلاحی بادشاہی کے دیئے ہیں، مثلاً من لہ مال لا یحتاج معہ الی تکلف الاعمال وتحمل المشاق و فارغ البالی و آسودہ حالی کی یہ نعمت بیشک مصر سے نکلتے ہی حاصل ہو گئی تھی۔

ا۔ ان حضرات مفسرین نے جو تفسیر لکھی ہے وہ بھی بجائے خود صحیح ہے، مگر عند التحقیق یہ سب معانی مجازی ہی ہیں کما صرح بہ صاحب روح المعانی بعد نقل ہذہ الاقوال اور میں نے جو تفسیر اختیار کی ہے وہ حقیقت ہے اور بدوں تعذر کے حقیقت کو نہیں چھوڑا جاتا اور یہاں کوئی تعذر نہیں۔ کیونکہ آیت میں یا تفسیر میں یہ کہیں نہیں کہ غرق فرعون کے بعد متصل ہی اس پر قابض ہو گئے تھے اس لئے تعارض تاریخی کا اشکال واقع نہیں ہوتا اگر لفظ ابھی سے شبہہ ہو تو ابھی زمانۂ قریب کے لئے آتا ہے اور قرب و بعد کا مدار عرف پر ہے۔ شام پر جہاد کا حکم ہونے سے پہلے قبضہ ہو جانا باعتبار فتح شام کے قریب کہا جا سکتا ہے۔ اور مصر پر قبضہ خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کما یدل علیہ قولہ تعالیٰ فی بنی اسرائیل فاراد (فرعون) ان یستفزہم من الارض (ای من ارض مصر) قطعاً فاغرقناہ ومن معہ جمیعا وقلنا من بعدہ لبنی اسرائیل اسکنوا الارض (ای الارض المذکورۃ) عہ

عہ قریباً من القطع وقولہ تعالیٰ فی الشعراء بعد قولہ فاخرجنٰہم واورثنٰہا بنی اسرائیل فہو نص فی استیلاء بنی اسرائیل علی ملک فرعون نیز سوال میں بھی بہت بعد سلطنت ملنا تسلیم کر لیا گیا ہے

بس ترتیب واقعات کی بلا غُبار یوں ہوسکتی ہے کہ غرق فرعون کے بعد فوراً مصر کو واپس نہیں ہوئے، آگے بڑھتے چلے گئے۔ علمائے توریت وغیرہ کے بعد مصر پر قابض ہوئے۔ فلا یفنین المذکورتین ۱۱ تفاً۔ پھر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اُن کا آبائی وطن مُلک شام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اول ہجرت فرما کر آرہے تھے ان کو دیں۔ اس وقت وہاں عمالقہ کی حکومت تھی الخ یہ آیتیں جن میں جعلکم ملوکاً آیا ہے اُس موقع کی ہیں جب وہ مامور بجہاد العمالقہ ہوئے اور اس سے پہلے مصر پر قابض ہوگئے۔ بس میرا یہ کہنا تفسیر میں صحیح ہوا کہ مُلک فرعون پر ابھی قابض ہو چکے ہو یعنی جس وقت اِس جہاد کا حکم ہورہا ہے، اِس سے قبل زمانہ قُرب میں الخ۔ بس اب کوئی اشکال نہیں رہا۔ یہ سب صحت تاریخ کی تسلیم کے بعد ہے ورنہ قصہ اور بھی سہل ہے۔ واللہ اعلم۔ اگر اب بھی کوئی شُبہہ ہو بے تکلف ظاہر فرمایا جائے۔ میں نے مدّت ہوئی یہی ترتیب کئی سال پہلے اپنے رسالہ الترتیب اللطیف میں لکھ دی ہے۔"

اب اِس پر مَیں یہ کیا عرض کرتا کہ اِس ترتیب واقعات کا ساتھ تو تاریخ کسی حد تک بھی نہیں دے رہی ہے۔ جہاد شام کا حُکم تو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلتے ہی اور آزاد و خود مختار بنتے ہی وادیِ سینا میں مل گیا تھا، اور مصر پر قبضہ تو کئی صدیوں بعد جا کر حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوا ہے!

(۷۶)

مکتوب ابھی ختم نہیں ہوا آگے چلا جارہا ہے۔ پچھلے نمبر سے ملا کر پڑھیئے۔

تتمۂ جواب سابق متعلق اتحاد توریت والواح۔ اِس کی تائید ایک آیت سے بھی ہوئی۔ خدا تعالیٰ وکتبنا علیہم فیہا (ای فی التوراۃ) ان النفس بالنفس یہاں سے توریت کا مکتوب ہونا ثابت ہوتا ہے اور پہلی آیت سے الواح کا مکتوب ہونا بس ظاہر یہی ہے کہ دونوں متحد ہیں۔ واللہ اعلم

م۔ نصاریٰ و یہود کی کتاب مقدس (بائبل) کی فہرست صحائف کا نقشہ ارسال خدمت ہے[1]۔ توریت کا اطلاق عہد عتیق کے زیادہ سے زیادہ ابتدائی صحائف خمسہ پر ہو سکتا ہے۔ علیٰ ہذا

---

[1] ملاحظہ ہو نمبر ۷۵۔

انجیل کا اطلاق بہت کھینچ تان کے بعد، عہد جدید کے ابتدائی صحائف اربعہ پر۔ کھینچ تان میں نے یوں کہا کہ خود ان اناجیل اربعہ میں ایک جگہ بھی اپنے کلام الہٰی ہونے کا دعویٰ نہیں۔ نہ تنزیل معنوی کا نہ تنزیل لفظی کا۔ یہ اناجیل اربعہ (اور یہی اناجیل کثیرہ میں سے مستند ترین ہیں) بھی حضرت مسیحؑ کا کلام نہیں۔ بلکہ آپ کے متعلق کچھ روایات اور آپ کے کچھ ملفوظات کا مجموعہ ہیں، جو آپ کے بعد دو صحابیوں اور دو تابعین نے اپنے اپنے طور پر مرتب کر دیئے ہیں! ان کتابوں کا دعویٰ اپنے متعلق صرف اسی قدر ہے مسلمان مناظر کے لئے بڑی مشکل کا مقام ہے، اُسے ان کتابوں کا وہ احترام و تقدس ملحوظ رکھنا ہوتا ہے، جس کے مدعی خود عیسائی بھی ہرگز نہیں۔ رہی محفوظیت، تو اس بارہ میں ان کتابوں کو قرآن مجید سے دور کی بھی نسبت نہیں۔

ا۔ یہ حقیقت میری سمجھ میں اچھی طرح نہیں آئی۔ آپ خود سمجھ کر فوائد میں لکھ دیجئے۔ البتہ اگر وہ اشکال صاف بتلایا جائے جو مسلمان مناظر کو کسی دلیل صحیح کے تعارض سے پیش آتا ہے تو میں اس میں مکرر غور کر کے کچھ عرض کر سکوں۔

م۔ گھر میں خواب یہ دیکھا کہ جیسے حق تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا ہے۔ خواب کا کوئی جزو بھی تفصیلاً یاد نہیں۔ صرف اتنا یاد رہ گیا کہ جیسے اللہ میاں کو دیکھ لیا تھا۔

ا۔ مبارک ہو۔ ایسا ہونا ممکن ہے جس کی حقیقت غامض ہے۔ اگر کوئی سوال ہوتا تو غالباً کچھ عرض کر سکتا۔

فرصت کی کمی سے جواب میں دیر ہوئی "

تفسیر کے ان دونوں اشکالات، یعنی ایک تو وہی تاریخی اشکال بنی اسرائیل کی حکومت مصر سے متعلق، دوسرا کلامی اشکال توریت و انجیل کے درجۂ تنزیلی سے متعلق، بار بار کہنا اور کھل کر کہنا سوءِ ادب کا پہلو رکھتا تھا، پھر بھی ایک بار اور ذرا بسط و تفصیل سے عرض کرنے کی ہمت کر لی ——— یہ ۱۴ ار اکتوبر کا نیاز نامہ مع جواب ضخامت کے لحاظ سے مکتوب نہیں ایک رسالچہ ہے :-

م۔ پچھلے والا نامہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مصر پر قبضۂ بنی اسرائیل خود قرآن مجید سے معلوم ہوتا

ہے۔ فی الشعراء بعد قولہ فاخرجناھم واورثناھا بنی اسرائیل فھو نص اسیلاء بنی اسرائیل علی ملک فرعون

بادب گذارش ہے کہ اس بارہ میں اس کا نص ہونا ہی تو محل گفتگو ہے۔ اور ثناھا میں ھا کی تفسیر یہ بھی تو ممکن ہے کہ جنات وعیون وکنوز مطلق صورت میں مراد لئے جائیں نہ کہ خاص فرعونیوں ہی کے جنات وعیون وکنوز چنانچہ شام میں یہ سب چیزیں مل کر رہیں۔ پہلی تفسیر پر تاریخی حیثیت سے سخت اشکال وارد ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کی بادشاہت اور حکومت ملک فرعون پر، صدیوں بعد تک، تاریخ سے بدرجۂ ضعیف بھی ثابت نہیں۔ تفسیر حقانی کی ایک عبارت سے میرے مفہوم کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔ اس لئے اسے نقل کرتا ہوں:۔

"اس مقام پر اکثر لوگوں کو دھوکا ہو گیا ہے کہ اورثناھا بنی اسرائیل میں ھا کی ضمیر کو فرعونیوں کے خاص جنات و عیون و کنوز و مقام کریم کی طرف پھرایا ہے، اور اس کی تفسیر میں کہہ دیا ہے کہ فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد ان کے باغوں اور عمدہ مقامات کے بنی اسرائیل پھر لوٹ کر مالک ہو گئے تھے، حالانکہ یہ بات نہیں ہوئی کس لئے کہ تمام اہل تاریخ اس پر متفق ہیں کہ دریائے قلزم کو عبور کر کے بنی اسرائیل چالیس برس تک تیہ میں ٹکراتے پھرے، مصر میں واپس نہ آئے۔ اور نیز اس فرعون کے بعد دوسرا فرعون تخت پر بیٹھا ہے۔ اس کی سلطنت کا خاتمہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھ سے سیکڑوں برس بعد ہوا۔ صحیح توجیہ جیسا کہ بیضاوی فرماتے ہیں یہ ہے، کذالک اورثنا مثل ذالک المقام الذی کان لہم فعلی (انہ صنعۃ) مقام اس تقدیر پر یہ معنی صاف ہو گئے کہ ایسے مقامات کا ہم نے بنی اسرائیل کو وارث بنا یعنی مالک کر دیا۔ یعنی ملک شام فلسطین میں ہم نے ان کو بھی ایسے ہی عمدہ مقامات اور باغ اور چشمے اور خزانے عطا کئے جیسا کہ فرعون کے پاس تھے۔ خلاصہ یہ کہ ان عمدہ مقامات سے ان کو نکالا اور ایسے عمدہ مقامات بنی اسرائیل کو عطا کئے گئے"

یہ عبارت متن حقانی کی تھی۔ ایک طویل حاشیہ میں اسی مضمون کی اور زیادہ صراحت کی ہے۔

١- الجواب: في روح المعاني قوله في البقرة اهبطوا مصرا - حكي عن اشهب انه
قال قال لي مالك هي مصر مسكن فرعون فيه اذا علم ان اسماء المواضع قد تغير من حيث المكانية
فمتذكر وقد تغير من حيث الارضية وتؤنث فهو ان جعل علما فاما باعتبار كونه بلدة فالمنع
مع العلمية والتانيث بسكون الوسط واما باعتبار كونه بلدا فالصرف على بابه اذ الفرعية
الواحدة لا تكفي في منع ويؤيده ما قاله الامام مالك رحمه الله في مصحف ابن مسعود مصر بلا الف
بعد الراء (روح فيه) قوله تعالى في بني اسرائيل فاراد ان يستفزهم من الارض اي ارض
مصر التي هم فيها او من جميع الارض ويلزمهم اخراجهم من ذلك قتلهم واستيصالهم الى قوله
تعالى اسكنوا الارض التي اراد ان يستفزكم منها وهي ارض مصر وهذا ظاهر ان ثبت
انهم دخلوها بعد ان خرجوا منها واتبعهم فرعون وجنوده فاغرقوا او ان لم يثبت فالمراد
من بني اسرائيل ذرية اولئك الذين اراد فرعون استفزازهم واختار غير واحد ان
المراد من الارض الارض المقدسة وهي ارض شام (روح فيه) سورة الشعراء قوله تعالى
واورثناها بني اسرائيل قال الواحدي ان الله تعالى رد بني اسرائيل الى مصر بعد ما
اغرق فرعون وقومه فاعطاهم جميع ما كان لقوم فرعون من الاموال والعقار
والمساكن الى ان قال وما ذكر عن الواحدي من ان الله تعالى رد بني اسرائيل الى مصر
بعد ما اغرق فرعون وقومه ظاهره وقوع ذلك بعد الغرق من غير تطاول مدة واظهر
منه في هذا ما روي عن الحسن قال لما عبروا البحر رجعوا وورثوا اموال القبط وذهب
الباقون مع موسى عليه السلام الى ارض الشام وقيل انهم بعد ما جاوزوا البحر ذهبوا الى
الشام لم يدخلوا مصر في حيوة موسى عليه السلام وملكوها زمن سليمان عليه السلام
والمذكور في التوراة التي بايدي اليهود اليوم صريح في انهم بعد ان جاوزوا البحر
توجهوا الى ارض الشام وقد فصلت قصة ذهابهم اليها في التواريخ على هذا وظواهر كثير
من الآيات تقتضي ما ذكره الواحدي والله اعلم وقلت ومع الواحدي الحسن وبعض الكتب

روح۹، سورۃ الدخان ...... قوله تعالى وأورثناها قوماً آخرين والمراد بالقوم الآخرين بنو إسرائيل وهم مغايرون للقبط جنساً وديناً ونظير ذلك قوله تعالى في سورة الشعراء كذلك وأورثناها بني إسرائيل وظاهره أن بني إسرائيل رجعوا إلى مصر بعد هلاك فرعون وملكوها وبه قال الحسن وقيل المراد بهم غير بني إسرائيل ممن ملك مصر بعد هلاك القبط وإليه ذهب قتادة قال لم يرد في مشهور التواريخ أن بني إسرائيل رجعوا إلى مصر ولا أنهم ملكوها قط وأوّل ما في سورة الشعراء بأنه من باب وما يعمر من معمر ولا ينقص من عمره وقولك عندي درهم ونصفه فليس المراد خصوص ما تركوه بل نوعه وشبهه والإيراث الإعطاء وقيل المراد من إيراثها إياهم تمكينهم من التصرف فيها ولا يتوقف ذلك على رجوعهم إلى مصر كما كانوا فيها أولاً وأخذ جمع بقول الحسن وقالوا لا اعتبار بالتواريخ وكذا الكتب التي بيد اليهود اليوم لما أن الكذب فيها كثير وحسبنا كتاب الله تعالى وهو سبحانه أصدق القائلين وكتابه جل وعلا مأمون من تحريف المحرفين۔

ان عبارات سے مفہوم ہوتا ہے کہ اِس باب میں اقوال مختلف ہیں۔ اور ان کے راجح مرجوح ہونے میں بھی اختلاف ہے۔ میری تفسیر بعض اقوال پر مبنی ہے جس میں امام مالک اور روح المعانی اور حسن بھی متفق ہیں۔ اور صاحب رُوح نے ظاہر الفاظ آیات کا مدلول اسی کو قرار دیا ہے اور تاریخ یہود کی حجیت کا انکار کیا ہے۔ مگر ظاہر کا نص ہونا لازم نہیں۔ اس لئے دوسرے قول کی بھی گنجایش ہے۔ اگر دوسرے قول کو لیا جائے تو جعلکم ملوکاً کا حمل مجاز پر ضروری ہے۔ میرے نزدیک فیصلہ یہ ہے کہ اپنے لئے تو مالک اور حسن کا قول لینا احسن ہے اور مخالفین کے لئے قتادہ کا قول لینا مناسب ہے۔ اب دونوں راہیں کشادہ ہیں۔ میں نے سابق جواب مجمل طور پر آیات کو دیکھ کر لکھ دیا تھا ان کو ظاہر پر محمول کرکے۔ اور اس وقت تفاسیر کو دیکھ کر کسی قدر مفصل لکھا گیا۔ واللہ اعلم۔“

طویل عریضہ اب بھی ختم نہیں ہوا۔ کئی اہم مسئلے باقی رہ گئے۔ وہ سب اِس نمبر میں ملاحظہ ہوں۔

م ۲ وحی قرآنی اور دُوسری کتُب آسمانی سے متعلق پچھلے عریضہ میں جو کچھ عرض کیا تھا، اِس سلسلہ میں ایک بات اور ذہن میں آئی۔ آیات قرآنی کے متبع سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآنی کے لئے قرآن مجید میں مصدر تنزیل آیا ہے، اور دُوسری کتابوں کے لئے عموماً انزال یا اتیان۔ اگر کہیں لُغت سے اِس کی سند مِل جائے کہ انزال عام ہے ہر القاء کے لئے۔ اور تنزیل مخصوص ہے وحی لفظی کے لئے۔ تو مسئلہ اور زیادہ صاف ہو جائے۔

ا۔ شاید تلاش سے مِل جائے، باقی مشہور فرق تو یہ ہے کہ تفعیل تدریج کے لئے ہے اور اِفعال عام ہے۔ قرآن مجید چونکہ تدریجاً نازل ہوا اس لئے اِس کے لئے باب تنزیل وارد کیا گیا بر خلاف دیگر کتُب کے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اِسی پر مبنی ہے۔ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا دُوسرے انزال جب دونوں کو عام ہے تو اس سے وحی لفظی کا جیسے اثبات نہیں ہوتا اُس کی نفی بھی نہیں ہوتی۔ اور خط سابق میں کَتَبْنَا کا الواح و توراۃ ہر دو میں آنا لکھ چکا ہوں۔ واللہ اعلم۔

م۔ شملہ میں کچھ انگریزی دان مُسلمانوں نے مجلس قرآنی کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے۔ بظاہر خوش عقیدہ اہل سُنّت معلوم ہوتے ہیں۔ ہمّت کرکے انگریزی میں ترجمۂ کلام پاک مع حواشی پارۂ اوّل شایع کر دیا ہے۔ خبر سے تو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ مگر پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ حسنِ نیّت کا اجر جتنا بھی کما لیں، باقی کام کام کی حیثیّت سے بہت پست ہوا ہے۔ ایک تو انگریزی غلط سلط، دُوسرے خود قرآن کے سمجھنے میں، ترکیب نحوی نہ سمجھنے سے بڑی غلطیاں کی ہیں۔ تیسرے حواشی میں مخاطبین کے مذاق کا ذرا بھی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ افراط عقیدت سے کام لے کر رطب و یابس سبھی کچھ نقل کر دیا ہے۔ مولوی محمد علی لاہوری کے بالکل برعکس دریہ سربید سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر ہیں کہ مسئلہ بجائے خود کیسا ہی کمزور ہو لیکن

بیان اِس انداز سے کریں گے کہ انگریزی خوانوں کے دِل میں اُتر جائے) یہ مترجم حضرات قصص الانبیاء کی روایتیں نقل کرتے چلے گئے ہیں۔

۱۔ افسوس ہوا۔ اگر نرم شفقت کے لہجہ میں اُن کو ایک خط لکھ دیا جائے تو شاید اصلاح ہو جائے۔

۲۔ ایک انگریز کا یہ اعتراض ابھی علم میں آیا کہ سورۃ الفتح میں بما عاهد عليه الله میں ضمیرہ کا اعراب بالضم غلط ہے، بالکسر ہونا چاہیئے مسلمان نحوی محض قرآن کے احترام میں خاموش ہیں۔ سرسری جواب میرے ذہن میں یہ آیا ہے کہ قرأۃ جمہور پر تو یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ تفسیر شوکانی میں ہے قرأ الجمهور عليه بكسر الهاء وقرأ حفص والزهري بضمها۔ لیکن ضرورت اِس سے شافی تر جواب کی ہے اور قواعد نحوی میں میری نگاہ نہایت قاصر ہے۔

۱۔ میری بھی نحو میں زیادہ نظر نہیں مگر کسی نحوی ماہر سے مراجعت ضروری ہے، اس وقت سرسری طور پر شرح المعانی سے مختصراً نقل کئے دیتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگی۔ وہو ہذا۔

قرأ الجمهور عليه بكسر الهاء كما هو الشائع وضمها حفص هنا۔ قيل وجه الضم انها هاء وهو هي مضمومة فاستصحب ذلك كما في له وضربه ووجه الكسر رعاية الياء وكذا في اليه وفيه وكذا في ما اذا كان قبلها كسرة نحوية ومررت بغلامه . . . .

. . . . ثم قال الاستاذ من

الكسر الى الضم وحسن الضم فى الآية التوسل به الى تفخيم لفظ الجلالة الملائم لتفخيم امر العهد المشعر به الكلام وايضا ابقاء ما كان على ما كان ملائم للوفاء بالعهد وعدم نقضه الخ۔ قلت قولنا الملائم

اور قرأت سب متواتر ہیں حفص کا تفرد اس میں قادح نہیں اور متواتر کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اور بیچارہ انگریز نحو وادب اہل لسان کے مقابلہ میں کیا جانے۔ اور وہ سرسری جواب اِس لئے کافی نہیں کہ اس سے حفص کی تغلیط نقل لازم آتی ہے جس میں تواتر کا انکار ہے۔ نیز علیہم میں دوسرے قراء نے جو جمہور ہیں داخل ہیں بضم ہاء پڑھا ہے تو کیا وہاں اُن کی تغلیط کریں گے۔ سب قراء متواتر کے راوی ہیں محض اجتہاد سے نہیں پڑھتے۔

م - پچھلے خط میں میں نے عرض کیا تھا کہ گھر میں خواب میں دیکھا کہ جیسے حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوئی - جاگنے پر تفصیل یاد نہ رہی - اِس پر ارشاد ہوا تھا کہ "مبارک ہو - ایسا ممکن ہے جس کی حقیقت غامض ہے - اگر کوئی سوال ہوتا تو غالباً کچھ عرض کر سکتا" سوال اب عرض کرتا ہوں - اگر یہ طویل عریضہ بارِ خاطر نہ ہو چکا ہو تو مختصراً اِس خواب کی حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے -

ا - یہ تجلی مثالی ہے - جیسے موسیٰ علیہ السلام کو بصورتِ نار ہوئی، اور جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں احسن صورت میں ہوئی - غیر محقق صوفی اِس میں اتحاد یا حلول کے قائل ہو گئے - اور محققین اس کو تجلی و ظہور اور اِس صورت کو مظہر کہتے ہیں - جس کی حقیقت ظہور شئے فی شئے متناسب لہ فی صفۃ مع بقاءہ علیٰ حقیقتہ بصفتہ الاصلیہ - اِس سے زیادہ زبانی عرض کر سکتا ہوں تحریر کافی نہیں -

اطلاع متعلق ترجمہ آیت وَجَعَلَكُمْ مَّلُوكًا -

میں نے اِس کے متعلق ایک حاشیہ لکھ دیا ہے جو اِس موقع پر تو نہیں چھپ سکتا، کیونکہ وہ جلد چھپنے گئی ہے - اِس کے یا مجموعہ تفسیر کے اخیر میں بہ قید حوالہ چھپ جائے گا - وہو ہذا :-

یہ ترجمہ صاحب ملاک اِس صورت میں ہے جب فتح شام سے پہلے مصر پر ان کا قبضہ ثابت ہو جائے اور دوسرے قول میں اِس ترجمہ کے اوّل میں لفظ جیسے جو تشبیہ کے لئے ہے بڑھا دیا جائے اور بین القوسین عبارت ذیل بڑھا دی جائے -

(یعنی کسی کی رعیت ہونے سے آزاد)

"تتمۃ الجواب - بعد تحریر جواب بالا ایک دوست نے اعراب القرآن[1] کی طرف رجوع کیا جو مسائل نحو میں مسلّم صحت ہے - اِس میں اس کے متعلق ایک مستقل فصل ملی جس میں سے بقدر ضرورت ذیل میں نقل کرتا ہوں - اِس سے مسئلہ صاف ہو گیا کہ اِس موقع پر ضمہ ہی اصل ہے، اور کسرہ خلاف اصل ہے - حتیٰ کہ جہاں ضمہ متعین ہے وہاں کسرہ جائز نہیں - جیسے لہٗ میں مثلاً - اور جہاں کسرہ مستعمل ہے وہاں ضمہ بھی جائز ہے جیسے بہٖ میں مثلاً - تو کسرہ میں تو ایسے سوال کا احتمال ہے اگرچہ مرفوع ہے اور

---

[1] کتاب اور مصنف کا پورا نام - اعراب القرآن - از ابو البقاء عبد اللہ بن حسن العکبری -

ضمہ میں اس کا احتمال ہی نہیں۔ والعبارۃ ہٰذہ:-

(الاصل فی ھٰذہ الہاء الضم لانہا تضم بعد الفتحۃ والضمۃ . والسکون نحو انہ وله وغلامه ویسمعه ومنه. . . وانما یجوز الکسر بعد الہاء نحو علیہم وابدیہم وبعد الکسرۃ نحو به وبدارہ وضمہا فی الموضعین جائز لانه الاصل وانما کسرت لتجانس ما قبلہا من الیاء والکسرۃ بکل قد قرئی (وقال بعدہ باسطر) ومن ضم الہاء قال ان الہاء فی علیه حقہا ان تکون الفاً کما تثبت الالف مع المظہر ولیست الیاء اصلاً الا الالف فکما ان الہاء تضم بعد الالف فکذالک تنضم بعد الیاء المبدلة منہا ومن کسر الہاء اعتبر اللفظ اعراب القرآن قبیل سورۃ البقرہ فی فصل مستقل)

اب کی بار خلاف معمول ذرا دیر ہوئی۔ کتاب دیکھنے کی فرصت نہ ملی تھی۔ باقی خیریت ہے۔ دُعا کرتا ہوں اور دُعا چاہتا ہوں۔"

جس تاخیر کی معذرت فرمائی گئی ہے وہ کچھ ایسی تاخیر بھی نہ تھی۔ ۲۴ اکتوبر کو خط روانہ کیا ہوا تھا، اور ۳۰ اکتوبر کو یہ لمبا چوڑا جواب، رسالہ نما، موصول ہو گیا تھا۔ جتنی عربی عبارتیں اس میں درج تھیں، صرف ان کی نقل ہی میں کتنی دیر لگی ہوگی! مجھے تو اس نقل کی نقل کرنی پڑی، تو گھنٹے لگ گئے، اور محض نقل ہی کا کام ایک دن میں نہ ہو پایا۔ پھر کتابوں کی تلاش اور مطالعہ میں جو وقت صرف ہوا ہوگا، کوئی اس کا حساب تو لگائے۔ اور پھر جب حضرت کا سن و سال اور سارے اشغال بھی ذہن میں رہیں! ——— ایک طرف قلب اس جذبۂ تشکر سے لبریز۔ لیکن دوسری طرف حضرت کا یہ ارشاد دل میں ذرا بھی نہ اُترا کہ مسئلہ مصر و بنی اسرائیل میں حسن تابعی و مالک فقیہ و محدث کا قول جو تاریخ کے تمام تر خلاف ہے، قابل استناد و احتجاج ہے۔ اب کی جو خط لکھا اس میں باوجود کمال ممنونیت و شکرگزاری کے اپنے اس شبہہ کو بھی پیش کر دیا۔ اور اس خط پر تاریخ ۷ نومبر کی ہے۔

م ۔ پچھلا مفصّل گرامی نامہ کئی روز ہوئے سرفراز کر چکا، اس کے بعد اس کا ضمیمہ بشکل کارڈ بھی موصول ہوا[1]۔ یہ عریضہ اظہارِ تشکّر کے لئے ہے۔ اتنے مفصّل جوابات، خصوصاً اتنی طویل عبارات کی نقل میں جیسی کچھ مشقّت جناب کو اُٹھانی پڑی ہوگی، بالکل ظاہر ہے۔ رہ رہ کر ندامت ہوتی ہے کہ کیوں بار بار اس قدر بار ڈالنے کا سبب بنتا ہوں۔

ا ۔ میں خود ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ کو ثواب دلوایا۔ پھر خود میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ میری تفسیر کا مقام درست ہو گیا۔ اسی میں لُطف ہے کہ میں آپ کا ممنون ہوں اور آپ میرے لئے دُعا فرمائیے۔

م ۔ اتنا تعب وہی شخص برداشت کر سکتا ہے جو مَیں و تو کے جھگڑے کو مٹا چکا ہو اور کام کو اللہ ہی کا کام سمجھ کر کرتا ہو۔ ورنہ عام تجربہ تو یہ ہے کہ لوگ دوسرے کے کام میں معمولی امداد دینے سے بھی پہلو تہی کرتے ہیں چہ جائیکہ اتنی محنت شاقہ برداشت کرنا۔ جزائے خیر وہی دے گا جس کا کام آپ نے کیا ہے۔

ا ۔ یہ سب آپ کا حُسن ظن ہے۔ ورنہ مجھ کو خود اپنی نیّت میں شُبہ ہے کہ ماجد کا رضاء مقصود ہے یا عبدالماجد کا۔

م ۔ اب ایک سوال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ پچھلے گرامی نامہ کا حاصل یہ ہے کہ مصر پر بنی اسرائیل کا قبضہ گو تاریخ سے ثابت نہ ہو لیکن حسنؒ اور مالکؒ وغیرہما کے اقوال اس جانب بھی ہیں، اس لئے جمع بین القولین کرنا چاہیئے۔ بس اسی اصل کو ذرا سمجھنا چاہتا ہوں۔ حسنؒ اور مالکؒ یقیناً اکابر اُمّت میں سے ہیں، اور ان سے بدعقیدگی میں عین اپنی محرومی سمجھتا ہوں لیکن گزارش یہ ہے کہ علوم دین کے دائرہ سے باہر ان حضرات کے قول کو اتنی وقعت ہی کیوں دی جائے۔ کسی طبّی مسئلہ میں ایک طرف اگر جالینوس و بقراط کی رائے ہو جو کھلے ہوئے مُشرک تھے اور

---

[1] سخت افسوس ہے کہ یہ کارڈ بڑی تلاش پر بھی نہ ملا۔

دوسری طرف انھیں اولیائے اُمّت کی، تو ان اطباء ماہرین کی رائے کو اختیار کرنا اور ان مقبولین کی رائے کو ترک کر دینا بے ادبی کیسے قرار پائے گا۔

ایک اور مثال عرض کر دوں، جو میرے علم میں حال ہی میں آئی ہے۔ موضح قرآن[1] میں شاہ صاحبؒ نے لاقرب من ہٰذا رشدًا کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ قصۂ اصحاب کہف توریت میں درج ہے۔ حالانکہ تاریخ کا مسلّم ہے کہ یہ واقعہ عہد موسوی تو کجا، عہد عیسوی سے بھی بعد کا ہے۔ اُس وقت کے رُومی بادشاہ کا نام اقیانوس تھا جو مُشرک تھا اور جس کا زمانہ تقریباً ۲۵۰ء کا ہوا ہے۔ تو حضرت شاہ صاحب کا علم، فضل اور مرتبۂ ولایت بالکل تسلیم، لیکن ان کے اِس قول سے یکسر انکار کر دینا کیسے اُن کے کمالات کا قادح ہو سکتا ہے۔

آنکھ بند کر کے بے چون و چرا مان لینے والی عظمت، مجھ ناسمجھ کی سمجھ میں بس یا تو نص قرآنی کی ہو سکتی ہے، اور یا پھر مُستند قول رسُول کی۔ باقی اکابر اُمّت میں سے تو بڑے سے بڑے محقق کے لئے بھی خطا و لغزش کا امکان لگا ہوا ہے خصوصاً اِن علوم و فنون میں جو دینیات سے باہر ہیں۔"

ا۔ میں حرفاً حرفاً آپ کے اِس خیال سے متفق ہوں اور آج سے نہیں، سالہا سال پہلے سے میں اپنی تقریرات میں بارہا اس کا اظہار بلاخوف لومۃ لائم کر چکا ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میرا وہ جواب اِس تحقیق کے معارض ہے، میں تو بالکل اس کے ساتھ متفق پاتا ہوں۔ مکرر نظر فرمائیں۔ اِس میں تصریح ہے کہ اس میں اختلاف ہے، میری تفسیر ایک قول پر مبنی ہے اور یہ قول ظاہر الفاظ قرآنیہ کے قریب ہے۔ گو نص نہیں مگر ظاہر کی نفی نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے اِس قول کی بھی گنجائش ہے۔ اور اس قول والوں کو تاریخ یہود کی حجیت کا انکار ہے۔ اور دُوسرا قول ہے جس میں تاریخ کی صحت کی تسلیم پر ترجمہ بدل دیا ہے تو دونوں قول میں گنجائش کی تصریح ہو گئی۔ البتہ ترجیح کا حکم میں نے نہیں کیا کیونکہ تاریخ مذکور ایسی حجت نہیں۔ باقی جمع بین القولین کا تو میرے کلام میں پتہ بھی نہیں۔ شاید سہل فیصلہ کے عنوان سے جو عبارت میں نے

---

[1] یعنی مترجم قرآن حضرت شاہ عبدالقادرؒ دہلوی۔

لکھی ہے اس سے شبہہ ہوا ہو۔ مگر یہ جمع قولین نہیں ہے بلکہ ایک ہی قول کو لینے کا مشورہ دیا لیکن اس طرح کہ اگر اپنا نفس تاریخ کے غلط ہونے کو تسلیم کرسکے تو مالک کا قول لیا جاوے اور جو مخاطب اس کو تسلیم نہ کرے تو قتادہ کا قول لے لیا جاوے۔ اس کو جمع بین القولین نہیں کہا جا سکتا۔

جدید اطلاع۔ ایک بار میں نے آپ کو ایک مجمل مسودہ یہاں آنے والوں کے متعلق ایک نئے دستور العمل کا سنایا تھا، آپ نے اس کو پسند فرمایا تھا۔ میں نے اس کو دستی پریس میں چھپوا لیا، اور پانسو سے زیادہ دہلی چھاپنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کے لئے ملفوف ہے آنے سے پہلے عازمین کو اس کی اطلاع کر دیا کروں گا تاکہ اوّل سے آخر تک سب مراتب کا احاطہ کرکے بصیرت کے ساتھ آویں، حیرت اور پریشانی نہ ہو۔ یہ تمام عبارت بلا قصد مقفیٰ ہوگئی۔

"اطلاع برائے عازمین تھانہ بھون" اس عنوان سے ایک چھوٹا سا پرچہ جامع ملفوظ حضرت نے آنے والوں اور راہنی دونوں کی سہولت و راحت کے خیال سے اس وقت چھپوا لیا تھا۔ اتفاق سے اس کی عبارت مقفیٰ ہوگئی تھی۔ والا نامہ کی آخری سطر میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت کو ڈاک کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ لیکن ڈاک خانہ اور ریل کے انتظامات بھی بہرحال بشری ہی انتظامات ہیں۔ کبھی کبھی گڑبڑ ہو جانا ناگزیر ہے۔ ۷ نومبر کے مذکورہ بالا عریضہ کے بعد، نومبر ہی میں ایک اور مفصل خط لکھا۔ جواب راستہ ہی میں ضایع ہوگیا۔ دو ہفتہ کے انتظار کے بعد دوسرا خط ۱۲ دسمبر (مطابق ۱۴ رمضان ۱۳۵۰ھ) کو لکھا۔ اسے ملاحظہ فرمائیں ـــــ شیخ الہند کے ترجمۃ القرآن پر استاذ العلماء مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی مدینہ پریس (بجنور) سے چھپ کر ابھی ابھی آچکے تھے۔

م یہ دو ہفتے ہوئے عریضہ روانہ کیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جواب عنایت نہ ہو۔ لامحالہ یہی ہوا کہ ڈاک والوں نے ڈاکہ ڈالا ادھر سے یا ادھر سے۔ بہرحال آج پھر ان ہی معروضات کو چند جدید اضافوں کے ساتھ دہراتا ہوں۔

ا۔ خط آیا تھا اور اگلے ہی روز جواب روانہ ہوگیا تھا۔ حیرت ہے کہاں ضائع ہوا۔

م۔ مولوی عبدالکریم صاحب کا مضمون مفتی کفایت اللہ صاحب کے جواب میں قابلِ داد ہے[۵]۔ جوابی مضمون میں اتنی متانت قائم رکھنا خاص آستانِ اشرفی کا فیض ہے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔

ا۔ یہ سب بزرگوں کی برکت ہے۔ میں کیا میرا اثر کیا۔

م۔ اشاعت البتہ ایک غلط اخبار (الامان) میں ہوئی۔

ا۔ اس میں مولوی عبدالکریم کا دخل نہیں۔ انھوں نے تو دیوبند والوں کے سپرد کر دیا تھا۔ آگے کچھ خبر نہیں۔ یہ خود اُن کا بیان ہے۔

م۔ مولانا شبیر احمد عثمانی[۶] صاحب کے حواشی تفسیری شائع ہوگئے۔ میری فہم ناقص میں تو بہت اچھے ہیں۔ میرے کام کے ہیں۔ اب تک اُردو تفسیروں اور ترجموں میں معتدبہ مدد صرف بیان القرآن سے مل رہی تھی۔ اب اس کے بعد ان حواشی کا نمبر ہے۔ کاہل باطل کے اشتباہات و مغالطات کو خوب پیش نظر رکھا ہے۔

ا۔ جی خوش ہوا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے نافع بنا دے۔ آپ سے یہ معلوم کر کے میری رائے زیادہ نرم ہوگئی۔ وہ یہاں آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ بہت سے ذرائع سے کام لے رہے ہیں۔ اس ایک ذریعہ کا اور اضافہ ہوا۔

---

[۵] یہ مولوی عبدالکریم صاحب علاقہ پنجاب کے رہنے والے حضرت کے خاص مستر شدین میں تھے۔ ایک عالم کی حیثیت سے خانقاہ تھانہ بھون میں اکثر مقیم رہتے اور کبھی تبلیغ کا، کبھی فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہتے۔ اب بالکل یاد نہیں رہا کہ وہ مضمون کون سا تھا جس کا یہاں ذکر ہے۔

[۶] مولانا عثمانی حضرت کے خلیفۂ خاص تھے۔ مگر تحریک خلافت وغیرہ کے سلسلہ میں آپس میں کشیدگی ہوگئی تھی۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا کے لئے مراسلت و مجالست وغیرہ کی ممانعت حضرت کی طرف سے ہوگئی تھی۔ الحمدللہ کہ اس کے کچھ ہی روز بعد دین کے ان دو بڑے خادموں کے درمیان از سر نو لطف قائم ہوگیا۔ ؎ درمیان جان و جانان ماجرائے رفت رفت۔

م۔ یہود عقیدہ عزیر ابن اللہ سے اپنی بالکل بَری کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے اوپر خواہ مخواہ تھوپ دیا گیا ہے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ خالص مسیحی قسم کا ہے۔ ہمیں اس سے مس نہیں۔ میرے ذہن ناقص میں یہ جواب آیا ہے کہ ولد اور ابن دونوں کے مفہوم میں فرق ہے، لغوی حیثیت سے بھی اور محاورۂ قرآن و توریت میں بھی۔ ولد کا اردو ترجمہ بیٹا ہے یعنی صلبی اولاد۔ جیسا کہ مسیحی حضرت مسیحؑ کو ولد اللہ کہتے ہیں۔ ابن کے معنی اس سے وسیع تر ہیں، جو فرزند معنوی و مجازی کو بھی شامل ہے۔ جیسے اردو میں لاڈلا یا چہیتا۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ دونوں اپنے کو ابناء اللہ اسی معنی میں کہتے تھے، یعنی ہمیں حضرت حق کے ساتھ وہ قربِ خاصہ حاصل ہے جو اور کسی مخلوق کو نہیں۔ قرآن مجید نے ضلالت تو عقیدۂ ولدیت و عقیدۂ ابنیت دونوں کو بتایا ہے لیکن ولدیت کو بالکل بجا طور پر مسیحیوں کے ساتھ مخصوص رکھا ہے۔

یہود کے ہاں حضرت عزیرؑ کے متعلق عقیدت کا غلو ضرور ملتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے عملاً ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا، اُن کے لائے ہوئے نوشتے جل کر برباد ہو گئے۔ اب توریت وغیرہ جو کچھ موجود ہے، سب حضرت عزیرؑ کی مرتب کی ہوئی ہے، عملاً ہمارا تعلق بس اُن ہی سے ہے جس جس طرح ہمارے یہاں کے غالی اور جاہل مشائخ عملاً اپنا تعلق فلاں چشتی اور فلاں قادری بزرگ پر ختم کر دیتے ہیں، اور اس سے آگے نہیں بڑھتے، نصاریٰ کہتے ہوں گے[1] کہ ہم مسیح کے سوا اور کسی کو نہیں جانتے۔ اور یہود کہتے ہوں گے کہ ہم عزیرؑ کے سوا کسی کو نہیں مانتے۔ آیت قرآنی میں کیا عجب کہ یہی مفہوم ادا فرمایا گیا ہو۔

ا۔ میں نے جواب میں اس توجیہ کی پسندیدگی عرض کی تھی۔ اور اس توجیہ کے خلاصہ کی جو خط کشیدہ عبارت میں ادا کیا گیا ہے۔ تائید اسی آیت سے لکھی تھی وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ اور یہ سب جب ہے کہ یہود کو اس بَری میں سچا سمجھا جائے ورنہ اُن کا کیا اعتبار اور ممکن ہے کہ کوئی خاص فرقہ اس کا بھی قائل ہو۔

---

[1] حضرت نے میری اس عبارت "نصاریٰ کہتے ... ... کہتے ہوں گے" کو زیر خط کر دیا تھا۔

پھر اس کا سلسلہ قطع ہو گیا ہو۔"

(۷۹)

خط کے بعض ذاتی اجزاء باقی رہ گئے۔ وہ اب درج ہوتے ہیں:۔

م ۲۔ دو فقہی مسئلے بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک اپنے لئے، ایک والدہ ماجدہ کے لئے۔ اپنے لئے تو یہ کہ سردی میں پیر بہت پھٹ جاتے ہیں۔ وضو کے لئے بار بار پیر دھونے میں اچھی خاصی تکلیف ہوتی ہے۔ چرمی موزوں کا تجربہ کیا۔ وہ بھی کچھ زیادہ آرام دہ نہ ثابت ہوئے۔ اونی یا سوتی پا تابہ پر مسح کر لینے کی کیا کوئی گنجایش نہیں نکل سکتی۔

ا۔ اِن کے تلے میں اور پنجہ پر چمڑا لگا لیا جائے، گو اس میں بھی بعض قیود و شروط کے اعتبار سے کچھ کلام ہو گیا ہے۔ لیکن کم از کم مسِ قرآن کے لئے تو گنجایش ہو سکتی ہے۔ نماز کے لئے پاؤں دھو لئے جائیں۔

م۔ والدہ ماجدہ خدا کے فضل سے بڑی پختہ دیندار ہیں۔ اِس ضعیفی میں بھی فرض روزے کیا، محرّم، شعبان، ذی الحجہ وغیرہ کے بھی نہیں چھوٹنے پاتے۔ لیکن رضاعت کے سلسلہ میں ۵ سال کے روزے اُن سے چھوٹے ہوئے ہیں۔ اُن کا فدیہ تو اُسی زمانہ میں دے چکی ہیں۔ لیکن دل میں آتا ہے کہ جب خود قضا رکھنے پر قدرت تھی، تو قضا ہی کیوں نہ رکھ لئے، کیا یہ ممکن نہیں کہ اب جتنے نفلی روزے رکھتی ہیں اُن ہی کے لئے یہ نیّت کر لیں کہ وہ قضا میں محسوب کر لئے جائیں۔

ا۔ ماضی کے متعلق تو یہ نیّت بے اثر ہے۔ مستقبل میں ایسا بھی کر سکتی ہیں۔

ہاں خط سابق میں جناب بھائی صاحب کی مزاج پُرسی بھی کی تھی۔"

سال کا آخری خط ۳ دسمبر کا عریضہ ہے، متفرق مسائل پر شامل۔ اور جوابات حسب معمول لطف سے لبریز ہیں۔

م ۲۔ الہ آباد سے منشی عبد المجیب صاحب تحصیلدار[1] کے فرزند میاں حبیب الرحمٰن نے اپنی طویل

---

[1] حضرت کے بڑے مخلص مسترشدین میں تھے۔ اب زمانۂ پنشن قریب تھا۔ ان کے فرزند دوسرے رنگ کے تھے۔ داستان مصائب کا تعلق اُن کی خانگی زندگی سے تھا۔

داستانِ مصائب لکھی ہے۔ جناب کی خدمت میں بھی ضرور بھیجی ہوگی۔

ا۔ جی ہاں۔

م۔ خطائیں جیسی بھی ہوں، بیچارہ اب ہے قابلِ رحم۔ میرے توجہ میں ہے کہ اُن کے والدِ ماجد کی خدمت میں صرف یہ مصرعہ لکھ بھیجوں

برادہ منگر برکرم خویش نگر

لیکن میری تحریر کا اثر ہی کیا۔

ا۔ اثر کیوں نہ ہوتا۔ مگر بعض محل پر جُرم زیادہ مؤثر ہوتا ہے شفاعت سے۔ اِس تازہ واقعہ کی تو خبر نہیں۔ لیکن اس کے قبل کا حال معلوم ہے کہ ایسا ہی تھا مگر اُنھوں نے کرم کو غالب کر کے معاف کر دیا۔ مگر اُس بندۂ خدا نے اُس کی قدر نہ کی۔ اب شاید بُوڑھا زیادہ قابلِ رحم ہو۔

م۔ والا نامہ میں مولانا شبیر احمد صاحب کے متعلق الفاظ پڑھ کر دِل باغ باغ ہوگیا۔ پُوری مسرت اُس وقت ہوگی جب اُنھیں لُطف و انبساط کے ساتھ خانقاہ میں حاضر دیکھ لوں۔

ا۔ اب جتنی دیر ہوگی اُدھر سے ہوگی، میں نے اپنی اصلی شرط کو چھوڑ دیا، اس کا بدل تجویز کر دیا۔ مگر بدل کا بدل نہیں ہوتا۔ ورنہ اصول سب پامال ہوجائیں گے۔

م۔ البتہ ایک سوال اِس ضمن میں استفادۃً کرنا چاہتا ہوں۔ تعلق بیعت کی حد تک تو حاضری کے قیود و شرائط بالکل بجا۔ لیکن اس تعلق خصوصی سے جب قطع نظر ہی کر لی جائے، اور محض یہ صُورت رہے کہ ایک خادمِ دین اپنے سے ایک بڑے خادمِ دین سے ملنے آرہا ہے تو اس میں کیا مضائقہ، اور اتنے کے لئے قیود و شرائط کیوں؟

ا۔ جدید شرط قید نہیں بلکہ رفع مانع ہے جو ضروری ہے۔ میں نے اِس حیثیت کے قیود کو بالکل اُٹھا دیا اب اِسی دوسری حیثیت سے ملوں گا۔ مگر اُس میں یہ شرط ضروری ہے کہ اُس پہلی حیثیت کی کوئی جھلک نہ ہو۔ حتّٰی کہ نہ میری تعظیم کریں، نہ مجھ سے استفادۃً کوئی سوال کریں، مساوی ہو کر آئیں ملیں۔

م۔ بھائی صاحب کو تین چار دن سے تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ رات کا بیشتر حصّہ بیٹھے ہی بیٹھے گذرتا ہے ضرور دُعا فرمائیں[1]۔

ا۔ دِل دُکھا۔ دِل سے دُعا ہے۔

م۔ ابھی چند روز ہوئے امریکہ سے انگریزی میں ایک کتاب عقائد و علوم و تاریخ یہود پر ۱۲ ضخیم جلدوں میں تقریباً ۰۰ ۲ سنہ میں آئی ہے[2]۔ حال کے بیسیوں عُلمائے یہود نے مِل کر لکھی ہے۔ کام کی بہت سی باتیں اس میں مِل گئیں۔ بعض وقت بڑی حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہمارے علماء نے بھی یہود و نصاریٰ کے ذخائر و اسفار کا مطالعہ کر لیا ہوتا۔ خُدا جانے کتنے موتی اِس سمندر سے نکال لاتے۔

ا۔ مگر بعض کے ڈوب جانے کا بھی ڈر تھا۔ اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو میں بھی متفق ہوں۔ مگر اس کا انتظام کیا ہو۔ اگر کوئی سہل صُورت ممکن ہو تحریک مناسب ہے۔

م۔ کیا عرض کروں مسیحیت کی مُشرکانہ حیثیت روز بروز واضح تر ہوتی جاتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے اِن "مسیحیوں" کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ تحریف و تلبیس تو یہود کے ہاں بھی بہت ہے، لیکن اس کے باوجود نفس توحید وہاں صحیح و سالم ملتی ہے اور عقیدۂ رسالت بھی ناقص شکل میں موجود ہے۔ بہ خلاف اس کے موجودہ مسیحیت تو تمام تر پولوس کا گڑھا ہوا ایک مذہب ہے۔ تمام تر رومی اور یُونانی مُشرک فلاسفہ سے متاثر۔ توحید و رسالت دونوں کی جڑ ہی یہاں کٹی ہوئی ہے۔

ا۔ ایسے ایسے جُملے مع کسی قدر مثالوں کے تفسیر میں لکھنے سے ایک درجہ میں فائدہ ہو گا اس کا ضرور خیال رکھیئے۔ جس کی سہل صورت یہ ہے کہ تفسیر کا ایک مقدمہ لکھئے اِس میں ایسے ایسے مضامین ہوں، آیندہ جو رائے ہو۔

---

[1] ضیق النفس کے شدید دَورے سردی کے موسم میں پڑتے تھے۔

[2] مراد جیوش انسائیکلو پیڈیا سے ہے۔

۳۴ء ختم ہو گیا۔ حضرت سے اصل تعلقات جولائی ۲۸ء سے شروع ہوئے تھے۔ اب اس مدت پر نظر کرتا ہوں تو قدرت خدا نظر آتی ہے! پہلی حاضری جب ہوئی ہے تو کیسے ڈرتے ڈرتے۔ اور پہلا عریضہ جب لکھا ہے تو کیسا سنبھل سنبھل کر! رفتہ رفتہ کیسا مانوس بلکہ کیسا گستاخ ہوتا گیا! علمی اور روحانی عظمت اب بھی قائم ہے بلکہ احترام تو شاید کچھ بڑھ ہی گیا ہے، لیکن ہیبت کی جگہ اب اُنس کی حکومت۔

۱۹۳۵ء

(۷۰)

جنوری ۱۹۳۵ء کی کوئی ۸ر تاریخ تھی کہ سال کا پہلا خط لکھا۔ اس کا جواب بھی ڈاک خانہ کی عنایت سے راستہ میں گم ہو گیا۔ انتظار کر کے ۲۳ر جنوری کو حسب ذیل عریضہ روانہ کیا:۔

م۔ خُدا جانے کون میرا ایسا دُشمن پیدا ہو گیا ہے جو جناب کے والا ناموں پر ڈاکہ ڈالنے لگا ہے۔ ایک والا نامہ ابھی چند ہی ہفتے ہوئے سیتاپور میں غائب ہو چکا تھا[۱]۔ دُوسری نوبت یہ ہے۔ کوئی دو ہفتے ہوئے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا، جس میں مولانا شبّیر احمد عُثمانی کے خط کا اقتباس تھا اپنا ایک خواب شب قدر سے متعلق درج کیا تھا، اور اور مضامین تھے۔ خُدا جانے وہ عریضہ راہ سے غائب ہوا یا اس کا جواب۔

ا۔ وہ تو پہنچا تھا، جواب ہی غائب ہوا۔

م۔ اب اِس کا کوئی علاج سمجھ میں نہیں آتا بجز اس کے کہ آیندہ ہر خط رجسٹری بھیجا کروں۔ مصارف میں زیادتی سہی، لیکن اذیّت قلب سے تو حفاظت رہے گی۔

ا۔ ایک دو بار اور دیکھ لیا جائے۔ ذرا ڈاک والوں کو بھی کہہ دیا جائے۔ پھر جو مصلحت ہو گی۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ لفافہ جوابی پر تین پیسہ کا ٹکٹ لگایا جائے[۲] کہ وہ بیرنگ ہو کر تو پہنچے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو نمبر ۶۷۔ [۲] اس وقت لفافہ کا ٹکٹ ۱ر کا تھا۔

م۔ اِس وقت تو صرف بیان القرآن کے تین مقامات پر توجہ عالی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔
جلد ۳ صفحہ ۶۵ لَشَهَادَتُنَا اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا یہاں شہادۃ کا ترجمہ قسم سے فرمایا گیا ہے اس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔ صراح اور قاموس میں تصریح ہے کہ اشہد کے معنی احلف ہیں۔ اور روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے اس کے معنی یمین کے نقل کئے ہیں۔

م۔ جلد ۳ صفحہ ۷۰۹۔ خیفاً کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ تفسیر میں یہ غلطی ہوئی کہ اس کے ترجمہ کو بین القوسین کر دیا۔ ناقل نے بین القوسین دیکھ کر ترجمہ سے خارج کر دیا۔ اِس کی یہ عبارت ہے۔ میں سب طریقوں سے یکسو ہو کر اپنا رُخ الخ یہ حنیفاً کا ترجمہ ہے دونوں طرف کے قوسین کاٹ دینا چاہیئے۔ بس ترجمہ متن میں رہ جائے گا۔

م۔ جلد ۳ ص ۰۰ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ۔ اِس پر آپ ہی کے قلم کا عربی حاشیہ ہے عبر بالاخفاء اشارۃ الیٰ ان قلوبہم کانت تصدق الخ میرے دل کو تو یہی مضمون بہت لگا لیکن ترجمہ اور تقریر ترجمہ کو پڑھ کر کسی کا ذہن اِس طرف نہ جائے گا۔ میری فہم ناقص میں حاشیہ والا مضمون متن میں آنا چاہیئے تھا۔

ا۔ اِس کا طریقہ ذہن میں نہیں آیا۔ آپ پوری عبارت بنا کر بتلا دیجئے تاکہ غور کر سکوں۔

س۔ ش کے متعلق مضمون مسرت و مقرون و حرت مشحون۔

عا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے۔ میں مکان پر تھا، سنتے ہی حاضر ہوا۔ میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل عریض تھا۔ بلا معتدل الخلقت پا کر قلب کو بہت انس ہوا۔ پھر ملاقات و مکالمت سے اُن کی تواضع و سادگی و رعایت جلیس دیکھ کر تو مسخر ہی ہو گیا۔ گیارہ بجے تشریف لائے۔ تین بجے واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا۔ ش سے یہی مراد ہے۔

عا۲۔ مولوی شبیر احمد صاحب نے ہمت کی کہ اعلان تجویز شدہ کو خود طویل بنا کر مجھ سے موافقت حاصل کر کے شائع کرا دیا۔ خود بھی آتے تھے مگر اعلان سے قبل ملنے بھی آئے تھے ہیں اکرام و احترام

ملا۔ باتیں بھی کیں۔ مگر کہلا بھیجا کہ ابھی بشاشت کا انتظار ہے جو اعلان پر موقوف ہے۔ جب اعلان آیا، وہ موجود نہ تھے ورنہ بُلا کر خود ملتا۔ اب آئیں گے تو بشاشت بھی ہوگی۔ البتہ یہ کہہ دوں گا کہ اب ملنا پہلی حیثیت سے نہیں۔ اِس لئے اب میرے ساتھ تعظیم یا استفادہ کا برتاؤ نہ کیا جائے، مساویانہ یا رندانہ برتاؤ رکھا جائے۔ اور اُن کو بھی چاہیئے کہ اِس کو قبول کریں۔ اور درخواست یہ کر دوں گا کہ اپنے کسی خادم یا معتقد کو ساتھ نہ لایا کریں۔ ش سے یہ مُراد ہے کہ

مکتوب گرامی کے اس آخری مضمون "س۔ ش" سے ظاہر ہے کہ حضرت کی کس درجہ عنایت شفقت اور بے تکلفی اِس نامہ سیاہ کے ساتھ تھی۔

اِس کے بعد کا جو عریضہ ۳۰ جنوری کا لکھا ہوا ہے، اُسے پڑھ پڑھ کر آج بھی لُطف آ رہا ہے اور اپنی جسارتوں پر کسی قدر حیرت بھی ہو رہی ہے۔ بلا انتظار مُلاحظہ ہو:۔

م۔ "س۔ ش" دونوں کی حاضری سے دلی مسرّت ہوئی۔ اللہ سب کو مبارک کرے۔ حسرت صرف اس کی رہی کہ بہ طور خبر کے صرف سُنا، بہ طور مشاہدہ کے خود نہ دیکھا۔

ا۔ واقعی بہت مسرور ہوتے۔ خُدا تعالیٰ پھر کوئی موقع عطا فرمائیں گے معلوم ہوا کہ مولوی شبیّر احمد صاحب آپ سے ملے ہی نہیں مگر مشتاق بہت ہیں۔[1]

م۔ پچھلے خط کا مضمون اوّل تو تمام و کمال یاد نہیں رہتا اور پھر اُسے دُہرا کر لکھنا جب خود اپنی طبیعت پر گراں پاتا ہوں تو جناب والا سے جوابات کے اعادہ کی جرأت کس طرح کر سکتا ہوں۔

ا۔ اچھی طرح مجھ کو گرانی نہیں ہوتی، گو پُورا اعادہ غالباً نہ ہو سکتا ہو۔

---

[1] عجیب اتفاق ہے کہ مولانا سے ملاقات کی نوبت آج (اگست ۱۹۴۸ء) تک نہ آئی اور اب اپنی اور اُن کی زندگی میں توقع بھی کیا ہو سکتی ہے خصوصاً جب کہ وہ باشندہ بھی اب ایک دوسرے مُلک کے ہو چکے ہیں! خیر انشاء اللہ جی بھر کے مُلاقات اب جنّت ہی میں ہوگی —— اِس دُنیا میں صرف ایک بار (غالباً ۱۹۲۷ء میں) دہلی میں دفتر جمعیۃ العلماء میں اُن سے سرسری ملنا یاد پڑتا ہے۔

م۔ ورنہ دِل تو یہ جاننے کو بہت مُشتاق ہے کہ جناب نے گُم شُدہ مکتُوب میں میرے اِن دو معروضات پر خُدا معلوم کیا لکھا تھا۔ ایک تو شب ۲۹ رمضان میں طلوعِ فجر سے ذرا قبل مسجد میں بیٹھے بیٹھے غنودگی کی حالت میں نہایت تیز روشنی بجلی کی سی سارے آسمان میں دیکھی۔

ا۔ اِس کے متعلق اتنا لکھنا یاد ہے کہ ایسے واقعات میں متعدد احتمالات ہوتے ہیں۔ ملکوتی ہونے کا بھی کہ عالم غیب کی چیزوں کا انکشاف ہوگیا ہو۔ اور ناسوتی ہونے کا بھی کہ متخیلہ کا تصرف یا اخلاط میں کچھ اشتعال ہوگیا ہو۔ امرِ اوّل نہ کوئی کمال ہے ہاں فضل ہے۔ اور امرِ ثانی نہ کوئی نقص ہے کیونکہ حکمت پر مشتمل ہے، وہ حکمت قلب کا انشراح ہے جس سے طاعت میں نشاط ہو۔ اب اِس کا فیصلہ صاحبِ واقعہ کے ذوق پر ہے۔

م۔ دوسری میری شاعرانہ تخیئل حضرت والا، اور مولانا سید حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری کے متعلق میدانِ حشر میں۔

[اصل عبارت اُس گم شدہ خط میں اِس موقع پر غالباً یہ تھی۔

اپنے کو جو خصوصی عقیدت جناب والا کے جن دو بزرگوں یعنی مولانا دیوبندی مدظلہ اور حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بجنوری کے ساتھ ہے، اِس پر اور پھر ان تینوں بزرگوں کے درمیان اختلافِ طبائع پر غور کرتے کرتے ایک شاعرانہ خیال یہ پیدا ہوا کہ اور اسے بکمال جسارت عرض خدمت کئے دیتا ہوں کہ جیسے عرصۂ حشر برپا ہے۔ اور مولانا دیوبندی سربسجدہ ہیں کہ جب تک میرے سارے رفیقوں اور متوسلین کو بھی میری معیت کا حکم نہ ہوگا۔ میں خود بھی جنّت میں قدم نہ رکھوں گا۔ عرض معاً قبول ہوگئی۔ اور مولانا اپنے ایک ایک رفیق و متوسل کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے ساتھ لیں گے۔ اِدھر حاجی صاحب کی شان یہ ہوگی کہ جنّت کی طرف خراماں خراماں چل رہے ہوں گے کہ لوگ راستہ میں گھیرنا اور تقاضہ کرنا شروع کریں گے کہ واہ حاجی صاحب، آپ بغیر ہمارے چلے جارہے ہیں، اور وہ فرماتے جائیں گے کہ اچھا بھائی تم بھی آؤ۔ حضرت کی روش ان سب سے جُدا ہوگی آپ بڑے اطمینان کے ساتھ تنہا جنّت کو جارہے

ہوں گے۔ لوگ آپ سے عرض کریں گے کہ حضرت آپ اپنے متوسلین کی فکر نہیں کرتے۔ آپ جواب دیں گے کہ کیا میں حق تعالیٰ سے بڑھ کر شفیق و رحیم ہوں، اُس نے خود ہی اپنی رحمت سے سب کو وہاں پہنچا دیا ہوگا۔ چنانچہ آپ جنت میں جب قدم رکھیں گے تو واقعۃً وُہ سب کے سب موجود ہوں گے اور آپ کے استقبال کو یہ کہتے ہوئے بڑھیں گے کہ "حضرت ہمیں تو آپ کی تربیت نے ایسا پاک صاف کر دیا تھا کہ ہمیں کسی کی سعی سفارش اُٹھانی ہی نہ پڑی اِس سیدھے جنت ہی آگئے"

ا۔ اِس میں یہ لکھنا یاد ہے کہ اِس تخیل میں ایک کسر رہ گئی وہ بھی شامل کر لی جائے۔ وُہ یہ کہ اگر میری نجات ہوگئی اور میں نے ایسی بے مروتی اختیار کی تو آپ میرے آگے آگے ہوں گے اور جب میرا جواب سُنیں گے تو پیچھے لوٹ کر مجھ کو میرے اِس فیصلہ سے ہٹا دیں گے اور مجھ کو ہٹنا پڑے گا تو انجام یہاں بھی وہی ہوگا جو دوسرے بزرگوں کی عنایت کا ہوا۔ باقی حقیقت کس کو معلوم کہ انجام کسی کا کیا ہو۔

دِل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

واللہ اعلم۔

م۔ اب کی جوابی لفافہ تین ہی پیسہ کا بھیجتا ہوں۔ یہ مشورۂ گرامی بہت صائب ہے۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ دوسرے آپ کو حکیم صرف اُمورِ دین میں سمجھتے ہیں، لیکن میں نے تو اپنے تجربہ میں چھوٹے اور بڑے دُنیوی معاملات میں بھی آپ سے زیادہ صائب اور حکیمانہ و عاقلانہ مشورہ کسی کا نہیں پایا۔ ذالک فضل اللہ الخ

ا۔ ایک فضل یہ بھی ہے کہ عقلاء کے [یہ جُملہ اصل خط میں یُوں ہی نا تمام رہ گیا ہے]

(۱۸)

مکتوب طویل ابھی ختم نہیں ہوا۔ تفسیری موضوع رہ ہی گیا تھا، اب ملاحظہ ہو،

م " بیان القرآن کے بعض مقامات پر اب کی پھر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جلد ۳ صفحہ ۱۳۰۔ حصہ تفسیر میں انا اول المسلمین پر آیت کا نمبر غلط ہو گیا ہے۔ بجائے ۱۶۵ کے

۱۶۴ چاہیئے۔

ا۔ یہ غلطی واقعی غلطی ہے جو کاتبین نے کی ہے۔

م۔ جلد ۳ صفحہ ۳۷۔ س ل۔ شروع سورۃ میں شمار آیات میں بجائے مائۃ وخمس وستون کے مائۃ ست وستون ہونا چاہیئے۔

ا۔ یہ غلطی غلطی نہیں۔ اقوال کا اختلاف ہے۔ دونوں قول ہیں خمس وستون اور ست ستون بیضاوی نے قول اوّل کو اختیار کیا ہے۔

م۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۰۔ سطر ۱۔ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّکَ کا ترجمہ "یا اُن کے پاس آپ کا رب آوے" درج ہے۔ اس میں "اُن کے پاس" کی عبارت محض تفسیری معلوم ہوتی ہے۔

ا۔ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

م۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۷۔ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ کا ترجمہ "ہماری ان آیتوں کو جھوٹا بتلایا" درج ہے۔ آیات اللہ کا ترجمہ تو بظاہر صرف "اللہ کی آیتوں" ہوتا ہے۔

ا۔ واقعی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

م۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۲۷۔ بَیِّنَۃٌ کا ترجمہ "ایک کتاب واضح" سے فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر تو بیشک صحیح ہے لیکن ترجمہ تو شاید "نشان واضح" یا "دلیل واضح" ہوتا ہے۔

ا۔ لغت کا مقتضا تو یہ ہے کہ بیّنۃ کا ترجمہ صرف واضح ہے۔ باقی اس کے ساتھ جو موصوف نکالا جاوے خواہ نشان یا دلیل یہ سب ترجمہ سے زائد ہے، جزو ترجمہ نہیں۔ تو اس میں سب الفاظ برابر ہیں۔ بعض نے ایسا توسع کیا ہے کہ موصوف ہی کو ترجمہ کا قائم مقام کر دیا جیسا حضرات شاہان دہلی نے کیا ہے[1] سب میں گنجائش ہے۔

م۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۱۴۔ سطر ۳۔ یُذِیْقُکُمْ وَ اٰتَیْنٰھُمْ "ہم ان کو اور تم کو رزق دیں گے"

---

[1] شاہ ولی اللہؒ شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ دہلوی مترجمین قرآن کو مولانا اپنی پر لطف زبان میں "شاہان دہلی" سے تعبیر کرتے تھے۔

اِس عبارت ترجمہ میں ترتیب ضمائر میں کہیں قلب تو نہیں ہو گیا ہے ؟

ا۔ یقیناً قلب ہوا جو واجب الاصلاح ہے۔

م۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۲۴۔ سطر ا۔ ذِی ظُفُرٍ کا ترجمہ "ناخُن والے جانور" سے فرمایا گیا ہے۔ یہ لفظ بھی ذرا کھٹکا۔ ناخُن تو سب ہی جانوروں کے ہوتے ہیں۔ صاحب حقانی نے "کھُر والے جانور" سے جانور مراد لیے ترجمہ کیا ہے۔ اور توریت میں اِس موقع پر "چِرے ہوئے کھُر" ہے۔

ا۔ حضرات شاہان دہلی نے ناخُن ہی سے فرمایا ہے۔ مَیں نے تفسیر میں اس کی مُراد بھی لکھ دی ہے۔ باقی محاورہ بدل گیا ہے۔ یا اُن حضرات نے بھی محاورہ کی پروا نہ کی ہو۔ اس کا مجھ کو علم نہیں۔

م۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۲۹۔ س۱۔ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ ترجمہ "اپنی اولاد کے قتل کرنے" میں "اپنی" سے التباس معبودوں کی اولاد کا ہوتا ہے۔ "ان کی" ہونا تو صاف تھا۔

ا۔ یہ محاورہ کی عدم مہارت کے سبب واقع ہوا۔ ذہن میں دوسری عبارت سے خلط ہوا جو اِس کا حاصل ہے۔ وہ دوسری عبارت یہ ہے کہ اُن شرکاء نے اُن کے خیال میں اِس امر کو مستحسن بنا دیا کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ اِس عبارت میں لفظ "اُن" شاید موزوں نہ ہو گا۔ ذہن میں اِس سے خلط ہو گیا۔ لیکن محاورہ کی صحت مرجح ہے جس لفظ میں ہو۔

م۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۲۔ س۲۔ لِيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ "بلا دلیل جھوٹ تہمت لگاتے تاکہ ان لوگوں کو گمراہ کرے" اِس ترجمہ میں بغیر علم کا تعلق "افتراء" سے معلوم ہوتا ہے۔ اکثر حضرات نے بغیر علم کو اضلال سے متعلق کیا ہے۔

ا۔ توجیہیں دونوں صحیح ہیں۔ یاد نہیں اُس وقت اس کی ترجیح ذہن میں کس بنا پر آئی۔ اِس وقت روح المعانی کو دیکھا۔ دونوں احتمال لکھ کر اوّل کو ترجیح دی ہے۔ شاید وجہ ترجیح کی یہ ہو کہ ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید بغیر علم کلام کی تاکید کے لئے بڑھائی گئی۔ سو افتراء کی تو ماہیت سے دلیل کا انتفاء مفہوم ہوتا ہے جو حاصل ہے بغیر علم کا۔ اِس لئے اِس کے لئے تاکید

ہونا واضح ہے اور اضلال کی ماہیت سے دلیل کا انتفاء مفہوم نہیں ہوتا گو دلیل خارجی سے اس انتفاء کا لزوم ثابت ہو تو اس کا اس کے لئے تاکید ہونا واضح نہیں۔ واللہ اعلم۔ باقی یہ سب تنبیہات میں درج کر دیا جائے گا۔ ناظرین کو ترجیح کا اختیار ہے۔

اطلاع۔ آپ کی تنبیہات ماضیہ و مستقبلہ متعلقہ تفسیر کو ایک جگہ جمع کر کے اس کا ایک نام بھی رکھ دیا ہے۔ موقع پر اس کو شائع کر دیا جائے گا۔"

ان آخری سطروں میں تو حضرت نے عزت افزائی کی انتہا کر دی۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، مراسلت کا اصل موضوع تفسیر قرآن ہوتا اور بڑھتا گیا بعض خط تو گویا اوّل سے آخر تک قرآنیات ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ ۱۲ر فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م۔ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے میری طلب پر "شکر نعمت" مجھے بھی ارسال فرمایا۔ لیکن میں اس کی عبارت پڑھ کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوا۔ اب کی خط لکھوں گا تو اتنا ضرور عرض کر دوں گا کہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ کو اس سے بڑی نعمت ملی ہے اور اس کے شکر میں ہی آپ زیادہ اہتمام فرمائیں گے۔[1]

ا۔ میرے ذہن میں وہ عبارت نہیں، کیونکہ میں نے وہ اعلان صرف ایک بار سرسری نظر سے دیکھا، اور اپنے پاس نہیں رکھا اور ذہن بھی منتقل نہیں ہوا۔ اور پوچھنا کاوش ہے جو عادت کے خلاف ہے، ورنہ آپ کو کچھ مشورہ دیتا۔ بہرحال بدوں کسر قلب کے جو مناسب ہو لکھا جا دے۔

م۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی مختصر سوانح عمری ایک یہودی عالم کے قلم سے لکھی ہوئی یہاں ابھی نظر سے گزری۔ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پرورش شاہی محل کے اندر ہوئی، اور ہارونؑ کی آزاد اہل بادیہ کے درمیان، جو اہل بادیۂ عرب کی طرح قوت تقریر و خطابت میں ممتاز تھے۔ اس لئے آپ نے بھی بڑے ہو کر بہ حیثیت خطیب و مقرر شہرت حاصل کی۔ اس بیان سے اِنْ شَاءَ اللّٰہُ "هُوَ أَفْصَحُ"

---

[1] اب کچھ یاد نہیں پڑتا کہ مولانا کے اس اعلان "شکر نعمت" میں کون سی بات اس وقت کھٹکی تھی۔

[2] جیوش انسائیکلوپیڈیا میں۔

ہنتی[1] کی تفسیر میں کام لوں گا۔ اِسی طرح کی اور بھی بہت سے کام کی چیزیں کُتب یہود میں مِل رہی ہیں۔

ا۔ مناسب۔ لیکن عنوان ایسا ہو کہ تفسیر کا موقوف علیہ نہ سمجھا جائے کیونکہ محتمل الکذب کو مدار کیسے بنایا جائے۔ تائید کا مضائقہ نہیں۔

م۔ بیان القرآن کے چند مقامات پر آج پھر کچھ عرض کرنا ہے۔

جلد ۴ صفحہ ۴۳ متن۔ س ۴۔ لمّا جاء تنا۔ اِس کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ متن و تفسیر دونوں میں بڑھا دیا، اس عبارت سے "جب وہ احکام ہمارے پاس پہنچے"

م۔ ص ۴۸۔ تفسیر۔ س ۲۔ کثرت بارش کا طوفان "طوفان" کی تفسیر میں تو متعدد اقوال آئے ہیں، اگر یہاں بھی کسی قدر مبہم و غیر متعیّن ہی رکھا جائے تو تاریخ سے قریب تر رہے۔

ا۔ میں نے زیادت شہرت کو مرجح سمجھا۔ زیادت شہرت کی روح المعانی میں تصریح ہے۔ یہ احسن ہے کہ ترجمہ مبہم رہے، اور اس پر حاشیہ ہو جائے کہ اس کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں زیادہ مشہور طوفان آب ہے۔

م۔ ص ۵۰۔ ترجمہ۔ س ۱۔ دریائے شور "بحر" کا ترجمہ اگر مطلق دریا یا سمندر سے کیا جائے تو جغرافیہ سے اقرب ہو جائے، گو کوئی خاص اعتراض اب بھی وارد نہیں ہوتا۔

ا۔ یہاں بھی اِسی زیادت شہرت کو مرجح سمجھا گیا اور شہرت مشہور ہے۔ یہاں بھی احسن ہے کہ ترجمہ مطلق رہے، اور حاشیہ یہ ہو جاوے کہ مطلق دریا بھی مراد ہو سکتا ہے، اور زیادہ اطلاق دریائے شور پر آتا ہے، تاریخ سے تحقیق کر لیا جائے۔

م۔ ص ۵۔ متن۔ س ۱۔ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ۔ اِس کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ کاتب نے اِس کے ترجمہ کو تفسیر بین القوسین کر دیا، وہ ترجمہ یہ ہے "ان کی اس عدول حکمی کے سبب" اور حاشیہ یہ ہے کہ لفظ "ان کی" قوسین سے خارج لکھا حالانکہ مجرد اس کلمہ کے

---

[1] اشارہ ہے آیات قرآنی کی جانب، جہاں حضرت موسیٰ اپنے کو اکیلا اور حضرت ہارون کو فصیح بتا رہے ہیں۔

کوئی معنی نہیں۔

م۔ ص ۵ ۵۔ س ۳ "اس حال" القصص کے ترجمہ میں صیغۂ واحد کو کیوں اختیار فرمایا گیا۔

ا۔ یہ لفظ اصل میں واحد ہی ہے چنانچہ اسی صفحہ کے عربی حاشیہ میں اس کو بیان کیا گیا، ایک بڑا عُمدہ قصہ اور سورۂ یوسف کے آخر میں جو قصصہم سے شُبہ جمع کا ہو سکتا تھا اس شُبہ کو عربی حاشیہ میں اس عبارت سے دفع کیا گیا، اشارۃ الی کونہ مصدرا بمعنی المخصوص لیے جنسہ الشامل للجمیع۔

م۔ ص ۹ ۵۔ ترجمہ۔ س ۲ "بشارت دینے والا اور ڈرانے والا" اس عبارت میں قلب تو نہیں ہو گیا؟

ا۔ یقیناً قلب ہو گیا۔ یادداشت میں تنبیہہ کر دی گئی۔

م۔ ص ۹۹۔ تفسیر۔ س ۲ "اس کا ظہور" لفظ "اس" کا مشارٌ الیہ صاف نہیں کھلتا۔ اگر لفظ "مصلحت" یا "جہاد" یا "معرکۂ قتال" قوسین میں بڑھا دیا جائے تو مطلب واضح ہو جائے۔

ا۔ چونکہ اس کے قریب ہی لفظ "حق" بمعنی مصلحت مذکور ہے اور کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس ضمیر کا مرجع بن سکے اس لئے اس ترجمہ کو کافی سمجھا گیا۔ اب زیادہ توضیح کے لئے لفظ مصلحت بین القوسین بڑھا دیا۔

تعجب و شکریہ۔ میں نے جلدی میں تفسیر پر نظرِ ثانی کی نہیں، اس لئے ایسی فروگذاشتیں عجیب نہیں لیکن دوسروں نے نظر کی ہے۔ بعض کو اجرت دے کر اصلاح کی نیت سے نظرِ ثانی کرنے کی فرمائش کی گئی۔ پھر بھی ایسے مقام رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس تنبیہہ پر جزائے خیر بخشے۔ اس مجموعہ کو بشکل رسالہ تتمیم کے بعد انشاء اللہ شائع کر دیا جائے گا"

حضرت شرافت و عالی ظرفی کے تو پُتلے تھے، کوئی ادنیٰ سی بھی خدمت کر دیتا، تو آپ اس کے آگے بچھ جاتے۔ مکتوب کی یہ آخری سطریں اسی دعویٰ پر شاہد عادل ہیں۔

(۸۲)

قرآنیات کا سلسلہ بحمد اللہ زوروں پر جاری ہے، اور بعض مکتوبات میں تو بجز

اِس کے اور کوئی ذکر ؛ مذکور ہی نہیں —— ۹ مارچ کا عریضہ ملاحظہ ہو :۔

م : بحمد اللہ نفس ترجمہ دسویں پارہ تک پہنچ گیا[1]

ا ۔ مبارک ، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ۔

م ۔ اب ترجمہ روک کر تحشیۂ پارۂ دوم سے شروع کر رہا ہوں ۔ دُشوار تر منزل یہی تحشیہ کی ہے ۔ وقت بھی اس میں بہت زیادہ لگتا ہے ، اور دِل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا ۔ دُعا فرمائیں جن کا کام ہے وہی اِس مُشکل کو بھی آسان فرمائیں ۔

ا ۔ دِل سے دُعا ہے ۔

تتمہ ۔ اگر تحشیہ میں حضرت دیوبندی کے ترجمہ میں فوائد محررہ مولوی شبیر احمد صاحب اور ترجمہ مولوی حبیب احمد موسومہ حل القرآن جو محمد عثمان دہلوی رسالۂ الہادی میں سورۂ ابراہیم کے ختم تک چھاپ چکے ہیں سامنے رہے تو اعانت کی اُمید ہے ۔ پُورا رسالہ ضروری نہیں ۔ امید ہے کہ مُستقل بھی مل سکے گا ۔ مولوی حبیب گو محقق نہیں مگر ذہین ہیں ۔ فوائد میں کام کی باتیں لکھ جاتے ہیں ۔ آیندہ جو مشورہ ہو ۔

م ۔ بیان القرآن کے دو چار مقامات سے متعلق آج بھی کچھ عرض کرنا ہے ۔

جلد ۴ ۔ اِنَّ اور اَنَّ کا ترجمہ اکثر مقامات پر رہ گیا ہے ۔ مثلاً صفحہ ۱۲۰ ۔ من انّھم لصنکم کا ترجمہ یُوں درج ہے " کہ وُہ تم میں کے ہیں " اِس میں اگر " کہ " اور " وُہ " کے درمیان کوئی لفظ " یقیناً " یا " ضرور " یا " بیشک " بڑھا دیا جائے تو شاید متن سے اقرب ہو جائے ۔ اِسی طرح صفحہ ۱۲ پر متن کی آخری سطر میں اَنّکم غیر معجزی میں اِنَّ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا ۔

ا ۔ یاد داشت میں لکھ لیا گیا ہے ۔ غالباً بیشک کا لفظ زیادہ مناسب ہے ۔

م ۔ تفسیر میں " کیونکہ " تو سین کے اندر ہے ۔ کہیں یہ ناقل یا کاتب کی فروگذاشت تو نہیں ؟

ا ۔ قوس سے باہر تو ظاہراً نہیں ہو سکتا ۔ کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں جس کا یہ ترجمہ ہو سکے ۔

---

[1] مُراد کلام پاک کا انگریزی ترجمہ ہے ۔ اُردو ترجمہ کا اِس وقت تک خیال بھی نہ تھا ۔

م - ص ۱۱۳ متن - س ۵ - فاستاذنک میں ک کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا - لفظ "آپ سے" لکھ دیا گیا۔

م - ص ۱۱۹ - س ۱ - ان تُقبَلَ مِنۡهُمۡ میں مِنۡهُمۡ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا - حضرت شاہ عبدالقادرؒ صاحب نے بھی نہیں لیا - ان کی یہ عبارت ہے "اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا اُن کے خرچ کا مگر اسی پر کہ وہ منکر ہوئے" حضرت مولانا دیوبندیؒ نے بھی نہیں لیا[۱]۔ غالباً محاورہ کی رعایت کو تحت اللفظ ترجمہ پر ترجیح دی ہے - تحت اللفظ سے سلاست نہیں رہتی۔ اِس سے گنجائش تو معلوم ہوگئی لیکن اگر سلاست کے ساتھ آجاوے تو احوط ہے۔ سوچوں گا۔

م - ص ۱۱۴ - متن - س ۳ - فی الآخرۃ کے معنی عنوان "البلاغۃ" کے تحت میں تو فی جنب الآخرۃ بالکل درست و مناسب درج ہیں - لیکن ترجمہ میں کوئی لفظ نہ ملا۔

ا - یہ عبارت ترجمہ و تفسیر دونوں میں بڑھادی گئی "آخرت کے مقابلہ میں"

م - ص ۱۱۶ - اِنَّمَا یَسۡتَاذِنُكَ الَّذِیۡنَ میں الَّذِیۡنَ کا ترجمہ اگر بجائے "وہ لوگ" کے "وہی لوگ" کیا جائے تو کیسا ہے؟

ا - بہت مناسب ہے - حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے بھی کیا ہے۔

م - جناب والا نے حیرت ظاہر فرمائی ہے کہ نظر ثانی کے وقت دوسرے حضرات کی نظر بہت سی چیزوں پر نہ پڑی - میں عرض کرتا ہوں کہ مجھے تو قدم قدم پر ہدایت و استفادہ مقصود تھا، اس لئے لفظ لفظ، حرف حرف غور و تامل کے ساتھ پڑھا، اور عبارتِ قرآنی سے نیز دوسرے تراجم و تفاسیر سے ملا ملا کر پڑھا - اِس طرح نہ پڑھتا تو قیامت تک مجھے بھی نہ سوجھتا۔

ا - خیر میرا تو کام بن گیا - تصحیح ہو رہی ہے - اللہ تعالیٰ آپ کے سب کام سنوارے۔

م - ایک بات اور بھی گستاخانہ عرض کردوں - اِس کام میں جتنا گھبرا اُترتا گیا ہوں، بخدا

---

[۱] اِس کتاب کے پڑھنے والوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مولانا محمود حسنؒ دیوبندی نے قرآن مجید کا کوئی مستقل ترجمہ نہیں کیا ہے - صرف شاہ صاحبؒ کے بعض الفاظ کی تسہیل ترمیم کردی ہے اور ایسے مقامات کو بالکل بدستور رہنے دیا ہے۔

اُسی قدر آپ کی تفسیر کی عظمت و وقعت دل میں عقیدت مندی کی بناء پر نہیں علیٰ وجہ البصیرۃ بڑھتی گئی۔

ا۔ ایک درجہ عقیدت مندی کا یہ بھی ہے کہ عقیدت مندی کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

م۔ اور بعض اکابر حضرات کی قدر اس حیثیت سے کم ہی ہوتی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ حضرات آپ سے متقدم ہیں، اس لئے ہوسکتا ہے کہ استفادہ جناب کو بھی براہ راست یا بالواسطہ ان ہی حضرات سے ہوا ہو۔

ا۔ غلبۂ محبت نے اس طرف نظر نہیں جانے دی کہ اصول ان حضرات اکابر ہی کے ہیں جن سے تفریع کی ہمت ہوگئی۔ زمانہ کے اور طبائع کے اختلاف سے عنوان میں تفاوت ہوگیا۔ احسان اُن ہی کا ہے۔ اصل کمال کپڑا بنانے والے کا ہے، ورنہ پھول کا ہے پر نکال لئے جاتے۔

م۔ میرے حق میں تو آپ کی تفسیر ایک نعمت عظیم ہے، بڑے بڑے اشکالات بات کی بات میں حل ہو جاتے ہیں۔

ا۔ طبائع میں فطری تناسب اس کا مدار ہے۔ بعض باورچیوں کے ہاتھ کی دال بعض کے قورمہ سے زیادہ لذیذ معلوم ہوتی ہے۔

بعض اطلاعات ضروریہ۔ [1] آپ کے ایک سابق[ف] کے جواب میں لِیُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ مگر لکھنے کے بعد بھی ذہن اس سے خالی نہیں ہوا۔ ۱۶ ذی قعدہ کو قرآن مجید کا ایک دوسرا مقام یاد آگیا۔ جہاں بغیر علم یقیناً لیضلہم کے متعلق ہے۔ وہ آیت یہ ہے لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (سورۃ النحل ختم رکوع ۳) اس بناء پر روح المعانی کی ترجیح مذکور اور میری توجیہ مذکور مخدوش ہوگئی۔

[2] غالباً اسی خط میں آیت فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ الخ کے معانی متعددہ میں سے طوفان آب کی ترجیح کی بناء میں نے اس معنی کی زیادت شہرت کو لکھا تھا۔ اس کے بعد ایک وجہ مرجح اور ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہ لفظ اسی معنی میں

[ف] ملاحظہ ہو نمبر ۱۸۔

وارد ہوا ہے۔ فَأَخَذَ هُمُ الطُّوفَانُ (عنکبوت۔ شروع رکوع ۲)

اوّل میں اپنی رائے کی ترمیم ہے۔ ثانی میں تائید ہے۔

میں نے اِن دونوں مضمونوں کو اُس رسالہ میں لکھ دیا ہے جو جامع ہے آپ کے مکاتبات متعلقہ تفسیر کا۔ آپ کے شوقِ تحقیق پر نظر کر کے اطلاع دیدی۔"

کبھی کبھی یہ تفسیری مذاکرے ہلکے علمی مناظرے کا سا رنگ اختیار کر لیتے تھے ـــــــ پھر اِدھر کثرت سے جو یہود اور مسیحیوں اور مُشرکوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا، اِس سے بھی قلب میں ایک عجیب طرح کی ظُلمانیت محسوس ہونے لگی تھی اِسے بھی حضرت کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری تھا۔

۴ اپریل کا عریضہ اِن رنگوں کا پُورا مظہر ملے گا:۔

م: بیان القرآن۔ جلد اوّل۔ ص ۸۹۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِس کے تحت میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے واِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بِرّ (نیکی) کو ساری، کے ساتھ مقیّد کرنے کی وجہ خیال مبارک میں غالباً یہ رہی کہ جہت کا اہتمام کسی درجہ میں شریعتِ اِسلامی کو بھی مطلوب ہے[۵]۔

عرض یہ ہے کہ یہاں خطاب اُن گُمراہ قوموں سے ہو رہا ہے جن میں سے بعض جہت پرست تھیں۔ یعنی اُن کے نزدیک کوئی خاص جہت (خصوصاً مشرق) بجائے خود مقدّس تھی۔ قرآن مجید تردید اسی گمرہی کی کر رہا ہے۔ اور کہتا ہے کہ تقدّس فلاں اور فلاں جہت میں کہاں سے آیا، کہ جہات تو سب اللہ ہی کی ہیں (لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ)۔ نیکی کا انحصار تو فلاں اور فلاں عقاید صحیحہ اور اعمالِ صالحہ پر ہے۔

اسلام تو کسی جہت کی تقدیس کا ذرا بھی قائل نہیں۔ نماز تو ایک متعیّن مکان، یعنی کعبہ کی جانب ہونا چاہیے، اب خواہ وہ کسی جہت میں بھی واقع ہو جائے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ

---

۵ بیان القرآن میں یہ تھا کہ "ساری نیکی یہی نہیں ہے کہ تم لوگ اپنا رُخ مشرق الخ

کہیں سے کسی جہت میں پڑتا ہے اور کہیں سے کسی میں۔ بہ خلاف عیسائیوں کے جن کے ہاں جہت مشرق بجائے خود مقدس ہے اُن کے گرجا ہمیشہ مشرق رویہ ہوتے ہیں خواہ پُشت ہی بیت المقدس کی طرف کرنا پڑے۔ بیت المقدس قبلہ یہود کا ہے۔ رُومی مُشرکین چڑھتے ہوئے سُورج دیوتا کی ڈنڈوت کے لئے مشرق کا رُخ کرتے تھے۔ وہیں سے جہت مشرق کی تقدیس عیسائیوں نے بھی لے لی۔ قرآن مجید اس عقیدۂ جہت پرستی کی تردید کر رہا ہے، جیسا کہ آگے چل کر لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا میں ایک دوسرے عقیدۂ فاسد کی تردید ہے۔ یہود کا اعتراض الگ تھا، اس کا جواب قرآن مجید دوسرے عنوانات سے دے چکا۔ باقی یہ نفی جو بار بار کسی خاص جہت کے تقدس کی ہو رہی ہے، اس کی مخاطب میری فہم ناقص میں یہی جہت پرست قومیں ہیں۔

(اگر یہ خطاب خاص جہت پرستوں کو بھی ہو تب بھی اس نفی کی بناء یہ نہیں ہو سکتی کہ جہت کسی درجہ میں بھی مطلوب نہیں، خاص شرائع میں خاص جہات کا قبلہ ہونا یہ خود اس کی مطلوبیت من وجہٍ کو بتلا رہا ہے بلکہ مطلق مطلوبیت بالذات کی قید لگائی جائے گی۔ سو میری تقریر اور آپ کی تقریر دونوں اس میں متماثل ہو گئیں کہ مطلق بر کی نفی تو کسی توجیہ پر بھی مُراد نہیں جیسا لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا میں مُراد ہے کیونکہ وہ کسی درجہ میں بھی طاعت نہیں۔ اور بر مقید کی نفی دونوں توجیہوں پر مُراد ہے۔ جیسے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ) میں بر مقید مُراد ہے، کیونکہ نفس بر مطلق اتفاق سے بھی حاصل ہے۔ صرف فرق دونوں توجیہوں میں یہ ہوا کہ آیت لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ میں آپ کی تقریر پر اس کی مطلوبیت میں بالذات کی قید لگائی جائے گی اور میری تقریر پر اس کی مطلوبیت میں کافی کی قید لگائی جائے گی، سو دونوں صحیح ہیں اور دونوں کا ایک ہی حاصل ہے۔ صرف عنوان اور عبارت کا فرق ہے۔ اور ان دونوں توجیہوں پر یہ خطاب عام بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس حکم میں اہل کتاب اور اہل اسلام برابر ہیں کہ اپنی اپنی مشروعیت کے زمانہ میں سب کے قبلے طاعات مقصودہ بالغیر ہوتے ہیں

اور طاعات مقصود بالذات نہ ہونے میں مُشترک ہیں۔ البتہ جن کے قبلے پر کوئی دلیل صحیح قائم نہ ہو اگر وہ جہت مقدس بھی نہ ہو تب بھی اس سے بریت منفی ہوتی گو اعتقاد تقدس کا واجب ہوتا۔ مگر وہ محل بحث نہیں۔ اسی طرح جن جہات کا قبلہ ہونا ثابت ہے خواہ جہت کی خصوصیت کی بناء پر یا کسی بقعہ کی فضیلت کی بناء پر، اگر اُس جہت یا اُس بُقعہ کو کوئی مقصود بالذات سمجھنے لگے گا تب بھی بریت کی نفی کی جائے گی خواہ یہ اعتقاد کسی کتابی کا ہو خواہ مُسلم کا، بہرحال حکم مذکور فی المحل میں کسی قوم کی تخصیص نہیں، سب کے لئے عام ہے واللہ اعلم۔

خلاصہ یہ کہ جہت کا کسی درجہ میں مطلوب ہونا اگرچہ وہ جہت کعبہ ہی ہو بوجہ مامور بہ ہونے کے آپ کی تقریر میں بھی منفی نہیں۔ اور مقصود بالذات کے درجہ میں مطلوب ہونا میری تقریر پر بھی لازم نہیں"

(۸۳)

وہی خط ابھی چل رہا ہے:۔

مسئلہ تفسیری سے متعلق معروضہ ختم ہو چکا۔ اب ایک معاملہ اپنے قلب کا عرض کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں کتب تصوف، خصوصاً مثنوی، شرح مثنوی یا احیاء علوم الدین کا مطالعہ زیادہ رہتا ہے۔ قلب میں ایک انشراح محسوس ہوتا رہتا ہے اور طبیعت پر رقت، خشیت اور لینت کا غلبہ پاتا ہوں، خواب بھی اس زمانہ میں بڑے بڑے پاکیزہ نظر آتے ہیں۔ لیکن اب ایک عرصہ سے یہ کیفیات گویا بالکل بند ہیں۔ اور گو جناب ہی کی زبان سے سُن سُن کر فقدان کیفیات پر زیادہ تشویش تو نہیں کرتا، تاہم کچھ نہ کچھ افسوس تو ضرور رہی رہتا ہے۔ اب مدت سے مثنوی وغیرہ کا مطالعہ ترک ہے، اور بجائے اس کے ہزارہا ہزار صفحات ملحدین، مُشرکین معاندین اسلام کے پڑھ رہا ہوں، یہ ظُلمت و قساوت قلب کہیں اسی کا نتیجہ تو نہیں؟

ا۔ اس تفاوت کا یہی سبب ہے۔ مگر اس کی حقیقت قساوت یا ظُلمت نہیں۔ کیونکہ حقیقی قساوت یا ظُلمت ہمیشہ اعتقادی ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت اور اثر طبعی ہے۔ جیسا ایک

تو تھی ہی، مگر غلاظت کرنے سے بہت بہت حقیر و ذلت (نفرت) کے ... اور ایک

نقص یہ تھا کہ پاخانہ میں نجاست لگ جانے سے بہت بہت ہی کیفیت و طہارت کے

اور خلاف ہے کہ غلاظت کا کہنا بوجہ طبیعت میں بہت کے شر [illegible] ہوتا ہے اور نجاست بدن کو

لگ جاتا، مضر و صحت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر تفصیل تفسیر ہے جس کے نتیجے جسد کے [illegible] تو

بوجہ غلاظت ہونے کے باطن کو زیادہ نقصان ہوگا۔ اور اس میں جس قدر نجاست ہوتی ہے

وہ بوجہ نجاست ہونے کے موجب حدوث قرب ہوگا۔ اور اس کے بعد جو ہوتے ہیں سے [illegible]

باقی رہ جائے گا پہلے سے زیادہ پاک ہو جائے گا۔ سو آپ ماشاءاللہ تطہیر [illegible]

آپ کی طہارت اور نورانیت میں باطنہ ظہور رہے۔ ابتداء [illegible] کے ساتھ صاف بھی [illegible]

رہے یعنی کسی قدر ملائکہ تصرف و ذکر اللہ۔

م۔ مسائلِ اسلام پر اعتراضات تو خیر تھے ہی، بانیٔ حضورؐ کی ذات گرامی کو ظالموں نے ایسا مسخ کر کر کے پیش کیا ہے، اور نفرت پیدا کر دینے اور تمسخر دلوں کی غرض سے ایسے ایسے گندے اعتراضات تراشے ہیں کہ برداشت کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ یونانی فلسفہ کا تصادم صرف عقائدِ اسلام سے ہوا تھا، معاندین حال کا سارا زور حضورؐ کی شخصیت کے رذائلِ بدترین مشابہ ہے۔ قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ رَجُلًا مَّسْحُوْرًا وغیرہ کی تفسیر گویا ان شیاطین کے ہاتھ ہیں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس مصارعت سے روح میں ایسی قوت پیدا کرنے کا سامان فرما دیا جس سے سب شیاطین الانس والجن کا قلب سے نکل جائے گا اور سب پر غالب آ جانے کی عادت کا مشاہدہ اور اطمینان ہو جائے گا۔

م۔ اہلِ یورپ کی ایک اور زبان یعنی فرانسیسی بغیر استاد کے حال میں پڑھنا شروع کی ہے۔ خیال ہے کہ اس کے اندر بھی بہت کچھ مل جائے گا[1]۔ ان ظالموں نے اسلام اور

---

[1] اس زمانہ میں فرنچ بطور خود پڑھنی شروع کی تھی، مگر زیادہ دن تک نہ چل سکی کئی سال بعد جرمنی کا خیال ہوا، اور اس کی کئی ابتدائی ریڈریں پڑھ ڈالیں۔ مزید ترقی اس میں بھی نہ ہو سکی۔ اصل سوال وقت ہی کا رہا۔

ذات رسولؐ پر حملے عجب عجب راہوں اور راستوں سے کئے ہیں۔ دُوسروں کا تو ذہن بھی اُدھر نہیں پہنچ سکتا۔ تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، اور حد یہ ہے کہ ان کی طب بھی اس زہر سے خالی نہیں۔ طب کی کتابوں میں امراض دماغی کے تحت میں صرع کا بیان لکھتے لکھتے لکھ جاتے ہیں کہ (خاکم بدہن) عرب کے فلاں مشہور شخص کو بھی صرع کے دَورے پڑا کرتے تھے۔

۱۔ قَاتِلُھُمُ اللّٰہُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔ جہاد اکبر اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمایا ہے مبارک ہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ سب پر غالب آئے گا۔"

حضرت سے مراسلت عموماً تو لفافہ ہی میں کرتا تھا، لیکن بعض دفعہ پوسٹ کارڈ سے بھی کام چلالیتا تھا۔ کاش لفافہ ہمیشہ ہی لکھتا رہتا! اُس وقت یہ کیا خیال تھا۔ لفافوں کی قدر تو اب ہو رہی ہے۔ مولانا کے جو کارڈ جواب میں آئے ہوئے ہیں، اکثر اُن سے اب کچھ پتہ نہیں چلتا، کہ اِدھر سے کیا لکھ کر گیا تھا، جس کا یہ جواب ہے ——— نقصان کتنا بڑا نقصان ہے لیکن پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ چارہ ناچار بہرحال کام تو اب ان ہی کارڈوں سے لینا ہے۔ کارڈ جس پر تھانہ بھون کی مُہر ۱۴ اپریل کی ہے حسب ذیل ہے:۔

"مولوی شبیر علی نے رسالہ کے متعلق جواب لکھ دیا ہے، جو رائے ہو تحریر فرما دیجئے۔ تفسیر کے دونوں مقامات درست کر دیئے۔ اوّل موقع پر نفی کا لفظ اِس طرح دیا "صفات نقص کی نفی" اور دوسرے موقع پر اس طرح لکھ دیا "اور جو کچھ خیرات تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدوں کی غرض سے کرتے ہو" شاہ عبد القادر صاحب نے خیرات کا لفظ لکھا ہے اور دُوسرے شاہ صاحبوں نے مال لکھا ہے، دونوں لفظ اچھے ہیں۔"

ظاہر ہے دونوں مقام بیان القرآن ہی سے متعلق ہوں گے۔ پہلی آیت کا تو بالکل خیال نہیں آتا۔ دوسری آیت وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ ہوگی۔

جس تحریر کا شروع مکتوب میں ذکر ہے، وہ یقیناً حضرت ہی کا کوئی مقالہ مطبوعہ النور ہوگا۔ پُشت کارڈ پر مولوی شبیر علی صاحب ایڈیٹر النور کی طرف سے حسب ذیل عبارت ہے:۔

"مخدومی زاد لطفکم۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

وہ تحریر رسالہ النور میں طبع ہوئی تھی۔ چار رسالوں میں ہے۔ مگر وہ رسالے جلد سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اگر ارشاد ہو وہ جلد پوری ارسال کر دوں۔ یہ رسالے النور جلد ۹ میں ہیں۔ پوری جلد کی قیمت مع محصول ۸/ خرچ رجسٹری ۲/ کل ۱۱/ ہوں گے" اور نقل میں تو بہت خرچ ہو گا"

[یہ فقرہ خاص مولانا کے قلم سے ہے]

اس کے بعد بھی بدقسمتی سے کارڈ ہی ہے۔ اگرچہ خوش قسمتی سے اس کا مضمون محض خانگی قسم کا ہے۔ کسی علمی و دینی تحقیق سے متعلق نہیں۔ اس پر تھانہ بھون کی مُہر ۱۲ رمئی کی ہے ——— معلوم ہوتا ہے میری کوئی بچی اُس وقت سخت علیل ہو گئی تھی۔

"السلام علیکم۔ بھلا ماں باپ کو تو کیوں نہ صدمہ ہوتا، خود میرے قلب پر عجب اثر ہے اُس اثر سے مضطر ہو کر دُعا کی اور کر دوں گا کہ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عاجل عطا فرمائے۔ مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب خصوصیت سے اِن امراض کے علاج میں مہارت رکھتے ہیں۔ صبح و شام میں حج سے لوٹنے والے ہیں۔ اُمید ہے مجھ سے بھی ملنے آویں گے۔ اگر مفصل حال لکھ کر بھیجئے اُن سے مشورہ کر لوں گا۔

تفسیر کی پسندیدگی سے دِل خوش ہوا۔ قادیان سے تو انصاف کی کیا اُمید ہوتی۔ اِس وقت تو قاضیان سے بھی اس کی امید نہیں۔ آپ کو پتہ لکھنئو کا یاد نہیں رہا۔ اب اٹکل پچو لکھ دیا۔ خدا کرے پہنچ جائے"

یقیناً یہ کارڈ ایسا ہو گا جس کے جواب کی مجھے توقع ہی نہ ہو گی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں جوابی کارڈ کا پتہ اپنے ہاتھ سے نہ لکھ بھیجتا۔ میرے خط میں ذکر ہو گا کہ مرتبہ کو لکھنؤ لئے جا رہا ہوں۔ حضرت نے لکھنئو ہی دفتر سچ کے پتہ پر کارڈ لکھا ——— تفسیر اور قادیان کی تلمیحیں اب میرے لئے بھی بالکل چیستان ہیں۔

۱۱ رجون کے مفصل عریضہ میں ایک حصہ تو وہی بیان القرآن سے متعلق ہے۔ ۔

م بیان القرآن، جلد ۶، صفحہ ۱۰۷۔ آخری سطر میں یٰوَیْلَتٰی کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ یہ انتخاب کرنے والوں کی کوتاہی ہے۔ تفسیر میں یٰوَیْلَتٰی کا ترجمہ موجود ہے "ہائے میری شامت" غلطی یہ کی کہ اس لفظ کو بین القوسین کر دیا۔ ممکن ہے میں نے جلدی میں کر دیا ہو۔ مگر انتخاب کرنے والے ادنیٰ توجہ سے اس کو درست کر سکتے تھے۔ اب اس عبارت کو میں نے قوسین سے خارج کر دیا، اور صرف لفظ "اے مخاطب" کو بین القوسین رہنے دیا۔

م۔ صفحہ ۱۲۰۔ متن۔ سطر ۳۔ کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ کا ترجمہ اگر بجائے "استہزاء نہ کیا ہو" کے میں "استہزاء نہ کرتے رہے ہوں" رکھوں تو کیسا ہے؟

ا۔ نہایت مناسب ہے۔ میں نے بھی ترجمہ و تفسیر دونوں میں یہی بنا دیا۔

م۔ صفحہ ۸۰۳۔ سطر اوّل بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ۔ غلام کا ترجمہ اگر بجائے "فرزند" کے میں "لڑکے" سے کردوں تو کیا مضائقہ ہے۔ لغت میں تو غلام عام ہے۔ بیٹے کے معنی محض سیاق سے پیدا ہوئے ہیں۔

ا۔ بہت مناسب ہے۔ میں نے یہی بنا دیا۔"

تفسیر والا حصہ تو ختم ہو گیا۔ باقی اس مکتوب میں کئی دوسرے اہم مسئلے بھی تھے۔

(۱۴۸)

حضرت کے تعلقات مولانا سید حسین احمد صاحب سے ایک مدت تک بڑے مخلصانہ اور محبانہ رہے۔ ۱۹۲۸ء میں اُن کے باہمی لطف و ارتباط کی تفصیل ان ہی صفحات میں گذر چکی ہے۔ ۱۹۳۳ء بلکہ اس کے بعد تک بھی جوں توں نباہ ہوتا رہا۔ لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، کہ شگفتگی رفتہ رفتہ انقباض میں اور بشاشت روز بروز گرانی میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ چرچے خدام باخلاص کی زبانوں پر بے تکلف آنے لگے۔ اب اس سے بڑی کشمکش اُن لوگوں کو پیش آگئی، جو دونوں آستانوں کے نیاز مند تھے ———— بہرحال اس مکتوب میں ہمت کر کے ذرا اس کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا۔

م۔ "النور" کے ایک پچھلے پرچہ سے یہ معلوم کر کے بڑی ہی مسرت ہوئی کہ خواجہ صاحب جناب کی

سوانح عمری مرتب کر رہے ہیں۔[1]

ا۔ صحیح خبر ہے، جس میں مجھ سے شدید مجاہدہ کرایا گیا ہے، کئی طرح پر۔ اوّل یہ کہ میرے مذاق کے بالکل خلاف ہے۔ میں نے اپنے وصایا میں اس کی سخت مخالفت کی ہے مگر دوسرے اس لئے کہ مجھ کو تصحیح کی غرض سے دکھلایا جاتا ہے جس سے بہت ضیق ہوتی ہے۔ اس ضیق کا علاج میں نے ایک شعر سے کیا ہے جو تمہید میں لکھ دیا ہے ؎

نقش کردہ ام رستم داستان　　　　دگرنہ یلے بود در سیستان

م۔ خدا ایسا کرتا کہ جلد سے جلد شایع ہو جاتی۔

ا۔ کوشش جامع کی بھی یہی ہے مگر مزاج میں اُن کے کاوش اور تطویل ہے جس کو میں بہت شدت سے روک رہا ہوں، جس سے غالب اُمید ہے کہ زیادہ تاخیر نہ ہوگی۔

م۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اشاعت سے قبل ہی اس سے مشرف ہو جاتا۔ لیکن خیر یہ کہاں نصیب۔

ا۔ اگر مسودہ یہاں ہوتا تو دکھلانا بہت آسان تھا۔ تیار حصہ لکھنؤ چلا گیا، کاتب سے لکھوانے کے لئے۔

م۔ فتنۂ قادیان کے مسئلہ میں ایک مسئلہ محض اپنی تشفیٔ قلب کے لئے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر جو الزام اجراء نبوت کا عائد کیا گیا ہے، تو اجراء نبوت کے تو اہل سنت بھی قائل ہیں، یعنی ظہور مسیح آخر الزمان کو مانتے ہی ہیں۔ اب گفتگو تعیین شخص میں رہ جاتی ہے، یعنی علامات و آثار مسیحیت کا مصداق آیا فلاں شخص ہے یا نہیں۔ تو اس میں اجتہاد کی بڑی گنجائش ہے۔ اس پر مختصراً کچھ ارشاد فرما دیا جائے۔

ا۔ اس کا دعویٰ حضرت مسیح ہی کے ساتھ نام نہیں جس میں شبہہ مذکورہ فی السوال کی گنجائش ہو۔ وہ تو مسیح غیر مسیح سب کے لئے نبوت کو ممکن کہتا ہے اُس کے رسائل میں اس کی تصریح ہے۔ پھر

[1] یہ خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب کی وہی سوانح عمری ہے جو اشرف السوانح کے نام سے تین جلد میں اول حضرت کی حیات ہی میں شایع ہو گئی تھی، اور چوتھی جلد خاتمۃ السوانح کے نام سے حضرت کے بعد نکلی۔

مسیح میں بھی بقائے نبوت سابقہ ربو کہ موصوف کا کمال ذاتی ہے جو بعد عطا کے سلب نہیں ہوتا بدون ظہور آثار خاصہ تشریع وغیرہ جیسا خود عالم برزخ میں یہ کمال سب حضرات کے ذوات میں باقی ہے) عطائے نبوۃ کو مستلزم نہیں اور معانی ختم نبوۃ کے عطائے نبوۃ ہے جس کا وہ اپنی ذات کے لئے مدعی ہے کیونکہ پہلے موجود نہ تھا تاکہ اِس نبوۃ کو نبوۃ سابقہ کہا جا سکے۔ نہ کہ بقا بشان مذکور اور یہ بالکل ظاہر ہے۔

م۔ دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دِل دُکھتا ہے، خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف کو دیکھ کر صحابۂ کرام کے اختلافات تسکین وتشفی کے لئے سامنے نہ ہوتے، تو دِل بالکل ہی مایوس ہو کر رہتا۔

ا۔ واقعی سچی محبت اور خیر خواہی یہی ہے جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اب میں بھی صدق وخلوص سے حقیقت عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حقیقت اِس تحقیق کی میری بھی سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ بالکل مبہم ہے، میرے ذہن کو مبہم سمجھنے کی عادت نہیں۔ ضرورت ہے کہ حسب ذیل نقشہ پُر کرکے مجھ کو عطا فرمایا جائے تاکہ مجھ کو موقع ملے نظر کرنے کا اور نظر کرانے کا۔

اختلاف کا واقعہ جو اشرف علی کے متعلق معلوم ہوا	معلوم ہونے کا ذریعہ	مشورہ جس پر اشرف علی کو کاربند ہونا مناسب ہے

آخری ہفتہ جولائی میں دو بچیاں سخت قسم کے ٹائفائیڈ بخار میں مبتلا ہوئیں حسب دستور حضرت کے نام جوابی کارڈ دُعا کے لئے لکھا۔ جواب ۲۸ جولائی کا چلا ہوا حسب ذیل عنایت ہوا:۔

"بچیوں کی علالت سے دِل دُکھا بالخصوص ماں کی پریشانی سے۔ دِل سے دُعا کرتا ہوں کہ بچیوں کو صحت کاملہ عاجلہ عطا ہو اور اُن کی والدہ کو جمعیت وسکون۔ اگر بعد نماز فجر چینی کی تشتری پر سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ اور یہ دُعا باوضو لکھ کر آب طاہر یا زمزم سے دھو کر سب کو پلا دیا جایا کرے تو امید نفع کی ہے۔ دعا یہ ہے، یا حی حین لا حی فی دیمومۃ ملکہ وبقائہ یا حی۔"

معلوم ہوتا ہے زمانۂ قریب ہی میں کچھ اور علالتیں بھی پیش آ گئی تھیں۔ ۲۲ر اگست کے کارڈ کا مضمون حسب ذیل ہے :۔

"صاحبزادی کی صحت سے بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مبارک کرے اور ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ اب دوسرے صاحبوں کی علالت سے تعلق خاطر ہے۔ دل سے دعائے صحت عاجلہ کاملہ کرتا ہوں۔ واقعی بدنی و مالی کلفت دونوں موجب کلفت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی جمعیت ظاہری و باطنی عطا فرماوے بزرگان سلسلہ سے یہ دعا منقول ہے **یا حی حین لا حی فی دیمومۃ ملکہ وبقائہ یا حی** بعد نماز فجر مع دعائے بالا چینی کی طشتری پر باوضو لکھ کر دھو کر پلایا جائے۔"

عجب اتفاق کہ اُس طرف برابر پوسٹ کارڈ ہی اسی قسم کے خانگی مضامین کے آتے جاتے رہے۔ اکتوبر میں ارادہ تھانہ بھون کی حاضری کا کیا اور حسب معمول اطلاعی کارڈ لکھ دیا۔ ۱۶ر اکتوبر کا جوابی کارڈ ملاحظہ ہو :۔

"الحمد للہ، برخورداری کو صحت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ضعف بھی رفع فرمائے۔ مژدۂ تشریف آوری سے مسرت ہے۔ اللہ تعالیٰ بخیر ملاوے۔ گو اس وقت آپ کے سفر سے قلب پر ایک گونہ خجلت کا اثر ہوتا ہے جو پہلے بھائی صاحب کے تشریف رکھنے سے کم ہوتا تھا لیکن مسرت کو بہ تکلف خجلت پر غالب کرنے کی کوشش کروں گا۔ دعا کا محتاج۔ اشرف علی۔"

اللہ اللہ کیا ٹھکانا ہے رعایت جذبات کا! فرماتے ہیں کہ آپ مجھ سے ملنے سفر کرکے آ رہے ہیں، اس سے خجل ہوا جا رہا ہوں۔ پہلے آپ کے بھائی صاحب سہارنپور میں تھے، اور اب تو یہ سفر تمام تر میرے ہی لئے ہوگا۔ پھر بھی آپ کے آنے کی مسرت اتنی ہے کہ اس مسرت کو کوشش کرکے اپنی خجلت پر غالب کروں گا!

دیوبند سے افسوسناک اختلافات روز بروز بڑھتے ہی رہے تھے۔ حضرت مدت دراز سے مدرسۂ دیوبند کے سرپرست اعلیٰ چلے آ رہے تھے۔ اب حضرت کی نیک نفسی نے یہ گوارا نہ کیا کہ

اختلاف کے باوجود بھی یہ سرپرستی قائم رکھی جائے۔ استعفاء تو حضرت اِس سے قبل دے چکے تھے، اُسے ارکان نے منظور نہیں کیا تھا۔ ایسی بزرگ عدیم المثال ہستی کی سرپرستی سے محرومی مخالفین تک کی نظر میں کوئی آسان اور معمولی بات نہ تھی۔ اب حضرت نے اپنی علیحدگی بالکل ہی طے فرمالی، اور سُنّتِ حسنیٰ کے اتباع میں اپنے کو اِس منصب سے معزول فرمادیا۔ ارکان مدرسہ اِس معزولی کو بھی کب گوارا کرنے والے تھے۔ اِس لئے حضرت کو قرینِ مصلحت یہی معلوم ہوا کہ اِس واقعۂ خود معزولی کو بطورِ خود شایع مشتہر کردیا جائے۔ اِس خدمت کے لئے انتخاب اِس خاکسار کا ہوا۔ اور حضرت نے اپنے معمولِ عام کے خلاف مکاتیب میں ابتدا کرکے میرے نام حسبِ ذیل والانامہ رسالی فرمایا۔ ڈاکخانہ کی مُہر اِس لفافہ پر ۵ راکتوبر کی ہے:-

(۸۵)

"از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی جناب مولوی عبدالماجد صاحب سلمہٗ۔ السلام علیکم۔

ایک ناگوار تکلیف بادلِ ناخواستہ خلافِ عادت دے رہا ہوں۔ آپ کی عنایت سے امید ہے کہ گوارا فرمائیں گے۔ یہ ایک مسوّدہ دار العلوم کی باضابطہ خدمت سے یکسوئی کا ہے جس کو مدرسہ میں بھی بھیج چکا ہوں۔ مگر وہ شاید شایع نہ فرمائیں یا جلدی شایع نہ فرمائیں، اور خیرخواہانِ مدرسہ کے سکون کے لئے ضرورت ہے جلدی اشاعت کی۔ اِس لئے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ آپ جس پرچہ میں مصلحت سمجھیں شایع فرمادیں خواہ الصدق میں یا کسی اور پرچہ میں[1]۔ میرا تعارف دیگر اخبارات سے خاص طور پر نہیں۔ اِس لئے شاید میرے لکھنے سے شایع نہ کریں۔ آپ کے ایسے صاحبوں سے تعلقات ہیں۔ یہ بھی اختیار ہے خواہ اپنی رائے کے ساتھ شایع فرمائیں یا بدون رائے کے۔ اور رائے میں بھی بالکل آزاد ہیں۔ بس اتنا لحاظ ضروری ہے کہ مدرسہ کو کوئی گزند نہ پہنچے، بلکہ اگر کسی قدر مدرسہ کی خدمت کی ترغیب ہو تو مصلحت ہے۔ ورنہ نہ نفع ہو نہ ضرر۔ والسلام۔

---

[1] یہ پرچہ لکھنؤ کا اور پھر بند ہو چکا ہے، اور اب اس کی جگہ مئی ۱۹۳۵ء سے صدقِ جدید نکل رہا ہے، مگر اس وقت تک بجائے ہفتہ روزہ کے روزانہ روزنامہ۔

اگر ایک پرچہ میں بھی دیکھ سکوں تو دل چاہتا ہے گو بہ عاریت سہی۔

میں نے خط کو حفاظت کے لئے قصداً بیرنگ کر دیا ہے۔ اگر ڈاک والے دلیں تو ٹکٹ حاضر ہیں۔ اور اگر ذہول سے نہ لیں تو ان ٹکٹوں کو چاک کر دیجئے۔ اگر چاک کرنے کو دل گوارا نہ کرے۔ کسی خط میں (جو خاص اس غرض سے نہ بھیجا جائے) مجھ کو اطلاع کر دی جائے۔ میں خرید کر کے چاک کر دوں گا۔"

حضرت عالی ظرفی اور شرافت نفس کے بادشاہ تھے۔ خود تنگ ہو کر مدرسہ سے الگ ہو رہے ہیں مگر یہ گوارا نہیں کہ مدرسہ کو کسی طرح بھی ضرر پہنچے، بلکہ کوشش اسی کی ہے، کہ ہو سکے تو نفع ہی پہنچ جائے! یہ شرافت نفس حضرت تھی مولانا کا ——— اور پھر آخر خط میں ٹکٹوں کے بارے میں احتیاط کا کمال۔ سچ یہ ہے کہ تقویٰ و تدین کا اب تک نام ہی سُنا تھا۔ عملی نمونہ حضرت ہی کا دیکھا۔

یہ تو مکتوب تھا۔ اب اصل اعلان برائے اشاعت ملاحظہ ہو:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ الآیۃ۔ حامداً ومصلیاً

احقر اشرف علی آیت کی بناء پر عرض رسا ہے۔ چونکہ آج کل مدرسۃ العلوم دیوبند کے ارکان میں بعض مسائل انتظامیہ میں غیر معمولی اختلاف ہے جس کو بناء بر حسن ظن اختلاف اجتہادی کہنا اولیٰ ہے اور منجملہ ان مسائل کے احقر کی سرپرستی کی نوعیت کا مسئلہ بھی ہے، جو میری آزادی پسند طبیعت پر سب سے زیادہ گراں بھی ہے اور آئندہ ناگوار آثار کے ترتب کا بھی احتمال ہے۔ اس لئے احتیاطاً واخذاً بالعزیمۃ حضرت سیدنا حسنؓ کی سُنت کے اتباع میں نفس سرپرستی ہی سے اپنے کو معزول کرتا ہوں جو حقیقت میں تجدید اعادہ استعفاء سابق ہے۔ امید ہے کہ اس کے بعد بقیہ مسائل جلد ہی سہولت سے حل ہو جائیں گے۔ لیکن مدرسہ کی ہر خدمت مقدورہ سے انشاء اللہ تعالیٰ تقاعد نہ ہوگا۔ واللہ الموفق۔ فقط مقام تھانہ بھون۔ ۴ رجب جمعہ ۱۳۵۴ھ۔

اضافہ۔ البتہ جن صاحبوں نے اس معاملہ میں حدود شریعت وتہذیب سے متجاوز ہو کر میرا دل دُکھایا ہے، اُن سے خاص تعلقات رکھنے سے معذور رہوں گا۔ جب تک اس دلآزاری کا

نداڑک نہ کریں۔ گو عام اسلامی تعلقات باقی رہیں گے۔ اشرف علی۔ ۸ رجب ۵۴ھ

ایسی خدمت کی تعمیل میں ظاہر ہے کہ ادھر سے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ خدمت کے ایسے موقع کو تو اپنی سعادت سمجھا۔ اور پہلی ڈاک سے ۱ اکتوبر کو یہ جواب عرض کر دیا:۔

م۔ دیدہ نامۂ مبارک کل موصول ہوا، ایسے وقت کہ ڈاک کا وقت نکل ہی رہا تھا۔ ایک اخبار کو تو تحریر گرامی میں نے اُسی وقت روانہ کر دی۔ باقی دو تین اخبارات کو نقول آج روانہ کر رہا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م۔ خدام والا کی جو ادنیٰ سی ادنیٰ خدمت مجھ سے بن پڑے میرے لئے باعثِ سعادت ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اس محبت کا صلۂ جزیلہ عنایت فرمائے۔

م۔ واقعۂ علیحدگی سے گو مجھے صدمہ تو بہت ہوا۔

ا۔ یہ اقتضائے طبعی ہے جس کا منشا محبت طبعی ہے۔

م۔ لیکن پھر دوسرے پہلوؤں پر نظر کر کے خوشی ہوئی۔

ا۔ یہ اقتضائے عقلی ہے جس کا منشا حُبّ عقلی ہے۔ اور یہ دونوں محبتیں ایک دوسرے پر جزئی تفاضل رکھتی ہیں لیکن کلّی طور پر حُبّ عقلی افضل واکمل وانفع ہے مگر تجربہ سے اُس میں ایک قید بھی ہے کہ وہ کسی قدر حُبّ طبعی سے منسوب بھی ہو۔

م۔ صدق کی اشاعت میں ابھی ایک عشرہ کا وقت ہے۔

ا۔ مجھے کچھ جلدی نہیں۔ مرکز پر جلدی اطلاع کرنا تھی سو کر چکا اور دونوں جماعتوں کو اور اخباری اطلاع صرف مصالح عامہ مدرسہ کے لئے ہے سو اس میں اِس سے زیادہ توقف بھی مضر نہیں۔

م۔ اِس میں انشاء اللہ اِس واقعہ کو "ایثار کا ایک نمونہ" کی سُرخی کے تحت میں درج کروں گا۔ اور لکھوں گا کہ اس نے قرونِ اُولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔ دُوسرے اخبارات کو بھی یہی مشورہ دے رہا ہوں۔

ا۔ یہ محض آپ کا حُسنِ ظن ہے۔ ورنہ میرے نزدیک اس کی حقیقت واقعیہ یہ ہے کہ ؎

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں کُنجے گرفت و ترسِ خُدا را بہانہ ساخت

م - اِس طرف کچھ خانگی حالات ایسے پیش آ گئے کہ حاضری کی توقع عنقریب نہ رہی۔
ا۔ طبیعت کے خلاف اِس سے مجھ کو بھی مسرت عقلی ہوئی کہ اُس وقت تک تشویش ناک خبروں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔
م ۔ ڈاک والوں نے بیرنگ کر لیے لیے۔ اِس لئے ٹکٹوں کے چاک کرنے کا سوال ہی نہ رہا۔
ا۔ اطمینان ہو گیا۔"

خیر یہ سب مضامین تو خطوط میں اتفاقی اور عارضی ضروریات کے تحت میں آ جاتے تھے۔ باقی مستقل موضوع مُراسلت تو وہی تفسیر القرآن چل رہا تھا۔ ۱۱ر دسمبر ۳۵ء (۴ار رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ) کا عریضہ اسی رنگ میں ہے :۔

م " بیان القرآن ۔ جلد ۲ ۔ ص ۱۰۱ سطر متن ۲ ۔ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ ۔ مِنْہُ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔
ا۔ اب بنا دیا اِس طرح "وہ اُن کی طرف سے غلط خیال میں الخ
م ۔ جلد ۱ ۔ ص ۴۰ ۔ سطر متن ۳ ۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا ۔ وَلَقَدْ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔
ا ۔ اب بنا دیا اِس طرح "اور بہ تحقیق ہم نے الخ
م ۔ جلد ۱ ۔ ص ۴۴ ۔ سطر متن ۱ ۔ عِنْدَ اللّٰہِ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔
ا۔ اب ترجمہ و تفسیر دونوں میں اس طرح بنا دیا "عالم آخرت اللہ کے نزدیک محض الخ
م ۔ جلد ۲ ، ص ۱۷۶ ۔ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ تفسیر میں یہ عبارت درج ہے "اور نہ مقرب فرشتے کبھی عار کریں گے جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں جن کو اِلٰہ کا ایک جُزو مانتے ہیں" اِس پر عرض یہ ہے کہ عیسائی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے جُزو تثلیث ہونے کے مطلق قائل نہیں ۔ یہ التباس غالباً لفظ رُوح القدس سے پیدا ہوا۔ رُوح اللہ تو صرف ہماری اصطلاح میں جبرئیلؑ کے مرادف ہیں، ورنہ عیسائیوں کے ہاں تو بالکل الگ ایک ہستی ہیں، جن کا جبرئیلؑ یا کسی فرشتہ سے کوئی تعلق نہیں۔
البتہ عیسائیوں کا سوادِ اعظم کُل ملائکہ مقربین خصوصاً حضرت میکائیل کو خدائی میں کسی

حاجت کا دخیل و شریک سمجھتا ہے، اور اُن سے روزانہ اپنی دُعاؤں میں استعانت و استمداد کرتا رہتا ہے، جیسے ہمارے ہاں کے غالی اہلِ بدعت بزرگوں اور پیروں کے ساتھ معاملہ کرتے رہتے ہیں۔ میری فہمِ ناقص میں یہ قرآنی اشارہ اسی عقیدۂ فاسد کی جانب ہے، جیسے دُوسری جگہ ملائکہ کا وصف عباد الرحمٰن کہہ کر یہ بتا دیا گیا ہے کہ اُنھیں خدائی میں کچھ دخل نہیں وہ تو محض بندے ہیں۔ مذاہبِ غیر کی کتابیں جتنی زیادہ پڑھتا جاتا ہوں، اتنا ہی قرآن پاک کا اعجاز دِل میں اور زیادہ اُتر جاتا ہے۔ قوموں کی قومیں ایسی گذر چکی ہیں، جنھوں نے آسمان کو دیوتا مانا ہے، زمین کو دیوی سمجھ کر پُوجا ہے۔ ہوا، بارش، رعد، برق، رات اور دن، شجر، حجر، حیوانات سب کی پُوجا کی ہے۔ قرآن مجید جو بار بار ان سب کو مختلف پیرایوں میں محض مخلوق بتاتا ہے، اُس کی حکمتیں اب کُھلتی جاتی ہیں۔ ورنہ اب تک تو کبھی کبھی یہ شبہہ پیدا ہو جاتا تھا کہ ایسی کُھلی ہوئی حقیقتوں کو بار بار بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

ا۔ مجھ کو اس کی تحقیق نہ تھی۔ واقعی رُوح القدس کے متعلق یہی خیال تھا کہ جیسے ہم اتباعاً للقرآن رُوح القدس کا مصداق حضرت جبرئیل علیہ السلام کو کہتے ہیں اِسی طرح عیسائی بھی کہتے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک دونوں کے مفہوم میں تغائر ہے مگر یہ پتہ نہیں کہ اُس رُوح القدس کی حقیقت کیا ہے۔ آیا کوئی فرشتہ ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے تب تو تفسیر کی عبارت میں بجائے لفظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے رُوح القدس کا لفظ بدل دینا کافی ہے اور اس صورت میں اس کا تعلق مسئلۂ تثلیث سے رہے گا جس کا اُوپر سے ذکر ہے۔ اور اگر وہ ان کے نزدیک فرشتہ نہیں تو عبارت تفسیر کی اِس طرح بدلنا مناسب ہوگا "نہ مقرب فرشتے کبھی عار کریں گے جن کو بعضے شرک شریکِ الوہیت مانتے ہیں خود اُن سے کوئی پُوچھ دیکھے) تو اِس تقدیر پر اس کا تعلق خاص مسئلۂ تثلیث سے نہ ہوگا مطلق شرک سے ہوگا جس کو اُوپر تقریرِ ربط میں عام رکھا ہے۔

م۔ خدام والا خُدا کرے ہر طرح بہ خیریت ہوں۔

ا۔ بحمداللہ تعالیٰ مدت سے بالکل بہ عافیت ہوں، اِس کے قبل دو مرتبہ پیچش میں مُبتلا ہو گیا تھا جس کا اِس وقت بفضلہ تعالیٰ کوئی اثر نہیں۔ آپ کی خیریت مع متعلقین مطلوب ہے۔"

۱۹۳۶ء

(۸۹)

خطوط میں زیادہ دیر تو عموماً ہونے ہی نہیں پاتی تھی، اب میرے ذخیرۂ خطوط میں جہاں کہیں لمبا وقفہ نظر آتا ہے، تو اس کا سبب یا تو یہی ہوگا کہ اِس درمیان میں مَیں خود تھانہ بھون حاضر ہوگیا ہوں گا اور یا پھر بدقسمتی سے اِس درمیان کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔ بہرحال اُس ۱۱ دسمبر والے خط کے بعد عریضہ ۸ فروری ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے ــــــ حسبِ دستور تفسیر قرآنی کا ایک درس :-

م: تفسیر بیان القرآن جلد ۳، ملاحظہ میں رکھ لی جائے۔

صفحہ ۹۲۔ س ۱۔ فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ترجمہ "کوئی اور بات" درج فرمایا گیا ہے مفہوم تو بیشک اِس سے ادا ہوگیا۔ لیکن یہ صاف نہ ہوا کہ ضمیر مذکور واحد غائب کس لفظ کی جانب ہے۔ اِسم اس کے قریب تو صرف آیات آیا ہے۔

ا۔ آیات ہی طرف ہے، یہ تاویل حدیث یا قرآن کذا فی رُوح المعانی۔ اب اِس طرح ترجمہ کردیا "یہاں تک کہ وہ اِس بات (یعنی قرآن) کے علاوہ"

م۔ ص ۹۷۔ س ۳ متن۔ حَنِيْفًا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ تفسیر میں ہے "یکسو ہوکر" جو غلطی سے قوسین کے اندر لکھ دیا، اِس لئے ترجمہ میں نہیں لیا گیا۔ اب قوسین باہر کردیا گیا۔

م۔ ص ۹۹۔ س ۱۔ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ کا ترجمہ "بڑا علم والا، بڑا حکمت والا" درج ہے۔ یہ قلب ترتیب قصداً فرمایا گیا ہے یا محض سہو کتابت ہے؟

ا۔ سہو ہے اور سہو بھی میرا۔

م۔ صفحہ ۱۰۱ و صفحہ ۱۰۲۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ الخ اِس پوری آیت کی تفسیر خوب دلنشیں نہ ہوئی۔ دوسری تفاسیر سے مراجعہ کے بعد بھی شرح صدر خاطر خواہ نہ ہوا۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ، یہ قول تو بظاہر مشرکین کا معلوم ہوتا ہے کہ وہی سرے سے سلسلۂ وحی کے منکر تھے۔ یہود اِس سے یکسر انکار کیسے کر سکتے تھے۔ شان نزول کی روایات تو چنداں قوی ہوتی نہیں، البتہ اعتراض کا جو جواب قرآن مجید نے دیا ہے، اِس سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ قول یہود کا تھا۔

ایک خیال یہ آیا کہ قول مشرکین ہی کا ہوگا اور جواب الزامی بھی اُن ہی کے مقابلہ میں ہے، اِس لئے کہ یہود کے صاحب کتاب ہونے کے وہ بھی قائل تھے، لیکن تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ اور تُبْدُوْنَهَا اور تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کی سہ گونہ تصریح نے اِس خیال کو بھی جمنے نہ دیا، اِس لئے کہ یہ تینوں اعمال تو یقیناً یہود ہی کے تھے۔ بہرحال ابھی تک حیص بیص میں پڑا ہوں۔

ا۔ اِس اشکال کا احساس مجھ کو بھی ہوا، مگر میں نے تفسیر میں اِسی کو ترجیح دی کہ یہ یہود کا ہے۔ اِس پر دو اشکال واقع ہوئے ایک یہ کہ سورۃ مکی ہے، اور یہود سے مناظرہ مدینہ میں عربی حاشیہ میں دیا گیا۔ اجیب باستثناء هذه الآيات من المكية كما اخرجه ابو الشيخ الخ و فی تفسیر الخازن عن ابن عباس نزلت سورة الانعام بمكة الا ست آيات منها قوله وما قدروا الله حق قدره فانها نزلت بالمدينة۔ ۔ دوسرا اشکال یہ کہ یہود ایسی بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اِس کا جواب تمہید میں دیا گیا لقولی "جوش میں آ کر" اور عربی حاشیہ میں اِس کی مزید تفصیل کی گئی فی المعالم فی القصة ان مالك بن الصيف لما سمعت اليهود منه تلك المقالة عتبوا عليه وقالوا اليس الله انزل التوراة على موسى فلم قلت ما انزل الله على بشر من شيء قال فقال مالك بن الصيف ــــ

اغضبنی محمد فقلت ذالک فقالوا له وانت اذا غضبت تقول علی اللہ غیر الحق فنزعوہ من الحبریہ وجعلوا مکانہ کعب بن الاشرف اِس سے اقرب کوئی توجیہ ذہن میں نہیں آئی اور اس میں کچھ بُعد بھی نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کی ایک نظیر یہود سے منقول ہے۔ من قولہ تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔

اِس تحریر کے بعد ایک اور توجیہ بہت اقرب ذہن میں آئی جس میں نیشاپوری سے کچھ مدد ملی۔ روایات میں ہے کہ جس یہودی نے یہ بیہودہ بات کہی تھی اِس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا انشدک بالذی انزل التورٰیۃ علی موسٰی اما تجد فی التورٰیۃ ان اللہ یبغض الحبر السمین وکان حبرًا سمینًا فقال واللہ ما انزل اللہ علی بشر من شئ الخ رواہ ابن جریر بسندہٖ عن سعید بن جبیر اِس پر نیشاپوری نے ایک قول نقل کیا ہے وقیل اللفظ وان کان مطلقًا بحسب اللغۃ الا انہ مقید بتلک الواقعۃ فکانہ قال مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ فی انہ یبغض الحبر السمین الخ اب تو اِس میں یہ بُعد نہ رہا کہ یہود ایسی بات کیونکر کہہ سکتے تھے۔ البتہ ایک اور اشکال واقع ہوتا ہے جس کو نیشاپوری نے بلاجواب نقل کیا ہے بقولہ ویرد علی ھذہ التوجیہ ان قولہ من انزل الکتٰب الذی جاء بہٖ موسٰی لا یکون مبطلا لکلام الخصم۔ مگر الحمد للہ میرے ذہن میں اس کا جواب آگیا۔ وہ یہ کہ گو نیت قائل کی تقیید کی ہو لیکن لفظ میں اطلاق جو دال ہے عموم پر خود خلاف دین ہے اور صیغۂ مستلزم ہے مطلقاً انزال کی نفی کو اور تنبیہ ہے اِس کلام مطلق کی شناعت پر، اِس کی نظیر یہود کا وہ قول ہے اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِیَآءُ کہ انھوں نے یہ قول گو بطور الزام کہا تھا مگر یہ قول بلفظہٖ ولو لنفی الالزام میں کافی نہیں بلکہ دال ہے دعویٰ پر، اس لئے اِس پر تشنیع کی گئی ذکرنہ فی رسالتی الخطاب الملیح۔

م۔ کلام پاک کے دقائق و نکات تو خیر الگ رہے، میں تو اب یہ کہتا ہوں کہ سادہ عبارت کے لحاظ سے بھی اس کا پوری طرح سمجھ لینا اور پھر اسے دوسری زبان میں ادا کر دینا انتہائی

دُشوار کام ہے۔

ا۔ واقعی دُشوار ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ سہل فرما دیتے ہیں۔[1]

م۔ ضمائر میں بہت اُلجھتا رہتا ہوں۔ نیز اس قسم کی ترکیبوں میں وَ لِیَکُوْنَ۔ کلام ماسبق سے ربط ملانے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے۔

ا۔ ضرور دقت ہے لیکن یہاں بھی وہی استثناء ہے۔

م۔ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کا ترجمہ، جیسا کہ اس کا حق ہے، اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔ "جن پر تیرا غضب نازل ہوا" یہ محض مفہوم ہے، ترجمہ نہیں۔ ایک تو ضمیر "تیرا" کا اضافہ کرنا پڑا، دوسرے صیغہ کو معروف سے مجہول بنانا پڑا۔ میرا دل تو اس قسم کی ترکیب ڈھونڈھتا ہے "جو مغضوب ہیں" یا جن پر غضب کیا گیا ہے"

ا۔ میں نے اپنا ترجمہ دیکھا، اُس کے یہ الفاظ ہیں "ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا" اس میں اگر لفظ (آپ کا) کو خطوط وحدانیہ میں ہو تو غالباً سب رعایتیں محفوظ ہو جائیں۔

م۔ لوگ اپنی عام عقیدت کی بنا پر حضرت شاہ صاحبؒ[2] کے ترجمہ کو بہترین کہتے ہیں، لیکن میں تو اب اپنے تجربہ و بصیرت کی بنا پر حلف لینے کو تیار ہوں کہ جو جو رعایتیں بیان القرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اُن کا شاہ صاحبؒ کے ہاں پتہ بھی نہیں۔ ہاں شرفِ اوّلیت بیشک اُن ہی کو حاصل ہے۔

ا۔ اس پر بجز اس کے اور کیا عرض کروں کہ رائی اور مربی کا تناسب شرطِ رویت ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر اور ترجمہ کے دقائق غامض ہیں، اُن پر حضرت مولانا دیوبندیؒ کی نظر پڑی اسی لئے انھوں نے کلام اللہ کی خدمت کے لئے اُن کے ترجمہ کو منتخب فرمایا۔ مقدمہ میں اس ترجمہ کے کچھ غوامض و رعایات کی توضیح بھی فرمائی ہے۔ ایک بڑے نے دوسرے بڑے کا

---

[1] اس مختصر سے جواب کی جامعیت لاجواب ہے۔

[2] یعنی شاہ عبدالقادر دہلویؒ۔

ادراک فرمایا۔ اور میں چھوٹا تھا۔ میرے التزامات و رعایات بھی چھوٹے درجہ کے ہیں جو زیادہ غامض نہیں۔ آپ بھی حضرت مولاناؒ سے چھوٹے تھے اُن کا ادراک آپ کو ہوا[1] مصرعہ اسی تناسب کے متعلق مشہور ہے:۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

میں نے اِس سے دو مصرعہ حسب مقام بنائے ہیں۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دو باطن بیں

اور

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دو ظاہر بیں

معذرت۔ مجھ کو مضمون بڑھنے کا گمان نہ تھا۔ ورنہ اوّل جُدا کاغذ سے شروع کرتا۔ مطالعہ کی پریشانی معاف کیجئے۔"

حضرت کا جواب علاوہ میرے اصل خط کے کاغذ کے دو الگ پرچوں پر آیا تھا۔ یہ معذرت اسی کے متعلق ہے! ــــــ اللہ اکبر، کسی دُوسرے کا ایسی معمولی اور خفیف چیزوں کی طرف خیال ہی کیوں جانے لگا تھا؟

(۸۷)

حضرت کی اصلی اور سب سے بڑی حیثیت مُعالج نفس ہی کی تھی۔ اور ادھر اپنے میں تفسیر نویسی کی برکتوں کے باوجود یہ نہیں ہوا تھا کہ نفس خبیث اپنی شرارتوں اور خباثتوں سے باز آ گیا ہو، اور علاج و مسلسل علاج کی ضرورت جاتی رہی ہو۔ وقتاً فوقتاً حضرت کی خدمت میں، برابر امراض نفس کے لئے چارہ جوئی جاری رہی۔ ۳۰ مارچ کا عریضہ تمامتر اسی کے نذر کرنا پڑا ــــــ امراض، پوشیدہ و ظاہر، تو خدا معلوم تعداد میں کتنے تھے، لیکن غصہ کا مرض سب سے زیادہ مُستمر، بے پناہ اور لاعلاج سا نظر آیا۔ ڈیڑھ صفحہ کا عریضہ اپنے بیجا غُصّہ کا کچّا چِٹّھا، خصوصاً

---

[1] اِس جواب کی لطافت، بلاغت، حلاوت وجد آفریں ہے۔

مُلازم پر۔ اور بالکل تنگ آکر حضرت سے استدعا کی ہے۔ پورے خط کی نقل بے نتیجہ ہوگی۔ صرف آخر کا حصہ درج ہے :۔

"..... چند ہی منٹ بعد جب سکون ہوجاتا ہے، تو اپنے اُوپر خوب ملامت کرتا ہوں، طرح طرح کی غیرت دلاتا ہوں کہ نفس کی اس فربہی کے ساتھ اور اسی ظرف پر مفسر قرآن بننے کے حوصلے ہیں! بزرگوں کے بھلا یہی طریقے رہے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے نفس کے لئے انتقام لینا جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے خادموں کے ساتھ حضورؐ کا کیا برتاؤ تھا۔ غلاموں پر سختی کے لئے کیا وعیدیں آئی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں یاد آتی ہیں، مگر سب بعد از وقت۔ عین وقت پر جب جنون سا سوار ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی شئے کا بھی استحضار نہیں رہتا

کچھ روز سے ہر نماز فرض کے بعد بالالتزام اس کے لئے بھی دُعا کرتا رہتا ہوں۔ لیکن ابھی تک وہ بھی غیر موثر رہی ہے کبھی کبھی ایک لمبا وقفہ جب ہوجاتا ہے تو کچھ امید بندھنے لگتی ہے کہ بس ایکبارگی پھر دریا کا بند جیسے ٹوٹ جاتا ہے، اور کی کرائی کوشش رائگاں جاتی ہے۔ اب للہ جناب ہی کوئی علاج تجویز فرمائیں"

حضرت کے ہاں سے جواب وہی مرحمت ہوا، جس کی توقع ہی حکیم الامت سے کی جاسکتی تھی :۔

"بیماری کا علاج بیمار کیا کرے۔ میں خود اس بلا میں مبتلا ہوں۔ لیکن اگر ایک بیمار کو کوئی نسخہ یاد ہو خواہ خود استعمال نہ کرے تو دوسرے کو بتلا دینے کا مضائقہ بھی نہیں۔ اس حیثیت سے کچھ عرض کرتا ہوں کہ یہ حالت یا واقعہ دو سبب سے مسبب ہوسکتا ہے۔ ایک یہ کہ غصہ کے وقت اس کے تبعات یاد نہ رہیں، دوسرا یہ کہ باوجود یاد رہنے کے قوت وہمت ضبط کی نہ ہو۔ اگر اوّل سبب ہے تو اس کی یہ تدبیر ہے کہ ایک پرچہ غصہ، مفرطہ کی ابجدوں کا لکھ کر کلائی پر باندھ لیا جائے، اس پر نظر پڑتے ہی یاد پڑ جائے گا۔ اور اگر دوسرا سبب ہے تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ فوراً وہاں سے علیحدہ ہوجائیں یا مغضوب علیہ کو جدا کردیں۔ جب ہیجان بالکل فرو ہوجائے اُس وقت اطمینان سے سوچا جائے بلکہ کسی عاقل سے مشورہ لیا جائے کہ اس جُرم کی کیا سزا مناسب ہے، بعد تامل یا مشورہ جو

طے ہو اُس کو مُبلا کر اُس سزا کو جاری کر دیا جائے۔ مگر بہر حال میں اتنی ہمت کی ضرور ضرورت ہے کہ تدبیر کو اختیار کر لیا جائے، اگر کسی میں اتنی بھی ہمت نہیں تو پھر بجز خرق عادت کے کوئی علاج نہیں اور وہ کسی کے قبضہ میں نہیں۔"

غزالیؒ وغیرہ نے جو علاج غصہ کے بتائے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر اچھے خاصے ہیں، لیکن اس غزالی وقت کے تجویز کیے ہوئے علاجوں کی شان ہی کچھ اور ہے۔

موضع پھریہا ضلع اعظم گڑھ کے ایک فاضل بزرگ مولانا حمید الدین تھے۔ مولانا شبلی کے عزیز قریب، ادبیات عربی کے ماہر اور قرآن کے بڑے گہرے طالب علم۔ انگریزی میں بھی گریجویٹ۔ جو کچھ لکھتے عموماً عربی ہی میں لکھتے۔ تفسیر قرآنی ایک فلسفیانہ اسلوب پر کرتے۔ اور متعدد تفسیری رسالوں کے مصنف تھے۔ ایک مدرسہ بھی، اُن کے خاص انداز پر چلایا ہوا مدرسۃ الاصلاح کے نام سے سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں قائم تھا۔ اُن کی تفسیر نظام الفرقان کا تذکرہ ان اوراق میں ۱۹۲۹ء کے واقعات کے ذیل میں آچکا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔ چند سال بعد اُن کے بعض ناتمام قلمی مسودے ان کے شاگردوں نے اسی صورت میں شایع کر دیئے۔ ان میں یقیناً بعض الفاظ دینی حیثیت سے بیجا اور قابل گرفت موجود تھے (نظر ثانی کے وقت مولانا خود اُن کی اصلاح ضرور کر دیتے) مولوی صاحبان تو ایسے موقع کی تاک ہی میں لگے رہتے ہیں، اور یہاں تو پھر ایک مدرسہ بھی اس مدرسہ کے مقابل، تھا، زور و شور سے تکفیر ہونے لگی۔ اور مکفرین میں حضرت مولانا کے بعض شاگردوں کے ساتھ ساتھ خود حضرت مولانا کا نام بھی آنے لگا ـــــ یہ سب تمہید ذہن میں رکھ کر اب میرا معروضہ ۲ رجون کا ملاحظہ ہو:-

"مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ایک کارکن اور رسالۃ الاصلاح کے مدیر[1] کا ایک خط میرے نام پیشتر بھی آیا تھا۔ اب کل پھر آیا ہے۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"مولانا تھانوی کا فتویٰ شایع ہو گیا۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کافر ہیں[2] اور چونکہ

---

[1] یعنی مولوی امین احسن صاحب اصلاحی۔

مدرسہ ان ہی دونوں کا مشن ہے، اِس لئے مدرستہ الاصلاح مدرسۂ کُفر و زندقہ ہے۔ اور اِس کے تمام متعلّقین کافر و زندیق ہیں، یہاں تک کہ جو عُلماء اِس مدرسہ کے جلسوں میں شرکت کریں وہ بھی مُلحد و بے دین ہیں ..... افسوس کہ اصل فتویٰ نہ مل سکا۔ مِل جاتا تو اصل یا نقل آپ کی خدمت میں بھیج دیتا[۲] ..... عام مولویوں کی شکایت فضول ہے۔ ان سے توقع ہی کسے تھی۔ البتہ بڑی مایُوسی مولانا تھانوی سے ہوئی[۳] ..... جن دو عبارتوں پر مولانا حمید الدین کی تکفیر کی گئی ہے، ہر چند کہ میرے نزدیک وہ بالکل واضح ہیں تاہم آپ کی ہدایت کی تعمیل میں ان دونوں کی تشریح جُون کے پرچۂ الاصلاح میں چھپ گئی ہے"

۱۔ (۱) اِس کا جواب میری تحریر کُلّی میں معروض ہے۔

(۲) وہ میرے پاس بھی نہیں مگر بعض اجزاء جو فتویٰ کی طرف منسُوب کئے گئے ہیں غالباً غیظ اُس نسبت کا سبب ہے۔ امید ہے کہ وہ اجزاء اِس فتویٰ میں نہ ملیں گے۔ شاید روایت بالمعنی کو کذب سے بچنے کے لئے کافی سمجھا گیا ہوگا مگر ہر روایت بالمعنی کو اس شان کا سمجھنا غلط ہے۔

(۳) اِس کا عُذر تحریر کلّی میں مرقوم ہے۔

۴۔ مولانا حمید الدین مرحوم کی خدمت میں مجھے مدتوں نیاز حاصل رہا ہے۔ اپنے علم میں اتنی دینداری اور خشیت میں نے بہت کم لوگوں میں پائی ہے۔ دین پر ادنیٰ اعتراض سُن کر جوش سے بھر جاتے تھے۔ میں نے خود اپنے دَورِ الحادیت[۱] بارہا اُن کی ڈانٹ کھائی ہے۔ ایک دن خود مولوی شبلی صاحب نے (جو آخر میں خود بھی بہت درست ہو گئے تھے) قرآن مجید کے متعلّق شوخی سے گفتگو کی تھی، مولانا حمید الدین کو گویا بُخار چڑھ آیا اور جب تک مفصّل تردید نہ کر لی چین سے نہ بیٹھے۔ نماز کے عاشق تھے، تہجّد گذار تھے، وقس علیٰ ہذا۔ اور یہ مشاہدات تنہا میرے نہیں، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بھی انشاء اللہ پُوری شہادت دیں گے۔

---

[۱] یہ دَور کالج کی طالب علمی کے زمانہ (۱۹۰۸ء) سے لے کر ۱۰، ۱۱ سال تک قائم رہا۔

ا - میں تو شہادت کا بھی محتاج نہیں - اور شہادت کے بعد تو کوئی حق بھی نہیں ان واقعات میں شبہ کرنے کا - لیکن ان سب کے ساتھ یہ مقدمہ بھی جائز الذہول نہیں کہ یہ سب اعمال و احوال ہیں - عقائد ان سے جداگانہ چیز ہیں - صحت عقائد کے ساتھ فساد اعمال و احوال اور فساد عقائد کے ساتھ صحت اعمال و احوال جمع ہو سکتا ہے -

م - ایک طرف یہ سب کچھ ہے، دوسری طرف یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ جناب والا آسانی سے کسی کلمہ گو کی تکفیر کرنے والے نہیں - خدا معلوم کیا صورت واقعات پیش آئی جو یہ نوبت آکر رہی -

ا - تحریر طویل میں معروض ہے -

م - لفظ "غیر التشبہ" اور اسماء سور والی عبارت یہ دونوں مجھے بھی کھٹکے تھے - لیکن دل نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یا تو یہ الفاظ مولانا کے ہیں ہی نہیں، کاتبوں نے خدا معلوم کیا سے کیا کر دیا اور یا اگر اُن ہی کے ہیں تو یقیناً بے خیالی میں قلم سے نکل گئے - اور اُن کا وہ مطلب تو اُن کے ذہن میں ہو بھی نہیں سکتا جو بہ ظاہر اُن سے متبادر ہوتا ہے -

ا - مجھ سے یہ دونوں لفظ پڑھے نہیں گئے - نہ کچھ یاد آیا نہ وہ عبارتیں سامنے ہیں کہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا -

م - اور مولانا کی وہ تحریر تو چھپنے کے لئے تھی بھی نہیں - خود اپنے لئے یہ طور یادداشت لکھی تھی معتقدین نے خواہ مخواہ بلا ترمیم و اصلاح بجنسہ شائع کر دی -

ا - مگر کسی محقق متقیظ عالم سے مشورہ کر لیا جاتا -

م - مجھے اپنی جگہ پر تو یقین ہے کہ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو بلا تامل ایسی عبارتوں کو بدل دیتے -

ا - ان جذبات پر فضل کیا بعید ہے -

م - خادمت والا میں چونکہ بہت گستاخ ہوں - اس لئے بلا تکلف یہ سب عرض کر ڈالا -

ا - ایسی گستاخی و بے تکلفی کا تو بھوکا ہوں - مگر دوسرے لوگ نفرت و غصہ سے کہتے ہیں،

لـ (کا استعمال بعض الفاظ قرآنی کے متعلق)

اِس لئے بشر بن جاتا ہوں اور بشر بھی وہ جس میں بادہ جبّارہ ہے اور بشر مجرد ہے۔

م۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس قدر بے چین ہو رہا ہوں۔

ا۔ مسلمان کا تو یہ تمغہ ہے سے

چو از محنتِ دیگراں بے غمی — نشاید کہ نامت نہند آدمی

م۔ مدرسہ کی حمایت میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ جیسی آزادی آج کل سب کہیں ہے مدرسہ میں بھی ہو گی۔ مجھے تو جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ صرف مولانا مرحوم کی ذات سے متعلق ہے۔

ا۔ اِس انصاف و غیر جانبداری پر دُعا بلکہ دُعائیں نکلتی ہیں۔
میں رسائل[1] کا منتظر ہوں۔

م۔ ابھی یہ معروضہ بالکل خانگی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف جناب والا کے ملاحظہ کے لئے۔

ا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسی پر عمل ہو گا۔ البتہ میری تحریر کا[2] میں بعض چیزیں طالب علموں کے لئے مفید ہیں۔ اُن کو یادداشت میں رکھنے کے لئے ایسے عنوان سے نقل کرا لوں گا کہ کسی کو نہ واقعہ معلوم ہو نہ اصحابِ واقعہ کا نہ آپ کے خطاب کا پتہ چلے۔ اِسی لئے رسالۃ الاصلاح کا نام کاٹ دیا ہے۔ اور اس کو ابھی شائع نہ کیا جائے گا بلکہ بعد غور کے جب کہ اُس میں نہ خود کوئی محظور و مفسدہ معلوم ہو نہ کسی دوست کی تنبیہ ہے۔ چنانچہ نقل کی تمہید کی یہ عبارت ہے:-

"احقر نے ایک ایسے فتویٰ پر دستخط کر دیئے جو بعض صاحبوں کی بعض عبارات کے متعلق تھا۔ ایک مخلص دوست کی اطلاع پر بعض لقول میں تردد ہو گیا، اِس کے متعلق ذیل کا جواب لکھا گیا:-

اب اِس کے آگے حضرت کی وہ مفصّل اور کلّی تحریر ہے، جس کا حوالہ مکتوب بالا میں بار بار آیا ہے۔

---

[1] یعنی وہ رسالے جو مولانا شبلی اور مولانا فراہی کی صفائی میں لکھے گئے تھے۔

[2] حضرت کی اصطلاح میں اِس سے مُراد علماء ہوتے تھے۔

"از اشرف علی عفی عنہ بخدمت مکرمی دام لطفہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

پرسوں رسالہ اور کل الطاف نامہ پہنچا، رسالہ کے بعد خط کا انتظار تھا کیونکہ رسالہ بھیجنے کی غایت معلوم نہ ہوئی تھی۔ خط سے سب معلوم ہوگیا۔

اس خیرخواہی و رہنمائی کا شکرگزار ہوں۔ آپ سے بوجہ آپ کے خلوص کے کچھ تکلف نہیں، اور میں تو کسی سے بھی تکلف و تلبیس نہیں کرتا۔ اس لئے بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ سب سے پہلے بعض مقدمات عرض کرتا ہوں۔ پھر مقصود عرض کروں گا اور سب مختصر ہوگا۔

؁ مفتی کا منصب قانون دان وکیل کا ہوتا ہے قاضی کا نہیں ہوتا یعنی قاضی کا حکم فیصلہ ہوتا ہے اس لئے اس پر واجب ہے کہ واقعات کی تنقیح کرے۔ مفتی کے ذمہ یہ نہیں، اس کے قول کا حاصل محض قانون بتلانا ہوتا ہے۔ وہ بھی پوچھنے پر۔ تمام بار سائل پر ہوتا ہے بہ لفظ دیگر اس کا قول قضیہ شرطیہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر یہ واقعہ اس طرح ہے تو اس کا قانونی حکم یہ ہے۔ حدیث صحیح میں تصریح ہے کہ ہندہ نے اپنے شوہر ابوسفیانؓ کی تنگی خرچ کی شکایت کرکے استفتاء کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدون تنقیح واقعہ کے ارشاد فرمایا فخذی من ماله کما هو مصرح فی تسوالها، ما یکفیک وولدک بالمعروف۔ اگر مفتی باوجود کسی قسم کی ذمہ داری نہ ہونے کے کوئی احتیاط کرے وہ تبرع ہے جو لازم نہیں۔

؂ کبھی وہ اس تبرع یعنی احتیاط کو اختیار کرتا ہے جہاں دوسرا پہلو یعنی عدم تبرع کا قوی نہ ہو۔ اور کبھی وہ اس کو اختیار نہیں کرتا جہاں خاص احتیاط کرنے میں کوئی قوی مفسدہ ہو اور مفسدہ کا قوی یا ضعیف ہونا اس کے اجتہاد پر ہے اور نیک و بد ہونے کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

؃ انشاء اور موافقت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یعنی ایک تو خود کسی قول کا دعویٰ کرنا، دوسرے کسی دوسرے کے قول کے ساتھ موافقت کرنا۔ اول میں زیادہ تحقیق کرتا ہے ثانی میں

تھوڑی بھی گنجایش ہوتی ہے اِس میں مخالفت نہیں کرتا۔

اِن مقدمات ثلثہ کے بعد واقعہ عرض کرتا ہوں مستفتی نے میرے سامنے واقعات پیش کر کے جواب چاہا۔ میرے قویٰ بھی مضمحل ہو گئے، مشاغل کا بھی ہجوم ہو گیا۔ میں نے جواب لکھنے سے عذر کر دیا کہ اور صاحبوں سے لکھوا لیا جائے۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر میرے سامنے جواب پیش کیا۔ واقعات مسئول عنہا کی تحقیق کو میں نے اپنے نزدیک ضروری نہیں سمجھا دو وجہ سے۔ ایک تو مقدمۂ اولیٰ کی وجہ سے، دوسرے مستفتی کے علم و تدیّن کی وجہ سے۔ جواب چونکہ سوال کے مطابق تھا میں نے موافقت پر دستخط کر دیئے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر میں خود جواب لکھتا اسی میں عنوانات و عنوانات دونوں میں زیادہ رعایت کرتا مگر چونکہ موافقت میں توسع ہوتا ہے مقدمۂ ثالثہ کی وجہ سے اِس لئے میں نے اس میں تنگی نہیں کی۔

عے چونکہ مجھ سے یہ ظاہر کیا گیا جس کی تکذیب کی کوئی دلیل بھی میرے پاس نہ تھی کہ بہت سے لوگ نئے خیال کے اِس مدرسے سے بگڑ رہے ہیں اور بہت لوگ پرانے خیال کے بگڑنے کو ہیں اور اکثر لوگ متردد ہیں اور حقیقت کو معلوم کرنا چاہتے ہیں اِس لئے اِس فتویٰ کی سخت حاجت ہے۔ اِن حالات کو سن کر تبرع و احتیاط کے پہلو پر انتظام کا پہلو غالب آیا اور احتیاط معتاد کو لازم نہیں سمجھا بنا بر مقدمۂ ثانیہ۔ اتنا پھر بھی کیا کہ مستفتی کو سوال میں کسی کا نام لکھنے سے نہایت تاکید کے ساتھ روک دیا تاکہ فتویٰ کا محل کسی کی ذات نہ رہے، محض وہ عقاید ہوں پھر مجھ کو معلوم نہیں اُنھوں نے کس مصلحت یا ضرورت یا کس کے مشورہ سے طباعت کے وقت بین القوسین غالباً نام بھی لکھ دیئے۔ غالباً انھوں نے اِس ہیئت کو عرف کے سبب سوال سے خارج ہونے کے لئے کافی سمجھا جس میں میں موافق نہیں۔ سوال میں خاص رسالہ سے جو مضمون نقل کیا گیا ظاہر ہے کہ اس کو جس شخص کے سامنے پیش کیا جائے گا وہ وہی جواب دے گا جو اُس سوال پر لکھا گیا۔ اب دوسرا رسالہ آنے سے ضرور تردد ہو گیا کہ آیا منقول عنہ سابق میں اسی طرح ہے جو سوال میں نقل کیا گیا ہے یا اُس طرح ہے جو دوسرے رسالہ میں لکھا گیا ہے۔ اِس لئے میں آج خط لکھ کر مستفتی صاحب سے

منقول عنہ منگاتا ہوں پھر تطابق و عدم تطابق کو دیکھوں گا۔ اور اس کے بعد اس کے متعلق کچھ عرض کر سکوں گا۔ اگر انھوں نے کسی عذر سے یا کسی خاص مقتضی سے رسالہ نہ بھیجا تو آپ سے درخواست کروں گا کہ کسی سے مستعار بھجوا دیجئے۔ میں نے سب واقعہ بدوں افراط و تفریط کے لکھ دیا۔ اب حالت موجودہ میں آپ سے بھی مستفیدانہ مشورہ طلب کرتا ہوں کہ مجھ کو مختلف حالات میں کیا کرنا مناسب ہے، کہ کسی خاص کو بھی ضرر نہ ہو اور عوام کو بھی ضرر نہ ہو۔ میں بہ شرط سمجھ میں آجانے کے دل و جان سے اُسی پر عمل کروں گا۔ والسلام

یہ تو عرض کلّی تھی۔ اب بعض جزئیات خود الطاف نامہ کے حواشی پر عرض کرتا ہوں" اور یہ حواشی وہی ہیں، جو پچھلے نمبر میں سلسلہ وار نقل ہو سکے۔

دُنیا بھی ایک عجیب و غریب جگہ ہے۔ عجیب سے عجیب واقعات جن کا سمجھ میں آنا مشکل ہوتا ہے، مولانا حمید الدینؒ خود ایک بڑے متقشف عالم تھے۔ کوئی خیال بھی کر سکتا تھا کہ نوبت اُن کی تکفیر کی آئے گی۔ لیکن آئی، اور بالکل بلا وجہ بھی نہیں۔ خلاف احتیاط اور قابل گرفت الفاظ بیشک اُن کی ایک یادداشت میں نکلے۔ جسے ان کے شاگردنے بجنسہٖ اسی صورت میں چھاپ دیا تھا ——— رہے مولانا شبلی تو اُن کی الکلام میں قابل گرفت عبارتیں برسوں پیشتر سے لکھی چلی آرہی تھیں۔ میرے یہ دونوں بزرگ بڑے محسن اور عملاً اُستاد تھے۔ اُن کی جائز حمایت و نصرت میں رجو اُس وقت عین حق و انصاف کی حمایت تھی، جو کچھ بھی عاجزانہ کوششیں بن پڑیں، کی گئیں اور شکر ہے کہ حضرت کے ہاں حضرت ہی کی انصاف پسندی اور اعتدال دوستی کی بنا پر بڑی حد تک کامیاب و مقبول ہی ہوئیں۔

مولوی شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی آج ۱۹۴۲ء میں، ماشاء اللہ دونوں ایک دوسرے کے دوست و محبّ، اور حضرت ہی کے دونوں خلیفہ مجاز ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں صورت حال اس کے برعکس تھی۔ مولوی شاہ عبد الغنی صاحب مع ساری جماعت اشرفیہ کے اس طبقہ کے شدید مخالف تھے، جس کی سیادت مولانا سید سلیمان ندوی

اور مولوی مسعود علی ندوی کے ہاتھ میں تھی! سید صاحب کی متعدد تحریریں اس زمانہ میں
شائع ہوئیں، اور مولوی صاحب کے خانگی خطوط میرے نام داد وتحسین کے آتے رہے، ان
سب کی تفصیل الگ کی جائے، تو یہ بحث خود ایک رسالہ کی ضخامت اختیار کرلے، اور پھر
حضرت حکیم الامت کی ذات سے براہ راست اس کا تعلق بھی نہیں۔ حضرت سے تفصیلی مراسلت
اس موضوع پر کچھ روز تک جاری رہی، اور مولانا حمید الدین مرحوم کی صفائی ایک بڑی
حد تک ہو گئی۔

۴ر جولائی کا عریضہ اسی بحث سے پیدا ہونے والے حالات سے لبریز ہے

م- دو گرامی نامہ نیز مفصل کلی تحریر نے سرفراز کیا۔ بحمد اللہ ایک بڑا بار قلب سے ہٹ گیا۔ میں نے دونوں تحریریں جناب کا انتظار کئے بغیر مولانا مناظر احسن صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دی ہیں۔

ا- در کار خیر حاجت اذن واشارہ نیست۔

م- اب جو کچھ عرض کرنا ہے، انشاء اللہ موصوف ہی کریں گے۔

ا- ٹھنڈے دل سے دیکھ لوں گا۔

م- اس کے بعد بھی کچھ ضرورت باقی رہی تو یہ نامہ سیاہ بھی عرض کردے گا۔

ا- بہتر۔

م- آج دو امور اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جن کا اس موضوع سے براہ راست تو کوئی تعلق نہیں۔ البتہ وہ خیالات پیدا اسی سلسلہ میں ہوئے ہیں۔

ایک یہ کہ بے احتیاط مصنفین بارہا اپنے قلم کی رو میں بالکل بے خیالی سے ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں، جو بجائے خود نہایت گستاخانہ بلکہ ملحدانہ ہوتے ہیں، لیکن ان بیچاروں کی کبھی بھی یہ نیت نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر تو اس کے برعکس عین خدمت اسلام ونصرت دین ہی کی ہوتی ہے۔ ایسے اشخاص کے ساتھ میری فہم ناقص میں معاملہ ہمیشہ نرمی وآشتی کا رکھنا چاہیئے۔ یعنی صرف یہ

---

[1] کہ انھیں بھی میری ہی طرح مولانا حمید الدین مرحوم کی صفائی کی فکر تھی۔

تنبیہ کافی ہو جانا چاہیئے کہ ایسے الفاظ سے خوف کفر کا ہے، نہ یہ کہ انھیں دانستہً کافر بنا کر
دشمنانِ دین و معاندینِ اسلام کی صف میں کھڑا کر دیا جائے۔

ا- بعض اوقات یہی طرز نافع ہوتا ہے لیکن بعض اوقات مضر بھی ہوتا ہے، اگر اُن کو
نہیں تو دوسروں کو۔ غرض یہ ایک امر اجتہادی ہے۔ پھر جب اُن کی نیت کی بناء پر اُن کے
ساتھ نرمی مناسب ہو سکتی ہے، اُسی طرح زجر کرنے والوں کی نیت بھی خدمتِ دین حفاظت
کی ہو سکتی ہے۔ ان کو بھی معذور سمجھنا چاہیئے۔ حق تعالیٰ کے نزدیک دونوں مستحق رحمت ہو سکتے
ہیں۔ کسی کی شخصی مصلحت پر نظر ہوتی ہے کسی کی جمہوری مصلحت پر۔

م- دوسری چیز میرے ذاتی تجربہ کی ہے۔ انگریزیت کے اثر سے دل میں ملحدانہ چکا ہو
سرکارِ رسالتؐ سے نعوذ باللہ ایک عناد کی کیفیت تھی۔ مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ کی جلد اوّل
اُس وقت شائع ہوئی۔ عبارت، اسلوب بیان وغیرہ بالکل ہم انگریزی خوانوں کے
مذاق کے مطابق تھا۔ اُسی دور میں اُس کا مطالعہ میرے حق میں اکسیر ہو گیا۔

ا- بالکل تصدیق کرتا ہوں۔ مگر بہت سے آزاد لوگوں کو ضرر بھی پہنچ رہا ہے کہ تمام
اکابرِ اُمت اور اُن کے روایات کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور ان تصانیف کو تائید تمسخر
بناتے ہیں۔

م- فرنگی شیاطین نے جتنے الزامات عائد کیے تھے سب کی تردید ہو گئی۔ اور دل نے
کہا کہ یہ صاحب بیشک مُلکِ عرب، بلکہ نوعِ انسان کے بڑے مُصلح تھے۔ نہ معاذ اللہ ڈاکو
اور ظالم تھے اور نہ عیش پرست و طالبِ جاہ۔ بلکہ بڑے اچھے انسان تھے قابلِ تعظیم۔ آج
اپنے اُن خیالات پر بھی ہنسی آتی ہے، لیکن اُس وقت کے لحاظ سے یہی بڑی نعمت تھی۔ آپ
حضرات کی تصانیف کی طرف تو اُس وقت میں رُخ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نام ہی سے نفرت
و بیزاری اور بدعقیدگی تھی۔ اُس منزل میں دستگیری شبلی ہی جیسے مصنفین کے ذریعہ سے ہوئی۔

ا- مسلّم ہے مگر اس کی دوسری جانب بھی مسلّم ہونا چاہیئے۔"

م: مقصد گذارش یہ کہ اس قسم کے حضرات کا بھی وجود کفر و الحاد کے مقابلہ میں ایک بڑی سپر کا کام دیتا ہے۔

ا۔ مگر دوسرے زخمی بھی ہو رہے ہیں۔ اُن پر شمشیر کا کام دیتا ہے۔ اب اس کا فیصلہ محض نیّت و اجتہاد پر ہے۔ تسامح کرنے والا بھی معذور اور "تشدد" کرنے والا بھی۔

م۔ اور یہ سب اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق اسلام کے خادم ہی ہیں۔ دُشمن یا مخالف نہیں دوست کیسا ہی نادان بھی بہرحالی ہوتا دوست ہی ہے۔

ا۔ یہ قاعدہ تو قادیانی کے حق میں بھی جاری ہوتا ہے۔ آخر اس کی کوئی حد ہونا چاہیئے۔

م۔ آپ حضرات جس معیار سے گرفتیں کرتے ہیں وہ بجائے خود بالکل صحیح لیکن ہم انگریزی خوانوں کی، اس منزل میں، نظر ان مفاسد پر تو پڑتی نہیں، ہمیں تو اسلام سے قریب لانے میں یہ تحریریں بہرحال معین ہی ہو جاتی ہیں۔

ا۔ تو اس بنا پر اعتزال و ارجاء و جبر و قدر و اخراج و رفض سب محلِ سکوت رہیں گے۔

م۔ مجھ سے کئی سال ہوئے ایک اُردو خوان شخص نے جو محض ناول افسانے وغیرہ پڑھنے کا عادی تھا، قرآن مجید کا اُردو ترجمہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مَیں نے صلاح دی کہ شروع ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے کرو، لیکن وہ ایک سال بعد، جب اُسے وہ ایک بار پڑھ چکو، تو بس اس کے بعد اُسے بالکل چھوڑ دو۔ پھر مولانا تھانوی کا ترجمہ رکھو۔ صحیح و مُستند وہی ہے۔ لیکن وہاں تک تمھیں لانے کے لئے یہ زینہ کا کام دے گا۔

ا۔ اُدھر عرض کر چکا ہوں کہ یہ تدبیر کہیں نافع بھی ہے کہیں مضر بھی۔ تو یہ مشورہ مجھ جیسے قاصر النظر ضعیف القلب کو تو دیا جا سکتا ہے، اور اکثر مواقع پر نرمی میرا طریق بھی ہے۔ مگر عام شہرہ دینا مصالح انتظامیہ کو برباد کرنا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے۔ جیسا کہ ہر جج کو رائے دی جائے کہ مجرم کو بری کر دیا جاوے، اس سے اس کے اندر اطاعت کا جذبہ

پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھی کہے گا کہ شریف طبیعت کا تو یہی خاصہ ہے۔ مگر لئیم تو زیادہ جسور ہو جائے گا۔ اس لئے ہر جج ایسا نہیں کر سکتا۔"

حضرت کی بہت زیادہ تحریروں سے تو اطمینان ہو جایا ہی کرتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس ارشاد سے پوری تشفی اب تک بھی نہیں ہوئی ہے ——— اور نہ جج کو ہر مجرم کے علی الاطلاق بری کر دینے کی تمثیل سمجھ میں آئی۔ جج کو مشورہ تو صرف یہ دیا گیا تھا کہ مجرم کو سزا محض صورت جرم پر نہ دیدی جایا کرے، بلکہ حقیقت جرم کی بھی خوب تحقیق کر لی جائے کہ بہت سے جرم صرف صورۃً ہوتے ہیں، اور اُن کے مرتکب کی تو بعید نیت بھی قانون شکنی و نافرمانی کی نہیں ہوتی۔

اس والا نامہ کا آخری ٹکڑا:۔

"اطلاع کارروائی متعلق فتوی۔ ارادہ تھا کہ اس کارروائی کی تکمیل کر کے اطلاع عرض کروں۔ مگر ایسے موانع پیش آئے کہ اب تک قاصر رہا۔ اِن موانع کی اجمالی فہرست یہ ہے کہ مجھ کو ایک روز بخار آ گیا جو اُتر تو گیا مغرب ہی کے وقت مگر اس میں ایسی ہیئت تھی کہ مدتوں تک کے لئے ناکارہ کر دیا۔ اب بفضلہ تعالیٰ قریب قریب اصلی حالت ہونے لگی۔ پھر مہمانوں کا ہجوم متواتر۔ پھر اس کی بھی تدبیر سوچتا رہا کہ مستفتی کی رائے کو بھی بقدر جائز نرم کیا جائے۔ خط کے جواب کا انتظار ہے۔ اِن موانع سے جواب میں دیر ہو گئی۔ اور ابھی غالباً پانچ چار روز کی اور دیر لگے گی۔ پھر آج خیال ہوا کہ خلاف معمول توقف ہونے سے آپ کو انتظار کی تکلیف ہو گی۔ موجودہ حالت ہی کی اطلاع کر کے رفع انتظار کر دوں۔ پھر بعد فراغ اُس وقت کی حالت کی اطلاع کر دوں گا۔ اس لئے آج یہ خط بھیج رہا ہوں عنقریب مکمل اطلاع کر دوں گا۔ اُسی کے ساتھ ساتھ جون کا رسالہ[1] واپس کر دوں گا۔"

اللہ اللہ! حضرت کو اپنے خوردوں کا بھی کس درجہ لحاظ رہتا تھا!

---

[1] یعنی رسالۃ الاصلاح۔

اِسی کے چند روز بعد ذیل کا والا نامہ، جس پر تاریخ درج نہیں، موصول ہوا:۔

"مکرمی۔ السلام علیکم۔ حسب وعدہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ کے مرسلہ رسالہ کو دیکھ کر جو مضمون لکھا، پھر جولائی کا جو رسالہ جو مدرسہ سے آیا تھا دیکھ کر اس کا ضمیمہ لکھا۔ یہ سب مُلاحظہ کے لئے مُرسل ہیں۔ دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ اوّل علالت کا اضمحلال رہا جواب بالکل نہیں۔ پھر اضیاف کے ہجوم سے خلوءِ ذہن کے ساتھ مطالعہ یا سوچنے کا وقت نہ ملا۔ پھر مُستفتی صاحبوں کو اطلاع کر کے متوقع موافقت فی الرجوع کا رہا۔ مگر زیادہ انتظار کو پسند نہ کر کے آج بھیجتا ہوں۔ یہاں ترتیب سے اپنے نمبر[1] پر یہ مضمون النور میں شائع ہوگا جس کی مدّت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ غالباً کئی مہینے ضرور لگیں گے۔ اگر وہاں جلدی اشاعت میں مصلحت ہو میری طرف سے عام اجازت و آزادی ہے۔ والسلام۔ اشرف علی عفی عنہ"

اِس مکتوبِ گرامی کے پہونچنے کی تاریخ میرے قلم کی لکھی ہوئی ۲۶ ر جولائی۔

مناظرہ شروع ہو چکا تھا، تحریریں فریقین کی طرف سے نکلنے لگی تھیں اپنی والی حقیر کوشش برابر یہ تھی کہ آگ زیادہ پھیلنے نہ پائے اور کم سے کم حضرت تھانوی تو ضرور اس سے باہر نکل آئیں۔ مولانا فراہی کی طرف سے صفائی پیش کرنے والے۔ علاوہ اِس خاکسار کے حضرت فاضل گیلانی بھی تھے اور مولانا سیّد سلیمان ندوی کی حالت عجب نازک سی اور حسرت انگیز تھی! ایک طرف اُن کی عقیدت حضرت کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ اور ندویت سے نکل کر وہ دیوبندیت (یا تھانویت) کی طرف آ رہے تھے، کہ درمیان میں ایسی ناخوشگوار تکلیف دہ رکاوٹ پیش آگئی۔ مولانا فراہی کے اور ان کے ایک عُمر کے گہرے تعلّقات تھے۔ سیّد صاحب کی طرف سے مدافعانہ، انھیں وہ نظر انداز کر کے کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین اپنے دونوں بزرگوں کی طرف سے صفائی اور دفاع میں قُدرۃً اُن کا قلم حرکت میں آ چکا تھا، اور میں اپنے دِل میں کُڑھ ہی کُڑھ رہا تھا —— یہ تھی صُورتِ حال جب حسبِ ذیل

---

[1] غالب کے اتباع میں حضرت بھی انگریزی کے نمبر کو اردو میں "لمبر" لکھتے تھے۔

عریضہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو حضرت کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ "م" سے اشارہ میری طرف ہے اور "ا" سے حضرت تھانویؒ کی جانب۔

"م: سیدی و مطاعی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ا۔ و السلام علیکم

م۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن صاحب کی مطبوعہ تحریریں بہ غرض ملاحظہ ارسالِ خدمت ہیں۔

ا۔ میں اپنا مضمون جو اس لفافہ میں ملفوف ہے روانہ کرنے کو تھا کہ آپ کا یہ مقالہ آ گیا۔ جو اِس لفافہ سے مقصود ہے وہ پہلے ہی میں لکھ چکا۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ سب واقعات پیش کر دیئے۔ مگر الحمدللہ مجھ کو نہ اخبار کا انتظار، نہ اخبار کا کوئی اثر۔ حق جب طریق سے ثابت ہو جاتا ہے۔ الحمدللہ اس کا اتباع کرتا ہوں۔

م۔ مشیت میں جو کچھ ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ قبل اس کے کہ ادھر سے سلسلۂ تحریر شروع ہو۔ آپ کا اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا بیان شائع ہو جائے[1]۔

ا۔ یہ آپ کی محبت ہے۔ مگر مجھ کو مستفتی کے خط کا اِس لئے انتظار رہا کہ شاید وہ کوئی سہل سبیل نکالیں۔ مجھ کو تو سب ہی کے مصالح پر نظر رہتی ہے۔ مگر جب انتظار کی حد ہو گئی۔ میں نے جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا۔ جو ملاحظہ سے گزرا ہو گا۔ پھر کل مولانا سید سلیمان صاحب کا مضمون دیکھا اِس پر جو کچھ لکھا گیا وہ آج ملاحظہ سے گزرے گا۔

م۔ فتویٔ تکفیر کی زد میں میرا تو خیر ذکر ہی کیا۔ مولانا سید سلیمان مولانا سید مناظر احسن۔ حضرت مولانا حسین احمد۔ تمام علماء ندوہ اور بہت سے علماء دیوبند سب ہی آ رہے ہیں۔

ا۔ مفتی کیا کرے۔ اِس کا ذمہ دار تو مستفتی ہے۔

م۔ ایک اہلِ علم نے جو میری ہی طرح جناب والا اور حضرت مولانا[2] دونوں سے یکساں

---

[1] دونوں حضرات اس وقت تک اپنے فتویٔ تکفیر سے رجوع کر چکے تھے، [2] یعنی مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔

اخلاص و عقیدت رکھتے ہیں۔ بڑی حسرت و دلسوزی سے کہا کہ اب تک تو ہم اسی کو رو رہے تھے کہ دیوبند اور تھانہ بھون کی سیاسیات الگ الگ ہیں۔ اب دنیا پر اس کا بھی اعلان ہو کر رہا کہ دونوں کا دین بھی الگ الگ ہے۔

ا۔ ان خیالات کا تو کچھ بھی علاج نہیں۔ یہ سب ناحقیقت شناسی کی شاخیں ہیں۔

م۔ منصب مُفتی سے جناب نے جو ارشاد فرمایا وہ ضابطہ سے بالکل درست سہی لیکن پھر آخر بریلی والے کیوں بدنام ہیں۔ وہ بھی تو یہی کرتے ہیں۔ کہ صاحب تقویۃ الایمان حفظ الایمان وغیرہ کے اور سارے عقائد سے۔ اور ان کے تقویٰ و تقدس سے قطع نظر کر کے درمیان سے ایک آدھ فقرہ یا ایک آدھ لفظ لے لیتے ہیں۔ اور اسی پر تکفیر کر ڈالتے ہیں۔

ا۔ ان کے سامنے تو سب واقعات ہیں۔ پھر قصداً تلبیس کرتے ہیں اور بعد اطلاع حقیقت کے بھی رجوع نہیں کرتے۔ کیا خدانخواستہ یہاں ایسا ہوا ہے۔

م۔ رسالہ الاصلاح[۱] نے ابھی یہ کیا ہے کہ خود جناب ہی کے ایک وعظ کا بڑا طویل حصہ جو احتیاط در بارۂ تکفیر میں ہے۔ نقل کر دیا ہے۔ میں نے خود بھی کلید مثنوی میں یہ مضمون پڑھا تھا (اصل الفاظ یاد نہیں خلاصۃً لکھ رہا ہوں) کہ مولانا کا کوئی ایک شعر جو خلاف شریعت نظر آئے۔ اس پر رائے نہ قائم کی جائے۔ بلکہ سارے کلام کو ملحوظ رکھ کر کی جائے۔

ا۔ میں اپنے مسلک پر بفضلہ تعالیٰ قائم ہوں۔ اس کی تفصیل مع رفع شبہات اتر سوں کے رجسٹری شدہ مضمون میں عرض کر چکا ہوں امید ہے کہ ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

م۔ ابھی دو ہی چار مہینہ کی بات ہے کہ مولانا سید سلیمان نے اپنی شدید علالت کے دوران[۲] میں جناب کو خواب میں دیکھا تھا اور کہتے تھے کہ معلوم ہوتا ہے یہ حضرت مجھے چھوڑیں گے نہیں

---

[۱] یہ اسی درسۃ الاصلاح (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ) کا ماہنامہ تھا۔ جس پر تکفیر کی یورش تھی۔ مولوی امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

[۲] سید صاحب اس زمانہ میں مرض قلب میں بہت سخت بیمار ہو گئے تھے۔

یعنی بغیر اپنے حلقۂ ارادت میں لئے نہ رہیں گے۔

ا۔ اچھا ہوا خواب غلط ہو گیا۔ اللہ نے انھیں دھوکے سے بچا لیا۔

م۔ کہاں میرا دل اس سے باغ باغ ہو رہا تھا۔ کہاں آج یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے! والسلام محتاج دُعا۔ عبدالماجد

ا۔ غور نہیں فرمایا میں تو اتہ سوں کے مضمون میں ثابت کر چکا ہوں کہ میرے اصلی مسلک اور دستخط جدید میں تعارض ہی نہیں۔ باقی کجا حلقہ ارادت کجا ہیں۔ اس کی اہلیت تو پہلے ہی سے نہیں۔ یعنی قبل دستخط بھی۔ نجات ہی ہو جائے تو غنیمت ہے۔ جس کی دُعا کا سب احباب اور بزرگوں سے امیدوار ہوں۔

میں نے جو کچھ کیا، یا جو کچھ کر رہا ہوں۔ الحمد للہ کسی کے معتقد بنانے یا معتقد رکھنے کے لئے نہیں۔ نہ کسی کے کم ہو جانے سے کوئی افسوس۔ اپنے نزدیک حق کی غلامی کی نیّت ہے۔ خواہ کوئی معتقد رہے یا نہ رہے۔ جتنے معتقد کم ہوں۔ اتنا ہی ہلکا رہوں گا۔ جو کہ ضُعفا کے لئے عین مطلوب ہے۔ والسلام"

سیّد صاحب نے اس کے چار ہی پانچ سال بعد جس والہانہ انداز سے حضرت کی بیعت قبول کی۔ اور پھر اپنی آخر عمر تک جس انتہائی حد تک حضرت سے عقیدت قائم رکھی۔ اس کے پیش نظر ان کا ایک زمانہ میں ان منزلوں سے گزرنا کتنا سبق آموز اہل بصیرت کے لئے ہے!

اس والا نامہ کی آخری سطریں میرے لئے ایک نوع خلش و اضطراب کا باعث بن گئیں۔ ان سے یہ صاف مترشح ہو رہا تھا۔ کہ جیسے میں نے حضرت کے اخلاص نیّت پر کچھ شبہ کیا ہے۔ اس کا احتمال بھی میرے لئے ناقابل برداشت تھا وہ والا نامہ ۲۸، ۲۹ جولائی کو ملا ہو گا۔ یکم اگست کو ادھر سے عریضہ روانہ ہوا۔ کچھ توضیح کچھ شکایتی۔

"م" اور "ا" کی وہی علامتیں بدستور قائم ہیں:۔

م۔ سیّدی و مطاعی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

ا۔ مکرمی محترمی دام لطفہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

م۔ پچھلا والا نامہ ملفوف ہے۔ آخر کی سرخ نشان زدہ عبارت سے شبہ[۵] ایسا ہو رہا ہے کہ گویا میں نے جناب کے کسی عمل کے اخلاص میں اشتباہ ظاہر کیا تھا اور اسے لوگوں کے معتقد رکھنے بنانے پر محمول کیا تھا۔

ا۔ یہ شبہ بھی محبت سے ناشی ہوا ہے، محبت کی عینک عشق کے رنگ میں سرخ اور خونیں ہے جس سے بعض سادہ رنگ کی چیزیں بھی خونیں نظر آتی ہیں۔

عشق است و ہزار بدگمانی

اسی کی شرح ہے۔ اور وہی عینک اس تحریر کے وقت میری آنکھوں پر تھی۔ اس لئے عنوان ناکافی ہو گیا۔ میرا مقصود اشتباہ کا گمان نہ تھا، بلکہ میں بھی حسرت ہی سمجھا تھا۔ البتہ اس حسرت کے نقل کرنے میں یہ ضرور سمجھا تھا کہ آپ کا محبت سے جی چاہتا ہے کہ اس حسرت کا کوئی علاج ہو جائے۔ سو وہ علاج بدون خاص اہتمام کے ہو نہیں سکتا۔ اور وہ اہتمام میرے ذوق میں مرادف تھا تغیر تقاضائے اعتقاد کا اس لئے آزاد الفاظ صادر ہو گئے جس سے اب شرمندہ ہوں۔

م۔ استغفر اللہ۔ یہ خیال تو آپ کے ادنیٰ خدام کے لئے بھی نہیں رکھتا چہ جائیکہ خود جناب سے متعلق، اس تصور ہی سے تکلیف ہو رہی ہے کہ میری کسی عبارت سے ایسا سمجھا ہی کیوں گیا۔ مولانا سلیمان کے خواب کا ذکر اور دوسرے تذکرے تو انتہائی حسرت کے اظہار کے لئے تھے، کہ دین کے دو مخلص خادموں میں تعلقات یگانگت کی بنیاد پڑ کر پھر رکاوٹ پیدا ہو گئی اور ونزعنا ما فی صدورہم من غل کا نظارہ بجائے دنیا کے پھر آخرت پر اٹھ رہا۔ کوئی شخص باپ اور بڑے بھائی کے درمیان ایک مدت تک ان کے بچھڑے رہنے کے بعد خوشگوار دل دیکھے گا۔ تو طبعاً مسرت ہوگی۔ اور جب پھر انقباض پائے گا تو اپنا

۵؎ یہ اسی پچھلے والا نامہ کی آخری سطریں ہیں۔ جن پر میں نے سرخی سے خط کھینچ دیا تھا۔

دل بھی مسرت سے مُرجھا جائے گا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ باپ کو کسی درجہ میں بھی منافقت برتنا چاہیئے۔ والسلام محتاج دُعا

عبدالماجد

ا۔ ممکن ہے کہ میری لفظی کوتاہی اس شبہ کا منشا ہوا ہو۔ میں حقیقت عرض کر چکا۔ باقی انقباض ورکاوٹ، یہ راویوں کی عنایت کا ثمرہ ہے۔ اور میں جرأت باجسارت کرکے یہ بھی عرض کر سکتا ہوں کہ راویوں کا اثر خوش اخلاق بزرگوں پر زیادہ ہوتا ہے خشک اخلاق پر نہیں ہوتا۔ یا کم اور کم بھی کالعدم ہوتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ خوش اخلاقی جب عام ہوتی ہے راویوں کی بھی ہمت ہوتی ہے اور خشونت مانع جرأت ہوتی ہے اصلی ضمیر کے اظہار سے اور خشونت باعث ہوتی ہے اس اظہار کی۔ چنانچہ میرے دل میں جو تھا، وہ میں نے مولوی طیب[6] کی زبانی جب مولانا[7] یہاں تشریف لاکر واپس ہوئے پھر مولوی طیب مکرر آئے۔ بہت صاف دیہاتی الفاظ میں عرض کر بھیجا کہ آپ کا مذاق خاص آپ کے لئے تو مجھ کو محل نکیر نہیں۔ لیکن طالب علموں کے لئے مجھ کو پسند نہیں۔ اُن کے لئے میں اس کو ان کے اصلی مقصد میں مضر اور مخل سمجھتا ہوں۔ بس اگر میری رائے گنجایش قبول رکھتی ہے، تو مدرسہ[8] میں اس کے لئے قواعد بنائے جائیں اور جو طالب علم اس کے خلاف کرے اس کو مدرسہ سے خارج کر دیا جائے۔ اور اگر یہ رائے یقیناً غلط ہے اور وہ مذاق مدرسہ وطلبہ کے لئے نافع ہے تو پھر مجھ کو چھوڑ دیا جائیے[9] تاکہ دونوں طرف یکسوئی ہو۔ اور یہ چھوڑنا خدانہ کرے شقاق کا سبب نہ ہوگا۔ بلکہ انشاءاللہ تعالیٰ سبب وفاق کا اور رافع روزمرہ کی کشاکش اور اختلاف کا ہو جائے گا اور عوام الناس کو درجہ وفاق کا

---

[6] یعنی مولانا محمد طیب دیوبندی موجودہ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

[7] یعنی مولانا حسین صاحب مدنی۔

[8] یعنی دارالعلوم دیوبند طلبہ میں جو سیاسی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ حضرتؒ کو بہت گراں گزر رہا تھا۔

[9] یعنی دارالعلوم کے منصب سرپرستی سے آزاد کر دیا جائے۔

معلوم ہو کر ان کو دعوے کے سے بچا لے گا۔ کیا یہ صفائی غل کو چھوڑ سکتی ہے مولانا

دل صفا غش کے بل پا لو دگی

تمام نیاز نامہ کے متعلق مولانا نیازؒ[1] کا ایک شعر ملاحظہ ہو

اے خامۂ نیاز نہ چلنے سے تو مچل — یعنی مقام ناز ہے جس چال چاہے چل

نیاز مند اشرف علی عفی عنہ "

اتنی مفصّل تحریر کسی مکتوب میں حضرت کی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی اور اس سے ظاہر ہے کہ حضرت کی نظر میں اس موضوع کی اہمیت بھی خصوصی حاصل تھی ——— لیکن میرے قلم کی کوتاہی نے حضرت کو ایک غلط فہمی میں بھی ڈال دیا۔ میں نے اپنے اِس عریضہ میں اِس شدومد سے جس حسرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ حضرت اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑھتے ہوئے مُخلصانہ تعلّقات میں وقتی رکاوٹ پیش آجانے کے سلسلہ میں تھا۔ حضرت اس کو اپنے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے ناشگفتہ تعلّقات کی جانب لے گئے۔ اور اس کا جواب اتنی تفصیل سے عنایت فرمایا۔

اِسی اثناء میں حضرت کا ایک اور والا نامہ مع ایک مضمون کے ملا۔ والا نامہ :۔

" از اشرف علی عفی عنہ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

چونکہ معاملہ جاریہ کے متعلّق ایک اور مضمون لکھا گیا دِل چاہا کہ آپ سے وہ بھی مخفی نہ رہے۔ اس لیے مُرسل ہے۔ اس کو ضمیمۂ سابقہ کے بعد ہی ملحق کر دیجئے۔ جس مضمون پر یہ لکھا گیا وہ مولانا محمد سلیمان صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ وزنی ہونے کے سبب لفافہ میں نہیں رکھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ آپ کے پاس ہو گا۔ لیکن اگر ضرورت ہو میں بھیج دوں گا۔ اس وقت احتیاط کے لیئے لفافہ کو رکا بیرنگ کر دیا۔ رجسٹری کی ہمت نہ ہوئی۔

بعد تحریر ان سطور کے آپ کا لفافہ آ گیا۔

---

[1] یعنی مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی قدّس سرہ۔

اگر کوئی صاحب میرے سب مضامین کو، یا بعض کو چھاپنا چاہیں تو میری طرف سے کوئی امر مانع نہیں۔ ورنہ یہاں تو چھپے ہی گا مگر دیر ہیں۔ بالخصوص میری وہ تحریر جو بہ طور قول کلی کے ہے غالباً وہ اوروں سے زیادہ مفید اور دائم الضرورۃ ہے۔ اگر سب مضامین چھپیں اس کو بھی نہ بھولا جائے آیندہ جو مصلحت ہو۔ والسلام اشرف علی از تھانہ بھون۔"

اب اس کے بعد وہ اصل مضمون جس کا اس خط میں حوالہ ہے، ملاحظہ ہو: -

ضمیمہ ثانیہ رسالہ الایضاح لمافی الافصاح - رسالہ مذکورہ کے ضمیمہ اولیٰ کی تحریر سے تقریباً ایک ہفتہ بعد میرے پاس سرائے میر ضلع اعظم گڈھ سے (جیسا ڈاک خانہ کی مہر سے معلوم ہوا) ایک جاریہ ومطبوع مضمون معنون بہ عنوان فلاں فلاں حضرات بر غوغائے تکفیر مرقوم یکم جمادی الاوّل جس میں زید وعمرو[1] دونوں کے تبریہ کے متعلق توجیہات تھیں پہنچا۔ چونکہ میں عمرو کے متعلق خود اصل رسالہ الاصلاح میں اپنے تخط سے رجوع کرچکا ہوں اس حصے کے متعلق تو مزید تحقیق کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس ضمیمہ میں زید کے متعلق بنا برکسی تاویل یا تبریہ کے معلوم نہ ہوسکنے کے رجوع سے معذوری ظاہر کی تھی۔ اور اس جدید مضمون میں خود زید کی ایک تحریر سے نقل کیا گیا ہے کہ جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادّہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں وہ ملحد اور زندیق ہے الی قولہ الکلام میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں۔ اور اس غرض سے نقل کئے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے، جو اُن کے تبریہ پر دال ہے۔ اس لئے اس وقت اس حصہ کے متعلق مختصراً بہ قدر ضرورت عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ زید کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ایسے عقاید خود زید کے نزدیک بھی الحاد وزندقہ ہیں مگر زید اپنے کو ان عقائد سے بری کہتے ہیں اور الکلام میں ان کے لکھنے کا ایک عذر کرتے ہیں، تو اس تقدیر پر فتنۂ الافصاح کے مجیب اور خود زید ان عقائد کے قائل کفریہ ہونے میں تو متفق ہوگئے، اس لئے اہل جواب کی یہ شکایت تو ہو نہیں سکتی کہ غیر کفر کو

---

[1] زید سے مراد مولانا شبلی، اور عمرو سے مراد مولانا حمید الدین ہیں۔

کفر کہہ دیا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل جواب نے جدید مضمون تبریہ کا کیوں نہیں دیکھا سو ظاہر ہے کہ یہ عدم احاطہ نظر محل ملامت نہیں۔ اب صرف کلام اس میں باقی رہا کہ یہ عذر الکلام کے کسی مقام سے کلیاً یا جزئیاً معلوم و مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر اس تنقیح کے بعد جو حکم شرعی ہو اس کا اتباع سب پر واجب ہے۔ مگر یہ موقوف ہے رسالۂ الکلام کے بالاستیعاب دیکھنے پر۔ چونکہ میرے پاس نہ وہ رسالہ ہے نہ مجھ کو اتنی فرصت، اس لئے میں قطع مسافت کر کے اپنے مسلک توسع محتاط بالحدود الشرعیہ کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ اگر اس رسالہ میں یہ عذر کلیاً یا جزئیاً مذکور بھی نہ ہو تب بھی زید کے اس انکار انتساب کو توبہ پر محمول کر کے زید کے متعلق بھی اپنے دستخط سے رجوع کرتا ہوں مگر اسی کے ساتھ زید کی جماعت کو یہ مشورہ بھی دیتا ہوں کہ امت محمدیہ پر رحم کر کے نہ زید کی ایسی تصنیفات کو شائع کریں نہ اُن کی حمایت کریں۔ اور مدرسۂ اصلاح کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے موہم موحش اقوال اور ان کے قائلین من حیث القائلین اور اشتہار مضمون بعنوان "ایک دینی درسگاہ کی خدمت" کے مضمون سے براءت کا اعلان کر دیں جیسا کہ احقر نے رسالہ الافصاح اور اس کے ضمیمۂ اول کے جزو چہارم میں عرض کر دیا ہے اور جب تک ایسا نہ کیا جائے باوجود زید و عمرو کے متعلق اپنے دستخط سے رجوع کر لینے کے خود مدرسہ کے متعلق میں اُسی رائے پر قائم ہوں جو میں نے رسالہ الافلاح میں عرض کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بہرحال مدرسہ جب تک ایسے اقوال سے الی قولی اُس مدرسہ کی امداد کسی طرح کی جائز نہیں۔ اور چونکہ میں اس رائے کو حق سمجھتا ہوں اگر اس میں مجھ کو بدنام بھی کیا جائے (جس سے مجھ کو اب تک غایت تہذیب کے سبب بچایا گیا ہے جس کی مجھ کو خاص قدر ہے جزاہم اللہ تعالیٰ) تب بھی یہی عرض کروں گا۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

والسلام خیر ختام ولیکن ہذا آخر الکلام فی ہذا المرام وافوض امری الی اللہ فی کل قال ومقام
آخر الاسبوع الاول من جمادی الاولی ۵۵ھ

خدا خدا کرکے یہ تکفیر و رجوع عن التکفیر وغیرہ کا یہ ناخوشگوار گو یقیناً بعض اعتبارات سے نہایت مفید سلسلہ ختم ہوا۔ اور پھر مراسلت کا عام موضوع وہی قرآنیات لوٹ آیا۔ ۱۱ر اگست کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م: تفسیر بیان القرآن سے متعلق آج چند امور اطلاعاً و استفادۃً عرض ہیں۔
جلد ۴ صفحہ ۱۲۲۔س ۱۔ یحلفون باللہ۔ باللہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ لفظ "سامنے" کے بعد یہ بنا دیا "اللہ کی"۔

م۔ جلد ۵۔ صفحہ ۸۔ س ۱۔ من ربہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ لفظ "معجزہ" کے بعد یہ عبارت بنا دی "اُن کے رب کی طرف سے"۔

م۔ جلد ۵۔ صفحہ ۳۔ حصۂ تفسیری، سطر ا "اُس وقت تو مصر کے مالک ہو گئے" محلِ نظر ہے۔ مسئلہ تاریخ کا ہے اور تاریخ سے مطلق تائید نہیں ہوتی۔

ا۔ جلد ۳۔ ص ۲۰۔ س ۳۔ آیت کے متعلق ایسا ہی سوال کیا گیا تھا اور اس کا بہت مفصل جواب لکھا گیا تھا[1]۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تفسیر ایک قول پر ہے۔ اگر آپ کے کاغذات میں مل جائے ملاحظہ فرمالیں۔ اس وقت اس مقام پر بھی حاشیہ لکھ دیا گیا ہے۔

م۔ جلد ۵۔ ص ۳۸۔ س ۱۔ نوزعنہا۔ ہا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ "جگہا کر" کے بعد لفظ "اس کو" بڑھا دیا۔

م۔ جلد ۵۔ ص ۴۱۔ س ۱ علیٰ بینۃ من ربہ۔ بینۃ کی تفسیر میں تو گفتگو نہیں، لیکن ترجمہ لفظ "قرآن" سے کرنا محلِ تردد ہے۔

ا۔ اب یوں کر دیا۔ "جو ایک روشن دلیل (یعنی قرآن) پر"۔

م۔ جلد ۵۔ ص ۴۸، ۴۹۔ طوفانِ نوح کا عموم دل کو زیادہ نہیں لگتا۔

---

[1] ملاحظہ ہوں ص ۶۵ و ۶۶۔

ا۔ دِل کو نہ لگنے کی بناء میں نظر کرنا چاہیئے۔

م۔ جب بعثت صرف اہلِ قومِ حضرت نوح تھی اور غرق ہونے والے حسب تصریح سورۂ یونس، صرف مکذبین اور منذرین تھے تو طوفان کو قوم نوحؑ تک کیوں نہ محدود رکھا جائے۔

ا۔ اوّل ایک مقدمہ سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ بعثت خاصہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی باعتبار مجموعہ اصول و فروع کے ہے باقی محض اصول کے اعتبار سے سب کی بعثت عام ہے، کیونکہ وہ سب شرائع میں متحد ہیں۔ اِسی لیئے بعض آیات میں وارد ہے کذّبت قوم نوح المرسلین حالانکہ انھوں نے صرف نوحؑ کی تکذیب کی تھی۔ اُس کی وجہ وہی ہے کہ اتحادِ اصول کے سبب ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔ بہرحال جب اصول میں بعثت عام ہے تو قومہ میں قوم کی تخصیص اِس اعتبار سے ہے کہ مخاطب اوّل وہی تھے اور دوسرے اُن کے واسطے سے اور جب بعثت عام ہے تو مکذبین اور منذرین بھی سب کو عام ہوگا اِس لیئے سب اہلِ ارض پر عذاب آنا مُستبعد نہ ہوگا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ خود ارض پوری اُس وقت آباد نہ ہو، غرض جتنی آبادی تھی اس کو طوفان عام تھا۔ چنانچہ لا تذر علی الارض من الکافرین دیّارًا ظاہرًا اس پر دال ہے۔ نیز اگر بعض کفار اُس وقت بچ جاتے تو ان کی نسل منقطع ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اور آیت وجعلنا ذریتہ ھم الباقین سے یہ امر یقینی ہے۔ تو کیا عدم عموم کے شق میں یہ بُعد نہیں۔ نیز اگر طوفان عام نہ ہوتا تو جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھنے کی کیا وجہ۔ اگر ایک بھی نہ رکھا جاتا تب بھی نسل منقطع نہ ہوتی۔ کیا یہ سبب نہیں بُعد کا عدم عموم کے قول میں۔

م۔ اہلِ جغرافیہ و طبقات الارض نے عموم طوفان کا انکار شدومد سے کیا ہے یعنی وطن نوحؑ میں اُس کا وقوع بھی اِسی شدومد سے تسلیم کیا ہے۔

ا۔ اہلِ جغرافیہ کے اِس دعویٰ پر جو دلیل قائم کی گئی ہو اُس کے مقدمات دیکھنے چاہیئے۔ تاکہ اُن میں نظر کی جائے۔ ورنہ تخمین محض تو قابل التفات نہیں۔ نیز اگر طوفان

عام نہ ہوتا تو حضرت نُوح علیہ السلام کو بجائے کشتی بنانے کے ہجرت ارض بعیدہ کا حکم کیا جانا کافی تھا۔"

تفسیر مقامات قرآنی کی داستان اتنی لذیذ ہے کہ جی چاہتا ہے ، بس یہی سلسل چلی جائے۔ ——— خیر ابھی کچھ عرصہ تک تو انشاء اللہ یہی لُطف قائم رہے گا۔ ۱۵ر اکتوبر کا نیاز نامہ مُلاحظہ ہو۔

م "تفسیر بیان القرآن ملاحظہ ہو۔

جلد ۶۔ ص ۳۔ س ۱۔ لقد کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ ترجمہ و تفسیر دونوں میں لکھ دیا "بالتحقیق" اور بھی چند مقامات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اُن میں بھی اس کا ترجمہ رہ گیا۔ غالباً اس کو مفہوم نہیں سمجھا کیونکہ یہ تاکید و تحقیق کے لئے ہے۔ سو جب ہمارے محاورات میں بدوں اس کے خاص ترجمہ کے بھی کلام اپنے سیاق و سباق سے تحقیق کو مفید ہو تو اس کے مُستقل ترجمہ کی حاجت نہیں سمجھی گئی ہو گی۔ لیکن ترجمہ ہونا زیادہ احوط ہے۔ میں نے احتیاطاً حضرت شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ترجمہ کے کئی مقام کو دیکھا۔ کہیں بھی اس کا ترجمہ نہیں کیا۔

م۔ جلد ۶۔ ص ۳۔ س ۱۔ بِاٰیٰتِنَا کے ترجمہ میں بھی شک رہا۔ یعنی آیا ترجمہ رہ گیا۔ یا "حکم" کافی سمجھا گیا۔

ا۔ رہ ہی گیا۔ اب اس طرح بنا دیا "اپنی نشانیوں کے ساتھ"

م۔ جلد ۶۔ ص ۱۷۔ متن سطر آخر۔ یَومَئِذٍ کا ترجمہ رہ گیا۔

ا۔ یہ انتخاب کنندہ کی غفلت ہے چنانچہ تفسیر میں ہے "اس روز" اب ترجمہ میں بھی لکھ دیا۔

م۔ جلد ۶۔ ص ۲۱۔ متن س ۳۔ کانوا بہ یستھزءون۔ استہزاء نہ کیا ہو" پورا مفہوم آیا اس میں آگیا، یا یُوں بہتر ہو گا "استہزاء کرتے رہے ہوں"

ا۔ پورا مفہوم دوسری عبارت میں ہے۔ میں نے بنانا چاہا تو بنا ہوا ملا۔ کسی وقت تنبیہ ہوا ہوگا۔

م۔ جلد ۸ ص ۵۔ متن س ۳۔ کانوا بہٖ یستھزءون ۔ کا ترجمہ نہ ملا۔

ا۔ اب لکھ دیا "اللہ کی قسم" دَالیعفوا والیصفحوا۔

م۔ جلد ۸ ص ۷ متن سطر آخر۔ شھادات باللہ۔ باللہ پورے فقرہ کا ترجمہ نقل ہونے سے رہ گیا۔

ا۔ واقعی بہت بڑی فروگذاشت ہوئی۔ اب ترجمہ و تفسیر میں بنادیا۔ ترجمہ میں تو یہ عبارت لکھ دی "اُن کو معاف کر دینا چاہیئے اور درگذر کر دینا چاہیئے" اور تفسیر میں اس ترتیب سے لکھ دیا "مہاجر بھی ہیں) اور (آگے معافی اور درگذر کا حکم فرماتے ہیں کہ) ان کو معاف کر دینا چاہیئے اور درگذر کر دینا چاہیئے (آگے ترغیب کے لئے الخ

جزاکم اللہ علیٰ ہذہ التنبیہات۔

م۔ اپنا ایک تازہ خواب بھی عرض کئے دیتا ہوں۔ شاید کہ کوئی خیال ذہن مبارک میں آ جائے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بڑا وسیع میدان تنہا اور پا پیادہ قطع کر رہا ہوں۔ جابجا برساتی گھاس کثرت سے اُگی ہوئی۔ پیر میں محض معمولی چپل ہے خیال گذرا کوئی زہریلا جانور پیر میں کاٹ نہ لے۔ اتنے میں نظر آیا کہ کچھ فاصلہ پر میرے راستہ سے الگ، ایک لمبا سیاہ سانپ ہے۔ میں پہلے تو خوش ہوا کہ راستہ سے الگ ہے۔ لیکن معاً وہ سانپ میری طرف دوڑا۔ دل نے کہا یہ تو بڑی موذی قسم کا ہے کہ جھپٹ کر حملہ کرتا ہے۔ میرے ہاتھ میں کوئی چھڑی وغیرہ بھی نہیں۔ ہراس ایک آناً فاناً پیدا ہوا اور مٹ گیا۔ دل میں کہا کہ مجھے تو قرآنی عمل معلوم ہے۔ معاً آیہ کریمہ اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّاَکِیْدُ کَیْدًا کا استحضار ہو گیا بس کہاں تو وہ افعی لپکتا ہوا آ رہا تھا اور مجھ سے فاصلہ وہی چار فٹ کا رہ گیا تھا، کہاں بس جہاں تھا، وہیں دبک کر اور سکڑ کر اور اپنا سر اپنے جسم میں چھپا کر رہ گیا۔ ایک انچ بھی

آگے نہ بڑھ سکا۔ اور میں بہ اطمینان خوش خوش اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

ذہن میں تعبیر یہ آتی ہے کہ شیطان کا حملہ شدید ہونے والا تھا۔ اللہ نے قرآن مجید کی برکت سے روک دیا۔

ا۔ ظاہراً بالکل کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی حفاظت میں رکھے۔ اور عجب نہیں کہ یہ شیطان شیطان الانس ہوں اور عجب نہیں کہ اہل تقیہ ہوں کہ اُن کا تقیہ مشابہ ہے سانپ کے زہر خفی کے۔ شاید اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اہل حق کو اُن کے کید و شر سے محفوظ رکھے گا۔ واللہ اعلم۔"

(۹۱)

دن اور تاریخ تو اب کاہے کو یاد رہنے لگے تھے، شروع نومبر کی کوئی تاریخ تھی، جب تھانہ بھون حاضری ہوئی۔ اطلاعی کارڈ حسب معمول قبل سے روانہ کر دیا تھا، جواب حسب ذیل آیا، جس پر مُہر ۲۹ر اکتوبر کی ہے:۔

"رواق منظر چشم من آشیانۂ تست کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

انشاء اللہ تعالیٰ اسٹیشن پر اور شبیر علی کے مکان پر سب انتظام سہولت سے ہو جائے گا۔

اعتراض کا جواب تو دینے کو دل نہیں چاہتا، اُسی کا جی خوش ہو گیا۔ مگر کشفِ حقیقت خود ایک مطلوب چیز ہے۔ وہ یہ کہ افعل التفضیل کا مفہوم کبھی حقیقی ہوتا ہے اور کبھی اضافی۔ نصوص میں اُمت کے لئے بہ کثرت ایسے صیغے وارد ہیں، علماء کے کلام میں بھی بہ کثرت مستعمل ہیں۔"

یہ اعتراض حضرت ہی کے ایک سر پھرے مُرید نے کیا تھا۔ کہنے تھے کتاب کے "اشرف السوانح" نام سے لازم آتا ہے کہ یہی تمام سوانح عمریوں سے "اشرف" ہے یہاں تک کہ پیمبروں کے بھی سوانح سے!

قیام یقیناً اب کی مختصر رہا۔ وہی دو چار دن۔ کاغذات کے مجموعہ میں ایک چھوٹا سا پُرزہ ملا، جس پر کوئی تاریخ و سنہ تو درج نہیں، لیکن دل کہتا ہے کہ عجب نہیں، اُسی زمانہ سے متعلق ہو:۔

"مکرمی۔ السلام علیکم۔ جس مضمون کے دکھلانے کا میں نے وعدہ کیا تھا وہ حاضر ہے۔ یہاں دیکھنے کے لیے فارغ وقت نہ ملتا۔ اگر نقل کو دل چاہے دیر تک کتاب رکھنے کی گنجایش ہے۔ ورنہ ہمراہ لیتے آئیے۔ صفحۂ ہذا کی سطر اخیر سے شروع ہوا ہے"

یہ پُرزہ اُس کتاب یا رسالہ کے اُسی صفحہ پر لگا ہوا تھا ——— دوسرے کی سہولتوں کی رعایت کس بلا کی حضرت کے ہاں رہتی تھی!

یہ مختصر سا قیام اب کی بار بڑا قیمتی نکلا۔ ایک روز اپنے ہاں بےخبر بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک حضرت کے ایک خادم ایک بند ڈبیا اور ایک دستی والا نامہ لے کر پہنچے۔ ڈبیا کے اندر کیا تھا، یہ اس والا نامہ کے پڑھنے ہی سے ظاہر ہو جائے گا:۔

"مکرمی۔ السلام علیکم۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میری کوئی یادگار آپ کے پاس رہے۔ اتّفاق سے مجھ کو ایک تسبیح یاد آگئی۔ جس پر میں نے مدتوں پڑھا ہے۔ مگر وزنی ہونے کے سبب اب دوسری ہلکی تسبیح پر پڑھنے لگا ہوں جو ہر وقت ہاتھ میں نہیں رہ سکتی ہے۔ تو گویا وہ رکھی ہوئی تسبیح میری حاجت سے زائد ہے۔ وہ پیش کرتا ہوں۔ قبول فرمالیجئے۔ اِس تسبیح میں ایک اور برکت بھی ہے۔ یہ امیر عبدالرحمٰن خان نے اپنے کمانڈر انچیف کو دی تھی۔ انھوں نے میرے ایک پیر بھائی کو جو اُن کے مہمان تھے دی۔ اُنھوں نے مجھ کو دی۔ یہ سنگ مقصود کہلاتا ہے۔ سُنا ہے اِس وقت نایاب ہے۔ واللہ اعلم۔ اشرف علی۔ ۲۰ شعبان ۵۵ھ"

۲۰ شعبان ۱۳۵۵ھ جنتری میں دیکھا، تو ۵ نومبر ۱۹۳۶ء کے مطابق نکلی ———

غالب نے "خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال" میں تو ایک شاعرانہ مضمون باندھا ہے۔ یہاں البتہ یہ "خدا کی دین" اپنے حق میں شاعری نہیں، حقیقت تھی۔ حضرت کا عطیہ کچھ بھی ہوتا ایک تبرک ہی ہوتا۔ چہ جائیکہ ذکر حق کی تسبیح! اور وہ بھی ایسی جس کو حضرت کی متبرک اُنگلیاں ایک مدت تک مس کر چکی تھیں، پھر غازی و مجاہد امیر عبدالرحمٰن خان والیِ افغانستان (متوفی

سنہ ۱۹۱۰ء) اور اُن کے غازی سپہ سالار کی دہری دہری نسبتیں! نُورٌ علیٰ نُور ہی نہیں، مجموعۂ انوار!

---

۱۷ نومبر ۳۶ء (یکم رمضان ۵۵ھ) کا عریضہ ایک اہم مسئلہ کے متعلق سوال لکھا ہے:۔

م: تھانہ بھون سے واپس ہوتے ہی ایک دوسرے سفر میں لگ گیا۔ آج ذرا فرصت ملی تو حسب ارشاد والا اپنی بہ خیریت معاودت کی اطلاع عرض کرتا ہوں۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔

م: پچھلے شب جمعہ کو آپ کے شاگرد اور مخلص مسترشد شیخ حسن الرحمٰن[1] قدوائی رئیس بڑاگاؤں، ضلع بارہ بنکی نے وفات پائی۔ تدفین جمعہ کے دن ہوئی۔

ا۔ اِنّا للہ۔

م: غفلت اور بدحواسی کی حالت میں بھی نماز اور تلاوت آیات قرآنی اور درود خوانی سے غفلت نہ تھی۔

ا۔ سُبحان اللہ۔

م۔ انتقال سے دو ہی چار منٹ قبل کلمۂ شہادت پڑھا۔ پھر تین بار اللہ اللہ کہا۔ زبان اِسی پر بند ہوئی۔

ا۔ سُبحان اللہ۔

م۔ ایسی موت پر رشک آرہا ہے۔

ا۔ بیشک۔ مَیں نے بہ کثرت ایسے واقعات سُنے ہیں اور اہل بصیرت سے سُنا ہے کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے متوسلین بہ واسطہ یا بلا واسطہ کو حُسن خاتمہ کی دولت عطا

---

[1] بڑے مخلص مسلمان تھے اور مولانا کے شیدائی۔ وطن میں محسن میاں کے نام سے مشہور رہتے۔ ان کے لڑکے شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی۔ بی اے جامعہ ملیہ (دہلی) کے مشہور کارکن ہیں (طبع اوّل) ہندوستان کی آزادی ہو جانے سے صُوبۂ دہلی کے وزیر تعلیمات ہو گئے اور اُسی زمانہ میں ناگہانی وفات پا گئے (طبع ثانی)

کی جاتی ہے۔ رزقنا اللہ تعالیٰ وایاکم ھذہ النعمۃ"

وہ اہم مسئلہ اب آتا ہے۔

"ایک سوال بہت روز سے کرنا چاہتا تھا۔ اب کی زبانی بھی موقع نہ ملا۔ وہ یہ کہ عدالتی عہدے مثلاً منصفی، سب ججی، تحصیلداری، خواہ وہ عہدے بلاتنخواہ ہوں مثلاً آنریری مجسٹریٹی۔ غیر مسلم حکومت کے تحت میں قبول کرنا جب کہ فیصلے لامحالہ غیر اسلامی قانون کے ماتحت کرنے پڑیں گے، کہاں تک جائز ہے؟

بہ ظاہر تو حکم عدم جواز ہی کا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مسلم ان عہدوں پر نہ رہ جائے، تو امت اسلامی ہی کے دوسرے مصالح فوت ہوئے جاتے ہیں۔ جناب کی کسی تحریر میں کوئی قول اس باب میں دیکھنا یاد نہیں پڑتا، ورنہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔

ا۔ میں نے اس کے متعلق لکھا تو ہے مگر اس وقت مقام مجھ کو بھی یاد نہیں، اس لئے اس وقت جو ذہن میں حاضر ہے، مختصراً عرض کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ بعض افعال ایسے ہیں کہ شرعی کلی قانون سے حرام ہیں، لیکن ضرورت میں شرعاً بھی اس کی اجازت دے دی جاتی ہے خواہ نصاً خواہ اجتہاداً جیسے اکل میتہ۔ تناول خمر مخمصہ میں یا اکراہ میں یا اساغۃ لقمۂ غاصبہ کے لئے۔ ایسے ہی افعال میں باقتضاء قواعد یہ مناسب مسئول عنہا بھی داخل کئے جاسکتے ہیں اگرچہ کوئی نقل جزئی اس وقت میری نظر میں نہیں، مگر کلیات ونظائر سے تمسک ممکن ہے۔ چنانچہ اس کی ایک نظیر فقہائے ذکر کی ہے۔ دفع النائبۃ والظلم عن نفسہ اولی الی قولہ ویوجر من قام بتوزیعھم بالعدل وان کان الاخذ باطلا قولہ ویوجر من قام بتوزیعھا بالعدل ای بالمعادلۃ کما عبر فی النفسیۃ ای بان یحمل کل واحد بقدر طاقتہ لانہ لو ترک توزیعھا الی الظالم ربما یحمل بعضھم مالا یطیق فیصیر ظلما علی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعھا بالعدل تقلیل الظلم فلذا یوجر وھذا الیوم کالکبریت بل ھو اندر۔ درمختار ورد المختار قبیل باب

نظیر ہونا ظاہر ہے کہ مقصود کا فی نفسہٖ غیر مشروع ہونا اور اہل کے ہاتھ میں ہونے سے اشد المفسدتین سے متبدل ہوجانا دونوں میں مُشترک ہے۔ البتہ کلام ضرورت میں ہے۔ اور یہی اہم ہے۔ سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں۔ ایک تحصیل مُنفعت خواہ دینی ہو یا دُنیوی۔ خواہ اپنی ہو یا غیر کی۔ دوسری دفع مضرّت اسی تعمیم کے ساتھ۔ سو تحصیل منفعت کے لئے تو ایسے افعال کی اجازت نہیں مثلاً محض تحصیل قوت لذّت کے لئے دوائے حرام کا استعمال یا اجتماع لاستماع الوعظ کے لئے آلات لہو و غنا کا استعمال بمثل ذالک۔ اور دفع مضرت کے لئے اجازت ہے جب کہ وہ مضرّت قواعد صحیحہ منصوصیہ یا اجتہادیہ سے معتد بہا ہو اور شرعی ضرورت یہی ہے۔ مثلاً دفع مرض کے لئے دوائے حرام کا استعمال جب کہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہوگیا ہو۔ کیونکہ بدوں اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا۔ اور مثلاً مسئلہ منقولہ مذکورہ میں بہ ضرورت دفع ظُلم اشد کے توزیع کی کہ وہ بھی ظُلم اخف ہے اجازت دی گئی۔ پس یہی تفصیل واقعۂ مسئول عنہا میں سمجھنا چاہیئے کہ یہ مناصب فی نفسہٖ شرعاً حرام ہیں جس کی وجہ خود سوال میں بھی مذکور ہے۔ اور اگر عمل کے ساتھ خاص یہ فسادِ عقیدہ بھی ہو کہ حُکم قانونی کو بہ مقابلہ حُکم شرعی کے مُستحسن و راجح سمجھا جائے تو کفر ہے جس کو مَیں نے بیان القرآن سورۂ مائدہ آیت وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ کی تفسیر میں بیان بھی کیا ہے[1]

مگر اس وقت کلام صرف اسی درجہ میں ہے جو محض معصیت اور حرام ہے۔ پس فی نفسہٖ حرام ہونے کے بعد ان کو اگر جلبِ مُنفعت مالیہ یا جاہیہ کے غرض سے اختیار کیا جائے تو کسی حال میں جائز نہیں اور اگر دفع مضرت کی غرض سے اختیار کیا جائے کہ

---

[1] اِس خاکسار کی تفسیر میں سورۃ المائدہ کی ان تینوں آیتوں کے تحت میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے ناظرین کرام براہ کرم اُسے بھی ضرور دیکھ لیں۔

اُمّتِ مسلمہ پر کفّار کی طرف سے جو مظالم و مضرّات پہونچتے یہ اہل مناصب بہ قدر امکان اُن کو اگر دفع نہ کر سکیں تو کم از کم تقلیل و تخفیف کر سکیں تو اس صورت میں حکم جواز کی گنجائش ہے، واللہ اعلم۔

نوٹ۔ میں نے کسی نقل جزئی سے نہیں لکھا، اِستدلال سے لکھا ہے۔ جس پر مجھ کو اعتماد نہیں۔ اِس لئے مناسب بلکہ واجب ہے کہ دوسرے علمائے محققین سے بھی اطمینان کر لیا جائے اور پھر بھی عمل کے وقت حضرت امام مالکؒ کے ارشاد نفعل و نستغفر کو معمول رکھیں۔"

۱۹۳۷ء

(۹۲)

درس تفسیر کا تحریری سلسلہ جاری ہے۔ ساتھ ہی دوسرے دینی حقائق و معارف کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ ۳۷ء شروع ہو چکا ہے۔ ۲۶ر جنوری کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م: تفسیر بیان القرآن سے متعلق آج معروضات ذیل پیش کرنے ہیں۔

جلد اوّل، ص ۹۳۔ س ا۔ من شھد منکم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ ترجمہ و تفسیر میں بنا دیا۔ "شخص" کے بعد "تم میں سے" لکھ دیا۔

م۔ جلد ۹۔ ص ۹۔ فاولٰئک ھُمُ المُصْحَفُوْنَ کے ترجمہ میں "خدا تعالیٰ کے پاس" تفسیری اضافہ ہے نہ کہ ترجمہ

ا۔ واقع میں ایسا ہی ہے۔ میں نے اس طرح درست کر دیا کہ ترجمہ میں سے حذف کر دیا۔ اور تفسیر میں اس کو بھی قوسین کے درمیان کر دیا۔

م۔ جلد ۹۔ ص ۸۹۔ ما بین الباطل والعیب اصل ترجمہ کے بجائے اس کا ماحصل ایک اردو محاورہ میں ملا۔

ا۔ واقعی ظاہرا تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں نے جو حاشیۂ عربیہ میں توجیہ کی تقریر کی ہے اس سے یہ ماحصل قریب، قریب ترجمہ کے ہو گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جو میں نے حضرت مولانا دیوبندی قدس سرہ کا ترجمہ دیکھا اور اس پر فوائد بھی دیکھے تو اب میری

رائے میں یہ مناسب معلوم ہوا کہ ترجمہ تو حضرت کی موافقت میں اس طرح کیا جائے کہ "اور باطل کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور نہ پھیر کر لا دے" مگر چونکہ اس سے مقصود واضح نہیں ہوا اس لئے تفسیر میں اس طرح کر دیا جائے "یعنی نہ وہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا محض گیا گذرا الخ بس لفظ "یعنی" کاٹ دیا جائے اور دوسری قوس اپنے حال پر رہے جہاں پہلے سے ہے۔ غالباً اس میں سب رعایتیں محفوظ اور نمایاں رہیں گی۔ میں نے مدرسہ کے نسخہ میں اسی طرح کر دیا ہے۔

م " جلد ۹۔ ص ۹۲۔ س ۱۔ بعد موتہا۔ ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

ا۔ اس طرح بنا دیا "زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے"

م۔ جلد ۱۰۔ ص ۳۶۔ آخری سطر متن۔ اشد العذاب میں "عذاب" ہی کیوں نہ رکھا گیا "آگ" سے ترجمہ کیوں فرمایا گیا؟

ا۔ یہ عقلمندی اہل مطبع کی ہے۔ میری تفسیر میں عذاب کا لفظ ہے۔ آگ نہیں۔

م۔ جلد ۱۰۔ ص ۷۶۔ س ۱۔ ذکر الرحمٰن میں رحمٰن ہی یا خدائے رحمٰن کیوں نہ رکھا گیا؟ "اللہ" سے ترجمہ کیوں فرمایا گیا؟

ا۔ خدائے رحمٰن بنا دیا۔ مصلحت یاد نہیں۔

م۔ جلد ۱۰۔ ص ۷۷۔ س ۲ متن۔ ذکر کا ترجمہ بجائے نصیحت وغیرہ کے "شرف کی چیز" سے پوری طرح دلنشین ہوا۔

ا۔ دوسرے مفسرین نے بھی ایسا کیا ہے کما فی الجلالین وغیرہ۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ بھی اسی طرف مشیر ہے۔ قاموس میں ذکر کے معنی شرف کے بھی لکھے ہیں۔ اور اس کو اسی لئے ترجیح ہو سکتی ہے کہ یہ حضور کی شان کے زیادہ لائق ہے۔

م۔ جلد ۱۰۔ ص ۹۱۔ عذاب الجحیم کے ترجمہ میں لفظ عذاب چھوٹ گیا۔

ا۔ ترجمہ چھوٹا نہیں۔ لفظ تکلیف دینے والا، عذاب ہی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ عذاب کے لغوی معنی یہی ہیں۔ اور گو حضرت شاہ صاحب دہلوی نے جلتے پانی کا عذاب ترجمہ میں

لکھا ہے مگر لفظ "ذوالو" عذاب کے ساتھ محاورہ میں بے ربط ہے۔ اِس لئے نہیں لیا گیا۔

م۔ کچھ روز سے موت بہت یاد آنے لگی ہے۔ مگر شوق و اشتیاق کے ساتھ نہیں، بلکہ خوف و دہشت کے ساتھ۔

ا۔ نہ شوق مقصود بالذات ہے نہ خوف۔ دونوں مقصود بالعرض ہیں۔ اور مقصود بالذات تعلق آخرت اور تقلیل تعلق عن الدنیا ہے جو دونوں طریق سے حاصل ہے۔

م۔ خیال بار بار یہ آتا ہے کہ وہ وقت تو تمام مالوفات و مرغوبات سے یکسر انقطاع کا ہوگا۔ دُنیا میں جو پاکیزہ ترین موانست حاصل ہے وہ رجال ہی کے ساتھ ہے جو بہر حال اپنے ہی ہم جنس انسان ہیں، اور موت کے وقت سابقہ اُن سے نہیں بلکہ براہ راست حق تعالیٰ سے پڑے گا، جن کی ذات سے حقیقتہً قلب کو ذرا بھی تعلق اُلفت و اُنس نہیں۔ اگر تعلق ہے تو وہ بس عظمت و جلالت کا ہے۔

ا۔ مرنے سے پہلے مومن کو اُنس ہو جاتا ہے۔

م۔ اُس وقت یک بیک کیا گذر رہے گی۔

ا۔ وہی گذرے گی جس کی خبر دی گئی ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ

م۔ اعمال جو بدتر ہیں وہ تو ہیں ہی، جو بہ ظاہر بہترین معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی جب خود اپنی ہی جرح کے بعد خالصتہً للہ نہیں ٹھہرتے تو پھر وہاں کی جرح کا کیا ذکر ہے۔

ا۔ یہ سب صحیح ہے مگر عفو و رحمت کی امید بھی تو دلائی گئی ہے۔

م۔ بار بار یہی تمنا کرنے کا جی چاہتا ہے کہ کاش پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔

ا۔ یہ بھی صحابہ کی سُنت ہے۔ اِس کی برکت سے بھی امید فضل ہے۔

م۔ حاجی محمد شفیع صاحب بجنوری ماشاء اللہ اپنے سولھویں حج کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

ماشاء اللہ تعالیٰ۔

مکرمی۔ السلام علیکم۔ سب مقامات کو دیکھ کر لکھ دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ فروگذاشتوں کی اطلاع فرما دیتے ہیں۔ آئندہ اس کا نفع انشاءاللہ جاری و باقی رہے گا۔

ان مقامات کی تعین سے احتمال ہوتا ہے کہ شاید آپ کا انگریزی ترجمہ یہاں تک پہنچ گیا۔ اگر ایسا ہے تو نہایت خوشی اور مبارکباد کا محل ہے خصوصیت کے ساتھ تو اس کے جواب کی ضرورت نہیں لیکن اگر اتفاقاً پھر کوئی خط آئے اور بے تکلف یاد بھی رہے تو اُس کی بھی اطلاع دیجئے۔ اکثر احباب مُشتاقانہ پُوچھتے ہیں۔

استحضار میت وغیرہ کے سلسلہ میں امام غزالیؒ اور بعض دوسرے اکابر نے بہت کچھ لکھا ہے اور داد تحقیق دی ہے لیکن حضرت سے مراسلت کرکے براہ راست جو تسکین قلب حاصل ہو سکتی تھی وہ اور کسی طریقہ سے نصیب ہونا ممکن ہی نہ تھی ——— اور حضرت کے جوابات کی مثال ابھی، اُوپر گذر ہی چکی۔

بعض لمبے لمبے خط ان ہی تفسیری استفسارات سے بھرے ہوتے۔ ۲ فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو۔

ھ ہ تفسیر بیان القرآن، جلد ۱۱ و ۱۲ سے متعلق معروضات ذیل ہیں:۔

جلد ۱۱۔ ص ۱۰۱، سطر ۳ متن۔ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ کے کا ترجمہ "اپنی سی" سمجھ میں نہ آیا۔

ا۔ غلط نامہ میں اس کی تصحیح چھپ چکی ہے "اپنی سے پہلی" الخ

۲۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۳۔ س ۱ متن اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کا ترجمہ جو لوگ کافر ہیں' یا جن لوگوں نے کفر کیا، اور اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا ترجمہ جو لوگ ایمان لائے' اگر کیا جاتا تو شاید الفاظ قرآنی سے قریب تر رہتا۔

ا۔ بیشک اس میں یہ ترجیح ہے۔ اور ترجمہ موجودہ میں سلیس اور مختصر ہونے کی ترجیح ہے۔ اہل ذوق کو اختیار ہے۔

م۔ جلد ۱۱۔ ص ۵۷۔ س ۲ متن۔ یُدِسّھم میں ضمیر ہم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ حاصل کے محفوظ رہنے سے مُضر تو نہیں لیکن اگر ترجمہ ہو تو اولیٰ ہے، جیسے شاہ صاحب دہلوی نے لفظ "اپنے" اور حضرت دیوبندیؒ نے لفظ "ان کے" سے ترجمہ کیا ہے۔

م۔ جلد ۱۱۔ ص ۵۸۔ س ۱ متن۔ وکتٰب اور والبیت اور والبحر جو واؤ ہے اس کے متعلق سوال ہے کہ یہ واؤ قسم ہے یا واؤ عطف۔

ا۔ اکثر نے واؤ عطف ہی لیا ہے۔ ملاحظہ ہو روح المعانی۔ بقولہ والواو الاولی للقسم وما بعدھا علی ما قال ابوحیان للعطف و تفسیر شاہ صاحب دہلوی و حضرت دیوبندی مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے واؤ قسم لیا ہے اور دونوں کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا فَالزّٰجِرٰتِ زَجۡرًا وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا میں۔ اسی طرح وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا الخ اسی طرح وَالذّٰرِیٰتِ الخ میں واؤ عاطفہ ہے۔ بقرینہ فاء کے فاء قسم کے لئے نہیں آتی۔ اور وَالشَّمۡسِ وَضُحٰىهَا الخ میں ظاہراً سب واؤ قسم کے لئے ہیں اور عطف بھی محتمل ہے۔ اور یہ تعدد قسم یہاں تو صریح نہیں۔ مگر سورۂ قیامہ میں تکرار لا اقسم سے یہ تعدد صریح ہے۔

م۔ جلد ۱۱۔ ص ۷۳۔ س ۱۔ نذیر اور نُذُر کا ترجمہ بجائے ڈرانے والے اور ڈرانے والوں کے، پیغمبر اور پیغمبروں سے کیوں فرمایا گیا ہے۔

م۔ جلد ۱۱، ص ۷۶۔ س ۲۔ وہی سوال بالا۔

ا۔ روح المعانی میں اس مقام پر اس تفسیر کی تصریح کی ہے۔ کذبت ثمود بالنذر بالرسل علیہم السلام گو دوسرے احتمال کو بھی بعد میں لکھا ہے مگر راجح اوّل ہی کو سمجھا ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہاں مقصود خاص قید انذار نہیں۔ اس لئے مُقید بول کر مطلق مُراد لیا گیا۔

م۔ جلد ۱۱۔ ص ۸۲۔ س ۲ "جن و انس"، تو ثقلان کی تفسیر ہوئی نہ کہ ترجمہ۔

ا۔ مگر شاہ ولی اللہ دہلوی نے جن و انس ہی سے ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ میں ایسے توسعات سب کے کلام میں ہیں۔

م۔ جلد ۱۱۔ ص ۹۷۔ س ۳۔ جاء امر اللہ۔ ترجمہ میں "تم پر" اضافہ معلوم ہوتا ہے۔

ا۔ واقعی معلوم نہیں یہ کیوں لکھا گیا۔ اب حذف کر دیا گیا۔

م۔ جلد ۱۲۔ ص ۹ س ۱۔ اِنَّ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ لکھا نہیں گیا۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ میں بھی نہیں لکھا گیا۔ مگر ہونا بہتر ہے۔ اب بنا دیا تحقیقاً۔

جلد ۱۲۔ ص ۱۵۔ س ۳۔ عنہ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اب لکھ دیا "اُس سے"۔

م۔ جلد ۱۲۔ ص ۱۵ ۔ س ۵۔ اجورہن ضمیر ھُن کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اب لکھ دیا "اُن کی"۔

م۔ جلد ۱۲۔ ص ۱۵۔ س ۶۔ ترضع لہٗ۔ لہٗ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ واقعی ضروری چیز کی فروگذاشت ہوئی۔ شاہانِ دہلی نے "بہ فرمودہ او" اس کی خاطر سے ترجمہ کیا ہے۔ جس میں اشارہ ہے کہ لہٗ کا مرجع باپ ہے۔ چنانچہ جلالین میں اس کی تصریح ہے۔ میں نے ترجمہ اِس طرح درست کر دیا ہے "تو باپ کی تجویز سے" الخ۔ میری رائے میں اس میں سب ضروریات کی رعایت ہو گئی۔

م۔ جلد ۱۲۔ ص ۱۸۔ س ۵۔ احسن لہ۔ لہٗ کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ تفسیر سے انتخاب میں کوتاہی ہوئی۔ لفظ "ان کو" کو چھوڑ دیا۔

م۔ جلد ۱۲۔ ص ۲۰۔ س ۵۔ عیناً ت کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ تفسیر میں موجود ہے۔ یہاں بھی انتخاب میں کوتاہی ہوئی۔

خط یوں ہی طویل ہو گیا۔ لیکن متعلقات تفسیر ابھی باقی ہیں۔

م۔ بحمد اللہ نفس ترجمہ کا سرسری مسودہ ۲۰ پاروں تک ہو گیا۔ انشاء اللہ ماہ مارچ تک پورا قرآن مجید ہو جائے گا۔

ا۔ بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ قبول اور آپ کی سعی کو مشکور فرمائے۔

م۔ لیکن ترجمہ تو میں بیان القرآن اور ایک آدھ انگریزی ترجمہ سامنے رکھ کر گھسیٹتا جاتا ہوں، اور کبھی کبھی لغت اور بعض تفاسیر کی جانب بھی مراجعت کرنی پڑتی ہے۔ باقی اصل وقت حواشی تفسیری میں لگتا ہے۔

ا۔ واقعی وہی اہم بھی ہے اور وقتی ضروری۔ دل سے دعاء تائید و رفع موانع کرتا ہوں۔

م۔ اور وہ پندرہ پاروں کے تو ابھی بالکل ہی باقی ہیں، اور ابتدائی پندرہ پاروں کے بھی ابھی بہت زیادہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ بس حضرت دعا برابر فرماتے رہیں۔

ا۔ دل سے دعا ہے اور امید قبول بھی۔

م۔ مسائل کے سمجھنے میں تو کوئی ایسی زاید دشواری آپ حضرات کی برکت سے پیش نہیں آئی، لیکن نفس عبارت ہی کے سمجھنے میں لوہے لگ جاتے ہیں۔ محذوفات و مقدرات کے کھولنے، معطوف و معطوف علیہ کے متعین کرنے، ضمائر کا مرجع قرار دینے، اس قسم کے نحوی اشکالات کے حل میں تو ہمت ہی ہار گیا ہوتا اگر بیان القرآن قدم قدم پر دستگیری کے لیے موجود نہ ہوتی۔

ا۔ یہ سب توفیق الٰہی ہے خواہ نام کسی چیز کا ہو جائے۔"

مفسر محقق کے ساتھ ساتھ شیخ و عارف کی حیثیت بھی حضرت کی مراسلات میں غائب نہیں ہونے پاتی تھی۔ اسی مکتوب کا آخری ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

مِنّے گھر میں پرسوں خواب دیکھا کہ خانۂ کعبہ کا طواف بڑے ذوق و شوق سے کر رہی ہیں۔ کعبہ کا سیاہ غلاف اُترا ہوا ہے۔ نفس عمارت بیحد نُورانی نظر آرہی ہے۔ شدت شوق کی کیفیت کی کوئی مثال ہماری ہیں نہیں ملتی کسی طرح کے خوف وہراس کا نام نہیں۔ تمام تر وجد ہی وجد ہے۔ اُسی حالتِ طواف میں بعض اور عورتوں کو جدید فیشن کے غیر ساتر لباس میں دیکھا۔ پہلے غصہ آیا کہ یہاں بھی یہ بے حجابی۔ لیکن پھر خیال آ گیا کہ کیسی ہی ہوں بہر حال اُن کی زبانوں پر اللّٰھم لبیک تو ہے۔ جناب کی خدمت میں خواب عرض کر دینے کو مجھ سے کہا ہے۔

ا۔ پُر اسرار خواب ہے۔

ع۱ سرِ اوّل۔ عبادت کی مشغولی اور عبادت بھی عاشقانہ جو روح ہے ارکان حج کی۔

سر ع۲۔ بیت اللہ عالم رویا میں مثال ہے دین کی۔ انشاء اللہ دین صحیح سے تعلق راسخ رہے گا۔

سر ع۳۔ منکرات پر غیظ جو علامت ہے ایمانِ کامل کی۔

سر ع۴۔ اُس میں اعتدال کہ مساوی کے ساتھ محاسن پر بھی نظر ہوئی، یہی مجمع حق ہے مسلمانوں کا۔

سر ع۵۔ اِس کا اشارہ کرا دیا گیا کہ دین میں اپنے اہواء نفسانیہ سے لوگوں نے تصرف کر لیا ہے۔

بہر حال صلاح و اصلاح دونوں کا یہ خواب جامع ہے۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور آثار و برکات عطا فرمائے۔

یہ مکتوب ۱۷ فروری کا تھا۔ مارچ، اپریل، اور خود باقی حصۂ فروری کے خطوط خدا معلوم کیا ہو گئے۔ آج اپنی اس غفلت اور بے احتیاطی پر کتنا غصہ اور افسوس ہو رہا ہے۔ اور طبیعت اپنے اُوپر کیسی جھنجھلا رہی ہے! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اتنے اتنے دِن تک

میں نے خط لکھا نہ ہو۔ بہرحال اب جو مکتوب محفوظ ملا، وہ ۷ رمئی کا ہے، اور وہ حاضر ہے:۔

م: "تفسیر بیان القرآن کے سلسلہ میں آج حسب ذیل عرض ہے:۔

جلد ۱۲۔ص ۳۵۔ فنزی القوم فیھا۔ فیھا کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح "اس قوم کو ان (ایام) میں اس طرح الخ

م۔ جلد ۱۲۔ص ۳۵۔ یحمل عرش ربك فوقھم۔ فوقھم کا ترجمہ مجھے نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح بنا دیا "آٹھ فرشتے اپنے اوپر اُٹھائے ہوں گے"

م۔ جلد ۱۲۔ص ۳۶۔ فلیس لہ الیوم ھھنا۔ ھھنا کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح بنا دیا "اس شخص کا یہاں (یعنی آخرت میں کذا فی الخازن)

م۔ جلد ۱۲۔ص ۳۹۔ فی اموالھم حق معلوم معلوم کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح بنا دیا "حق مقرر ہے"

م۔ جلد ۱۲۔ص ۴۷۔ قالوا تلك اذا کرۃ خاسرۃ۔ قالوا کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔ جدید مطبوعہ میں اس طرح چھپا ہا۔ (استعجاب سے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو الخ)

م۔ جلد ۱۲۔ص ۹۰۔ الا ماشاء اللہ کا ترجمہ "مگر جس وقت" چھپا ہے۔ یہاں لفظ "وقت" بجائے "قدر" کے غلط چھپ گیا ہے، جیسا کہ آگے چل کر تفسیر میں "جس قدر" ہی درج ہے۔

ا۔ جی ہاں۔ تفسیر سے کسی نے انتخاب میں غلطی کی۔

م۔ جلد ۷۔ص ۴۶۔ بل متعنا کے ترجمہ میں ضمیر جمع متکلم کا ترجمہ واحد متکلم سے چھپا ہے

ا۔ اب لفظ "ہم نے" بنا دیا ہے۔

م۔ جلد ۷۔ص ۵۴۔ الیتہ بینات کے ترجمہ میں "جس میں" اصل پر اضافہ معلوم ہوا

ا۔ لیکن اگر اس کو ترجمہ سے زائد مانا جائے تو اس صورت میں کلمہ "ہیں" کو بھی زاید ماننا پڑے گا۔

تو بقیۂ عبارت ترجمہ کی سلیس نہ رہے گی۔ مَیں نے سلامتؔ و وضاحت کی غرض سے حاصل سے ترجمہ کیا ہے۔ صرف لفظی ترجمہ نہیں ہے اور ایسے توسعات ترجمہ میں سب محققین کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔

م۔ جلد ۸۔ ص ۱۲۵۔ وعرضنا جھنم الخ جو ترجمہ فرمایا گیا۔ اس میں عرضنا کا زور بھی آ گیا ہے۔

ا۔ نہیں آیا۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ صاحب کے ترجمہ سے بھی غالباً یہ زور ادا نہیں ہوا۔ مَیں نے اس طرح بنادیا ہے "سامنے خاص طور پر (جس میں مصیبت ہی مصیبت نظر آوے) پیش کردیں گے" اس میں اس سوال کا جواب بھی ہو جاوے گا جس کا جواب حاشیۂ عربیہ میں تحت عنوان بلاغت دیا گیا ہے۔

م۔ جلد ۶۔ ص ۱۲۴۔ سدِّ ذوالقرنین کے جو اوصاف قرآن و حدیث سے درج ہوئے ہیں۔ اُن میں نمبر ۵ پر جو وصف درج ہے "یعنی "دیوار کے اس طرف جو یاجوج و ماجوج ہیں وہ ابھی باہر نہیں نکل سکے" اس باب میں شرح صدر نہیں ہوا۔ یعنی اُن کے اس وقت تک نہ نکل سکنے پر قرآنی یا حدیثی دلیل سمجھ میں نہ آئی۔

ا۔ سورۂ انبیاء میں جو آیت ہے حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ میرے نزدیک وہ اس کی واضح دلیل ہے۔ فُتِحَتْ کی تخصیص بالوقت الخاص سے صاف معلوم ہوا کہ وہ اس وقت تک نہیں نکل سکے اور یہ عادۃً موقوف ہے اس پر کہ دوسری طرف راستہ نہیں ہے۔

م۔ جلد اوّل۔ ص ۳۔ ۱۔ فی الحج کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔ یُوں بنادیا "حج (کے زمانہ) میں"

م۔ جلد اوّل۔ ص ۷۔ ۱۔ ما ذکروہ میں ضمیر کا ترجمہ نہیں ملا۔

ا۔ اس طرح بنادیا "اور اس کو اس طرح"

م۔ جلد اوّل۔ ص ۱۰۵۔ وَمَن تَأَخَّرَ کے ترجمہ میں "دو دن" اصل پر اضافہ معلوم ہوا۔

ا۔ واقعی۔ اور غالباً ترجمہ کے وقت میرے ہی ذہن میں یہ رہا کہ تَأَخَّرَ کے بعد بھی قرآن مجید میں فِي يَوْمَيْنِ ہے۔ اب اس کو خطوط وحدانیہ کے اندر کر دیا ہے۔

م۔ جلد اوّل۔ ص ۱۱۱۔ ام حسبتم کے ترجمہ میں "دوسری بات سُنو" اصل ترجمہ پر اضافہ معلوم ہوا۔

ا۔ نہیں ایسا نہیں۔ بلکہ اس ام کو منقطعہ قرار دیا گیا ہے۔ پس اس کی توجیہ اس ترجمہ سے ہو گئی تو گویا یہ ترجمہ مدلول ہے ام کا۔ عربی ملحقات الترجمہ میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔

خط کا تفسیری حصہ ختم ہوا، ابھی دوسرے اجزاء باقی ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ ہوں :۔

م۔ تفسیر سے متعلق معروضات ختم ہو چکے۔ اب ایک دوسری بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اِدھر کچھ عرصہ سے خواب اپنی موت سے متعلق بار بار دیکھنے لگا ہوں۔ خواب تو بہت واضح ہیں، مگر صبح تک تفصیل حافظہ سے نکل جاتی ہے۔ کبھی اپنے کو کفن پہنے دیکھتا ہوں کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ آمد اجل کا علم ہو گیا ہے، اور اس کے انتظار میں ہوں۔ کچھ زیادہ ہراس محسوس نہیں کرتا (جیسا کہ بیداری میں اس کے فرض کرنے اور خیال کرنے سے ہوتا ہے) بلکہ ایک آدھ بار تو کسی قدر اشتیاق بھی محسوس ہوا۔ بعض خوابوں میں جناب والا کو بھی دیکھا۔ مثلاً ایک بار کا اتنا دیکھنا یاد ہے کہ جیسے میرا وقت موعود آ گیا ہے۔ میں لیٹا ہوا ہوں، اور آپ وہیں قریب ہی کی مسجد کے صحن میں کھڑے ہوئے بڑی خندہ روئی کے ساتھ دلاسا دے رہے ہیں۔

ا۔ مجھ کو تعبیر سے کوئی خاص مناسبت نہیں۔ باقی قواعد سے ایسے خوابوں کے چند محمل ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اشارہ ہو فنائے نفس کی طرف اور بشارت ہو اس درجہ کے عطا ہونے کی عاجلاً یا آجلاً، دوسرے یہ کہ حسی آنے والی موت سے وحشت رفع کرنا ہو۔ تیسرے یہ کہ

کبھی کوئی غفلت طاری ہوگئی ہو وہ بہ شکل موت نظر آئی ہو۔ ایک احتمال کی تعیین تو معبر کامل
کرسکتا ہے یا صاحب معاملہ اپنی حالت کا اندازہ کرکے۔

م۔ ابھی کل رات کو یہ دیکھا کہ ایک صاحب میرے سامنے شہید ہوئے اور بعد انتقال مجھ سے
ملے ہیں۔ میں نزع رُوح کی کیفیت دریافت کرتا ہوں، وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ تکلیف جو
کچھ بھی ہوتی ہے وہ اس سُرعت کے ساتھ گذر جاتی ہے کہ انسان اس کا احساس بھی نہیں کرنے
پاتا۔ احادیث میں جو مضامین ترہیب آئے ہیں وہ سب اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن مومن کے
ساتھ یہ خاص رحمت کا معاملہ رہتا ہے کہ قبل اس کے کہ وہ اذیت محسوس کرسکے اذیت ہی
ختم ہو جاتی ہے۔

ا۔ یہ تو کھلی بات ہے، تعبیر کی حاجت نہیں۔ مسئلہ کی تعلیم کی گئی ہے۔ اکثر مومنین کے ساتھ
ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے خصوصاً شہداء کے ساتھ جیسا حدیث میں ہے کہ صرف چیونٹی کے
کاٹنے کے برابر تکلیف ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۹۴)

تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں، مدت دراز
سے بالکل واضح وغیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے
خوشگوار اور شگفتہ تھے۔ نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانوی کی جانب سے تھی اور نہ احترام
و بزرگداشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے ـــــ مثالوں اور نمونوں
کے لئے ملاحظہ ہوں خود اسی کتاب کے ابتدائی نمبر، بلکہ کچھ وسطی نمبر بھی۔

لیکن دیکھنے والے یہ بھی دلی تاسف کے ساتھ برابر دیکھ رہے تھے کہ رفتہ رفتہ یہ
شگفتگی گھٹتی جا رہی ہے۔ اور بشاشت کی جگہ گرانی لیتی جا رہی ہے[1]۔ تا آنکہ شعبان ۵۵ھ
کے رسالہ النور میں حضرت کے قلم سے ایک مستقل مقالہ المانعۃ عن بعض الجامعۃ کے

---

[1] ملاحظہ ہوں ۸۳ و ۸۵۔

عنوان سے شایع ہوگیا۔ جس نے اُن نیاز مندوں کو جو طرفین سے تعلق رکھنا چاہتے تھے، بڑی مُشکل میں ڈال دیا ـــــــ ایک عالم مُخلص جن کو باضابطہ بیعت دیوبند سے تھی، مگر جنھیں بعد کو سندِ خلافت تھانہ بھون سے ملی، اور جو سلسلۂ عالیہ اشرفیہ کے ایک بڑے کارگزار اور اہم رُکن ثابت ہوئے[1] اُن کا خط مجھے اپنے کاغذات میں ۲۲ اپریل ۳۷ء کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا :-

"شعبان ۵۵ھ کے النور میں" المانعیۃ عن بعض الجامعیۃ" تو آپ نے ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ میں نے ابھی اِسی عشرہ میں تھانہ بھون کی حاضری کے بعد رجب دیوبند حاضر ہوا تو وہاں دیکھا۔ آپ نے اِس "مانعیۃ" سے کیا سمجھا، اور کیا کیا؟ کوئی امر مانع نہ ہو تو اِس معاملہ میں رہنمائی کا محتاج ہوں"

بیشک حیرانی بالکل قُدرتی تھی۔ مقالہ میں اشارے نہیں، تقریباً صراحتیں ہی ایسی موجود تھیں۔ اب نیچے اصل مقالہ ملاحظہ ہو :-

المانعیۃ عن بعض الجامعیۃ

اخبار استقلال دیوبند بابتہ ۲۰ ستمبر ۳۶ء ۳ رجب ۵۵ھ کے صفحہ ۵ میں یہ خبر پڑھ کر کہ طلبائے دارالعلوم دیوبند نے ایک ایسے اسٹیشن پر پُر عظمت استقبال احترام کیا نیز بعض اکابر دارالعلوم نے اس کی فرودگاہ پر جا کر اس کی ملاقات کی اور اس کی معیت میں جلسہ گاہ میں آئے جس سے عام مُسلمانوں پر جو اثر ہوسکتا ہے، ظاہر ہے (جو علاوہ غیر مُسلم ہونے کے احکام اسلام کی اہانت و انہدام کی سعی کرتا ہے) چنانچہ اخبار الامان دہلی ۱۲ ستمبر ۳۶ء بمطابق رجب ۵۵ھ کے صفحہ ۳ میں اِس شخص کا ہندو مُسلم کی باہمی ازدواج کے

---

[1] اور اب اِس کتاب کے طبع ثانی میں ان بزرگ کے نام کے اظہار میں کوئی مانع باقی نہیں رہا۔ مولانا عبدالباری ندوی صاحب "جامع المجددین" وغیرہ۔

متعلق تمام ہندوستان کے لئے عام قانون بنانے پر زور دینا مذکور ہے اور یہ محض ایک نمونہ ہے (وللکافرین امثالها) اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کی برداشت کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ میں آج ہی سے اپنے کو ایسے حضرات کی زیارت و صحبت سے محروم کردوں کیونکہ ان تعلقات سے اس صدمہ کی تجدید ہو گی جس کا تحمل میری ہمت سے خارج ہے اور اگر ایسے طلبہ کو یہاں آنے سے منع کر دیا جاوے تو میں اس کو اپنی اعانت علی الراحت سمجھ کر ممنون ہوں گا۔ پس مقصود اس تحریر سے اپنے خاص ضعف کا علاج ہے نہ کہ تقویٰ کا دعویٰ بقول ایک حکیم کے ؎

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں　　کنجے گرفت و ترسِ خدا را بہانہ ساخت

اسی طرح میں ایسے حضرات کو جو دونوں طرف سے خصوصیت کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس خیال کو بالکل دل سے نکال دیں۔ یہ برزخیت یا جامعیت دینی و دنیوی مصالح کے بالکل خلاف ہے۔ اسلم یہی ہے کہ ایسا تعلق ایک ہی طرف رکھیں خواہ ضعفاء سے خواہ اقویاء سے اور سہل یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیں۔ باقی عام اسلامی تعلقات یا ضابطہ کے معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح دار العلوم سے جو بلا واسطہ تعلق ہے اس پر بھی اس بے تعلقی للعارض کا کوئی اثر نہیں عوارض تو انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد فاما الزبد فیذھب جفاء کا منظر ثابت ہوں گے اور دار العلوم اپنی ذات و برکات میں واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کا مظہر رہے گا۔

اخیر میں یہ دُعا بھی کرتا ہوں اور یہی چاہتا بھی ہوں۔

اللھم اجعلنا جمیعا کما تحب و ترضیٰ واجعل آخرتنا خیرا من الاولیٰ

۵ ر رجب ۵۵ھ

خط خاص] السلام علیکم۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ کی زبانی مجھ کو یہ پیام دیا گیا تھا کہ ہم طلبہ میں کانگریسی اثر نہیں پھیلاتے کیا یہ کانگریسی اثر نہیں۔ کیا اُن کی شرکت اور

طلبہ کو سختی سے نہ روکنا اس کا سبب قریب و موثر نہیں۔ پھر قول و فعل میں تطابق کہاں۔ اِس لئے ظاہر کیا گیا کہ اب تو اِس اعلان میں مجھ کو معذور سمجھا جائے گا۔ آپ اِس اعلان کو کسی منظرِ عام پر چسپاں کر دیجئے۔

اشرف علی

۵ رجب ۱۳۵۵ھ تھانہ بھون

۲۸ء کیا معنی ۲۹ء بلکہ اس کے بھی بہت بعد تک طرفین میں باوجود اختلاف مسلک کے جو ارتباط قائم رہا، اس کے نمونے ان اوراق میں بار بار گذر چکے ہیں لیکن اب ۳۶ء و ۳۷ء تھا۔ اور اب جو دیوار اختلاف کی اُٹھی، وہ مُستقل تھی، اور مجھ نادان کے علم میں تو آخر تک قائم رہی ——— یہ تذکرہ ناخوشگوار و تکلیف دہ جتنا بھی ہو بہرحال حقیقت نگاری کے لحاظ سے تھا ضروری ہی۔

(۹۵)

جُملۂ معترضہ، اہم سہی، بہرحال ختم ہوا۔ اب پھر اُسی سلسلۂ مراسلات کی طرف واپس آجائیے ——— ۲ مئی کا نیاز نامہ ایک خواب نامہ ہے۔ اب وہ ملاحظہ ہو۔ پہلے اصل اور پھر اُس کا جواب:۔

"ایک عزیز دوست کا خط ملاحظۂ عالی کے لئے ارسال ہے[1]۔

ایک اپنا بھی خواب پرسوں شب کا دیکھا ہوا عرض کر دینا چاہتا ہوں[2]۔ اپنے ایک مرحوم دیندار دوست کو اچھی حالت میں دیکھا۔ بڑھ کر اُن سے پُوچھا کہ آپ کی حالت تو خود ہی کہے دیتی ہے کہ بہت اچھی گذری، یہ بتائیے کہ عام طور پر کیا گذرتی ہے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے چلتے جاتے تھے، اور وہاں کے متعلق ہر طرح کی تسلّی دلاسے دیتے جاتے تھے۔

---

[1] اب بالکل ذہن میں نہیں کہ خط کن صاحب کا اور کس مضمون کا تھا۔ حضرت نے یقیناً اِس کے متعلق اُسی خط پر لکھ دیا ہوگا، اور میں نے اُسے بجنسہٖ اُن مکتوب نگار کے پاس بھیج دیا ہوگا۔

خلاصہ اُن کی گفتگو کا یہ تھا کہ مومن کو کچھ ڈر نہیں۔ خطرے کے مقامات آتے ضرور ہیں، لیکن بس آتے ہی گذر جاتے ہیں۔ شدائد صرف کافروں کے لئے ہیں[2]! یہ باتیں کرتے ہوئے شکل و صورت تو اُن ہی دوست کی سی ہے، لیکن معلوم ایسا ہونے لگا کہ گفتگو ایک دوسرے مرحوم فرما رہے ہیں، جنھیں میں دوست نہیں بلکہ بہت بڑا بزرگ سمجھتا تھا[3]۔ خیر۔ باتیں کرتے کرتے ایک خاص مقام تک وہ مجھے لے گئے اور بولے کہ یہی سراپردۂ احدیت ہے[4]۔ دیدار تو ابھی ہم لوگوں کو نصیب ہوا نہیں، البتہ آواز یہیں سے آتی ہے[5]۔ میں نے دیکھا تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ برف کی شفاف بڑی بڑی چٹانیں ہیں، اور ایک بالکل ہُو کا عالم ہے۔ معاً ایسا محسوس ہوا کہ آپ وہاں تشریف فرما ہیں۔ شکل دیکھنے میں نہ آئی، لیکن تسکین قلب کو بہت زائد رہی[6]۔ خواب اوّل شب میں دیکھا تھا۔ اُس وقت خوب تفصیل سے یاد تھا، اور طبیعت بہت ہی بشاش تھی۔ جی میں آیا کہ اُسی وقت اُٹھ کر قلمبند کر لوں مگر پھر یہ خیال غالب آ گیا کہ خوب یاد ہے، بھولنے والا نہیں ہے۔ جب صبح سو کر اُٹھا تو بیشتر حصہ بھول چکا تھا۔ اتنا بھی حافظہ پر خوب زور ڈالنے کے بعد لکھ سکا ہوں۔ بڑا افسوس رہا۔ اسی شب میں نے سونے سے قبل طبیعت بہت ہی افسردہ تھی، کچھ تو افکار خانگی کی بنا پر اور کچھ اضاعت عمر پر۔"

جوابات نمبروار ملاحظہ ہوں:-

(۱) "بے تکلف جواب تو یہ ہے کہ

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم ۔۔۔ چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

اور تکلف کا جواب ہر جزو کے ساتھ معروض ہے۔

(۲) بالکل صحیح اور صریح ہے۔ اہل ایمان کی غالب حالات میں نجات و مغفرت ہی ہو جاتی ہے کسی کسی پر خفیف عقوبت بھی ہوتی ہے۔ جس سے زیادہ مقصود تطہیر ہے۔

(۳) شاید یہ اشارہ ہو کہ اہل برزخ کے درجات میں ترقی ہوتی رہتی ہے۔

(۴) شاید مراد ہو کہ توحید کی برکت سے حجاب قریب تک رسائی ہوتی ہے۔

(۵) یہ واقعہ ہے کہ دیدار کی دولت تو آخرت میں موعود ہے، اس وقت وراء حجاب کلام ہوسکتا ہے۔ وفیہ قال الشیرازی ؎

کس نہ دانست کہ منزل گہ آں یار کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

(۶) حدیث میں ہے۔ اللّٰھم اغسل خطایای بماء الثلج والبرد یہ تمثل ہے اعمال مامور بہا کا، جس سے راحت ہی راحت ہے جو کیفیات نفسانیہ سے منزّہ ہے، محمودہ سے بھی۔ الحمد للہ آپ نے اِس نا اہل کو وہاں دیکھا۔ شاید بشارت ہو صحتِ طریق کی۔ باقی مجھ کو زیادہ مناسبت نہیں۔

مولانا جن علوم اور جن مسائل سے اپنی زیادہ مناسبت نہ ہونا بتاتے رہتے تھے، اُس میں بھی اُن کی دیدہ وری کا یہ عالم رہتا تھا، پھر جن علوم سے اُنھیں واقعی مناسبت تھی، مثلاً تفسیر و فقہ و سلوک و کلام، اُن میں اُن کے پایہ و مرتبہ کا کہنا ہی کیا!

آخر مئی کے بعد پھر مکتوب ایک دم سے وسط اگست دستیاب ہوا۔ اِس مکتوب میں اُس درس تفسیر قرآنی کا سلسلہ تو نہیں، البتہ اور کچھ چیزیں کام کی ہیں۔ تاریخ اِس پر ۱۷ اگست کی پڑی ہے:۔

م: مدت سے دریافت خیریت کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ ہر طرح عافیت ہی ہو گی۔

ا۔ الحمد للہ بہ دعائے احباب بہ عافیت ہوں۔

م۔ ایک روز مشکوٰۃ کے مطالعہ میں باب النکاح والخطبہ کی فصل ثانی پر نظر پڑی۔ آیت قرآنی، بہ سلسلۂ خطبۂ نکاح، اِن الفاظ میں منقول ملی۔ یٰایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ الذی تساءلون بہ والارحام ان اللہ کان علیکم رقیبا لیکن آیت اِن الفاظ کے ساتھ تو قرآن مجید میں ہے نہیں۔ سورۃ النساء کی مشہور آیت میں

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا نہیں بلکہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ ہے۔ پھر اس کے متصل اور جو الفاظ ہیں[۱]۔ وہ روایت مشکوٰۃ میں غیر منقول ہیں۔ مزید حیرت اِس پر ہے کہ اصحاب سنن سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں، اور کسی شارح کے ہاں اس سے تعرض نہ ملا، حالانکہ یہ حضرات تو بڑے محقق محتاط گذرے ہیں۔

ا۔ ماشاءاللہ۔ نہایت ضروری سوال ہے جس کی طرف کبھی التفات نہیں ہوا۔ جزاکم اللہ کہ آپ نے متوجہ کیا۔ یہاں کتابیں کم ہیں مگر اختیاطاً مظاہر حق میں دیکھا تو انھوں نے بر مزع اِس سے تعرض کیا ہے اِس عبارت سے "اور دوسری آیت میں جو لفظ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا سب مشکوٰۃ کے نسخوں میں ہے، شاید ابن مسعودؓ کے مصحف میں (جو کہ اِس حدیث کے راوی ہیں) اِسی طرح ہوگا ورنہ اِس مصحف مجید میں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بدون یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ہے"

م۔ ایک فقہی مسئلہ بھی دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک غیر شادی شدہ عزیزہ سوڈیڑھ سو کے زیور کی مالک ہیں لیکن کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتیں۔ معمولی خورونوش ایک دُور کے عزیز کے ذمہ ہے، باقی دُوسری ضروریات زندگی کے لئے بڑی تنگی رہتی ہے۔ اور اسی سے وہ اپنے زیور کی بھی زکوٰۃ نہیں نکال پاتیں۔ ان عزیزہ کو زکوٰۃ دینے سے آیا زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

الجواب۔ نہیں، اس لئے کہ وہ صاحب نصاب ہیں۔

ایک صورت اُن کی امداد کی ہوسکتی ہے کہ کوئی مسکین مستحق زکوٰۃ کسی سے قرض وغیرہ لے کر بہ قدر زکوٰۃ واجب اُن کو ہدیۃً دیدے۔ پھر وہ اس کو اپنی زکوٰۃ میں دیدیں خواہ اسی مسکین کو

---

[۱] یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔

[۲] ترجمہ اُردو و شرح مشکوٰۃ۔ چار جلدوں میں۔

خواہ اور کسی کو۔ اگر کسی اور کو دیں تو پھر کوئی غنی اپنی زکوٰۃ اس مسکین کو دیدے کہ وہ اپنا قرض ادا کر دے۔"

دُوسرا مکتوب اسی اگست ہی کی ۱۳ر تاریخ کا ہے۔ حسب معمول دینیات کا ایک کشکول :-

م :۔ تفسیر بیان القرآن ملاحظہ ہو :-

جلد ۹ - ص ۹ - بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ کا ترجمہ نہیں ملا۔ بعض مفسرین نے ضمیر کا مرجع حق تعالیٰ کو رکھا ہے۔

ا ۔ اب بنا دیا "اللہ تعالیٰ کے ساتھ" جیسا کہ بعض مفسرین سے سوال میں نقل کیا گیا ہے۔

م ۔ جلد ۹ - ص ۹ - فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ترجمہ میں "خدا تعالیٰ کے پاس" کے الفاظ اصل سے زاید معلوم ہوئے۔

ا ۔ واقعی ۔ چنانچہ مدرسہ کے نسخہ میں ترجمہ و تفسیر میں کٹے ہوئے ہیں۔

م ۔ جلد ۹ - ص ۲۳ ۱۲ - إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا الْغُدُوًّا مِنَ الْحَمِيمِ ۔ عَلَيْهَا کا ترجمہ نہ ملا۔

ا ۔ اب ترجمہ و تفسیر میں اس طرح بنا دیا "اُن کو اُس پر"

م :۔ پچھلے عریضہ میں عرض کیا تھا کہ مشکوٰۃ (باب خطبۃ النکاح) میں سورۃ النساء کی پہلی آیت قرآنی کسی قدر غیر قرآنی لفظوں میں بحوالۂ سنن اربعہ، نقل ہوئی ہے۔ اس سے ذہن کو قدرۃً تشویش تھی کہ اکابر محدثین سے الفاظ قرآنی میں یہ سہو و تسامح کیونکر ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اصل سنن کا مطالعہ کیا۔ سو ابو داؤد میں تو بیشک وہی الفاظ منقول ہیں۔ لیکن ترمذی و ابن ماجہ میں ایسا نہیں، بلکہ آیت کا جزو اول یکسر حذف کر کے اسے شروع ہی یہیں سے کیا ہے، اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ الخ اس سے کم از کم اِن دو اصحاب سنن کی طرف سے تو تساہل کا شبہہ رفع ہو گیا۔

ا ۔ میں نے بھی دیکھا۔ بہت دل خوش ہوا۔ ایک توجیہ اور ذہن میں آئی تھی، کہ آیت کا نقل کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ آیت سے اقتباس مقصود ہو اور اقتباس میں بہت توسع ہے۔

م۔ ایک بات اور اِس وقت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن کے مسودت کا ایک بڑا ذخیرہ کٹا پٹا ہوا جمع ہوگیا ہے، جواب بیکار رہی ہے۔ ایک پوری الماری اِس سے لبریز ہے۔ عرض یہ ہے کہ اِن کاغذات کو اب کیا کروں؟

ا۔ دفن اولیٰ ہے۔

م۔ ایک خیال یہ دل میں آتا ہے کہ سردست انھیں محفوظ رہنے دوں اور وصیت یہ کر جاؤں کہ میرے غسلِ میت کے لئے پانی ان ہی کاغذات کو جلا کر گرم کیا جائے۔ پھر سوءِ ادب کا خیال مانع آتا ہے۔

ا۔ بیشک سوءِ ادب اور ابتذال ہے۔

م۔ امام بخاریؒ سے متعلق یہ روایت پڑھنے میں آئی ہے کہ آپ کے غسل میں آپ کے حسبِ وصیت آپ کے قلم کے تراشے پانی میں ڈال دیئے گئے تھے۔

ا۔ اگر یہ منقول ہو تو اِس پر اِلقاء کا قیاس مع الفارق ہے۔

م۔ بہرحال اِسی قسم کے کسی مصرف میں لانے کا دِل چاہتا ہے۔ اب آگے جیسا ارشاد ہو۔

ا۔ اُوپر عرض کرچکا ہوں۔"

(۹۶)

شروع اکتوبر کے لئے تھانہ بھون کی حاضری کا پروگرام تھا۔ اور اب کی حاضری ایک طویل عرصہ کے بعد ہو رہی تھی۔ اِس طرح اطلاع ناموں یا اجازت ناموں کے لئے عموماً جوابی کارڈ ہی استعمال کرتا تھا۔ اب کی حسنِ اتفاق سے لفافہ بھیجا (اور اب کی سفر ذرا زیادہ اہتمام چاہتا بھی تھا) جو محفوظ رہ گیا۔ اور اس سے اپنے الفاظ اور اُدھر سے حضرت کا جواب دونوں مل گئے۔ اِس عریضہ پر تاریخ ۲۶ ستمبر کی ہے:۔

م: سال بھر بعد اب پھر حاضری کا قصد ہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ سہولت و راحت سے ملادے۔

م۔ گھر میں بھی آپ کی ہمراہ چلنے پر اصرار ہے۔

ا۔ گھر میں بہت خوش ہوئیں اور نہایت اشتیاق کے لہجہ میں کہا کہ بہت ہی دنوں میں آ رہی ہیں۔

م۔ ان کے علاوہ ایک چھوٹی لڑکی ہوگی۔

ا۔ بچیاں خوش ہوئیں۔

م۔ اور ایک مُلازم۔

ا۔ میں خوش ہوا کہ آپ کو راحت دے گا۔

م۔ یہ ساڑھے تین آدمیوں کا قافلہ انشاء اللہ ۵ اکتوبر سہ شنبہ کی دوپہر کو تھانہ بھون حاضر ہوگا۔

ا۔ خدا تعالیٰ خیریت سے ملا دے۔

م۔ اسٹیشن پر اگر ایک ڈولی کا انتظام فرما دیا جائے تو زہے کرم۔

ا۔ ضرور ایسا ہی ہوگا۔[1]

م۔ واپسی کی اجازت چھٹے دن یعنی جمعہ کے سہ پہر کو طلب کروں گا۔

ا۔ فاترک ما اریدلما ترید۔

م۔ مکان جو بھی مناسب سمجھا جائے مرحمت ہو، مجھ سے دریافت فرمانے کی حاجت نہیں۔

ا۔ گھر میں یہ رائے قرار پائی کہ چار دن کے لئے جو گھر کیا ہوگا۔ اپنے ہی گھر میں ٹھہرایا جائے گا۔ بالاخانہ کا ایک حصہ ایسا ہے کہ اس کا راستہ دہلیز میں ہو کر ہے وہاں سے

---

[1] بعد کو خدا معلوم کیا اسباب پیش آئے (غالباً یہی ہوا ہوگا کہ لکھنؤ والی گاڑی سہارنپور اتنی لیٹ پہنچی ہوگی کہ وہاں سے تھانہ بھون کی ٹرین چھوٹ چکی ہوگی) کہ پہونچنا دوپہر کو نہیں، بلکہ گیارہ بجے شب کو ہوا۔ ڈولی مع حضرت کے ایک خادم کے اُس وقت بھی موجود ملی۔

آپ کی آمد و رفت بے تکلف ہو سکتی ہے[1]

میرا حاشیہ اتنا اور ہے کہ آنے پر جو آپ کی رائے ہوگی ویسا انتظام ہو جائے گا۔

م۔ آپ کی آدمی کئی ہیں۔ اِتنوں کی مہمانداری کا بار ڈالنا مجھے طبعاً گراں گذر رہا ہے۔ اِس لئے کھانے کے بہ طور خود انتظام کی اجازت مرحمت ہو۔

ا۔ صلاح ما ہمہ آنست کان صلاح شماست[2]

بڑی لڑکی کی شادی عنقریب ہی ہونے والی تھی۔ اور گھر میں جو اس سفر میں ساتھ چلیں، اِس سے اُن کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حضرت سے دُعائے برکت کرائی جائے۔ اور گشایش رزق کی بھی، کہ زیور وغیرہ کا انتظام کسی مناسب حد تک تو ہو جائے۔ خیر وُہ بہت خوش خوش رہیں، اور حضرت نے ان کی خاطر خواہ دُعائیں کر دیں ——— چار دن کی بسا طہی کیا ہے۔ ہم لوگ جب لوٹے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی خزانہ کما کر ساتھ لائے ہیں۔ اور یہ احساس اب کی ہی دفعہ نہیں۔ بلا استثناء ہر حاضری تھانہ بھون سے واپسی میں ہوتا رہتا۔

شادی بحمداللہ دلخواہ طریقہ پر ہوگئی۔ اُس کے کچھ روز بعد ذیل کا عریضہ لکھا ——— علاوہ اِس اطلاع دہی کے ایک مستقل تفسیری مذاکرہ۔ خط پر تاریخ ۸ر نومبر ۳۷ء (مطابق ۳ر رمضان ۵۶ھ) پڑی ہے۔

م۔ لڑکی کا عقد بحمداللہ ۱۱ر شعبان کو ہو گیا تھا۔

ا۔ مبارک۔

م۔ ایجاب و قبول حاجی شاہ محمد شفیع صاحب بجنوری نے کرایا۔

ا۔ دُوسری مبارک۔

م۔ خدمت والا میں عرض کرنے کی نوبت آج جا کر آرہی ہے۔

---

[1] گھر میں تو یعنی حضرت ہی کے مکان میں اُتریں، اور میں مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر۔
[2] لیکن واقعۃً یہ نہ ہوا۔ مہمانداری مولانا ہی فرماتے رہے۔

ا۔ کیا منشا تھا۔

م۔ ذرا حسنِ معاشرت کی فرمائش۔

ا۔ دل و جان سے۔

م۔ بیان القرآن۔ جلد ۱۱۔ ص ۱۹۔ ووقٰهم عذاب الجحيم کا ترجمہ رہ گیا۔

ا۔ اب لکھ دیا۔

م۔ اسی صفحہ پر وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ زَوَّجْنٰهُمْ کا ترجمہ "ہم بیاہ کر دیں گے" درج ہے۔ شاہ صاحب وغیرہ نے بھی یہی کیا ہے۔ لیکن اہلِ لغت نے یہاں تصریح "تزویج" کے معنی قِران یا ملانے کے قرار دیئے ہیں نہ کہ نکاح متعارف کے۔ چند عبارتیں حاضر ہیں۔

قاموس۔ زَوَّجْنَاهُمْ بحورٍ عين اے قَرَنّاهم۔

مُفرداتِ راغب۔ اے قرنّاهم بهن ولم يجئ في القرآن زوجناهم حورًا كما يقال زوجته امرأة تنبيهًا ان ذٰلك لا يكون على حسب المتعارف فيما بيننا من المناكحة۔

لسان العرب۔ قال الفراء۔ زوج الشئ بالشئ وزوّجه اليه قرنه وفي التنزيل وزوجنٰهم بحورٍ عين اے قرنّاهم۔

تاج العروس۔ قال شيخنا وفيه الباء الى ان الآية تكون شاهدًا لما كان القرآن لان المراد منها القران لا التزويج المعروف لانه لا تزويج في الجنة۔ وقيل قرنت باعمالها وليس في الجنة تزويج ولذلك ادخل الباء في قوله وزوّجناهم بحورٍ عين۔

ا۔ واقعی اِن عبارات کا مقتضا یہی ہے جو آپ نے لکھا۔ لیکن مختصر تتبع سے مشہور ترجمہ کی بھی اصل ملی۔ في تفسير الجلالين زوّجناهم من التزويج او قرنّا في الكمالين ولذلك عدّي بالباء اما التزويج فانما يتعدى بنفسه لا بالباء وانه لا عقد هنالك ومن فسره بالتزويج قال الباء زائدة على انه نقل عن الاخفش تعديته بالباء ايضًا وفي روح المعاني بعد نقل القول بانه متعد بنفسه وفيه بحث فان الاخفش جوّز الباء فيه فيقال زوّجته بامرأة فتزوّج

بها وازو شنوءة يعدونه بالباء ايضاً. وفي القاموس رقبل العبارة المنقولة في السوال) زوجته
امرأة قلت واليه اشير بقولي في الحاشية وهذا احد القولين واما نفي التزويج فلا دليل عليه
سوى ان الجنة ليست دار التكليف وقد ذكرت جوابه في تفسيري تحت هذه الآية فليراجع؟

۱۹۳۸ء

(۹۷)

نمبر ۸۷، ۸۸، ۸۹ پر ایک بار پھر نظر کر لی جائے۔ تکفیر مولانا فراہی والی بحث مہینوں گذر جانے پر بھی مُلک میں چل رہی تھی۔ آخر جنوری ۳۸ء میں، ہفت روزہ اہلحدیث (امرتسر) میں مولانا فراہی کی حمایت میں ایک مضمون نکلا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مولانا نے اگر بعض الفاظ قرآنی کو غیر مترتب لکھ دیا تو کیا ہوا، بہت سے اکابر، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے اِسی طرح کے اقوال منقول ہیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ وُہ تراشہ حضرت کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ ۲۶ رجنوری ۳۸ء کے نیاز نامہ میں ایک ذکر یہی ہے، اور دُوسرا ذِکر اپنے ایک خواب کا ہے۔ جزو اوّل کا جواب بہت ہی مفصّل و مطّول آیا۔ پہلے اصل عریضہ حاضر ہے:-

پرچۂ اہلحدیث کا تراشہ ملفوف خدمت ہے۔ حسب فُرصت اِس مضمون سے متعلق اجمالی رائے عالی سے مطلع فرما دیا جائے۔ محض اپنے اطمینان خاطر کے لئے چاہتا ہوں۔ کِسی اخباری بحث و مباحثہ سے تعلّق نہیں۔

کئی دِن ہوئے خواب میں زیارت ہوئی تھی۔ یہ دیکھا کہ آپ میرے ہاں مہمان تشریف لائے ہیں۔ اور میں انتہائی مسرّت کے ساتھ ساتھ اِس پر فخر بھی کر رہا ہوں کہ برسوں کے معمول عدم سفر میں میرے لئے استثناء فرما دیا گیا۔ پھر دیکھا کہ آپ واپس

تشریف لے گئے ہیں، اور معاً بعد حکیم مصطفیٰ صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ اُن سے بڑے فخر کے ساتھ حضرت کی تشریف آوری بیان کر کے اُن سے وادہ مبارک باد کی توقع کر رہا ہوں۔ کچھ چپ سے ہو گئے۔ اِس پر ذرا گرانی محسوس کر رہا ہوں۔

جواب جزو اوّل کا ملاحظہ ہو:۔

الجواب قال اللہ تعالیٰ فی الکهف انزل علی عبدہ الکتب ولم یجعل لہ عوجا۔

عوج مقابل ہے استقامت کا۔ کسی شے کی استقامت یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا اختلال نہ ہو۔ پس عوج عام ہوگا ہر اختلال کو، اور یہ نکرہ ہے تحت نفی کے۔ پس ہر قسم کا عوج منفی ہوا۔ اِسی بنا پر رُوح المعانی میں اِس کی یہ تفسیر کی۔ لم شیئا من العوج باختلال اللفظ من جھۃ الاعراب ومخالفۃ الفصاحۃ وتناقض المعنی وکونہ متنعلا علی ما لیس بحق او داعیا لغیر اللہ وقال تعالی وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

اِن نصوص قطعیہ سے قرآن مجید کا ہر قسم کے نقص سے منزّہ ہونا اور اس تنزیہ میں اس کا معجز ہونا مصرّح ہے۔ نیز اس پر تمام اُمّت کا ایسا اجماع ہے کہ اِس عقیدہ کو اِس درجہ ضروریات دین سے سمجھا جاتا ہے کہ اس کے انکار پر بالاتفاق کُفر کا حکم کیا جاتا ہے۔ اور اہل ایمان تو بجائے خود رہے قرآن کے اِس اعجازی کمال کا اقرار ہمیشہ کُفّار کو بھی رہا۔ اگر نعوذ باللہ اس میں شائبہ بھی کسی قسم کے نقص کا ہوتا تو کیا وہ خاموش رہتے۔ اور جس طرح اس کے اعجاز پر یہ نصوص دلیل عقلی قطعی ہیں ثبوتاً بھی دلالۃً بھی۔ اور قاعدہ متفق علیہ بین اہل ملت و بین اہل عقل ہے کہ ایسے قطعی کا معارض ایسا ہی قطعی تو ہو نہیں سکتا لاستلزامہ الجمع بین النقیضین اگر معارض ظنی ہو تو اگر معصوم سے منقول ہو تو ثبوت کا انکار رواۃ کی غلطی سے واجب ہے اور دلالۃ کی تاویل واجب ہے اور اگر غیر معصوم سے ہو اگر وہ محل حُسن ظن نہیں تو رد وابطال واجب اور اگر محل حسن ظن ہے تو سند میں جرح یا تاویل مستحسن ہے اِس مقدمہ کی تمہید کے بعد جتنی روایات واقوال موہم معارض پائے جائیں۔ یا تو وہ معارض ہی نہیں جیسے بعض کلمات کا اصول کے

خلاف ہونا، کیونکہ درحقیقت وہ مطلق اصول کے خلاف نہیں صرف اصول مشہورہ کے خلاف ہیں، تو اصول کا انحصار مشہورہ میں یہ خود غلط ہے۔ اکثر تو ان کے مقابل دوسرے اصول بھی پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض مطلقاً اصول کے خلاف ہونا بھی ثابت ہو جائے اگرچہ یہ فرض تقریباً باطل ہے لیکن اس کو فرض کر لینے کے بعد بھی اصول کی تدوین کو ناقص کہا جائے گا۔ اصول کی مخالفت سے ایراد نہ کیا جائے گا کیونکہ اصول خود فصحاء اہل لسان کے کلام کے تتبع سے جمع کئے جاتے ہیں، فصحاء اہل لسان ان کے تابع نہیں ہوتے، اور اس کے تسلیم میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ جیسے اصول فقہ مجتہدین کے فروع سے مستنبط ہوتے ہیں۔ مجتہدین اپنے فروع کو اُن پر مبنی نہیں کرتے۔ یا اگر معارض ہیں تو واجب الرد یا ماؤل۔

اس تحقیق کلی سے تمام جزئیات کا فیصلہ ہوتا ہے۔ بعض جزئیات بطور مثال کے ذکر بھی کی جاتی ہیں۔ مثلاً فواصل کی رعایت سے اصول کی مخالفت، یہ محض بعض اصول کی مخالفت ہے، مطلق اصول کی مخالفت نہیں۔ کیونکہ اس رعایت کی تقدیم یہ بھی ایک صحیح اصل ہے۔ کما صرح بہ فی الاتقان نوع ۵۹ فصل ۲۔ اور یہ اُس وقت ہے جب صرف یہی رعایت موجب ہو۔ مگر خود اسی میں کلام ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار مواقع ایسے ہیں کہ فواصل میں سجع کا سلسلہ شروع ہو کر ایک آیت میں سلسلہ ٹوٹ گیا اور اس کے بعد پھر عود کر آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف رعایت فواصل کی اس مخالفت کی داعی نہیں بلکہ اس میں اور بھی اسباب غامض ہوتے ہیں چنانچہ اتقان کی نوع تاسع و خمسون میں ایسے امثلہ کے بعد بہ عنوان تنبیہ ابن الصائغ کا قول نقل کیا ہے لایمتنع فی توجیہ الخروج عن الاصل فی الآیات المذکورۃ امور اخری مع وجہ المناسبۃ فان القرآن العظیم کما جاء فی الاثر لا تنقضی عجائبہ اور مثلاً ابن عباسؓ سے ایک ایسی ہی روایت منقول ہے اس کی نسبت ابو حیان کہتے ہیں۔ روی ابن عباس انہ قال ذالک فھو طاعن فی الاسلام ملحد فی الدین وابن عباس بری من ذالک القول کذا فی روح المعانی تحت قولہ تعالیٰ حتی تستانسوا الخ اور مثلاً ایک ایسی ہی

روایت کے متعلق روح المعانی تحت آیۃ افلم یایئس الذین آمنوا کہا ہے

اما قول من قال انما کتبہ الکاتب وھو ناعس فسوی اسنان السین فھو قول زندیق بل ملحد علی ما فی البحر وعلیہ فروایۃ ذالک کما فی الدر المنثور عن ابن عباس غیر صحیحۃ اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اتقان نوع سادس وثلثون کی فصل سوال عاشر کے جواب میں خود ابن عباسؓ سے اس کے خلاف منقول ہے۔ اسی طرح ہر مقام کے متعلق خاص خاص تحقیقات ہیں جن کا ذکر موجب تطویل اور اجمال مطلوب فی السوال کے خلاف ہے۔ اور ایک ان سب روایات کا مشترک جواب ہے جس کو اپنی تفسیر بیان القرآن حاشیہ عربیہ متعلقہ آیۃ حتی تستأنسوا سے نقل کرتا ہوں۔ والذی تقرر عندی فیہ وفی ما ورد من امثالہ علی تقدیر ثبوت ھذہ الروایات ان ھؤلاء رضی اللہ عنھم سمعوا القرأت التی اشتھروھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یسمعوا القرأت الموجودۃ ثم ان تلک القرأت نسخت ولم یبلغھم الجزم بہ اوملوا علیھا وانکروا غیرھا المخالفتہ ظاھر القواعد وعدم سماعہ کما کان ابو الدرداء یقرء والذکر والانثیٰ وکانت عائشۃؓ تقرء خمس رضعات

اور اسماء سور کے تعدد کا اس بحث میں کچھ دخل ہی نہیں۔ ان میں تعارض ہی کیا ہے۔ مگر ان اسماء میں سے کسی کو غیر مناسب کہنا بدعت شنیعہ ہے۔ کیونکہ بعضے اسماء خود احادیث صحیحہ مرفوعہ میں وارد ہیں۔ علیٰ ہٰذا احادیث کے ایسے مقامات کا جواب ہی ان ہی اصول سے معلوم ہو سکتا ہے مثلاً معرورات کی جگہ مازورات فرمانا یہ بھی ایک اصل میں داخل ہے۔ اس اصل کا اصطلاحی نام ہے ازدواج۔ کذا فی القاموس۔

(وتسم ہٰذا المجموع ملاحۃ البیان فی فصاحۃ القرآن)۔ اشرف علی۔ السادس والعشرین من ذی القعدہ ۱۳۵۶ھ۔

اب حضرتؒ کی عمر ۷۷، ۷۸ سال کی تھی۔ اور قویٰ پر پیرانہ سالی کا اثر بھی نمایاں ہونے لگا تھا۔ اس سن وسال میں اتنا مفصل جواب، وہ بھی مراجعت کتب کے بعد لکھنے میں ظاہر ہے کہ

کتنا تعب برداشت کرنا پڑا ہوگا۔ اِس لئے ذیل کے اِس ضمیمہ پر تعجّب بالکل نہ کیجئے:۔

"اطلاع خاص بنا بر بے تکلفی۔ مدّت سے دماغی کام سے قاصر ہوگیا ہوں۔ اور اکثر ایسی خدمات سے عُذر کر کے دُوسرے اہل علم کا پتہ دے دیتا ہوں۔ چُنانچہ استفتے عموماً واپس ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ کے خط کے جواب میں عُذر کرنے کو جی نہ چاہا۔ چونکہ طبع میں اضمحلال محسوس ہوتا تھا اِس کے نفع کے انتظار میں رہا۔ کل قدرے نشاط معلوم ہوا۔ جواب لکھا مگر تعب اِس قدر ہوا کہ اِس وقت تک دماغ میں درد اور طبیعت میں کسل غیر معمولی موجود ہے۔ اِس تجربہ کے بعد صرف اِس کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی جواب سے تقاعد کا اتّفاق ہو جائے تو اسی عُذر پر محمول فرما لیا جاوے۔ لیکن سوال میں آپ بالکل آزاد ہیں"

خود اس مختصر سی اطلاع کے اندر عمومی اور خصوصی جتنے پہلوؤں کی رعایت ہے یقین ہے کہ خوش فہم ناظرین کی نظر خود اُن تک پہنچ جائے گی ——— اِس کے ساتھ ساتھ ایک اور "ضمیمہ موضحہ" نفس مسئلہ کے متعلق مُفتی صاحب مدرسہ کے قلم سے تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس کا اِس کتاب سے کوئی خاص تعلق نہیں۔

(۹۸)

بڑوں کی بات بڑے ہی سمجھیں۔ اِس ناچیز کی سمجھ میں تو یہ بات اب آتی ہے (لفظ "اب" خیال میں رہے، یعنی ۱۹۴۸ء میں جب کہ یہ کتاب لکھی جا رہی ہے، نہ کہ ۳۷ء و ۳۸ء جب کہ یہ بحث جاری تھی) اور ایک موٹی بات کی طرح بالکل صاف آتی ہے، کہ مفسر فراہی کا مقصد لفظ "غیر انسب" کے لانے سے ہرگز ہرگز کسی قسم کا اعتراض یا قرآن مجید کی منقصت کسی درجہ میں بھی نہ تھا۔ معاذ اللہ، جس کتاب جلیل و عزیز کی خدمت کرنے اور جس کے اُوپر سے اعتراضات دفع کرنے ہی میں اُن کی عُمر گذری تھی، اِس پر وہ اعتراض کا خیال بھی دِل میں لا سکتے تھے؟ اُن کا مقصد تحریر صرف یہ تھا، کہ جس طرح ہر لفظ بجائے خود ایک موزونیت و مُناسبت رکھتا ہے، اور اِس کا خیال رکھنا ادب و انشاء میں ضروری ہے، اُسی طرح عربی فن بلاغت میں قافیہ یا

سجع کی رعایت بھی بہت اہم ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے حسن انشاء کے اُسی مقتضا سے بعض جگہ سجع اتنا نیہ کو لفظی موزونیت پر مقدم رکھا ہے اور قصداً ایسے الفاظ لایا ہے، جو بجائے خود چاہے زیادہ مناسب و موزوں نہ ہوتے، لیکن قاعدہ حسن سجع کو بہرحال پورا کرنے والے تھے۔ اور یہ عربی انشاء و ادب کا عیب نہیں، عین ہُنر ہے۔

لفظ 'غیر انسب' عاشق قرآن و عاشق اسلام مغفور مرحوم ٹھیک اسی مفہوم میں لائے تھے۔ اور وہ بھی اپنے برنج کے مسودہ میں۔ طبع و اشاعت کے لئے جب وہ اپنی یادداشت پر نظر ثانی کرتے تو گمان کیا معنی یقین ہے کہ اس لفظ "غیر انسب" کو بھی مُوہم نقص سمجھ کر ضرور بدل دیتے۔ شاگردوں نے عقیدت کے جوش و غلبہ میں مسودہ کو ہاتھ لگانا گناہ سمجھا۔ اور پھر اس کے بعد سخن پروری تو وہ بلا ہے، جس سے اچھے اچھے باکمالوں اور مخلصوں کا بھی پیچھا نہیں چھوٹتا! ———— خفیف لفظی ترمیم قبول کر لینے سے ساری بحث چشم زدن میں ختم ہو سکتی تھی۔

جملۂ معترضہ اتنا لمبا، سیرت اشرفی سے غیر متعلق سہی، لیکن بہرحال اس بحث کے چھڑ جانے کے بعد لانا تھا ضروری ———— شاید کہ بہت سے پڑھنے والوں کی ذہنی اُلجھن کچھ اس سے دُور ہو جائے۔

اب پھر ایک پیرا گراف چھوڑ، مضمون کا سلسلہ نمبر (۷، ۹) سے ملائیے۔

اتنا مفصّل جواب، یاد ہوگا کہ عریضہ کے صرف جزو اوّل ہی کا ہوا۔ باقی جزو دوم جو خواب سے تعلق رکھتا تھا، وہ تو ابھی رہ ہی گیا۔ وہ اب حاضر ہے:۔

اوّل تو مجھ کو تعبیر سے بالکل مناسبت نہیں۔ دُوسرے خواب خود اپنی ذات میں وجوہ متعددہ کو محتمل ہوتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ میں کئی روز ہوئے آپ کو خود بخود یاد کر رہا تھا اور زیادہ یاد کر رہا تھا۔ ممکن ہے یہ خواب اس کی صورت مثالیہ ہو۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ بعد ذی الحجہ کے چھوٹے گھر میں سے اپنی چھوٹی ہمشیرہ سے ملنے کے لئے بلیا جانے کا خیال کر رہی ہیں۔ کہتی تھیں کہ اگر وقت میں گنجایش ہوئی اور سہولت سے پہنچنا ممکن ہوا تو آپ کی

اہلیہ محترمہ کے یہاں بھی مہمان ہوں گی۔ ممکن ہے یہ خواب اِس کی خیالی شکل ہو واللہ اعلم
اور بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ سب آثار قلبی توجہ اور تعلق کے ہیں جو اسلام میں مطلوب ہے۔"

یہ حضرت کی چھوٹی بیوی صاحبہ کی تشریف آوری کی اطلاع گویا لکل ضمناً اور
ایک تعبیر خواب کے ذیل میں ہوئی، ہم میاں بیوی کے لئے انتہائی نشاط طبع کا باعث
ہوئی۔ اور آنکھوں کے سامنے خیالی سماں ع

امروز شاہ شاہاں مہمان شد است مارا

کا پھرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ قلب پر بڑا اثر انفعال کا تھا کہ خواہ مخواہ تفسیری سوال کر کے
حضرت کے لئے اتنی زحمت کا موجب بنا۔

۵ر فروری کو عریضہ لکھنے بیٹھا، تو کُل یہی دو مضمون سامنے تھے۔ چنانچہ :-
م: سوال کا اتنا مفصّل و مبسوط جواب پا کر شرمندگی ہوئی کہ خواہ مخواہ اِس قدر
تعب کا باعث بنا۔ آیندہ کے لئے میری طرف سے مستقل درخواست ہے کہ میرے کسی سوال پر
ہرگز ایسی مشقت نہ گوارا فرمائی جائے۔ کامل نشاط طبع کے ساتھ بے تکلف جو کچھ بھی افادات
ہو جائیں انشاءاللہ بالکل کافی ہو جائیں گے۔ ہم نیازمندوں کا کام خدمت کرنا اور راحت
پہنچانا ہے نہ کہ کسی حیثیت سے بھی بار خاطر ثابت ہونا۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اِس رعایت پر جزائے خیر عطا فرماوے۔ مَیں تو خود ہی تجویز کر کے اطلاع
کر چکا ہوں۔ آپ اطمینان فرمائیے، انشاءاللہ تعالیٰ ایسا ہی عمل ہوگا۔ خصوص جب کہ آپ سے
کسی قسم کا تکلف نہیں تو اس کے خلاف کا احتمال نہ فرمائیے۔ اِس وقت تک تجربہ سے یہ
محسوس ہوا کہ جس جواب میں مراجعت کتب کی ضرورت نہ پڑے اس کا بے تکلف تحمّل ہو جاتا
ہے۔ اور کتاب دیکھنے میں بعض اوقات تکلف ہوتا ہے۔

م۔ گو یہ بھی ضرور ہے کہ اس طرح خود ایک مستقل تحقیق وجود میں آگئی۔
ا۔ مجھ نادان کی تحقیق ہی کیا۔ البتہ دوسرے محققین کے لئے ایک موقع یاد دہانی کا

نکل آیا۔

م ۔ چھوٹے گھر کے قصد سفر بلیا سے بے پایاں مسرت ہم سب کو ہوئی ۔ اور یہ اشتیاق تمام دن گنے جا رہے ہیں۔ وقت و تاریخ سے جس قدر بہ سہولت ممکن ہو مطلع فرما دیا جائے۔ لڑکیاں اور ان کی والدہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مشتاق ہیں۔ گھر میں امید کرتی ہیں کہ رشیدہ سلمہا بھی ضرور ساتھ ہوں گی۔ یہاں اُترنے اور زیادہ قیام فرمانے کے لئے عرض کرنا تو سوء ادب میں داخل ہے۔ تاہم اپنی طرف سے توجی یہی چاہتا ہے کہ جتنا بھی زیادہ وقت نکل سکے مرحمت فرمایا جائے۔

ا ۔ میں نے ان کو مطلع کر دیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ بقدر امکان سب ارشادات کی رعایت رکھی جائے گی، سب کو مطمئن فرما دیجئے۔"

مہمانداری کی سعادت نصیب میں نہ تھی۔ عید چاند نظر آ جانے کے بعد بھی نہ ہوئی! جب سفر کا موعودہ زمانہ قریب آ گیا، اور کوئی اطلاع اُدھر سے موصول نہ ہوئی، تو مارچ کے تیسرے ہفتہ میں کارڈ لکھ کر خود دریافت کیا۔ جواب میں یہ مایوس کن کارڈ ملا، جس پر مُہر ۲۸ مارچ کی پڑی ہوئی ہے:۔

"الحمد للہ بہ برکت دعائے احباب ہر طرح عافیت سے ہوں۔ چھوٹے گھر میں سے اپنی ہمشیرہ کے ملنے کو سفر کرنے والی تھیں مگر وہ اپریل میں خود آ رہی ہیں اور چار مہینے کے لئے آ رہی ہیں۔ اس لئے سفر ملتوی کر دیا۔ آج وہ اپنے میکہ گئی ہیں ورنہ وہ بھی شاید کچھ لکھواتیں جن کا تاسف اُن پر محسوس بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ پھر کوئی موقع نکال سکتے ہیں۔"

ساری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی، کوئی چیز جیسے ہاتھ میں آ کر نکل گئی۔ ہو ہی کیا سکتا تھا۔ دوسرا خط، ۲۴ اپریل کا لکھا ہوا محض ضابطہ کا ہے۔ شادی شدہ بھتیجی کو آثار حمل کے معلوم ہوئے۔ اس کے لئے تعویذ کی طلب تھی۔ اور تعویذ آ گیا۔

حضرت کی صحت جسمانی مدتوں قابل رشک رہی۔ ایک تو جُثہ قدرۃً قوی تھا۔ کاٹھی اچھی تھی۔ اور پھر حضرت کی احتیاط، خوئے اعتدال اور ہر بدپرہیزی سے پرہیز۔ میلوں

پیدل چلنے اور خوب تیز چلنے کی عادت نتیجۃً ثمرۃً یہ تھا کہ اپنے اصل سن سے ۱۰۔ ۱۵ سال کم معلوم ہوتے تھے۔ اور مدتوں بیماری پاس بھی نہیں پھٹکنے پائی۔ لیکن آخر کہاں تک اور کب تک اب سن ۸۰ سال کا تھا، اور اب ضعف نمایاں ہو چلا تھا۔ وسط ۳۰ء سے حالت مزاج مسلسل رہنے لگی، اور اس کی خبریں مختلف ذرائع سے آتی رہیں۔ سن سن کر ہول بڑھتا رہا۔ اور دعائیں اضطراب و اضطرار کے ساتھ ہونٹوں پر آتی رہیں۔ کسی کسی نے یہ بھی خبر دی کہ علاج کے لئے رائے سفر لکھنؤ کی ہو رہی ہے۔ ۸ / اگست کو عریضہ حسب ذیل لکھا:۔

"حالات مزاج گرامی سن کر قلب پر جو کچھ گذرتی رہتی ہے بس عالم الغیب ہی کو اس کا علم ہے۔

ا۔ بیشک۔

م۔ ایسے وجود گرامی کے بقائے صحت کے لئے مضطرانہ دعا کرنا اس کے حق میں نہیں خود اپنے حق میں دعا کرنا ہے۔

ا۔ آپ کی محبت ہے۔

م۔ مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا اس وقت وہاں موجود ہونا میرے حق میں ایک آیۂ رحمت ہے۔ مجھے اطلاعیں اُن ہی کے ذریعہ سے پہنچتی رہیں۔ یہ عریضہ بڑے تذبذب و تامل کے بعد لکھ رہا ہوں۔ عرصہ تک ڈرتا رہا کہ کہیں یہ طبع والا پر مزید بار کا باعث ہو جائے۔

ا۔ خدانہ کرے۔ کیا آپ کا ایسا تعلق ہے۔ احباب کے متفقہ مشورہ سے لکھنؤ کا سفر معالجہ کے لئے طے ہوا ہے۔ امید ہے کہ پرسوں جمعرات کی شام تک لکھنؤ پہنچ جاؤں گا۔"

(۹۹)

حضرت کی تشریف آوری لکھنؤ میں! ——— دل اس خبر پر کیسے یقین لائے۔ حضرت اور لکھنؤ! کیا صورت اب اس سفر کی رہ گئی تھی۔ حضرت تو اپنے عذرات جسمانی کی بنا پر معمولی اور ہلکا سا سفر دو ایک اسٹیشنوں کا بھی ترک کر چکے تھے، چہ جائیکہ اتنا بڑا سفر!

مژدہ وجاں میں لے آنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن دِل کہاں دل بھر خوش ہو پایا! ذہن سفر کے ساتھ ہی سبب سفر کی طرف بھی تو معاً پہونچ گیا۔ بیماری کی کوئی ایسی ہی مجبورکن نوبت آگئی ہوگی جب تو اتنا بڑا سفر اختیار کیا جا رہا ہے۔ تھانہ بھون اور شہر سہارنپور کی طبّی کوششیں ختم و ناکام ہو چکیں، جب تو لکھنؤ کی ضرورت پڑ رہی ہے! لکھنؤ کے مشہور خاندان جھوائی ٹولہ کے مشہور حاذق طبیب تو خود تھانہ بھون جا کر علاج کر چکے ہیں، یہ صورت کافی اورکارگر نہ ہوئی، جب تو حضرت کے بنفس نفیس لکھنؤ آنے اور طویل قیام کرنے کی ٹھہری!

—— خیالات و اوہام کے اس ہجوم نے مسرت کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع ہی کب دیا! موریر پھیلا کر ناچنے جا ہی رہا تھا کہ نظر اپنے پیروں پر پڑ گئی۔ طبیعت جز بز ہو کر رہ گئی۔ غالب کا مصرعہ یاد پڑ گیا، ع

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں!

حضرت اپنے پروگرام کے مطابق وارد لکھنؤ ہوئے۔ قافلہ اچھا خاصہ ساتھ تھا۔ قیام محلہ مولوی گنج (بھیڑی منڈی) میں حضرت کے مرید باخلاص و اختصاص مولوی محمد حسین کاکوروی[1] مالک انوار بک ڈپو و انوار المطابع کے وسیع مکان میں ہوا۔ ایک حصّہ زنانہ کر دیا گیا۔ ایک مردانہ۔ یہ مکان ہمارے لکھنؤ والے مکان، خاتون منزل (محلہ قبر ماموں بھانجے۔ مرزا حیدر مرزا روڈ) سے کل ۴ فرلانگ کے فاصلہ پر تھا۔ اور لکھنؤ کے دُور دراز فاصلوں کے لحاظ سے یہ چار فرلانگ کیا چیز تھے۔ کہنا چاہیئے کہ ہمارے مکان سے متصل ہی تھا۔ علاج یونانی جھوائی ٹولہ کا شروع ہوا۔ لکھنؤ سے دم بدم خبریں دریاباد پہنچتی رہیں۔ سہ شنبہ ۶ اگست کو حسب ذیل دستی عریضہ دریاباد سے روانہ کیا۔

"خیریت بحمد اللہ دریافت ہوتی رہتی ہے۔ انشاء اللہ پرسوں جمعرات کو نو بجے صبح لکھنؤ پہونچوں گا اور عیادت کی اجازت جس حد تک اور جتنے منٹ تک کے لئے اطبّاء دیں گے۔

---

[1] اب پاکستانی ہیں۔

یہاں تک کہ دُور سے محض زیارت ہی، اُس کو کافی سمجھوں گا۔[1]

ازواج محترم کی آمدِشن کر گھر میں بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہیں۔ مَیں خود تو بعد زیارت پہلی ٹرین سے واپس چلا آؤں گا۔[2] اُنھیں لکھنؤ چھوڑے آؤں گا کہ وہ زیادہ اطمینان کے وقت مل سکیں، گو زیادہ فُرصت ظاہر ہے کہ تیمارداروں کو بھی کہاں حاصل ہو سکتی ہے۔[3]

یہ عریضہ محض اطلاعی ہے۔ جواب طلب نہیں۔ لیکن اِس احتمال کی بنا پر کہ شاید کچھ زبانی یا تحریراً فرمایا جائے، حامل عریضہ کچھ دیر رُکے رہیں گے۔"

جواب لکھنؤ پہنچتے ہی حسب ذیل موجود ملا:۔

"یاد فرمائی و دُعا گوئی کا ممنون ہوں معلوم ہوا یہ رُقعہ آپ کو لکھنؤ پہنچ کر ملے گا، اِس کی رعایت سے جواب عرض کرتا ہوں۔

ع۱ کا جواب یہ ہے کہ حاذق ہے مگر وہ نہیں جو جناب کے ذہن میں ہے، بلکہ حد یہ ہے کہ جب راحت کی مصلحت ہوگی میں از خود عرض کر دوں گا بے تکلف۔

ع۲ اگر ترمیم موجب حرج ہو۔

ع۳ الحمد للہ اتنی تیمارداری کی احتیاج نہیں۔ زیادہ حصّہ فراغ کا ہے۔"

زیارت جتنی دیر کی بھی رہی، حسب معمول دل کو پُوری تسکین دینے والی رہی۔ اور اگلے ہفتہ پھر سفر کی ٹھہری، اور دل بے اختیار رہا کہ اب کی کچھ ہدیہ بھی ضرور پیش کیا جائے۔ لکھنؤ آنا گویا ہمارے جوار وطن میں آنا ہوا، خدمت مہمانی کا حق کسی ادنیٰ درجہ میں تو ادا ہو ——

—— انتظامات حضرت کی اس علالت کے زمانہ میں بھی قابل دید تھے نشست کے اوقات مقرر، ہر آنے والے کے لئے حصول اجازت کی ضرورت۔ چھوٹی بڑی ہر شے میں ایک ٹھاٹھ اور انتظام

—— ۲۳ راگست کو عریضہ اجازت کے لئے لکھا:۔

ع۱ انشاءاللہ ترسوں جمعہ کو پھر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ بہ خوشی ملائے۔

م۔ گاڑی وہی صبح نو بجے پہنچتی ہے۔ اب کی وقت کی ذرا زیادہ گنجایش رکھ کر، یعنی شام تک حاضر رہوں گا۔ ممکن ہے کہ دوسرے وقت پھر شرف نیاز حاصل ہو جائے۔

ا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔

م۔ اب کی دو رفیقوں کے لئے بھی اجازت چاہتا ہوں۔

ا۔ آپ کی رفاقت اُن کے لئے کافی ہے۔

م۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے چرواہے کی طرح تمنّا تو ہم دونوں (میاں بیوی) کی یہ تھی کہ شرف قدوم سے اپنے بیت خانہ کو منوّر کرتے، لیکن یہ تو نصیب ہی میں نہیں۔

ا۔ نصیب تو مشترک ہے۔ میں بھی یہی حسرت کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے دِل کو سمجھاتا ہوں کہ جب تجھ کو تحمّل نہیں تو اِس نصیب پر راضی رہنا چاہیئے۔

م۔ اِس لئے وہیں اگر کچھ تدرے قلیل ہدیا مثلاً انڈے یا گھی کی شکل میں پیش ہوتے رہیں تو از راہ کرم انھیں شرفِ قبول سے محروم نہ رکھا جائے۔

ا۔ تبرک ہونے کی حیثیت سے خود ہی مانگ لینا عجب نہ تھا۔ اب تو بے مانگے ملتا ہے؛

مریضوں کی نازک مزاجی اور چڑچڑاپن مشہور و مشاہد ہے۔ طبیبوں سے مختلف غذاؤں کی فرمایشیں عام ہیں۔ اور پھر اپنی طرف سے تجویزوں کی تو گنتی ہی نہیں رہتی۔ آنے جانے والے جو ہوتے ہیں اُن میں کے مخلص و تجربہ کار اپنی اپنی فہم و بصیرت کے مطابق کچھ مشورے ضرور دے جاتے ہیں۔ یہاں آنے والوں کی کیا کمی تھی۔ اچھے اچھے طبیب اور ڈاکٹر بھی حاضری دینے، زیارت کرنے آتے۔ اور جو صاحب بھی آتے، اپنے اخلاص ہی کے تقاضہ سے کوئی نہ کوئی دوا یا غذا یا تدبیر بھی بتا جاتے۔ حضرت کی کیفیت اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی۔ آنکھیں نیچی کر کے بڑے نرم و ملائم انداز میں فرما دیتے "جی بہت اچھا۔ اپنے حکیم صاحب سے اِس کا ذکر کر دوں گا۔ آگے وہ جیسا مناسب خیال فرمائیں"؛ اور اپنی نازبرداری تو کسی سے کیا کراتے، اُلٹے خود ہی حکیم صاحب کی نازبرداری کرتے رہتے ——— اپنے کو اُن کے

ہاتھ میں تمام تر دے کر خود مجسم تسلیم و رضا بنے رہتے۔ اور طبیب سے فرمائیشیں کرنے کی جگہ اُن کی چھوٹی بڑی ہر ہدایت کی پوری پیروی کرتے۔ تھانہ بھون چھوڑنے سے حضرت کے معمولات میں جو فرق آرہا تھا، اور جتنا ہرج ہو رہا تھا، بالکل ظاہر ہے۔ اور اس کی بنا پر جتنی بھی عُجلت حضرت کو واپسی وطن کی ہوتی، کم تھی۔ لیکن طبیب کے سامنے اشارۃً بھی یہ ذکر نہ آنے دیتے۔ فرماتے کہ یہ بھی ایک صورت تقاضہ کی اور منصب طبیب میں مداخلت کی ہے ــــ اللہ اللہ! فطرت بشری اور شریعت اسلامی کے کن کن حقائق و دقائق پر نظر حکیم الامّت کی رہتی تھی! کاش کسی صاحب نے حضرت کے کیفیات کو، جو بہ حیثیت مریض کے وارد ہوتے رہتے تھے، ذرا غور کر کے نوٹ کر لیا ہوتا۔ پورا ایک رسالہ آدابِ مریض پر تیار ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ کے لئے نافع، آیندہ نسلوں کے حق میں شمعِ راہ!

(۱۰۰)

صحت خُدا کے فضل سے برابر حاصل ہو رہی تھی، اور ظاہر ہے کہ بلا ضرورت خاص ایک دن کے لئے بھی قیام لکھنؤ کا سوال نہ تھا۔ دریافت کرنا تھا کہ عزم روانگی کب تک ہے تاکہ ایک بار پھر رخصتی سلام کو حاضر ہو لوں ــــ مریض ہونے کے باوجود افادات مجلسی کی گرم بازاری اُسی طرح تھی۔ صبح کی مجلس کہنا چاہیئے کہ خواص تک محدود تھی۔ سہ پہر کی مجلس گویا عام تھی۔ کلمات حکمت و معرفت کی بارش تھانہ بھون ہی کی طرح ہوتی رہتی۔ اِس کا لالچ تو تھا ہی، ادھر مولانا گیلانی کے مکتوب گرامی کے بھی بعض فقرے خدمت ِ اقدس تک پہنچا دینے تھے۔ ۲۰ ستمبر کو ذیل کا عریضہ ڈاک سے روانہ کیا:-

م۔ خیریت مزاج گرامی دوسرے ذرائع سے برابر معلوم ہوتی رہتی ہے۔ الحمد للہ۔

ا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ علیٰ سرورکم بعافیتی۔

م۔ اگر بہ سہولت ممکن ہو کہ تاریخ روانگی سے دو ایک روز قبل مجھے مطلع کر دیا جائے تو غایت کرم سمجھوں گا۔ ایک کارڈ اِسی اطلاع کی غرض سے ملفوف ہے۔

۱- امانت رکھ لیا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کروں گا۔ لفظ کوشش اس لئے عرض کیا کہ حکیم صاحب نے باوجود ایک جماعت کے پوچھنے کے کوئی صاف بات نہیں بتلائی، اور میرا پوچھنا موہم ہے تقاضے کو۔ اگر دو تین روز قبل معلوم ہوگیا فوراً اطلاع عرض کروں گا۔"

شرافت اِس آخری دقیقۂ اخلاق پر، کہ طبیب سے اجازت چاہنا بھی گویا اِس سے تقاضا کرنا ہے، لوٹ لوٹ گئی ہوگی ـــــــ علماء و صوفیہ کو انسانی اخلاق سے محروم اور خشک مزاج سمجھنے والوں نے کاش ایک بار بھی حضرت کی زیارت کرلی ہوتی!

خط ابھی چل رہا ہے:۔

م ۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے ایک تازہ گرامی نامہ کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے تو آج کل آپ سے خوب خوب ملاقاتیں ہوتی ہوں گی، اللہ تعالیٰ اُن کے سایہ کو ملّتِ اسلامیہ کے سر پر دیر تک صحت و سلامتی کے ساتھ قائم رکھے اور اس وقت کے طوفان کے اکیلے ملّاح کو اتنا تو وقفہ دے کہ کم از کم یہ طوفان سر سے[1] ٹل جائے علماء میں افسوس ہے کہ سب اُدھر ہی چلے گئے جدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نہیں ہیں۔ ایک حضرت ہی ہیں جن سے اس جماعت کی آبرو باقی ہے[2] موقع تو کیا ملے گا، لیکن اگر مل جائے تو کسی کی صحت کی دعا، دعا سحر گاہی میں کرنے والے کا سلام پہنچا دیجئے گا۔ یہ سُن کر افسوس ہوا کہ ہمارے مولانا سلیمان ندوی ایسے وقت جاگے جب جگانے والا خود نیند میں تھا۔ خداوند تعالیٰ حضرت کو تازہ قوت کے ساتھ پھر مسند تھانہ بھون پر جلوہ گر فرمائے۔"

۱۔ مولانا کے حُسنِ ظن اور عنایت و محبت کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس غیر واقعی خیال کو واقعی کردے، کلاً او بعضاً کما قال القائل ؎

---

[1] کانگریسی حکومتیں صوبوں میں نئی نئی قائم ہوئی تھیں، اور بعض صوبوں (مثلاً بہار) میں مسلمانوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

[2] مولانا گیلانی کا یہ اندازہ صحیح نہ تھا۔ علماء کی ایک اچھی خاصی جماعت حضرت کے ساتھ بھی تھی۔

مرا از زلفِ تو موئے پسند است　　　ہوس را رہ مدہ بوئے پسند است

مولانا سیّد سلیمان صاحب کی حضرت کی جانب التفات خصوصی اب ادھر تھوڑے دن سے پیدا ہوا تھا۔ مولانا گیلانی کا اشارہ اسی جانب ہے —— طلب صادق نے ماضی کی تلافی بڑی سرعت سے کر دی۔ اور مولانا ندوی کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے "اصحاب الیمین" ہی میں نہیں "مقربین" میں ہونے لگا۔

۱۹۳۹ء

۱۹۳۹ء دیکھتے دیکھتے آگیا۔ مہینہ غالباً فروری کا، ٹھیک یاد نہیں، بہرحال جاڑے ختم ہو رہے ہیں، اور میں تھانہ بھون دو چار روز کے لئے آیا ہوا ہوں۔ قیام اب کی مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر نہیں، بلکہ خانقاہ کے بالائی مہمان خانہ میں ہے۔ ایک روز دوپہر کا وقت ہے۔ صبح کی مجلس دیر ہوئی برخاست ہو چکی ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت صحن مسجد خانقاہ میں حوض کے اُوپر پتھر کے فرش پر دھوپ میں لیٹے ہوئے ہیں۔ میں کوٹھے سے ٹکٹکی لگائے اُسی طرف دیکھ رہا ہوں۔ جسم مبارک پر صرف کرتا ہے، جس سے لاغری پُوری طرح نمایاں ہو رہی ہے۔ اور میرا دِل اندر سے اُبلتا چلا آ رہا ہے، اہا یہ جسم کتنا گھُل چکا ہے، اور اب کب تک ساتھ دے گا! ابھی چند ہی سال اُدھر کی بات ہے کہ گرمیوں کے موسم میں حضرت کرتا اُتارے ہوئے کھڑے تھے۔ ناف سے اُوپر کا جسم کھُلا ہوا۔ اُس وقت ماشاء اللہ جسم کتنا توانا تنومند تھا۔ چند ہی برس کی مدت میں کتنا تغیر ہو گیا! پہچاننا مُشکل! ——— پہلے بار بار یہ سوچا کرتا تھا کہ حضرت کی وفات کسی مرض سے ہو گی کیونکر؟ اور ایسے صحت مجسم و احتیاط مجسم کے لئے اِس کی نوبت ہی کبھی کیسے آنے پائے گی؟ اب قُدرت یہ منظر دکھا رہی ہے۔ اب سوچ یہ ہونے لگا ہے کہ اتنا لاغر و نزار جسم زندہ و سلامت کب تک رہ سکے گا! کیا قُدرت کے کرشمے ہیں، اور کیسی شان حکمت کی اِنقلاب آفرینیاں ہیں۔

دیر تک یہی منظر دیکھتا اور دِل ہی سوچ سوچ کر اندر ہی اندر روتا رہا۔ ضُعف

چونکہ اب پوری طرح نماز میں بھی صاحب فراش ہو کر شرکت فرماتے اور

تیمارداروں سے گفتگو کرتے رہتے تھے پھر یہ بات اور یہ کہ دیکھنا آخری بار کی تھی!

مجھے یقین ہے کہ آپ کی تعزیت میں کتنے ہی ... بھر آئے ہوں گے جب ... تو

بہت ہی مغموم و دل شکستہ۔

۱۱۲

م۔ دوست کی دعوت آپ کی مدت دراز کے بعد تشریف آوری۔ خوش ہوا۔ رنج اور

جو ملال آپ کی ... ہے۔

م۔ آج ایک مدت دراز کے بعد یہ عریضہ دریافت خیریت کے لیے لکھ رہا ہوں۔

ا۔ آپ کبھی یاد نہ آئے۔ اگر کچھ نہ ہوتی۔ مرحبا کہ خود یاد کرتے رہیے جی شرمندہ

جزاکم اللہ تعالیٰ کہ آپ نے میرا انتظار رفع فرما دیا جس سے راحت ہوئی۔

م۔ وجہ تاخیر کچھ تو کاہلی رہی اور کچھ یہ بھی کہ خیریت مزاج والا دوسرے ذرائع سے دریافت ہوتی رہی اور پھر کچھ یہ خیال بھی کہ حضرت کے اوقات پر حتی الامکان بار نہ پڑنے پائے۔

ا۔ یہ سب آپ کی محبت ہے۔

م۔ اب ادھر چند روز ہوئے ایک صاحب سے یہ سن کر دل بے چین ہو گیا کہ مسجد خانقاہ میں پنج وقتہ نماز و امامت کے معمول میں اب فرق آ گیا ہے۔

ا۔ فرق بھی انتہائی کہ میں ایک وقت کی بھی امامت نہیں کرتا۔ اقتدا کی راحت اب مشاہد ہوئی۔

م۔ میرا تو اس تصور ہی سے دل بھر آتا ہے کہ وہ محراب کسی وقت بھی حضرت کی امامت سے خالی ہوتی ہو گی۔

اللہ "بھرنے" اور "خالی ہونے" میں صنعت تقابل بھی پُر لطف ہے۔[۵۱]

---

۵۱ یہ ہیں خشک مزاج و متقشف مولانا اشرف علی!

اِس میں بھی بلاقصد ایک حکمت ودیعت ہے کہ بعض احباب جو قراءت سُننے سے لُطف حاصل کرتے ہیں اُن کو اب اخلاص میسّر ہو گیا کہ محض اصلاح مقصود ہو گئی۔ لُطف کی شرکت بھی خارج ہو گئی۔"

اِسی اپریل میں ایک خاص واقعہ گھر میں حالتِ سفر میں پیش آ چکا تھا۔ اِس کا ایک شرعی پہلو بھی حضرت کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔

م۔ وہ گھر میں سلام عرض کر رہی ہیں۔

ا۔ میرا بھی سلام۔

م۔ ایک خاص مسئلہ بھی اُن کے سلسلہ میں دریافت طلب ہے۔ لکھنؤ سے شام کی گاڑی سے آ رہی تھیں۔ زنانہ انٹر کلاس میں صرف یہی تھیں۔ لکھنؤ سے معاً بعد نماز مغرب گاڑی چلی اور ابھی چند ہی منٹ چلی تھی کہ ایک لمبا تڑنگا مرد ان کے درجہ کے پائدان پر آ گیا، اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا چاہا۔ یہ گھبرائیں اختلاجی اور خفقانی۔ لیکن اللہ نے عین وقت پر اِتنی ہمّت دی، اور انھوں نے بلند آواز سے اُسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

ا۔ یہ قوت ایمانی تھی جو ضُعفِ طبعی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے۔

م۔ اور معاً گاڑی کی زنجیر اپنی پوری قوت سے کھینچنے لگیں۔ گاڑی اگرچہ ڈاک تھی[1] فوراً رُک گئی اور وہ شخص (غالباً مع اپنے ساتھیوں) کود کر اندھیرے میں فرار ہو گیا۔ بیان کرتی ہیں کہ زبان اور ہاتھ تو میرے مشغول تھے۔

ا۔ قوتِ ایمانی سے۔

م۔ لیکن دل برابر دھڑک رہا تھا۔

ا۔ ضُعفِ طبعی سے۔

م۔ اور دل میں یہ ٹھان لی تھی کہ اگر گاڑی کے رُکنے میں دیر ہوئی، اور یہ شخص اندر داخل ہو ہی

[1] کلکتہ پنجاب اکسپریس۔

ہو گیا تو معاً کھڑکی سے کود پڑوں گی۔

ا۔ اپنے منشا کے اعتبار سے جہادِ عظیم تھا۔

م۔ سوال یہ ہے کہ جو خودکشی اِس خاص صورت کے ساتھ ہو، کیا اِس کے لئے بھی اِسی عام خودکشی کا حکم ہے؟

ا۔ الجواب۔ ضعیف بیبیوں کو اُس وقت اکثر حیا وعفت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ توقع ہلاکت سے بہ تقدیرِ وقوع ذم ہلاکت کی طرف التفات بھی نہیں ہوتا۔ اِس لئے ایسی حرکت بہ طریق اضطرار ہوتی ہے۔ نیز ہلاکت یقینی بھی نہیں۔ بہت لوگ اِس طرح کود کر بچ بھی گئے ہیں۔ البتہ چوٹ ضرور لگی ہے سو ایسے غلبہ کے وقت امید ہے کہ معذور ہو گی۔ اِس لئے اس کو خودکشی نہ کہا جائے گا۔ وقریباً من ہذا اجاب اُستاذی مولانا محمد یعقوب حسین سُئل عن النسوۃ اللاتی القین الفسہن فی البیر حین خفن علیٰ عفتہن فی الزمان المعروف بالغدر لکن اذا فات الشرط ذات المشترط۔ یعنی شعور و اختیار کے رہتے ہوئے بہ قدر قدرت مدافعت و مقاومت کرے۔

جواب حسبِ توقع بالکل صحیح و محققانہ تھا۔

۳۹ء کے خطوط خدا معلوم میرے ذخیرہ میں اتنے کم کیوں ہیں؟ کارڈ اور لفافے ملا کر کُل چار ہی نکلے۔ اِتنی کم مراسلت سال بھر میں تو ہو سکتی ہی نہ تھی۔ اب اللہ جانے باقی خط کہاں گم ہو گئے۔ بہرحال اِس کے بعد کا عریضہ ۳؍ستمبر کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا:۔

م۔ شب کو ایک متوحش خواب جناب والا کے متعلق دیکھا کہ جیسے میرے سامنے آپ بہت سخت علیل ہو گئے ہیں۔ گو دماغ پوری طرح کام کر رہا ہے۔ لوگوں میں خبر بدمشہور ہو گئی۔ صبح اُٹھتے ہی پہلی تعبیر بے تکلف ذہن میں یہ آئی کہ خدانخواستہ دین میں کوئی سخت فتنہ برپا ہونے والا اور اُمت کے لئے کوئی سخت ابتلا پیش آنے والا ہے۔ لیکن ابھی یہ عریضہ شروع کرتے وقت خیال یہ آیا کہ شاید مجھ ہی سے کوئی شدید معصیت سرزد ہو چکی ہو یا ہونے والی ہو۔

ا۔ میرے خیال میں بے ساختہ اور تعبیر آئی۔ وہ یہ کہ آج کل حال سے زیادہ مسلمانوں کے مستقبل کو سوچ سوچ کر جس قدر صدمہ و قلق قلب پر ہے اس کو بیان نہیں کر سکتا۔[1] وہ حزن و اغتمال بہ صورت سقم و اعتلال مشاہد ہوا۔ واللہ اعلم باسرارہ۔

م۔ خواب اس لئے میرے لئے اور بھی وحشت ناک ہے کہ اس کے قبل جب آپ کی زیارت نصیب ہوئی تھی ہمیشہ شان جمالی کے ساتھ۔ اور تسکین و تشفی دینے والی۔

ا۔ اُس وقت یہ حوادث سامنے نہ تھے۔ خدمت دین کی امنگ ہوتی تھی اس لئے دوسری صورت نمایاں ہوتی تھی۔

م۔ مزاج والا خدا کرے مع متعلقین بہ خیر و عافیت تام ہو۔

ا۔ بحمد اللہ بہ عافیت ہوں۔"

آپ بیتی کے سلسلہ میں ایک مسئلہ کی کھٹک دل میں مدت سے تھی۔ اب کی عریضہ میں اُسے بھی لکھ ڈالا:۔

م "خیر یہ تو خواب تھا۔ ایک مسئلہ بھی مدت سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا۔ نوبت آج جا کر آرہی ہے خیال یہ رہ رہ کر آتا ہے کہ اپنے قلم سے اپنے حالات زندگی پوست کندہ، من وعن لکھ ڈالوں۔ پھر اگر ہمت ہو تو زندگی ہی میں چھاپ دوں، ورنہ بعد والوں کے لئے چھوڑ دے جاؤں۔ اس میں اپنی بدعقیدگی، بدعملی، معاصی سب ہی کی تصریح ہوگی۔ گو مقصود اس سے انشاء اللہ دوسروں کی اصلاح و عبرت ہی رہے گی لیکن پھر بھی دل ڈرتا ہے کہ حدیث میں تو اظہار فسق و اعلان معصیت کی ممانعت آئی ہے، کہیں اس کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اب جیسا جناب والا کا ارشاد ہو۔

ا۔ الجواب۔ غور کرنے سے اس کے متعلق یہ اجزاء ذہن میں آئے:۔

---

[1] یہ ذکر ۱۹۳۹ء کا ہے۔ اچھا ہوا جو ۴۷ء و ۴۸ء کے اور پھر اُن کے بعد کے قیامت خیز مصایب مدت کے دیکھنے کو حضرت زندہ نہ رہے۔

۱: جن معاصی کے اظہار سے ممانعت ہے مُراد اس سے وہ ہیں جن کو مُرتکب بھی معصیت سمجھتا ہے اُن کا اظہار صورۃً جسارت و وقاحت ہے اِس لئے ممنوع ہے۔

۲: عقائدِ فاسدہ کا اظہار اِس میں داخل نہیں کیونکہ ان کا ارتکاب دین اور حق سمجھ کر کیا تھا اِس لئے وہ علّت اِس میں نہیں۔

۳: پھر معاصی مذکورہ کا اظہار بھی اگر ضرورت دینیہ سے ہو، جیسے مصلح کے سامنے بغرض اصلاح، اِس میں وہ علّت نہیں پائی جاتی اِس لئے وہ ممنوع نہیں۔ جیسے بدن مستور کا کشف موالج کے سامنے جائز ہے اوروں کے سامنے نہیں۔

۴: اور جہاں یہ ضرورت نہ ہو محض اپنے نقص کے اظہار دوسروں کی تحذیر کی مصلحت ہو۔ چونکہ یہ مصلحت عنوانات کُلّیہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے، مثلاً مجھ سے بہت سے معاصی سرزد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، دُوسرے حضرات بھی میرے لئے استغفار کریں، اِس لئے جزئیات کا اظہار جائز نہیں۔

امید ہے کہ جواب کافی ہو گیا ہو۔ اگر کوئی ضروری چیز رہ گئی ہو، پھر سوال کر لیا جائے۔"

مزید سوال کی نوبت اب یاد نہیں پڑتا کہ آئی یا نہیں۔ بہر حال یہ کھٹک تو باقی ہی رہ جاتی ہے کہ اپنے نقص کے اظہار یا دوسروں کی اصلاح و عبرت کے لئے عنوان کلّی یا ذکر اجمال ہر گز ہمیشہ کافی و موثر نہیں ہوتا۔ بہت دفعہ ایک ایک جزئیہ کو کھول کر کہنا پڑتا ہے، جب جا کر مخاطب متاثر ہوتا ہے معصیت جس طرح آہستہ آہستہ دبے پاؤں اور زینہ بہ زینہ آتی ہے اُسی کو کھولنا تو مقصد اصلاح میں مؤثر ہوتا ہے۔

(۱۰۴)

منجھلی لڑکی کا عقد ے راکتوبر کو ہونے والا تھا۔ چاہیئے یہ تھا کہ حضرت کو بہت قبل سے اطلاع دے کر دُعائے خیر و برکت کراتا۔ اِس میں دیر خدا معلوم کیوں ہو گئی۔ ۵ رکو بار ڈ بہر حال لکھ دیا، اور اس میں یہ واقعہ بھی عرض کر دیا کہ گھر میں ناخوش ہو رہی ہیں کہ دُعا کی درخواست تو قبل نکاح

پہنچ جانی چاہیئے تھی۔ حضرت کا جواب ۶ر اکتوبر کا لکھا ہوا حسب ذیل موصول ہوا:۔

"آپ کا کارڈ ۵ر کو لکھا ہوا آج ۶ر کو پہنچ گیا۔ اور عقد ۷ر کو لکھا ہے۔ بہر حال عقد سے پہلے پہنچ گیا۔ دل سے دُعا ہر طرح کی خیر و فلاح کی کرتا ہوں۔ گھر میں کی ناخوشی بھی فضول ہے۔ دُعا تو پہلے ہی ہو گئی گو اطلاع دُعا بعد میں ہوئی۔ مقصود تو پہلی چیز ہے نہ کہ دُوسری **اللھم اصلح واصلح شانھما ووافق بینھما بالخیر والبرکۃ**"

اُسی زمانہ میں غالباً بچیوں میں سے کوئی بیمار بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ طلب دُعا کے کارڈ کے جواب میں صرف ذیل کا مضمون جوابی کارڈ میں ملا:۔

"دل و جان سے دُعا کرتا ہوں۔ **اَللّٰھُمَّ اشفھا۔ اَللّٰھُمَّ عافھا** میں بحمد اللہ ہر طرح خیریت سے ہوں"

سنہ ۱۹۴۰ء

سنہ ۱۹۴۰ء کے شروع مارچ میں پھر تھانہ بھون کا قصد کیا۔ اطلاعی کارڈ کے جواب میں کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا ۲۶ر فروری کو موصول ہوا :۔

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست   کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

اب یہ تو خیال نہیں آتا کہ کب گیا، اور کب واپس آیا۔ اتنا یاد ہے کہ اب کی حضرت کے ضعف و اضمحلال کو دیکھ کر بہت ہی زیادہ مغموم و دلگیر واپس آیا۔ اور یہ منظر تو قیامت کا تھا کہ نماز بجائے حضرت کے کوئی اور صاحب پڑھا رہے ہیں۔ گھر آ کر شدّتِ تاثر میں حضرت کے لئے بہت بہت دُعائیں کیں ——— ۱۱ر مارچ کو یہ عریضہ لکھا، آج تک یاد ہے کہ قلم لکھنے میں مشغول تھا، اور آنکھیں آنسو بہانے میں :۔

" اللہ آپ کی عمر میں اور صحت و قوت میں بہت بہت برکت عطا فرمائے۔ اب کی حاضری تھانہ بھون کے وقت بہت ہی متاثر رہا۔ نماز جماعت کے وقت محراب کو جناب والا سے خالی پا کر دل کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ مسجد سونی معلوم ہوتی تھی۔ جماعت کا لُطف ہی گیا۔ مجلس میں جتنی دیر بیٹھتا، نظر بار بار آپ کی اُنگلیوں پر جمی رہتی کہ اللہ اکبر! دین کی کیسی کیسی خدمات یہی اُنگلیاں انجام دے چکی ہیں۔ بہت ضبط سے کام لیا۔ ہر دفعہ بے اختیار یہی جی چاہتا تھا کہ آپ کے ہاتھ کو لے کر خوب آنکھوں سے ملتا اور ہونٹوں سے لگاتا جاؤں اور دل کھول کر روتا جاؤں محض اس تصوّر سے طبیعت میں ایک کیف پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی شبیہ

مبارک چشمِ تصوّر کے سامنے ہے اور آنکھوں سے آنسو مسلسل رواں ہیں۔

صحت اور درازیٔ عمر کے لئے یُوں تو دُعا بار ہا کی ہے، لیکن ایک روز اسی حالت میں یہ یاد آیا کہ اپنی عُمر کا کچھ حصّہ پیش کر دینا بھی بعض روایات میں آیا ہے۔ اسی وقت اپنے دل کو ٹٹولا تو ایک سال کی مدّت کے لئے اپنے کو بہ خوشی آمادہ پایا۔ اور عقلاً تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک سال کیا معنی، دس بیس سال بھی اگر پیش کر دوں جب بھی کم ہی ہے، اور حق اخلاص ادا کرنے کو بالکل ناکافی۔"

اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی بساط ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب وغیرہ حضرت کے عاشقوں کو دیکھا کرتا تھا کہ چہرۂ مبارک کی طرف برابر نظر جمائے دیکھ رہے ہیں، اور اس سے لُطف حاصل کر رہے ہیں۔ اپنی اتنی ہمّت ہی نہ ہوتی۔ اپنی نظر تو بس حضرت کی اُنگلیوں ہی تک رہتی۔ اور ان ہی کو بے اختیار چُومنے اور آنکھوں سے لگانے کا جی چاہا کرتا ــــــ مدینہ منوّرہ جب حاضری ہوئی تھی، تو مواجہہ مبارک کی طرف جانے کی ہمّت ہی نہ ہوتی۔ ہمیشہ پائیں ہی کی طرف جانا، اور وہیں دُور سے ادب کے ساتھ کچھ عرض معروض کرنے کو جی چاہا کرتا۔

بہر حال اِس عریضہ کا جواب آیا، تو حسب دستور توڑ توڑ کر نمبر وار نہیں، بلکہ ایک مسلسل عبارت ہیں:۔

"سارا خط پڑھا۔ کس کس کلمہ کا کیا جواب دوں۔ بجز اس کے کہ یہ دُعا کروں۔ باقی مجھ میں تو اس کی بھی اہلیت نہیں کہ کسی صالح کا مخاطب بنوں چہ جائیکہ محبوب بنوں۔ تو ایسی حالت میں میرے ساتھ ایسا برتاؤ اِس شعر کا مظہر ہے ؎

اوائے حق محبّت عنایتے ست زدوست   وگرنہ عاشقِ مسکین بہیچ خورسند است

باقی بجز دُعا و طلبِ دُعا کے کیا عرض کروں"

اپنی زبوں حالی اور سیہ کاری کا احساس تو اکثر ہی رہا کرتا تھا، اِس زمانہ میں فزوں اور زیادہ ہو گیا۔ جرح کر کے دیکھا تو اپنے سارے دفتر اعمال میں سفیدی ایک جگہ بھی نظر نہ آئی۔

مولانا حکیم الامت کے مطب کے سوا اور کہاں نصیب ہو سکتا تھا۔ ۲۱ر جون کے عریضہ میں دل کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیا:۔

م۔ مزاج گرامی خدا کرے کہ بالکل بہ عافیت ہو۔

ا۔ احباب کی دعا سے بہ عافیت ہوں۔

م۔ حضرت، اپنے متعلق جب تک بے خیالی میں پڑا رہوں جب تک تو خیر، لیکن غور و فکر کے بعد ایک عجیب اضطراب اور شدید خلجان میں پڑ جاتا ہوں۔ عام عبادات و فرائض کا تو ذکر ہی نہیں کہ وہ تو تمام تر عادت کے ماتحت محض رسم کے طور پر جوں توں ادا ہوتے رہتے ہیں، نہ کوئی تازگی ایمان نصیب ہوتی ہے اور نہ کوئی بیداری تعلق مع اللہ میں پیدا ہوتی ہے۔ خود اُن اعمال پر بھی جنھیں اپنے نزدیک خاص ولولۂ دینی اور حرارت ایمانی کے ماتحت انجام دیا تھا، جب کبھی بعد کو غور کرتا ہوں، مثلاً ملاحدہ کا رد، یا قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر، تو انھیں بھی اخلاص سے معرّیٰ ہی پاتا ہوں، اور اُن کی تہ میں بھی رضائے خالق سے کہیں زیادہ رضائے مخلوق ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بار بار یہ جرح کرتا ہوں کہ اگر کہیں سے بھی قبول اور داد کی توقع نہ رہے، جب بھی ان خدمات کا عزم و حوصلہ باقی رہے گا؟

بار بار دل میں اُلجھن اور حسرت بلکہ یاس تک پیدا ہو جاتی ہے کہ کہیں یہ سب الَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کا مصداق نہ ٹھہر جائے اور میں کہیں کا بھی نہ رہوں؟

جب کبھی جناب والا کے قلم سے ریا وغیرہ کا بیان دیکھ لیتا ہوں تو اُس وقت تسکین ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی تو دھوکا نہیں کہ خواہ مخواہ صالحین کا حال اپنے اوپر منطبق کر رہا ہوں۔ کئی دن سے اس کیفیت کا زور زیادہ ہے، اس لئے بے اختیار اس عرضِ حال پر مجبور ہو گیا۔

ا۔ الجواب۔ کسی ایسے شخص کو طبیب سمجھ کر اپنا مرض بتانا جو خود اپنے کو اُسی مرض میں مبتلا دیکھتا ہو یا سمجھتا ہو گو اس کے الوان کسی قدر مختلف ہوں، اس معنیٰ کہ تو کم مفید ہے کہ

راے العلیل علیل لیکن اِس معنی کو زیادہ مفید ہے کہ ایسا شخص اپنے لئے بہت ہی غوض و فکر واہتمام سے تدبیر تجویز کرے گا، تو دوسرے کو وہ تدبیر بلاتکلف ہاتھ آوے گی۔ اِس وقت اس جاہل کے ماتحت عرض کر رہاں۔

میرے نفس نے مجھ سے بھی یہی شکایت کی۔میں نے جواب دیا کہ ان سب مقدمات کو تسلیم کر کے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ آیا اِس کوتاہی کا تدارک اختیاری ہے یا غیر اختیاری۔ ظاہر ہے کہ اختیاری ہے، ورنہ شکایت اور قلق ہی بے معنی ٹھہرتا ہے۔جب اختیاری ہے تو اب ماضی پر حسرت انفع واہم ہے یا مستقبل میں تدارک۔ سو ظاہر ہے کہ شق ثانی ہی متعین ہے۔بس تو اس کے اہتمام میں مشغول ہونا چاہیئے۔اور شاید کسی کو پریشانی میں یہ وہم ہو کہ کوتاہی کی عمر تو اتنی دراز، اگر تدارک کے لئے اتنا دراز وقت نہ ملا تو تدارک کیسے ہوگا۔حل اس کا یہ ہے کہ تدارک کا کمیت میں تماثل ضروری نہیں، قوت میں تماثل کافی ہے۔اور وہ بھی اختیاری ہے، اور اختیاری کے ساتھ سہل بھی۔اب اِس تدارک کی تعیین باقی رہی اور اس میں کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا کہ عدم اخلاص کا تدارک صرف اخلاص ہے۔پس ماضی پر استغفار کر کے مستقبل میں اخلاص اختیار کیا جاوے جو نہایت سہل تدبیر ہے۔ بلا ضرورت مشقت و تعب میں کیوں پڑا جائے۔ یہ جواب ہو گیا تمام سوالات کا۔اب اگر اخلاص کے متعلق کوئی سوال ہو، تو بے تکلف ظاہر فرمایا جائے، انشاءاللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اس میں سہولت مشاہد ہوگی۔ وفی مثل ہذا قال الحافظ ؎

گفت آسان گیر بر خود کارہا کز روے طبع   سخت می گیرد جہاں بر مردمانِ سخت کوش

وکانہ ترجمۃ لحدیث۔ من شاق شاق اللہ علیہ۔ واللہ اعلم۔

تحدیث بالنعمۃ۔میں نے تو جواب لکھنے کے بعد بتوفیق حق کام شروع کر دیا جو بالکل سہولت سے ہونے لگا، اور چونکہ آپ اس کے واسطہ بنے آپ کے لئے بھی خوب دعا کی تحصیل کی بھی تعدیل کی بھی تکمیل کی بھی تسہیل کی بھی۔ ومن اللہ التوفیق۔"

جواب بجائے خود بالکل کافی بلکہ شافی تھا لیکن اصل مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوا۔ یعنی خود اخلاص ہی کا معیار کیا ہے؟ اور اس کا اطمینان کیسے ہو کہ فلاں عمل مخلصانہ ہے بھی ــــــ دوسرا عریضہ جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ جلد ہی یعنی ۲۸ر جون کو گیا :-

"جواب گرامی جامع بھی تھا اور شافی بھی۔ اب عرض یہ ہے کہ خود اخلاص کا معیار کیا ہے یعنی قلب کو یہ اطمینان کیسے ہو کہ فلاں عمل خالصتہً لوجہ اللہ صادر ہوا ہے۔"

جواب اب کی بھی خوب مفصل آیا ــــــ اور یاد رہے کہ یہ لمبی تحریریں اپنے ہاتھ سے وہ لکھ رہا ہے، جس کی عمر اب اسی سال کی ہو چکی ہے، اور پھر ایسی ایسی تحریریں تنہا میرے ہی نام نہیں، خدا معلوم کتنوں کے نام اس نے اپنے اوپر لازم کر رکھی ہیں!

"جواب کے پسند آنے سے جی خوش ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اخلاص و معیار اخلاص کے متعلق سوال کرنے سے ایک مشہور شعر یاد آگیا ؎

با سایہ ترا نمی پسندم عشق ست و ہزار بدگمانی

انطباق کی تقریر یہ ہے کہ اخلاص کی حقیقت معلوم ہے۔ چنانچہ خود سوال میں بھی اس کو ظاہر کر دیا گیا ہے کہ فلاں عمل خالصاً لوجہ اللہ صادر ہوا ہے۔ پھر وہ حقیقت چونکہ مثل صفات نفس کے ہے جن کا علم حضوری ہوتا ہے، ادنیٰ التفات سے اس کا اثباتاً و یقیناً علم ہو سکتا ہے اس لئے یہ سوال ایسا ہے جیسے کوئی پوچھے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ میرا مسلمان رہنا خالصاً لوجہ اللہ ہے یا کسی غرض و مصلحت سے۔ سو جو اس کا جواب ہوگا وہی اس کا جواب ہے۔ وہ جواب یہی ہوگا کہ ایمان کی نہ حقیقت مخفی نہ اس کا داعی مخفی پھر سوال کیسا۔ ایسے سوال کا منشا صرف غلبۂ ہیبت ہے کہ شوائب موہومہ پر حقائق واقعیہ کا شبہہ و وسوسہ ہو جاتا ہے اور اس کا نیانی وجود بھی ناگوار ہوتا ہے۔ جیسے سایہ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا مگر کوئی بدگمان عاشق اپنے وہم سے اس کو مستقل سمجھ کر مقصود کا مصاحب دیکھ کر اس سے کراہت کرتا ہے اسی طرح یہاں غلبۂ

ہیبت ہے جو کہ اثر ہے محبت و عشق کا، غیر مقصود کے درجہ وسوسہ کو مشابہ حقیقت کے سمجھ کر اس کے شبہ مشوب ہونے کا کرنے لگتا ہے۔ اور گو یہ ہیبت بھی بجائے خود محمود بلکہ مطلوب کما اشیر الیہ بقولہ تعالیٰ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ الآیہ۔ لیکن جس طرح ضعیف المعدہ غذائے قوی کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس کے نافع ہونے کے لئے کسی ایسے جزو کے ساتھ اس کو مرکب کرنے بلکہ غالب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو موافق بنادے۔ ایسی ہی اس ہیبت کے ساتھ رجا و انس کے منضم بلکہ غالب کرنے کی ضرورت ہے جس سے اس میں اعتدال ہو کر مفید ہو۔ اور اس انضمام کا طریقہ یہ حکم لگانا ہے کہ جب ہم اپنے اختیار سے اس عمل میں کسی غرض مذموم کا قصد نہیں کرتے تو بس وہ خالص لوجہ اللہ ہے اور یہ حکم لگانا ہے کہ اگر بلا قصد ایمان کسی دوسری غرض کے مشوب کا خطرہ محسوس ہو اور رفتہ اشتباہ کا اسی خطرہ کا احساس ہے تو وہ محض وسوسہ ہے، جس پر ذرا مواخذہ نہیں بلکہ ناگواری کے سبب اجر بڑھ جاتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جب کسی غرض کا وسوسہ ہو اسی کے ساتھ فی الفور ابتغاء مرضات اللہ کی نیّت کی تجدید کر لی جائے، پھر وہ وسوسہ خواہ رفع ہو یا نہ ہو اس کے درپے نہ ہو وہ مدفوع ہی کے حکم میں ہے۔ واللہ اعلم۔"

سارا جواب جواہرات میں تولنے کے قابل ہے، اور ایک محقق و عارف حکیم کے شایانِ شان، خصوصاً وہ حصہ جسے یہاں نقل میں زیر خط کر دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ، کیا شانِ تحقیق تھی۔

اصلاح و تزکیۂ نفس، معارف دینی و حقائق ایمانی کے علاوہ ضرورت کبھی کبھی تصوف اصطلاحی کے بھی مسائل و مضامین سے متعلق استفسار و استفتاء کی پیش آتی تھی۔ یکم اگست کا عریضہ اسی کا ایک نمونہ ہے:-

"مثنوی شریف میں لفظ ارتقاء ایک جگہ تو تصریحاً آیا ہے ؎

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی | آتشے یا خاک یا بادے بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا | کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا

بعض دوسرے مقامات پر انسان کی ترقی درجات و تبدیلِ احوال کو بیان کیا ہے ؎

از جمادی مُردم و نامی شُدم | وز نما مردم بحیوان سرزدم
مُردم از حیوانی و آدم شُدم | پس چہ ترسم کے ز مُردن کم شدم

اور اس کے دو شعروں کے بعد ؎

بارِ دیگر از ملک قُربان شدم | آنچہ اندر وہم ناید آں شدم

اِس قسم کے مضامین و الفاظ سے آج کل کے بعض کج فہموں نے دو طرح کے نتائج اخذ کئے ہیں۔ ایک گروہ نے ان سے ہندوؤں کے مسئلۂ تناسخ کی تائید نکالی ہے۔ اور دُوسرا گروہ فرنگیوں کے مسئلۂ ارتقاء کی طرف گیا ہے، یعنی اِس مسئلہ کی طرف کہ انسان ابتداءً محض حیوان تھا، ترقّی کرتے کرتے انسان بنا ہے۔

جناب کے اوقات عزیزہ سے کوئی مطالبہ کرتے مجھے خود بڑا تامل رہتا ہے۔ اگر سائل کی خوش قسمتی سے جناب والا کو کچھ فرصت میسّر آ جائے اور طبیعت پر بار بھی کسی طرح کا نہ پڑے، تو التماس ہے کہ اِس بارہ میں اشارۃً رہنمائی فرما دی جائے "

مثنوی کی شرح بہت سے حضرات لکھ چکے ہیں، لیکن حضرت کے مُرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحؒ کے املا کئے ہوئے حواشی کی شان ہی کچھ اور رہی ہے۔ دلنشین، مُختصر، حشو و زوائد سے پاک، جامع و مانع۔ اور کوئی شرح اسی شان کی اگر مفصّل و مبسوط موجود ہے تو وہ حضرت ہی کی کلیدِ مثنوی ہے۔ عارف رومیؒ کا صحیح ترجمان و شارح اِس دور میں عارفِ تھانوی سے بڑھ کر اور ہو کون سکتا تھا، جواب جو آیا، عین انہی توقعات اور اسی معیار کے مطابق:۔

"کسی خطاب میں تامّل کی توجیہ ضرورت ہو جب بار کا احتمال ہو جس کا تحمّل کرنا پڑے۔ یہاں تو محبت کے اثر سے آپ کا ہر خطاب تزئین و تحمّل لے کر آتا ہے کہ اس میں مشغول ہونے سے لذّت و راحت ہوتی ہے۔

"اب اصل مقصود عرض کرتا ہوں۔ اگر ان اشعار کا موقع بھی لکھ دیا جاتا تو ان کو مع سیاق

وسباق دیکھنے سے شرح میں بہت اعانت ہوتی۔ نیز یہاں پوری مثنوی کی شرح موجود ہے۔ دفتر اوّل وسادس خود میرا لکھا ہوا ہے اور بقیہ دفاتر میرے لکھائے ہوئے۔ اِس شرح میں بھی دیکھ لیا جاتا۔ اب گو اُس شان کا تو نہیں مگر انشاء اللہ تعالیٰ کافی معروض ہے۔

جو مدعی اِن اشعار کو ارتقاء مصطلح یا تناسخ پر محمول کرتا ہے وہ غلط فہمی یا غلط اندازی میں مُبتلا ہے۔ وہ یا تو ارتقاء و تناسخ کو نہیں سمجھا یا ان اشعار کو نہیں سمجھا اور اگر دونوں کو سمجھ کر ایسا کیا تو وہ قابل خطاب نہیں[1]۔ اِن اشعار میں جن انقلابات و تطورات انسانی کا ذکر ہے وہ معتاد اور عام ہیں۔ مدعیان ارتقاء ان کو ارتقاء منزعوب کب سمجھتے ہیں۔ اِن انقلابات کا حاصل تو یہ ہے کہ عناصر کی ترکیب سے اوّل غذا بنتی ہے اور غذا تناول کے وقت جماد ہوتی ہے۔ پھر بعد ہضم اس کا ایک حصّہ مادہ منویہ بن کر رحم میں علقہ مضغہ کی صورت میں جسم نامی ہوتا ہے پھر رُوح طبعی اس کے متعلق ہو کر وہ جسم حیّی ہوتا ہے پھر رُوح قُدسی کے نفخ سے وہ انسان ہو جاتا ہے۔ پھر اعمالِ صالحہ سے اِس سے دُنیا ہی میں شان ملکیّت پیدا ہوتی ہے، پھر آخرت میں کمال قُرب سے مشرف ہو کر مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر کا مصداق ہو جاتا ہے۔ پھر ان ہی تطورات پر تفریع کے طور پر فرماتے ہیں کہ جب ہمیشہ تجھ کو ترقّی ہی ہوتی رہی ہے، تو پھر حوادث غیر اختیاری سے نقص کا کیوں خوف کرتے ہو۔ سو اس سے ارتقاء مصطلح کا کیا تعلق باقی لفظ ارتقاء سے استدلال، یہ محض مضحکہ ہے۔ کیا یہ لفظ ہمیشہ معنی اصطلاحی ہی میں مستعمل ہوتا ہے۔ کبھی معنی لُغوی یعنی مطلق ترقّی میں مُستعمل نہیں ہوتا۔ اگر یہی ہے تو سورۂ صٓ کے شروع میں فلیرتقوا فی الاسباب میں کیا کہیں گے، یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ حامیان متعہ جہاں بھی م، ت، ع کا مادّہ دیکھتے ہیں اُن کو اپنا ہی متعہ نظر آنے لگتا ہے۔

---

[1] حضرت نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا مثنوی میں لفظ ارتقاء کو دیکھ کر انیسویں صدی مسیحی کے اصطلاحی ارتقاء پر استدلال کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا قرآن مجید میں لفظ 'شراب' کو دیکھ کر کوئی اُردو کی چلی ہوئی 'شراب' (خمر) پر اور قرآن مجید کے لفظ حدیث، سے اصطلاحی حدیث نبویؐ پر استدلال کرنے لگے'

رہ گیا تناسخ اُس کا تو یہاں جھوٹ موٹ بھی نام نہیں لے سکتے۔ اس کا حاصل تو رُوح کا مفارقتِ بدن کے بعد اعمال کی جزاء وسزا میں دوسرے اچھے یا بُرے جسد کے ساتھ متعلق ہوجاتا ہے۔ یہاں اس کا نام و نشان بھی نہیں۔ اور اگر کھینچ تان کر بہ تکلف بلکہ بہ تصلف اس کو یا اسی طرح ارتقاء کو چسپاں بھی کر دیا جاوے تو غایت ما فی الباب محتمل کے درجہ میں ہوگا تو دوسرا محمل بھی اسی طرح محتمل ہوگا۔ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔ پھر مولانا مُسلمان ہیں مسلمان ہوکر کافروں کا عقیدہ کیوں اختیار کرتے۔ خاص کر جب کہ مولانا نے دفتر پنجم کے تقریباً ایک ثلث بہ تحت عنوان بیان خلقت آدم الخ اِس خلقت کی کیفیت اِس طرح بیان فرمائی ہے :۔

چونکہ صانع خواست ایجاد بشر — از برائے ابتلائے خیر و شر

جبرئیل صدق را فرمود رو — مُشتے خاکے از زمین بستان گرو الخ

اہلِ ارتقاء آدم علیہ السلام کی خلقت براین کیفیت کے کب قائل ہیں۔ اور قیامت کے روز جزاء وسزا میں جنت و دوزخ میں جانا اور رہنا یہ تو خدا جانے مثنوی میں کتنی جگہ مذکور ہے۔ پھر ان کے کلام کو ارتقاء یا تناسخ پر محمول کرنا تاویل القول بما لا یرضی بہ القائل نہیں تو اور کیا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔"

(۱۰۴)

تفسیر اور قرآنیات سے متعلق استفتاء اور استفادہ کا سلسلہ ادھر عرصہ سے چھوٹا ہوا تھا۔ ۱۲ ار دسمبر کا عریضہ پھر اسی رنگ میں ہے :۔

م د : قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کی زبان سے شاہ مصر کی خدمت میں وزارتِ مال کی درخواست کے باب میں عرصہ سے یہ سوال دل میں کھٹک رہا ہے کہ مصری حکومت تو غیر مسلم تھی اس کے ماتحت عہدہ قبول کرنے، چہ جائیکہ اس کی خود فرمائش کرنے کی صورت جواز کیا تھی؟ تفسیروں میں بھی اس مسئلہ سے تعرض خیال میں نہیں آتا۔

ا۔ الجواب۔ آیت وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ الاية

اور آیت قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ اور آیت رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَا
وِیْلِ الْاَحَادِیْثِ سے متبادر ہوتا ہے کہ آپ برائے نام وزیر تھے۔ اسی لئے آیات میں یٰاَیُّہَا الْعَزِیْزُ
بھی آیا ہے لیکن باعتبار اکثر اختیارات کے بادشاہ تھے۔ البتہ رعایا کے غلبہ سے شرعی قوانین
جاری نہ کرسکتے تھے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ مگر
اس سے ماتحتی لازم نہیں آتی کیونکہ یہ بھی ثابت نہیں کہ قانون غیر شرعی پر آپ کا عمل تھا۔ سو اس
عہدہ کے قبول کرنے میں یا فرمائش کرنے میں کوئی مفسدہ عقلی یا نقلی تو تھا نہیں۔ مصالح ہی تھے
گو ناتمام سہی۔ وَاَعْظَمُہَا ایصال الارزاق الی اھل الجدب اور ایک آیت سے معلوم
ہوتا ہے کہ آپ تبلیغ بھی فرماتے تھے۔ یدل علیہ قولہ تعالیٰ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ یُوْسُفُ مِنْ
قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ الیٰ آپ کے بعد پھر سلطنت اہل قبط میں چلی گئی۔ اور یہ اس وقت ہے
جب مطلقاً عقد اجارہ حربی ناجائز ہو۔ لا دلیل علیہ لاسیما اذا اختلفت الشرائع۔ اور جائز کی
درخواست بھی جائز ہے لاسیما اذا اشتمل علی المصالح العامۃ خصوصاً۔"

آیت قرآن مجید کی مشکل آیات میں سے ہے۔ اور خوارج کے اس عقیدہ کی جڑ کاٹ رہی
ہے کہ غیر مسلم حکومت میں کسی قسم کا بھی عہدہ قبول کرنا مطلق صورت میں حرام ہے۔ اور ہیر پھیر
جتنا بھی کیا جائے، یہ حقیقت تو اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ اختیارات کامل بھی آپ کو ایک غیر مسلم
ہی کے دیئے ہوئے تھے۔

اسی عریضہ میں ایک مضمون اور بھی تھا:۔

"یہ تو ایک علمی استفتاء ہوا۔ اب دوسری بات بہ غرض تصویب پیش کر رہا ہوں۔
کل بعد دوپہر دفعۃً یہ خیال پیدا ہوا اور آج صبح حالتِ نماز میں اس کی مزید تفصیلات
ذہن میں آتی رہیں کہ ایک مستقل کتاب قرآن مجید سے متعلق متفرق مفید معلومات پر مشتمل تالیف
کر دی جائے۔ مثلاً یہ کہ قرآن مجید میں اعلام جتنے بھی آئے ہیں، خواہ انذاری حیثیت سے ہوں
یا تبشیری حیثیت سے، جیسے

انبیاءِ کرام، حضرت مریمؑ، لقمانؑ، زیدؓ، جبرئیلؑ، میکالؑ، ہاروت، ماروت، یاجوج ماجوج، ذوالقرنین، ابلیس، فرعون، ہامان، قارون، ابولہب وغیرہم،

یا جن حیوانات کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، مثلاً

حمار، ابل، جمل، سلویٰ، خنزیر، کلب، نحل، نمل، ذباب، عنکبوت، فیل، بقر، نعجہ، معز، غنم، ضفدع، قمل، بقرہ، وغیرہا۔

یا نباتات مذکورۃ فی القرآن۔ مثلاً

بقل، فوم، قثاء، حطہ، عدس، بصل، نخل، رمان، عنب، زنجبیل، یقطین، زیتون، زقوم، تین وغیرہا۔

ان سب پر مفصّل معلومات خود قرآن مجید اور حدیث اور تاریخ و دیگر علوم سے لے کر یکجا کر دیئے جائیں۔ کام ذرا تلاش و کاوش کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی دعاؤں کی برکت سے انشاء اللہ آسان ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ خیال جناب والا ہی کی خدمت میں بغرض مشورہ و رہنمائی و دعائے برکت پیش کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی کوئی موزون نام (ایک یا زاید) بھی بے تکلف ذہن مبارک میں آجائے تو اس سے بھی ایماء فرمایا جائے۔"

جواب توقع کے خلاف حسب ذیل آیا:۔

"میں نے بہت غور کیا، اس کی کوئی مصلحت معلوم نہیں ہوئی کہ اس کو پیش نظر رکھ کر غور کرتا۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی معتدبہ مصلحت ہو تو ظاہر فرمائیے، اُس وقت نام میں غور کر دوں گا"

حضرت کے پیش نظر بیسویں صدی کے افرنجی المذاق ناظرین کہاں تھے، اور کیسے ہو سکتے تھے اس طبقہ کے ہاتھوں تک توشخہ شفاء اصلاح پہنچانے کی یہی صورت ہے کہ "ڈکشنری آف دی بائبل" اور "انسائیکلوپیڈیا آف دی بائبل" وغیرہ کی طرح ہمارے ہاں بھی علوم القرآن اور اعلام القرآن وغیرہ پر مستقل قاموس تیار ہوں ——— یہ کام بہرحال کر ڈالنے کا ہے، اور

یہاں پہنچ کر میں وصیت کئے جاتا ہوں کہ یہ بے علم و کم سواد اگر اس کے بعد زندہ نہ رہا، تو کوئی اور اللہ کا بندہ اِس ارادہ و ہمت کو لے کر اُٹھے، اور یہ کام کرکے رہے۔

نومبر قریب ختم تھا کہ ایک خاص تقریب سے حضرت کی تشریف آوری لکھنؤ کی خوش خبری سُنائی دی۔ ۲۰ر نومبر کا عریضہ مُلاحظہ ہو:-

م۔ گھر میں بعد سلام عرض کرتی ہیں کہ بڑی لڑکی کے عقد کو اب خاصہ عرصہ ہو چکا، جی چاہتا ہے کہ اس کے کوئی اولاد بھی ہوجاتی۔ حضرت دُعا فرمائیں۔

ا۔ دِل سے دُعا کرتا ہوں۔

م۔ اور اگر اس کے لئے کوئی تعویذ بھی دیتے ہوں تو مرحمت فرمائیں گو میں اپنے تجربہ کی بنا پر آپ کی دُعا ہی کو کافی سمجھتا ہوں۔

ا۔ تعویذ آتا ہی نہیں۔

م۔ یہ مضمون تو گھر والی کی طرف سے ہوا۔ اب آگے میری طرف سے عرض ہے۔ سُنا ہے کہ جناب چھوٹی بیوی صاحبہ لکھنؤ دانت بنوانے کی غرض سے تشریف لارہی ہیں اور شاید جناب والا بھی ہمراہ ہوں۔ روایت اگر صحیح ہے،

ا۔ ورنہ ارادہ میں تو صحیح ہے، وقوع کی خبر اللہ تعالیٰ کو ہے۔

م۔ تو خدا معلوم کب تک اور کتنے دن کے لئے عزم مبارک ہے۔

ا۔ یکم دسمبر کو خیال ہے۔ مدت قیام دندان ساز کی رائے پر ہے، جس کا علم نہیں۔

م۔ ہم نیاز مندوں کے لئے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مسرت کی خبر اور کیا ہوسکتی ہے بشرطیکہ جناب کو بھی اِس سفر سے راحت رہے۔

ا۔ اللہ تعالیٰ اِس محبت کا صلہ دے۔"

لکھنؤ میں ڈاکٹر "شاہ صاحب" ایک پنجابی مسلمان (غالباً یورپ اور امریکہ کے سند یافتہ) بڑے ماہر فن دندان ساز ڈاکٹر تھے، اور حضرت کے بھی بڑے معتقد۔ اُن کی یہ مہارت فن اور

خوش عقیدگی دونوں اس موقع پر بڑی کام آئیں۔

حضرت محض رفاقت سفر کی خاطر تو شاید اتنا بڑا سفر نہ اختیار فرماتے لیکن اور بھی متعدد ضرورتیں نکل آئیں۔ خواجہ صاحب اپنے مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں حضرت کو اپنے وطن لے جانا چاہتے تھے۔ ادھر کانپور کے لئے بھی مخلصین کانپور کا اصرار تھا۔

غرض حضرت کی تشریف آوری کی خبر دریاباد ۲ دسمبر کو پہنچی، اور ۳ دسمبر کو دستی خط لکھنؤ حسب ذیل لکھا۔

"ابھی ابھی ورود لکھنؤ کی خوش خبری معلوم ہوئی۔ جمعہ کو ۹ بجے صبح کی گاڑی سے لکھنؤ حاضری کا قصد رکھتا ہوں۔ گھر میں بھی ان شاء اللہ ہمراہ ہوں گی۔

اگر قیام اس سے بھی مختصر ہو تو اطلاع ملنے پر اس سے بھی قبل حاضر ہو جاؤں گا۔"

جواب لے کر آدمی پہلی گاڑی سے آیا:۔

"سفر میں دوسروں کا قبضہ ہوتا ہے۔ نیز اپنی ضروریات کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے دونوں امر کے لحاظ سے ایک خاص نظام سفر و قیام کا مرتب کرنا پڑا جس کی رو سے پنجشنبہ کی صبح کو اورئی خواجہ صاحب کا مہمان بن کر جانا ہوگا۔ اور جمعہ کو وہاں قیام کر کے سہ شنبہ کو وطن کی روانگی ہے۔ اب گنجائش اور موقع خود ملاحظہ فرما لیا جائے۔ میں اتوار کو یہاں آ گیا تھا۔ دوشنبہ سہ شنبہ چہارشنبہ قیام رہا۔ غالباً خبر ملنے میں دیر ہوئی۔ والسلام"

لکھنؤ کی حاضری اب بجائے جمعہ کے اتوار ہی کو رکھی۔ اور ایک ٹرین قبل سے پہنچ کر لکھنؤ پلیٹ فارم پر حضرت کو کانپور ٹرین سے اترتے ہوئے دیکھا۔ خادموں کی ایک جماعت ہمراہ تھی۔ اسباب قدرۃً بہت زاید تھا۔ قلیوں نے ہجوم کیا۔ ایک قلی نے کچھ بڑھ بڑھ کر باتیں کرنی چاہیں۔ اجنبی معتقدین میں سے ایک صاحب نے اُسے للکارا، معاً وہ خود حضرت کی گرفت میں آگئے "میں اپنے معاملات طے کرنے کے لئے خود کافی ہوں۔ آپ کو یا کسی صاحب کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت؟" ——— تعلیم حضرت کی بات بات میں ملتی تھی۔

گاڑی جہاں رُکی تھی، وہاں سے باہر پہنچنے کی بڑی لمبی مسافت تھی۔ حضرت نے رفیقوں کے ساتھ پیدل ہی چلنا چاہا، ضُعف و ناتوانی کی بنا پر ممکن نہ ہوا۔ اسٹیشن پر جو کرسی بیماروں کے لئے رہتی ہے، وہ لائی گئی۔ اور اس پر حضرت باہر تشریف لائے۔

قُدرت کے انتظامات بھی عجیب عجیب ہوتے ہیں، نادان انسان کو دنگ و حیران بنا دینے کے لئے کافی۔ لکھنؤ محلہ جھنوائی ٹولہ کے ایک نامور اور خاندانی طبیب شفاء الملک حکیم حاجی عبدالحمید تھے۔ سُرخ و سفید، توانا و تندرست۔ حضرت کے مُخلص و مُعتقد۔ چند سال ہوئے جب حضرت علیل ہوئے تھے، تو یہ خود زحمت سفر اُٹھا کر تھانہ بھون پہنچے تھے۔ اپنے شہر میں موٹر کے عادی۔ وہاں یہ سواریاں کہاں۔ اسٹیشن سے شروع آبادی تک کھیتوں کی پگ ڈنڈی پر اور پھر حضرت کے مکان تک کئی فرلانگ پیدل گئے۔ اب مشیّت کی کارفرمائی دیکھئے کہ "یہ مسیحائے وقت" حکیم صاحب خود بیمار پڑے۔ پہلے ذیابیطس ہوا، اور پھر دق! اور دق کے جو شدائد ہوتے ہیں، ہر جاننے والے پر روشن ہیں۔ اِن ہی شدائد کی ایک ایک منزل سے ہفتوں نہیں مہینوں گزرتے رہے۔ جسم کے اعتبار سے گھُلتے رہے اور رُوح کے لحاظ سے دُھلتے رہے۔ اُن کے عین اشتداد مرض کا زمانہ تھا، کہ حضرت کا لکھنؤ آنا ہوا۔ اور خود اُن کی عیادت کو تشریف لے گئے ______ کتنا پُراثر اور عبرت ناک تھا یہ منظر۔ ابھی کل تک جو طبیب حاذق تھا، ہزار ہا کی صحت اور زندگی کا گویا زندہ ضامن، وہ آج بستر مرگ پر تھا، حقیر سے حقیر مریض کی طرح ہی بے بس اور بے کس۔ اور حضرت جو کل تک اُسی کے مریض و زیر علاج تھے، آج اُس کے سرہانے تلقین کر رہے ہیں، اُس کی ٹُوٹی ہوئی آس بندھا رہے ہیں، جنّت کی بشارتیں دے رہے ہیں، تسنیم و کوثر کا مُشتاق بنا رہے ہیں! آہ خوش قسمت حکیم عبدالحمید! ؎

بچہ نازِ رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے ۔۔۔ کہ بہ وقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

طبیب بے چارہ کو کیا خبر تھی کہ سفر تھانہ بھون میں جو تھوڑی بہت مادّی زحمتیں اُٹھانی پڑی تھیں اُس کی قیمت، اور اتنی جلد اسی عالم ناسوت میں، برزخ سے قبل ہی مل جائے گی!

حضرت تو شرافت کے بادشاہ تھے تسکین تسلی ہی کی باتیں نہیں فرمائیں، بلکہ اُسی وقت اپنے حلقۂ بیعت میں لے لیا ——— اللہ اللہ دوسروں کے لئے کتنی شرطیں، کتنی قیدیں لگی ہوئی تھیں، یہ حکیم صاحب طالب ہونے کی جگہ اس وقت عین مطلوب ہو گئے! لفظاً مُرید، معنیً مراد! ؎

قیمت نگر کہ کُشتۂ شمشیر عشق یافت ‏ ‏ ‏ ‏ مرگے کہ زاہداں بہ دُعا آرزو کنند

اِس حکمت تکوینی کی کسے خبر کہ حضرت تھانہ بھون سے لکھنؤ بھیجے ہی گئے تھے اِس مقصد سے (علاوہ دوسرے مقصدوں کے)۔

سنہ ۱۹۴۱ء

(۱۰۵)

سنہ ۱۹۴۱ء میں مراسلت کی ابتدا کی ایک دل کش خواب سے ہوئی۔ اور یہ ایک بار پھر مختصر کر لیجئے کہ جہاں تک حضرت کے ساتھ عقیدت کا تعلق ہے میرے گھر میں مجھ سے بڑھی ہی ہوئی تھیں، گو میری ہی طرح وہ بھی ضابطہ سے مرید حضرت کی نہ تھیں۔ بہر حال اب ۲۵؍ فروری کا عریضہ ملاحظہ ہو:۔

م:۔ عافیتِ مزاج کا طالب و دُعا گو ہوں۔

ا- الحمد للہ خیریت سے ہوں۔

م:۔ پرسوں شب میں گھر میں ایک عجیب خواب دیکھا۔ دیکھا کہ مدینہ منوّرہ کی مسجد قبا میں حاضر ہیں۔ وہیں جناب کی چھوٹی بیوی صاحبہ[1] بھی ہیں۔ یہ انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اُنھوں نے دریافت فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تصویر دیکھو گی؟ انھوں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا کہ ضرور۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ یہ تو عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اب یہ بڑے غور اور حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ صورت شکل، وضع لباس چھوٹی بیوی صاحبہ کا ہے، یہ حضرت صدیقہؓ کیسے ہو گئیں۔ اتنے میں پھر کسی نے کہا کہ نہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بہو ہیں۔

---

[1] یعنی حضرت کی محل خورد۔

اب یہ اپنے دل میں اور بھی حیرت کر رہی ہیں کہ حضورؐ کے تو کوئی صاحبزادہ ہی نہ تھے، تو پھر کیسی؟
اتنے میں پھر آواز آئی کہ ہر کلمہ گو حضورؐ کی اولاد ہے، اور مولانا اشرف علی جیسے بزرگ تو خاص الخاص
اولاد حضورؐ کی ہیں، اُن کی بیوی حضورؐ کی بہو ہی کہلائیں گی۔ اس کے بعد صحن مسجد سے اُنھیں ہمراہ
لے کر چھوٹی بیوی صاحبہ مسجد کے اندرونی درجہ میں داخل ہوئیں، وہاں ایک دروازہ سا کھلا،
اور اُس کے اندر سے بجائے تصویر کے خود حضورؐ کا جلوۂ مبارک نظر آیا۔

آگے بیان کرتی ہیں کہ نورانیت اس غضب کی تھی کہ میں چہرہ پر نظر نہ جما سکی۔ گھٹنوں کے
بل بیٹھ کر سر جھکا کر دست بستہ درود شریف بہ آواز بلند پڑھنے لگی۔ حضورؐ کی پشت مبارک
کی طرف انھیں اپنے حقیقی چچا بھی کھڑے ہوئے نظر پڑے جو ان کے بچپن میں اجمیر کے تالاب میں
غرق ہو چکے تھے۔ اُن کو دیکھ انھیں ذرا ڈھارس ہوئی، اور یہ اُن کے ہاتھ سے لپٹ گئیں۔
حضورؐ انور نے تبسم کے ساتھ شفقت و دلدہی کے لہجہ میں فرمایا "دل کی صاف ہے"۔

اس کے بعد یہ کہتی ہیں کہ مجھے اپنی ماں اور بہن یاد پڑیں کہ اُنھیں بھی دوڑ کر بلا لاؤں اور
زیارت کرا دوں، بس اسی میں آنکھ کھل گئی۔

تعبیر جو کچھ بھی ہو میرے لئے تو ایسا مجرد خواب بھی باعث رشک ہے۔

ا۔ مجھ کو اس رشک پر رشک ہے۔ یہ رشک دلیل ہے عشق کی۔ اللہ مجھ کو بھی
ایسا عشق نصیب کرے۔

برین خواب گرجان فشانم کم ست

خواب کوئی حجت شرعیہ نہیں۔ مگر رویاء صالحہ کا مبشرات میں سے ہونا یہ حجت شرعیہ سے ثابت
ہے۔ اس لئے اس کو بشارت سمجھنا اور اس پر مسرور ہونا شرعاً ماذون فیہ ہے۔ کسی کا حضرت عائشہؓ
کہنا اشارہ ہے وراثت فی بعض الاوصاف کی طرف۔ اس کا ذکر ایک خاص عنوان سے اصلاح انقلاب
میں بھی ہے، اس کے بعد جو کھٹکا ہوا اُس کی توجیہ خود خواب میں ظاہر کر دی گئی۔ جس میں ایک گندہ
کو طاہر بنانے کی بھی بشارت ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے راست لاوے۔ پھر حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی تجلی تو پوری ہی دولت ہے اس کا کیا پوچھنا۔ اور صفائی دل کی بشارت جس درجہ کی فال نیک ہے ظاہر ہے ومبارک ہے۔ غرض اس خواب سے جن جن کا تعلق ہے سب محل مبارکباد ہیں اور ساتھ ہی آپ بھی کہ ایسی مقبول بندی کے مالک ہیں۔ نعمت کا مالک ہونا بھی کم نعمت نہیں۔"

عریضہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک نازک فقہی مسئلہ باقی ہے:۔

مریدہ "اصل غرض جو عریضہ کی تھی وہ تو ختم ہو گئی۔ ایک فقہی مسئلہ عرصہ سے دریافت کرنا چاہتا تھا، اس وقت یاد پڑ گیا۔ وہ یہ کہ آیا حرام کمائی سے بھی انتفاع کی کوئی صورت ہے؟ ایک پیشہ ور دولتمند عورت اب اپنے پیشہ سے تائب ہو کر نکاح میں آنا چاہتی ہیں۔ ان کے لئے دریافت طلب ہے کہ نقد وجائداد کو کیا کریں؟ سب خیرات کر ڈالیں، یا پاس رکھنے کی بھی کوئی گنجایش نکلتی ہے؟

ا۔ معذرت۔ مسئلہ فقہیہ نازک تھا اس میں دیر لگی۔

الجواب مسئلہ از بس نازک است خصوص بدیں وجہ کہ اگر تسہیل نہ کردہ شود ہمت توبہ کنندگان می شکند۔ نیز محتمل ست کہ ایں زن تائبہ خود بر توبہ تاسف خورد کہ نتیجہ اتباع شریعت ابتلاء ایں چنیں مصائب است۔ واگر از قواعد طریقے تجویز کردہ شود ظاہر ست کہ آں قواعد را شرعی گفتن ضرور ست۔ ممکن است کہ بعضے جہلا یا طاغان از شریعت بدگمان شوند یا اعتراض کنند کہ شریعت حیلہ ہا می آموزد وحرام را برائے تکمیل اغراض نفسانی حلال می سازد بنا بریں ایں چنیں تحقیقات قابل زبانی فہمیدن می باشد۔ مگر شاید در زمان قریب موقع مکالمہ میسر نہ شود وحادثہ مقتضی تعجیل باشد لنظر بریں توقف روا نہ داشتم واحتیاطاً در فارسی نوشتم کہ اگر اخفاء کامل شود ناقص غنیمت است واجمالاً جواب طاعنان ایں ست کہ در ہر مقام استعمال ایں چنیں تدابیر ماذون فیہ نیست۔ صرف در محل ضرورت شدیدہ گنجایش دادہ می شود۔ پس ایں تسہیل غایت رحمت ورعایت ست از شریعت۔ اکنوں آں تدبیر را بہ قلم می سپارم۔ اینجا دو چیز ست۔ جائداد و نقد

پس در جائیداد وقف نہایت سہل ست زیرا کہ عادت غالب در جائداد ایں ست کہ اوّل عقد مکمل می شود وازاں بعد زرِ ثمن پیش کردہ می شود ازیں جہت خبث زرِ ثمن در بیع اثر نمی کند کما حققہ الکرخی واگر در محلِ مسئلہ ثمن اوّل حاضر کردہ شدہ باشد در سوال ظاہر کردہ شود آں را جواب دیگر است۔ اما اگر زرِ خبث نقد باشد آں را دو تدبیر ست۔ یکے سہل الوقوع لیکن معذوری در نقل دارد۔ صورتش آں ست کہ مالکِ چنیں مال ایں قدر از کسے قرض گیرد باز آں قرض را ازیں مال بصحت ادا کند و خرابی کہ در بر دارد آں ست کہ دیگر کس را دریں نجاست مبتلا گرداند و تدبیر دیگر آں ست کہ مساکین کہ مصارفِ چنیں اموالِ غیر مباحہ ہستند بمقدار نقد موجود از کسے قرض گرفتہ ایں مبتلا را بطورِ ہبہ دہند۔ باز ایں شخص ایشاں را آں اموال بطورِ تصدّق بخشد و آناں بدو قرض خود ادا کنند چوں چنیں اموال ایں مساکین را حلال ہستند لہٰذا آں خرابی مذکور دریں جا مفقود ست چہ مقرض ہم حلال خواہد بود۔

مولانا کی احتیاط و ژرف نگاہی کا کیا کہنا، فقہی اور باطنی سب پہلوؤں کی رعایت کرلی۔ باقی نفس "حیلۂ شرعی" پر لوگوں کا اعتراض اور محض لفظ "حیلہ" کے آجانے سے اس کے استعمال سے بدکنا محض جہل کی راہ سے ہے۔ حیلۂ شرعی کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ایک چیز شریعت کی اصل رُوح و مغز کے لحاظ سے تو درست نہیں، لیکن بہرحال ظاہر لفظ سے اس کے لئے گنجائش نکل آتی ہے، تو صریح نافرمانی کے مقابلہ میں اِس درجہ کی اطاعت بھی اطاعت ہی کہی جائے گی ——— شریعت کا مغز تو مغز ہی ہے، لیکن شریعت کا قشر یا خول یا غلاف بھی مہمل اور سرے سے ناقابلِ التفات نہیں ہے۔

اپنے ایک بڑے مخلص کرم فرما سید مقبول حسین وصل بلگرامی تھے[1]۔ بڑے خوش ذوق اور ایک پیکر خدمت و اخلاص، اپنے زمانہ میں عالمگیر، مرقع وغیرہ کئی ادبی ماہنامے نکالے۔ حضرت سے نسبت بیعت و ارادت تو بہت قبل سے تھی، آخر زمانہ میں سب طرف سے کٹ کے

---

[1] اوپر بھی ان کا ذکرِ خیر آچکا ہے۔

تھانہ بھون ہی کے ہو رہے تھے۔ مارچ میں اُن کے خط اور بعض اور خطوط سے معلوم ہوا کہ حضرت کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ معمولات موقوف اور مسجد میں آنا بند ہوگیا تھا۔ کچھ روز بعد اتنا افاقہ ہوگیا کہ پھر دونوں وقت خانقاہ تشریف لانے لگے ــــــ حضرت کی صحت اب مستقل طور پر گر گئی تھی، اور طبیعت برابر خراب رہنے لگی تھی۔ کبھی افاقہ اور کبھی پھر زیادتی۔ اور آہ، کہ جو مجسمۂ صحت تھا، وہ اب فطرت کے اُن قوانین طبعی کے آگے جو ولی اور نبی کسی کی بھی رعایت نہیں کرتے، روز بروز بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ یہ صل صاحب کے وہاں موجود ہونے سے بڑا کام یہ نکلتا تھا کہ حالات ان کے ذریعہ سے معلوم ہوتے رہتے، اور حضرت کو براہ راست زحمت دینے کی ضرورت نہ پیش آتی۔

(۱۰۶)

اپریل ۱۹۴۲ء کا مہینہ تھا کہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں، جو اب تک حضرت کے خاص اثر میں تھا، صدر مدرس کی جگہ خالی ہوئی۔ مشہور یہ ہوا کہ میرے خاص عنایت فرما مولانا . . . . فرنگی محلی بھی اس جگہ کے لئے، اپنا نام دیدیں۔ اُن کی یا کسی کی بھی کامیابی کی توقع بغیر حضرت کی امداد خاص کے دشوار سی تھی۔ مشکل یہ آپڑی کہ اُن سے اور حضرت سے کسی قسم کا تعارف سابق موجود نہ تھا۔ جرأت کرکے میں نے اپنی طرف سے تحریر ذیل مولانائے فرنگی محلی کے متعلق لکھ حضرت کی خدمت میں پیش کردی :-

"مولانا . . . . فرنگی محلی کی خدمت میں مجھے سالہا سال سے نیاز حاصل ہے۔ اُن کے علم تحقیق اور وسعت نظر و مطالعہ سے متعلق تو میری تحسین تحسین ناشناس ہوگی، البتہ اپنی محدود و ناقص بصیرت کے ماتحت اُن کی سلامت طبع کا معتقد ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ اُن کا سلیم الطبع اُستاد کسی مدرسہ کو ہاتھ آجانا اُس مدرسہ کے لئے باعث فلاح و برکت ہوگا"

حضرت کی وسعت اخلاق کا یہ عالم تھا کہ اسی تحریر پر مجھے تو سطور ذیل لکھ بھیجیں:-

"از اشرف علی عفی عنہ۔ میں ممنون ہوں کہ اس خدمت کے لئے مجھ کو یاد فرمایا گیا۔ میں نے

تمام شقوں پر نظر کر کے مولانا کی خدمت میں جو عرض کیا ہے ملاحظہ کے بعد اگر ترمیم کی حاجت ہو میں اس کے لئے بھی حاضر ہوں۔"

اُدھر خود مولانائے فرنگی محلی نے جو مکتوب روانہ خدمت کیا تھا، اس پر ذیل کا جواب انھیں عنایت ہوا:-

"مولانا دامت برکاتہم السلام علیکم - ایک ہی مکاتبت میں دل ایسا مل گیا اور کھل گیا کہ اب اختصار معروضہ بھی خلافِ تہذیب نہیں معلوم ہوتا- اس لئے بعد عنایت تمہید عرض ہے کہ میں نے ایک قطعہ الطاف نامہ کا اپنے پاس رکھ لیا ہے اور بہت جلد جامع العلوم میں مع اپنے خط کے بھیج دوں گا اور جواب آنے پر مطلع کروں گا- میرے سرخ رو ہونے کی دعا فرمائیں نا

یہ تھے حضرت تھانوی بہت سے معاصرین کی نظر میں خشک مزاج!!

افسوس ہے کہ حضرت کی وہ اصل تحریر محفوظ نہ ملی جو کہ ایک اجنبی عالمِ دین کے حق میں جن کا مسلک فقہی بھی حضرت کے مسلک سے کسی قدر الگ تھا، ارکان جامع العلوم کے سامنے پیش ہوئی تھی- البتہ اُسے دیکھ کر اُس وقت تو زبان پر جوش عشق آہی گیا تھا، اور فرط تاثر سے اُس وقت زبان قلم پر بے اختیار جو لفظ آگئے تھے، وہ کاغذات میں نکل آئے- اس سے کچھ اندازہ حضرت کی اصل تحریر کا ہو سکے گا:-

مرد جناب والا کے حسن اخلاق، حسن توجہ، جامعیت تحریر و احاطۂ جزئیات کا معتقد تو میں مدت سے تھا- لیکن مولانا . . . . فرنگی محلی کے مکتوب کے جواب میں ان اوصاف کی تو نمایاں مثال دیکھ کر دنگ رہ گیا- فارسی کی ایک مشہور لغت کا مصرعہ ہے،

اے در کمال حسن عجب تر زہر عجب

اسے دہرا دینے کی جرأت تو نہیں کر سکتا، البتہ اتنا عرض کر دینے کو تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کمالات اشرفی کے باب میں میرا تجربہ کچھ اسی نوعیت کا، یعنی ہر تازہ مثال پہلی مثال سے بڑھی ہوئی ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ-

ا۔ اِس جوشِ شفقت کے جواب میں بجز اس کے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا کہ

گر ہنرے باشد وہفتاد عیب دوست نہ بیند بجز آں یک ہنر

اشرف برائے نام"

اور مولانائے فرنگی محلی کا خط حضرت کے اِس مکتوب کے متعلق یہ آیا کہ اس کے چند مختصر مگر جامع لفظ دلچسپی کے ساتھ ساتھ دلکشی کی صفت بھی اپنے اندر رکھتے تھے۔

اِن سب خطوط پر تاریخیں اپریل کے آخری ہفتہ کی ہیں۔

اِسی اپریل کے تیسرے ہفتہ میں، مجھے خانگی زندگی میں جو بڑے سے بڑا صدمہ ہو سکتا تھا، پیش آیا۔ یعنی والدہ ماجدہ کی وفات، جو ایک پختہ مومنہ، صالحہ، حاجیہ تھیں۔ ۷ رمئی کے معروضہ میں حضرت کو حسب ذیل لکھا:۔

م ۱۵ ار ربیع الاوّل[1] کو عین غروب آفتاب کے وقت کہ شب دوشنبہ شروع ہونے کو تھی کہ میری والدہ ماجدہ نے ۸۵ سال سے اوپر کی عمر میں، بخار کے مرض میں وطن سے باہر شیخ آباد میں انتقال فرمایا، اور ہم لوگ اُن کی دُعاؤں کی برکتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

نماز کی اِس درجہ شائق بلکہ حریص تھیں کہ فرائض کیا معنی، اشراق و چاشت بلکہ تہجد بھی کسی موسم میں ناغہ نہ ہونے پاتی۔ روزے آخر تک پابندی سے رکھے گئیں۔ محرّم، ذی الحجہ، شعبان وغیرہ کے نفلی روزے نہ چھوڑتیں۔ داد و دہش اِس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ بعض اوقات ہم لوگوں کو طبعاً گراں گذرتی۔ ۲۸، ۲۹ سال قبل حج کرنے گئیں، کفن اسی وقت زمزم میں غسل دیا ہوا سفر و حضر میں برابر ساتھ رہتا، وہی اُس وقت پردیس میں کام آیا۔

آخری بات جو مجھ سے کی وہ یہ فرمایش تھی کہ اُلجھن بڑھی ہوئی ہے، سورۂ یٰسین پڑھ دو۔ اِس کے بعد ادھ کٹے لفظوں میں اور پھر محض اشاروں میں تیمم، وضو، نماز کے لئے کہتی رہیں۔

---

[1] مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۴۱ء

اذان کی آواز کی عاشق تھیں، گھر کے اندر اذانیں دلوایا کرتیں۔ وصیت بار بار یہ کی تھی کہ مسجد کے دروازہ پر یا قریب ہی دفن کرنا کہ اذان کی آواز برابر سنتی رہوں۔ اللہ نے آرزو پوری کر دی۔ ہم لوگ وطن لے آئے، اور خاندانی مسجد کے متصل ہی کی قبر مل گئی۔

وقت نزع شروع ہوا، تو اور سب عزیزوں نے تو کلمۂ شہادت اور میں نے سورۂ یٰسین شروع کی، جب سلٰمٌ قولاً من رب الرحیم پر پہنچا ہوں تو اسے اُن کے کان کے پاس جاکر تین تین بار پڑھا۔ اور جب فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیءٍ والیہ ترجعون پر پہنچا ہوں معاً روح پرواز کر گئی۔ اب جناب والا سے التماس دعا ہے۔

ا۔ اولیاء اللہ کی سی موت ہوئی۔ تعزیت کے ساتھ ایسی موت پر تشکر کی رائے دیتا ہوں۔

اِس عریضہ میں ایک اور موضوع بھی اہم تھا:۔

"اب ایک دوسری بات عرض کرنا ہے۔ ایک صاحب علم اور صاحب قلم دوست کو میں نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا کہ اپنی اصلاح و تزکیہ کے لئے کسی صاحب باطن خصوصاً حضرت والا سے رجوع کرنا بہتر ہوگا۔ اس پر اُن کا جو جواب آیا وہ خلاصۃً عرض ہے:۔

"مجھے خود اس ضرورت کا پورا احساس ہے لیکن مولوی شاہ عبدالقادر رائے پوری[1] اور شاہ وارث حسین صاحب مرحوم کا میں تجربہ کر چکا ہوں۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی ایسی بات مجھے نظر آگئی کہ زیادہ استفادہ نہ کر سکا۔ رہے مولانا تھانوی تو اُن کے یہاں کے آداب و ضوابط بجائے خود جیسے بھی ہوں میری طبیعت کو اُن سے بہت بُعد ہے۔ پھر مولانا کے طریق تربیت کو جہاں تک میں تربیت السالک کی مدد سے سمجھ سکا ہوں، شرعاً بھی مجھے اُس میں کلام ہے۔ مثلاً ازالۂ کبر کی یہ تدبیر کہ وہ شخص، نماز جماعت کے بعد علی الاعلان اپنے لئے دعا کرائے، مجھے تو احادیث و آثار سے یہ اظہار و اعلان معیوب ہی نظر آتا ہے۔ غرض یہ کہ مناسبت کے بغیر رجوع کرنے میں اندیشہ مزید بُعد کا ہے، کوئی حل آپ اِس دشواری کا نکالئے تو میں دل سے شکرگزار رہوں گا۔"

---

[1] یہ رائے پور یوپی کے ضلع سہارنپور میں ایک مشہور قصبہ ہے۔

میں تو اپنے ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی جناب والا ہی کی ہدایت کا طالب ہوں۔
۱۔ خدمت سے عار نہ تھا مگر اپنا تبریہ خلاف غیرت ہے۔ نیز احتمال ہے کہ ولاتزکوا انفسکم کے بھی خلاف ہو۔ اگر کسی دوسرے کے متعلق یہ شبہ ہوتا تو اس کا جواب میرے ذہن میں ہے۔ اب اسلم یہی ہے کہ بُعد کو قرب سے مبدل نہ کریں۔"

ہم لوگ آج کی بولی میں جسے خودداری سے تعبیر کرتے ہیں، حضرت کی اصطلاح میں اسی کا نام "غیرت" تھا۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت اِن شبہات کا جواب بڑی آسانی سے تحریر فرما سکتے تھے ——— جس شئے کی حدیث میں ممانعت ہے، وہ بلا وجہ اپنے عیبوں کی تشہیر کرنا ہے، جس سے یا خواہ مخواہ اپنی فضیحت ہوتی ہے، اور یا اس عیب کی شناعت کا ورجہ بھی لوگوں کی نظر میں گھٹتا جاتا ہے۔ اِس کو اِس اصلاحی اور بالقصد اعلان معصیت پر قیاس کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی باعفت خاتون شوہر کے سامنے بھی بے حجاب ہونے سے انکار اس بنا پر کرتی ہے کہ عورت کے لئے بے حجابی غیر مشروع ہے!

(۱۰۷)

تفسیر قرآنی کے متعلق مذاکرے ابھی ناظرین کی یاد میں تازہ ہوں گے۔ چند نمبر اُدھر مکتوبات انہی تفسیری مباحث سے بھرے رہتے تھے۔ اب اِدھر سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ وسط جون ۴۱ء کے مکتوب میں پھر سلسلہ قائم ہوا۔ اِس عریضہ پر تاریخ ۱۷ر جون کی ہے:۔

م: سورۃ البقرہ کی آیۂ کریمہ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا الخ کی تفسیر میں جمہور مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ چاروں پرندوں کا جسم بعد ذبح مخلوط کرکے اس کا ایک ایک جزو الگ الگ چار پہاڑوں پر رکھ دیا جائے۔ اِس پر جناب نے ایک مجلس میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہ تفسیر تو بلا ورود روایات خود الفاظ قرآنی ہی سے نکلتی ہے نہ کہ وہ جو بعض جدید فرقے اس وقت کر رہے ہیں کہ مُراد اس مجموعہ کے اجزاء یعنی چار الگ الگ افراد ہیں۔ اِس ارشاد کی تفسیر میرے ذہن سے نکل گئی۔ از راہ شفقت و کرم

مکرر ارشاد فرمادیا جائے۔

میرے ذہن ناقص میں یہ آتا ہے کہ اسم جزء کے معنی لغت میں قطعۃ من الشئ کے ہیں اور فعل جزء کے معنی پارہ پارہ کردن کے منتہیٰ میں اشارہ اگر اسی طرف نکل آئے کہ مراد ان میں سے ہر ایک کے ٹکڑے ہیں نہ کہ "ان کے مجموعے کے" تو قول جمہور کی بڑی تقویت ہو جاوے۔

ا۔ اُس وقت کی بات تو یاد نہیں، باقی اِس وقت جو ذہن میں ہے معروض ہے۔

اصل مقصود اہل حق کا ان طیور کی حیات بعد الممات ہے اور اہل زیغ اسی کے منکر ہیں۔ اور یہ حیات بعد الممات خواہ اجزاء بمعنی قطعات کے متعلق ہو جیسا کہ جزء کے لغوی اور حقیقی معنی بھی ہیں چنانچہ کتب لغت میں تصریح ہے اور خواہ مطلق ابعاض کے متعلق ہو جیسا کہ مجازاً جزء اس معنی میں بھی مستعمل آیا ہے کما قال تعالیٰ لکل باب منھم جزء مقسوم وکما فی الحدیث الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزء من النبوۃ او کما قال۔ اگر آیت میں حقیقی معنی قرار ہوں جیسا اصل بھی ہے اور اپنے محل میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ بدون تعذر معنی حقیقی کے مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں۔ تب تو مقصود پر دلالت ظاہر ہے کہ تقطیع کے بعد عروض موت یقینی ہے۔ اور اگر آیت میں حقیقی معنی مراد نہ ہوں تب بھی مقصود دلیل عقلی سے ثابت ہے کیونکہ اہل زیغ کی تفسیر پر یہ اہتمام ہی عبث ٹھہرتا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مانوس جانوروں کا بلانے سے چلا آنا کبھی نہ دیکھا تھا، یا اب نہ دیکھ سکتے تھے۔ اِس صورت میں اس کی تذکیر اور اس پر تنبیہ ہر کافی تھی۔ اور ان دونوں دلیلوں کے ساتھ اگر اجماع کو جو کہ آثار و اخبار منقولہ عن السلف اور عدم نقل خلاف سے ثابت ہے ملا لیا جائے تو مقصود میں اور قوت بڑھ جاتی ہے۔ انہی وجوہ مذکورہ میں سے بعض کی طرف روح المعانی میں بھی باختلاف عنوان اشارہ ہے۔ اِس کی عبارت ملخصاً یہ ہے فصرھن قرأ حمزۃ و یعقوب بکسر الصاد والباقون بضمھا مع التخفیف من صارہ یصورہ ویصیرہ لغتان بمعنی قطعۃ او امالہ لانہ مشترک بینھما کما ذکرہ ابو علی [1] (قلت) وتعیین

---

[1] یہاں اور آگے بھی قوسین کے اندر جتنی عبارتیں ہیں حضرت مولانا کی ہیں۔

معنى القطع مجمل جزء على المعنى الحقيقي) وقال الفراء الضم مشترك بين المعنيين و الكسر بمعنى القطع فقط وقيل الكسر بمعنى القطع والضم بمعنى الامالة وعن الفراء ان صاره مقلوب صراه عن كذا قطعه (قلت لما كان الاشتراك خلاف الاصل يترجح كون الكسر بمعنى القطع فقط وقد قوى به متواتر القراءتان في حكم الآيتين فترجح وقوع الامالة والقطع كليهما) واعظم منه فسادا ما قيل انه عليه الصلوٰة والسلام على كل جبل منهن طيرا حيا ثم دعاها فجاءت فان ذلك يبطل فائدة الطلب ويعارض الاخبار الصحيحة فان اكثرها ناطق باتحاد دعاها مفرقة الاجزاء الى قوله ومال الى هذا القول ابو مسلم وانكر القصة ايضا وقال ان ابراهيم عليه السلام طلب احياء الموتى من ربه سبحانه واراه مثالا محسوسا قرب الامر عليه والمراد بصرهن اليك اهلهن ومرهن على الاجابة لك عد دالطيور الاربعة بحيث اذا دعوتها اجابتك مال الحيوٰة والغرض منه ذكر مثال محسوس لعود الارواح الى الاجساد على سبيل السهولة ولا يخفى ان هذا خلاف اجماع المسلمين واضرب من الهذيان لا يركن اليه ارباب الدين وعدول عما يقتضيه ظاهر الآية (قلت اى مجموع سياقها خصوصا كلمة الفاء في فخذ اربعة الخ فانها للترتيب والوصل ترتب المطلوب على الطلب لا ترتب غير المطلوب والمطلوب مشاهدة احياء الموتى فدلالة الآية على هذا الاحياء) المؤيد بالاخبار الصحيحة والآثار الراجحة الى ما سمعه الاسماع ولا بد عوا اليه فالحق اتباع الجماعة ويد الله معهم۔

عربی تفسیروں میں حضرت کی خاص توجہ کا مرکز روح المعانی تھی، جیسا کہ ان کتوبات اور خود تفسیر بیان القرآن دونوں سے ظاہر ہے۔

آخر جون میں کوئی لڑکی، معلوم ہوتا ہے، زیادہ بیمار پڑی۔ حضرت کے کارڈ،

۲ر جولائی کے چلے ہوئے پر گل یہ عبارت ملی :۔

"السلام علیکم۔ برخورداری کے لئے دُعا کرتا ہوں۔ یہاں ہر طرح خیریت ہے"۔

لیکن سب خیریت کہاں تھی۔ سب کے لئے صحت و عافیت و مغفرت کی دُعائیں کرنے والا خود اپنی صحت کے لئے دوسروں کی دُعاؤں کا محتاج ہو رہا تھا۔ ۲۷ر اگست کو ایک عزیز نے لکھنؤ سے اطلاع دی کہ "حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کل شام کو تشریف لے آئے، اور مولوی محمد حسن صاحب کے ہاں مقیم ہیں۔ مرض میں بفضلہ تعالیٰ کمی ہے، مگر ضعف بہت ہے"۔

۸۰۔۸۲ سال کے سن میں خود ضعف ہی سب سے بڑا مرض ہوتا ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مرض کی حاجت ہی کیا تھی ـــــ حضرت کے لئے قریب کے مقام کا سفر، چہ جائیکہ لکھنؤ کا دُور دراز سفر، معمولی نہیں، غیر معمولی بات تھی۔ جب دُشواریاں ایسی ہی بڑھ جائیں، اور سارے مقامی علاج بے اثر رہ لیتے، جب کہیں خدام سفر لکھنؤ کا مشورہ دیتے، اور حالات کے مصارف سے کہیں یہ سفر ہو پاتا ـــــ سفر، اور پھر دوران جنگ عظیم، سنہ ۴۲ء و سنہ ۴۳ء و سنہ ۴۲ء کے سفر! معاذ اللہ۔ بلا مبالغہ کے بعد واقعی "نمونۂ سقر"!

حضرت ایک پورے قافلہ کے ساتھ لکھنؤ آگئے! ـــــ حضرت کا آنا کسی "لیڈر" کا آنا نہ تھا۔ نہ پوسٹر چھپے نہ اشتہارات تقسیم ہوئے، نہ ڈگی بجی، نہ رضاکاروں نے نعرے لگائے نہ مقامی اخبارات میں آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے باوجود خلقت کا ایک میلا صبح اور سہ پہر دونوں وقت لگا رہتا تھا۔ کوئی ملفوظات مبارک سے استفادہ کو آتا، کوئی مصافحہ اور دست بوسی پر ٹوٹا پڑتا، اور کسی کو محض شوق زیارت کھینچ کر لاتا۔ اولیاء الٰہی میں جو ایک خاص قسم کی کشش، محبوبیت و مرجعیت ہوتی ہے، اس کا نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور بار بار دیکھا ـــــ سنہ ۳۸ء میں بھی، سنہ ۴۰ء میں بھی، اور اب پھر سنہ ۴۱ء میں بھی، جب حضرت بہت زیادہ معذور ہو چکے تھے۔ تنا ہوا قد کمان بن چکا تھا، چال اور گردن پر اثر ضعف و پیرانہ سالی کا بہت زیادہ تھا۔

وصل بلگرامی کا ذکر ابھی دو ہی ایک نمبر اُدھر پھر آچکا ہے۔ لکھنؤ میں اُن کا مستقل قیام قیصر باغ، کوٹھی نمبر ۹ میں رہتا تھا۔ اپنا لکھنؤ جانا ۲۴ر یا ۲۵ر اگست کو ہوا تھا۔ حضرت کی آمد کی سُن گُن مِل چکی تھی۔ وصل صاحب سے زیادہ کار آمد خدام میں اور کوئی نہ تھا۔ ٹہلتا ہوا اُن کی طرف بھی گیا۔ اور جب وہ نہ ملے، اور یہ معلوم ہوا کہ ابھی تھانہ بھون سے آئے نہیں، صبح شام میں آنے والے ہیں تو اُن کے نام ایک پرچہ لکھ کر وہیں چھوڑ آیا تھا مضمون کچھ اِس قسم تھا۔

"آج تلاش وصل، میں آیا۔ ناکام واپس جا رہا ہوں۔ بہ ہمہ شوق آمدہ بودم۔ ہمہ حرماں رفتم۔ حضرت کے ہاں نئے معمولات اور اوقات مجلس خدا معلوم یہاں کیا رہیں گے، آپ تو مجسم وصل ہی ہیں۔ رہبر آپ سے بہتر کون مِل سکتا ہے"

وصل صاحب کا ۲۹ر کا لکھا ہوا کارڈ ۳۰ر کو موصول ہوا:-

"میں حضرت اقدس مدظلہم کے ہمراہ ۲۶ر اگست کی شام کو آیا۔ بیٹر بکس میں آپ کا گرامی پرچہ ملا۔ حضرت اقدس کو سُنایا اور لُطف اُٹھایا۔

کل شام کو آپ کا پوسٹ کارڈ باعث اعزاز و کاشف حالات ہوا۔ آج صبح کو وہ کارڈ حضرت اقدس کو سُنایا۔ آپ کے الفاظ، عبارت، مضمون اور بالخصوص طرزِ ادا سے حضرت کو بھی مسرت ہوئی، اور بہت دیر تک بہت کچھ فرمایا۔

جواب ملاحظہ ہو (آگے حضرت اقدس مدظلہم العالی کے الفاظ ہیں)

"اجنبیوں کے لئے قواعد ہیں، اپنوں کے لئے نہیں۔ جب آپ تشریف لائیں اپنے نظام اوقات سے مطلع کر دیں، اُس کے لحاظ سے وقت مقرر کر دیا جائے گا"

یوں تو بعد نماز فجر چند خاص لوگ آ جاتے ہیں اور حضرت کی اجازت سے ان کو باریابی ہو جاتی ہے قریب نو بجے تک نشست رہتی ہے۔ سہ پہر کو تین بجے سے مجلس عام ہے، مگر اُن لوگوں کی جن سے حضرت اقدس واقف ہیں۔ علاج حکیم عبد المجید صاحب کا شروع کر دیا گیا ہے۔ خدا کرے کامیابی ہو"

یہ حکیم عبد المجید صاحب جھوائی ٹولوی اُن ہی شفاء الملک حکیم عبد الحمید مرحوم کے بھائی تھے[1] اور خود بھی شفاء الملک کے خطاب سے ملقب، اور ویسے ہی طبیب حاذق نامور۔

۱۵ ستمبر کے صدق میں "حکیم الامت کی علالت" کے عنوان سے نوٹ حسب ذیل نکلا:۔

"حضرت مولانا تھانوی مدظلہ و طول اللہ عمرہ کا سلسلۂ علالت عرصہ سے چل رہا تھا۔ خدام کے مشورہ اور گذارش پر آخر اگست سے قیام لکھنؤ میں ہے۔ اور علاج شہر کے نامور طبیب حکیم عبد المجید صاحب (جھوائی ٹولہ) کا ہو رہا ہے۔ تھانہ بھون سے لکھنؤ کے طویل سفر میں خدام کی طرف سے راحت و آسایش کی ہر کوشش کے باوجود جو تعب لازمی طور پر اُٹھانا پڑا ظاہر ہے۔ تاہم بحمد اللہ یہاں آکر مرض بہت کچھ قابو میں آگیا ہے۔ اور حکیم صاحب اور ان کے مشیروں کی رائے میں مرض بڑھ نہیں رہا ہے بلکہ گھٹ رہا ہے۔ البتہ افاقہ کی رفتار بہت ہی سست ہے اور ضعف بہت ہی زائد ہے۔

اس شدید ضعف و نقاہت و لاغری کے باوجود افادات عالیہ جاری ہیں۔ صبح سویرے کی نسبتہً مختصر اور بعد ظہر کی طویل اور بڑی، دونوں مجلسوں میں گویا حکمت و عرفان کا دریا جاری رہتا ہے۔ اور حکیمانہ و عارفانہ مسائل و مضامین مسلسل بیان ہوتے رہتے ہیں۔ مصلح ملت و حکیم اُمت کی کوئی بات اصلاحی شان سے خالی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ جو اپنے مرض کی کیفیت بیان کرتے ہیں، عبادت کرنے والوں کو جو جوابات مرحمت فرماتے ہیں، اپنے کو جس شان تسلیم و رضا کے ساتھ طبیب حاذق و مشفق کے سپرد کئے ہوئے ہیں ان سب میں اصلاحی پہلو اور بہت سے سبق، ہر دیکھنے والے کو ہر وقت ملتے رہتے ہیں، اور لطائف و ظرافت کا سلسلہ طبیعت کے اس قدر بے کیف و مضمحل ہونے پر بھی منقطع نہیں ——— اللہ ایسے وجود کا سایہ اُمت کے سر پر مدتوں مدتوں قائم رکھے"

---

[1] یہ "تھے" صیغۂ ماضی میں محض روایات ماضی کے لحاظ سے ہے۔ ورنہ حکیم صاحب ما شاء اللہ اور بہ فضل خدا اس وقت تک ہر طرح بخیریت ہیں (جون ۱۹۴۲ء)

حاضری لکھنؤ کی ہوئی، اور چند صحبتوں میں جتنا بھی استفادہ ممکن تھا، ہوا ——— حضرت کی مجلسوں کا رنگ اب بھی وہی تھا۔ وہی تفسیری، فقہی، کلامی نکتے، وہی عارفانہ نکتہ سنجیاں، وہی مسائل اصلاح و تربیت کا زور، وہی علوم کے حقائق و دقائق۔ بس فرق جو کچھ بھی ہو گیا تھا، وہ بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی میں کہ اب وہ پہلی سی نہیں رہی تھی۔ اور ضعف کی تو حد ہی نہ تھی۔ اکثر حضرت چارپائی ہی پر تکیہ کے سہارے تشریف رکھتے، اور لوگ نیچے فرش پر بیٹھے رہتے، ورنہ اس سے قبل یہ کہاں ممکن تھا ——— ہر صاحب نظر کو یہ نظر آ رہا تھا، حسرت و غم و یاس کے ساتھ نظر آ رہا تھا کہ نسیم سحر اب چلنے کو اور چراغ بجھنے ہی کو ہے! پروانے دور دور سے دوڑ دوڑ کر چلے آ رہے تھے، اور شمع تھی کہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر تیزی کے ساتھ گھلتی ہی جا رہی تھی! قیام لکھنؤ میں عرصہ تک رہا، کھنچتا ہی چلا گیا۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کا باضابطہ تعلق بیعت یہیں غالباً شروع اکتوبر میں ہوا۔

۲۶ ستمبر کو وصل صاحب نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا:۔

"کل شام کو آپ کا جوابی پوسٹ کارڈ باعث عزت افزائی ہوا۔ حضرت اقدس ظلہم العالی کا مزاج بظاہر ابھی ویسا ہی ہے جیسا آپ دیکھ گئے تھے، لیکن ورم میں کمی ضرور ہے۔ اور حکماء بتاتے ہیں کہ مزاج بحمد اللہ رو بصحت ہے، اس طرف کچھ دست آ گئے تھے، اب بفضلہ تخفیف ہے۔ میں نے آپ کا سلام عرض کر دیا، ارشاد ہوا کہ میرا بھی سلام لکھ دو، اور دعا کے لئے بھی۔

سوء مزاج میں یہ اتار چڑھاؤ جاری رہا۔ اپنا پھیر لکھنؤ کا، باوجود ماہ رمضان کے آ جانے کے جلد جلد ہوتا رہا، کچھ اطلاعیں دوسروں سے بھی ملتی رہیں، یہاں تک کہ شروع اکتوبر میں حضرت بظاہر صحت مند ہو کر لکھنؤ سے وطن واپس تشریف لے گئے ———

اور آہ، کہ کون جانتا تھا، یہ حضرت کا آخری سفر اس عالم ناسوت میں تھا،

۲۳ر اکتوبر (یوم عید الفطر) کو جو عریضہ لکھا، وہ اپنی اندرونی اور باطنی حالت کا بالکل فوٹو تھا۔ سب کچھ اُس میں اُگل ڈالا ہے۔

م: خدا کرے اب افاقہ میں اضافہ اور قوت و توانائی مزید حاصل ہو گئی ہو۔

ا۔ الحمد اللہ بہ برکت دُعائے احباب ایسا ہی ہے۔

م۔ اِس ماہ مبارک میں خدا معلوم جناب والا کی عُمر و صحت میں برکت کی دُعائیں دل و زبان دونوں پر آتی رہیں، اور یہ سب اپنی خود غرضی کی بنا پر۔

ا۔ کیا ہر خود غرضی غیر محمود ہے۔ مولانا نے اِس کا خوب فیصلہ فرمایا ہے ؎

چُوں طمع خواہد زمن سُلطان دین　　　خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں!

م۔ اپنی تفسیری خدمات میں نفع سب سے زیادہ بیان القرآن ہی سے حاصل کرتا ہوں۔ اگرچہ پیش نظر اور بہت سی تفسیریں رہتی ہیں، اکابر کی بھی۔ ع

بسیار خُوباں دیدہ ام لیکن تُو چیزے دیگری

ا۔ پسند کا مدار مناسبت پر ہے، اور مناسبت کبھی چھوٹے سے بھی ہو جاتی ہے۔

م۔ ابھی پرسوں ہی سورۃ النساء میں آیت مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَا میں مِنْ قَبْلِ کی جو تقریر بیان القرآن میں نظر آئی اور کہیں نہ ملی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ا۔ فضل کا بیشک کوئی قاعدہ نہیں بجز مشیّت کے جو آیت میں منصوص ہے۔

م۔ عین ختم رمضان پر شب گذشتہ میں خواب یہ دیکھا کہ جناب والا کہیں سفر میں مقیم ہیں۔ اپنے مجمع کے اور بہت سے حضرات ساتھ ہیں۔ خواجہ صاحب سب سے پیش پیش ہیں۔ شب کا وقت ہے۔ مَیں بھی ایک طرف سونے لیٹ گیا ہوں، جناب نے مجھے سوتا ہوا خیال فرما کر خواجہ صاحب سے میرا ذکر شروع فرمایا۔ نام میرا نہیں آنے پایا، لیکن اشارے سب اپنی جانب سمجھ رہا ہوں پہلے بہت سے کلمات حسن ظن اور عزت افزائی کے

فرمائے۔ اس کے بعد کپڑوں کی ایک بڑی گٹھری کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ کاش یہ اس کو لے کر بازار میں بیچنے کو نکلتے تو بہت خوب ہوتا (یا یہ کہ اپنی مُراد کو پہنچ جاتے)۔ اِس فقرہ کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ روتا جاتا ہوں اور اپنے دل میں کہتا جاتا ہوں کہ مولانا نے ارشاد فرما دیا کہ محض علمی خدمات کافی نہیں۔ اپنی اصلاح اگر واقعی مقصود ہے تو اپنے پندار کا بُت توڑنا چاہیے اور خلق کی نظروں میں اپنے کو گرانا اور حقیر بنانا چاہیئے۔ اِس کے بعد آپ اُٹھ کر تشریف لے گئے۔ میں خواجہ صاحب سے لپٹ کر خوب رو رہا ہوں، اُن کی ڈاڑھی کو بوسہ دیتا جاتا ہوں اور اپنے حال پر نفرین کر رہا ہوں۔ خواجہ صاحب تشفّی اور دلدہی کر رہے ہیں آخر میں دیر کے بعد ہمّت کر لیتا ہوں اور بوجھ اُٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہوں۔ بس آنکھ کھُل گئی۔

ا۔ ہدایت اور بشارت ہے۔ اور خواب میں محض صورت مقصود نہیں ہوتی، معنی مقصود ہوتے ہیں معنی اس کے اصلاح ہے عُجب کی جس کا طریق صاحب معاملہ کے اجتہاد سے یا کسی شیخ کی تعلیم سے متعیّن ہو سکتا ہے۔"

خط کا ایک اہم ٹکڑا ابھی باقی ہے:۔

م۔ لکھنؤ میں آپ کی جتنی بار خدمت والا میں حاضر ہوا، خواجہ صاحب وغیرہ کو دیکھتا تھا کہ بار بار جناب کے چہرہ کی طرف دیکھتے اور اس میں لذت محسوس کرتے تھے اپنے میں اس کی تو ہمّت ہی نہیں پائی۔ البتہ نظر جناب والا کے ہاتھوں اور انگلیوں پر جمائے رکھتا تھا، اور دل میں کہتا جاتا تھا کہ اللہ اللہ دین کی کیسی کیسی خدمات اِن انگلیوں نے انجام دی ہیں!

ا۔ یہ سب غلبۂ حُسنِ ظن سے ناشی ہے۔ ورنہ میں اس کی پُرانی مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی بچّہ کے ہاتھ میں قلم دیجئے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیجئے اور کر دیا کچھ شعر لکھئے بچّہ فخر کرتا ہے کہ دیکھو میں نے کیسا لکھا ہے، اور واقعہ یہ ہے ؎

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

م۔ مدینہ منورہ کی حاضری کے وقت بھی نظر گنبدِ خضراء کی طرف اٹھتی تھی نہ مواجہہ مبارک میں جانے کی ہمت کرتا تھا۔ مسجدِ نبویؐ میں قدم رکھتا تو گویا در و دیوار سے یہ صدائے ملامت و نفرین سنتا کہ یہ وقت دین کی نصرت کا ہے اور یہ بیہودہ محض لفاظی میں پڑا ہوا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کبھی ہمت ہوئی تو جا کر روضۃ الزہرؓ کے پائیں میں بیٹھ گیا، اور جو کلام آنحضورؐ لے کر آئے تھے وہی کچھ دیر کے لئے انھیں سنا دیا۔

ا۔ یہ اعلیٰ درجہ ہے فنا کا جو مجاہدات سے بھی میسّر نہیں ہوتا۔ جو بلا تعب میسّر ہو گیا کتنی خوش قسمتی ہے۔

م۔ مجھے تو یہ سبق جو مدینہ طیبہ کی حاضری میں ملا تھا بس اسی سے ملتا جلتا ہوا آپ کی مجلسوں میں ملتا ہے۔ یعنی بجائے ذوق و شوق بڑھنے کے اپنی ہی گندگی، ابتری اور تباہ کاری کا اور زیادہ احساس۔

ا۔ خُرد بین کی یہی خاصیت ہے کہ رائی گنبد نظر آتا ہے۔ سو یہ رائی کا کمال نہیں عربی رائیؐ[1] کا کمال ہے۔ "رزقنا اللہ جمیعاً"۔

خدا جانتا ہے کہ حضرت کے قلم سے نکلے ہوئے ایسی ہمّت افزائی کے کلمات نقل کرتے ہوئے آج بھی شرم سے گڑا جاتا ہوں۔ اور اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ ایسے تمام موقعوں پر حضرت خود بھی افراطِ حسنِ ظن سے مغلوب ہو گئے ہیں ——— کیا اجتہاد میں غلطی بڑے سے بڑے مجتہد سے بھی نہیں ہو جاتی؟ ——— لیکن اگر ان سب مقامات کو حذف کر دیا جائے، تو پھر "حکیم الامت" کے نقوش و تاثرات نگاری کا آخر حق دیانت کیونکر ادا ہو گا!

۱۵ ر دسمبر کا عریضہ بھی بعض ضروری مضامین کا حامل ہے ——— محض توفیقِ خداوندی

[1] رائی عربی میں دیکھنے والے۔ نظر کرنے والے کے معنی ہیں۔

تھی کہ ایسے ایسے مسئلے جلدی جلدی پوچھ لیئے، جو نہ یاد پڑے یا نہ پوچھے جا سکے۔ آج اُن کے لئے بس حسرت ہی حسرت ہے :-

م:- ایک مسئلہ بہت مدت سے کھٹک رہا ہے۔ گذارش کی نوبت آج آ رہی ہے۔ سوال فارسی اور اُردو شاعری کے بڑے حصہ سے متعلق ہے۔ شاعروں نے کس کس طرح کفریات بکے ہیں اور اپنے اعمال فاسقانہ پر کیسا کیسا فخر کیا ہے۔ جنت پر، حور و قصور پر، ملائکہ پر ضحکہ، شراب کی مدح اور شراب خواری کی ترغیب، اپنی میخواری و حرامکاری پر فخر، ساری عبادت و تقویٰ کی قیمت ایک ساغر کو ٹھہرانا، صنم، بُت، طفل ترسا، مُغبچہ، اِس قبیل کے الفاظ کو موقع مدح پر لانا، ان خرافات کو مجاز کہہ دینے کی آخر سند کیا ہے؟ کتاب و سُنت نے ان اقوال کے قائلوں کو آخر کہاں مُستثنیٰ کیا ہے، چہ جائیکہ ایسے شاعروں کو بزرگ اور عارف باللہ سمجھنا!؟

ا- شاعری کی کیا تخصیص ہے۔ نثر میں بھی اگر ایسے مضامین ہوں اُن سے بھی ایسا ہی انقباض ہونا لوازم ایمان سے ہے مگر جس طرح اِس پر انقباض ضروری ہے، اور لوازم ایمان سے ہے اُسی طرح قائل کے ساتھ اگر کوئی صریح دلیل خلاف نہ ہو حُسن ظن بھی ایسے ہی لوازم سے ہے۔ سب سے زیادہ مُنتظم اور دین کے مُحافظ اور شاعروں کے مقابل گو وہ صوفیہ ہی ہوں فُقہاء ہیں۔ مگر انھوں نے دلائل شرعیہ سے یہ حکم فرمایا ہے کہ اگر کسی کلام میں ننانوے محمل کُفر کے ہوں اور ایک ایمان کا، تو اُس کو محمل ایمان ہی پر محمول کریں گے۔ اور ضرورت اِس کی اُن کے ایمان کی حفاظت نہیں بلکہ اپنے ایمان کی حفاظت ہے کہ دلائل شرعیہ کی مخالفت نہ ہو، جس کی توفیق بلاقصد آپ کو بھی عطا ہو گئی۔

م- اُن کی شخصیتوں سے بحث نہیں۔ عند اللہ وہ جیسے بھی ہوں، سوال صرف اُن کے کلام کی بابت ہے۔

۱۔ اِس قول میں کہ اُن کی شخصیّتوں سے الخ اِس طرح آپ کا اختلاف خود اُٹھ گیا"
مسئلہ بجائے خود یہی صحیح ہوگا۔ لیکن اپنی فہم ناقص کو کیا کیا جائے خلش آج تک بدستور
باقی ہے۔ کلام اگر فاسقانہ و کافرانہ ہے، تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کلام پر حکم بھی فسق و کفر کا لگنا چاہیئے۔

حضرت کی واپسی تھانہ بھون کے بعد ہی صدق میں یہ نوٹ حکیم الامت کی صحت کے عنوان سے نکلا تھا۔
حضرت مولانا اشرف علی صاحب مدظلّہٗ لکھنؤ میں ایک طویل قیام کے بعد آخر رمضان میں
وطن واپس تشریف لے گئے صحت خدا کے فضل سے بڑی حد تک درست ہو گئی یعنی اسہال
وغیرہ کی جو شکایتیں تھیں، وہ بحمداللہ جاتی رہیں ضعف میں بھی خاصی کمی ہو گئی البتہ پُشت پا پر
ورم کی شکایت ابھی باقی ہے، جو اِس سن میں اکثر ہو ہی جاتی ہے۔ علاج لکھنؤ میں جھوائی ٹولہ کے
مشہور و حاذق طبیب حکیم عبدالمعید صاحب ناظم مدرسۂ تکمیل الطب کا جاری رہا۔ اللہ
اِس آفتاب ارشاد و ہدایت کو مدّتوں روشن رکھے، باوجود اِس ضعف و معذوری کے سلسلۂ
فیض زوروں سے جاری رہا، اور خدا جانے کتنے اِس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔
مجلس کی کیفیت دیکھنے ہی سے تعلّق رکھتی تھی۔ بعض بہت نامور اور نمایاں ہستیوں نے بھی
اب کی بار اپنا تعلّق اصلاح اِسی مرکز رشد و ہدایت سے پیدا کیا۔

(صدق ۳ رنومبر ۱۹۴۱ء)

اور اس کے بس چند ہفتے بعد ذیل کی تحریر صدق میں نکلی جو آپ اپنی شارح و ترجمان ہے اور
اِس لئے تمہید سے بے نیاز۔

صحبت شیخ۔ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلّہٗ کا قیام پچھلے ستمبر
اکتوبر میں بسلسلۂ علالت لکھنؤ میں عرصہ تک رہا۔ کبھی کبھی اِس نامہ سیاہ کو بھی توفیق دریاباد
سے لکھنؤ کا سفر کرکے حاضری کی ملتی رہی۔ باہر کے ایک بزرگ نے، کہ وہ اہل دل بھی ہیں
اور صاحب علم و صاحب تصانیف بھی اور باوجود اس کے بھی کہنا چاہیئے کہ گمنام ہی سے ہیں[1]۔

---

[1] مُراد مولانا الحاج محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے تھی۔

فرط شفقت سے اُسے توجہ دلائی کہ حاضری کا اہتمام زیادہ رکھنا چاہیئے۔ جواب میں کچھ عذر یا اور طویل قیام لکھنؤ کی خرابیاں عرض کی گئیں۔ اس جواب کے جواب میں اِدھر سے جو کچھ ارشاد ہوا، وہ اس قابل ہے کہ اس میں ناظرین صدق کو بھی شریک کر لیا جائے۔

میرا مقصد یہ نہ تھا کہ آپ کے یہ مبارک اوقات بہترین شغل میں نہ گزرتے ہوں گے۔ اس کا تو مجھے خود ہی خیال تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ حضرت کے اس قُرب سے انتفاع کی طرف آپ کی توجہ خاص طور پر مبذول کرا دوں۔ اپنے خیال ناقص میں حضرت کا یہ سفر درحقیقت کسی اہم تربیت ہی کے لئے ہے۔ اِس لئے بہ مقتضائے الطاف دل چاہا کہ جناب کی خدمت میں لکھنے کی جرأت کروں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ دریاباد سے قریب ہونے کے باعث کسی خاص حرج یا وقت کا موجب نہ ہوگا لیکن جناب نے جو وہاں کے قیام کے خصوصی موانع اور کثرت احباب واعزہ کی بناء حرج کا تحریر فرمایا ہے تو یقیناً حرج کا مقصود نہیں ہو سکتا۔ البتہ جناب کا یہ ارشاد کہ "طویل ملفوظات جو چھپے ہوئے بھی دیکھے جا سکتے ہیں" ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے نقطۂ خیال سے مقصود تو زیارت اور ملفوظات دونوں نہیں، بلکہ اصل مقصود صحبت ہے۔ اہل اللہ کی صحبت، اعمال کی پختگی، دین کی صلابت، ایمان کی حرارت وغیرہ میں ایک مستقل حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے جس کی نظیر صحابہ کرام کا حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہنا ہے۔ مشبّہ اور مشبّہ بہ میں گو فرق زمین و آسمان سے بھی زیادہ کا ہو، لیکن نوع بہرحال ایک ہے۔ اس کے لئے اہمیت نہ ملفوظات کی ہے نہ خلوت کی۔ میں اصرار نہیں کرتا۔ آپ خود ہی اپنے قلب سے استفتاء کر لیں۔ استفت قلبک ولو افتاک المفتون۔ تفسیر بیان القرآن کے اوصاف جو آپ نے بیان فرمائے بالکل صحیح ہیں مجھے بھی بسا اوقات اس کی زیارت کی نوبت آتی رہتی ہے لیکن اس میں مشغول رہنا تو انتفاع مولانا کے علوم سے ہوا، مولانا کی ذات یا قُرب سے ہوا۔ قُرب مجلسی میں آخر کوئی چیز تو ہے جس کی طرف وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ میں اشارہ ہے اور حضور اقدسؐ کا اس آیت پر یہ ارشاد کہ الحمد للہ الذی جعل فی امتی من امرنی

ان اصبر معہم۔ اور جب حضور کا یہ عمل چھوٹوں اور اُمتیوں کے ساتھ ہو تو اس کے عکس کو خیال فرمالیں"

زمانہ کے شدید فتنوں میں سے ایک فتنہ صحبت صالحین سے بے نیازی کا ہے۔ کتابوں سے اس میں شبہ نہیں کہ معلومات بہت سے حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن زندہ شخصیت کی تاثیر ہی کچھ اور ہے، پیر پرستی کی منزل سے یقیناً بچنا چاہیئے، لیکن بزرگوں کی صحبت سے بے نیازی بھی کچھ کم مہلک نہیں۔ اور عجب ونخوت، خود رائی وخود پسندی کا بُت تو بغیر اس کے ٹوٹتا ہی نہیں۔

(۱۰۹)

دو تحریریں صدق کی درمیان میں حائل ہوگئیں مکتوب وہی ۵ اردسمبر والا چل رہا تھا اب اُس کا بقیہ ملاحظہ ہو:۔

م "اب ایک گذارش اپنی ذات خاص سے متعلق ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ بزرگوں کے کمالات وکرامات اور اُن کے مناقب کے کلام سے بڑی دلچسپی تھی، اور توحیدی مضامین خشک وبےمزہ معلوم ہوتے تھے۔ اب ایک عرصہ سے صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب توحید ہی کے مضامین سُننے اور پڑھنے کا دِل چاہتا ہے۔ اور بڑے سے بڑے بزرگ کے لئے اُن کی بشریت کا تصور اتنا غالب آجاتا ہے کہ ان کے کرامات ومناقب میں اب زیادہ جی ہی نہیں لگتا۔ حد یہ ہے کہ نعتیہ کلام میں بھی اب اگلی سی دلبستگی باقی نہیں۔ اور دِل لطف اِس فقرہ سے لیتا ہے جو اکبر الہ آبادی مرحوم کی زبان سے ایک بار سُنا تھا کہ "ہمارے اللہ میاں کا کیا کہنا، دیکھئے ایک بشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا جامع کمالات پیدا کر دیا" طبیعت بس ایسے ہی مضامین کو ڈھونڈتی ہے۔ خدا معلوم یہ حالت کیسی ہے۔ اگر قابل اصلاح ہو تو للہ اصلاح فرمائی جائے۔

جناب والا کے ضعف وسوء مزاج پر نظر کر کے اب کسی طویل مسئلہ کے چھیڑنے کی

ہمّت ہی نہیں پڑتی - یہ عریضہ بھی کئی ہفتہ کے تردّد و تامل کے بعد ہی لکھ سکا ہوں۔ اللہ ایسے وجودِ گرامی کو مدتوں افادۂ خلق کے لئے ہر طرح صحیح و تندرست رکھے۔

۱۔ یہ حالت جو لکھی ہے اِس میں بلا کسی زائد تفصیل کے میں خود متفق ہوں۔ میرا خود بھی مذاق ہے۔ لیکن اس کا حاصل نمک اعتدال سے کھانا ہے، جس کو خود تو حق ہے کہ زیادہ تیز نمک کا کھانا نہ کھائے۔ لیکن زیادہ نمک کھانے کی مذمت کرنا یا اتنا نمک کھانے والے پر اعتراض کرنا اس کا حق نہیں۔ البتّہ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ زیادہ حدِ اصول سے نہ نکل جاوے۔ اور راز اس کا یہ ہے کہ ایسی چیزوں میں دلچسپی یا عدم دلچسپی غیر اختیاری ہے۔ فلا یلوم بعضہم بعضاً

افسوس ہے کہ اِس جواب سے بھی تشفّی جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی نہ ہوئی ——— یہ کھٹک برابر قائم رہی، کہ جو لوگ حق توحید کے ادا کرنے میں تفریط و تساہل سے کام لے رہے ہیں، اور مخلوق کی تعظیم و ارادت میں افراط سے، اِن پر مومنین صادقین ہی کا اطلاق کہاں تک جائز ہے؟

۱۹۴۲ء

۴۲ء ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ سفر پشاور کی ٹھہری۔ اسلامیہ کالج پشاور کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ ۱۸ جنوری کو پشاور پہنچ کر طلبہ کے سامنے کسی دینی موضوع پر کوئی مقالہ پڑھئے[1]۔ سہارنپور سے ہو کر آمد و رفت دونوں میں ہو کر گذرنا تھا۔ جی نہ مانا کہ تھانہ بھون اتنا قریب رہ جائے، اور میں بالا بالا گذر جاؤں۔ وقت بہت کم رہا تھا، لیکن یہ تو حضرت کی ایک مستقل کرامت تھی کہ چند منٹ کی صحبت بھی بڑے فراغ خاطر اور دلجمعی کی صحبت ہو جاتی تھی، پشاور و لاہور سے واپسی پر ۲۱ جنوری کو دن ہی دن میں سہارنپور سے تھانہ بھون کی آمد و رفت میں وہاں قیام کا موقع کل ڈیڑھ دو گھنٹہ کا ملتا تھا۔ بے تکلف حضرت کو بھی لکھ بھیجا، اور یہ بھی لکھ دیا کہ اتنی دیر کے لئے مہمان وصل صاحب کا رہوں گا۔ حضرت کو زحمت ذرا بھی نہیں دینا چاہتا، چائے کی مہمانداری اُن ہی کے سر رہے گی۔

حضرت نے جواب میں کارڈ پر صرف یہ شعر لکھ بھیجا ؎

"ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست   وگرنہ عاشق مسکیں بہیچ خورسند ست"

خیر، ۲۱ جنوری (یکشنبہ) کی دوپہر کو جب تھانہ بھون پہنچا، تو وصل صاحب حسب توقع اسٹیشن ہی پر ملے۔ اور حضرت کا یہ پیام پہنچایا کہ "چائے میرے ہاں پیجئے۔ اس کو وصل صاحب ہی کی طرف سے سمجھئے۔ مجھ پر یہ بار مطلق نہ ہوگا۔ یہیں سے اسٹیشن واپس جائیے۔ اور

---

[1] یہی مقالہ ہے جو پہلے "نئی قصص الانبیاء" کے نام سے الگ شائع ہوا، اور پھر "قصص و مسائل" کا جزو بن کر۔

اگر بہ سہولت اور کسی انتظام میں خلل پڑے بغیر مزید گنجایش قیام کی نکل سکے تو نکالیئے، ورنہ اپنی مصلحت کو مقدّم رکھیئے۔"

آج وصل صاحب کی رہنمائی میں بجائے خانقاہ و مہمان خانہ کے حضرت کے چھوٹے زنانہ گھر میں لایا گیا۔ پردہ ہوا، اور پہلی بار وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ جاڑوں کا شباب تھا حضرت دھوپ میں صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں نشست رہی ـــــ حضرت کے اخلاق و کرم کا کیا کہنا۔ کوئی پَون گھنٹہ مجالست و مکالمت رہی۔ خانقاہ ہوتا ہوا اور مولوی شبیر علی صاحب سے ملتا ہوا وصل صاحب کی معیت میں اسٹیشن آیا، اور گاڑی پر بیٹھ روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر کوئی عریضہ ضرور لکھا ہوگا، افسوس ہے کہ کاغذات میں دستیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد کا لکھا ہوا خط ۲۳ مارچ کا، حسبِ ذیل ملا:۔

م ؒ النور، بابت ذی الحجہ ؁ میں امداد الفتاویٰ کے ذیل میں ص ۹ کے نصف آخر میں جو سوال درج ہے، اس میں ایک جگہ یہ عبارت ہے کہ "دُنیاوی موجودہ قانون میں نیّت پر دارومدار رکھا گیا ہے۔ اگر کسی کو قانونی غلط فہمی ہو جائے اور نیک نیتی سے سمجھ کر کرے تو قانون اس شخص کے ساتھ رعایت کرتا ہے" حضرت نے اصل سوال کا جو جواب مرحمت فرمایا ہے۔ وہ بالکل کافی ہے۔ لیکن اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ سائل صاحب کی عبارتِ بالا واقعہ کے خلاف ہے۔ مجھے معلوم انھیں کیا غلط فہمی ہو گئی۔ دُنیوی موجودہ قانون (نہ انگریزی حکومت کا اور نہ میرے علم میں کسی اور حکومت کا) تو قانون کی لاعلمی یا غلط فہمی کو کسی درجہ میں بھی عذر نہیں قرار دیتا۔ بلکہ بعض کتُبِ متعلقہ کے تو شروع ہی میں درج رہتا ہے کہ قانون سے ناواقفیت کوئی عُذر شمار نہ ہوگا۔

ا ـ مجیب کے ذمہ واقعہ کی تحقیق نہیں۔ واقعہ کا اثر بیان کرنا اُس کا منصب ہے جیسے طبیب سے کسی مریض کا حال بیان کیا جاوے کہ اُس کے سر میں درد ہے، اس کا کام یہ ہے کہ دردِ سر کا نسخہ بتلا دے نہ یہ کہ کسی خاص ذریعہ سے اس کی بھی تحقیق کرے کہ کیا

واقع میں اس کے سر میں درد ہے۔ یا یہ جواب علیٰ سبیل التنزل ہے کہ اگر ایسی نیت کو مؤثر بھی مان لیا جاوے تب بھی اعتراض اس لئے واقع نہیں ہوتا کہ ایسی نیت کا تحقق ہی محقق نہیں۔

م۔ اب دو عبارتیں تفسیر بیان القرآن کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

جلد ۳ ص ۲۰ وجعلکم ملوکاً کے تحت میں یہ عبارت درج ہے:۔

"تم کو صاحب ملک بنا دیا (چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہو چکے ہو)

لیکن فرعون کے ملک پر تو اس وقت بنی اسرائیل کا قبضہ ہو جانا تاریخ سے ثابت نہیں۔ ملک کے معنی اگر غلامی، محکومی سے نجات پا جانے والے آزاد و خود مختار کے لئے جائیں (جیسا کہ اکابر سلف کے معنی بیّنا اقوال میں پایا جاتا ہے[1]) تو یہ عبارت حسب ذیل ہو سکتی ہے:۔

"تم کو خود مختار بنا دیا (چنانچہ فرعون کی غلامی سے ابھی ابھی نجات پا چکے ہو)

اسی طرح اسی صفحہ پر فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ کے تحت میں درج ہے کہ "یہ ملک اُن کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا رستہ ہی نہ ملے گا)"

اس میں "گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا" سے معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کا ملک کوئی اور تھا اور بنی اسرائیل کا وطن کوئی اور۔ حالانکہ دونوں ایک ہی تھے۔ اس لئے ان چند الفاظ "اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا"، کو اگر حذف کر دیا جائے تو کوئی اُلجھن باقی نہ رہے گی"

ا۔ یہ دو سوال تاریخ سے متعلق ہیں۔ اگر فتح مصر مقدم ہے تو تفسیر موجودہ صحیح ہے اور اگر مؤخر ہے تو آپ کی تفسیر صحیح ہے۔ میں نے قرائن سے تقدم فتح مصر کو راجح سمجھا۔ باقی

---

[1] یہ ساری بحث اس کے قبل بھی گذر چکی ہے۔

احتیاطاً میں نے آپ کی تحقیق کو شایع کرنے کے لئے دیدیا۔ جو جس کو راجح سمجھے گا اختیار کر لے گا۔

علیٰ ہذا دُوسرا سوال اتحاد و تغائر کا بھی تاریخی ہے، جس سے کسی مقصود میں خلل نہیں پڑتا؛ اب مجھے خیال ہوتا ہے کہ مجھ سے یقیناً ادائے مفہوم میں کمی رہ گئی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ عدم تقدم فتح مصر تو ایک بالکل کھلا ہوا اور غیر اختلافی تاریخی مسئلہ ہے۔ اور فلسطین اور وطن اسرائیل کو مغائر سمجھنے کی تو آج دُنیا دبھی کسی جغرافیہ خوان مبتدی کے سامنے نہیں۔ میرا مفہوم اگر پُورا واضح ہو گیا تھا، تو حضرت نے بلا تامّل اپنی عبارتوں میں ترمیم قبول فرمائی ہوتی جس کی نظیریں چند نمبر قبل تفسیر قرآن ہی کے سلسلہ میں متعدد گذر چکی ہیں۔

(۱۱۰)

تفسیری مذاکرے اب پھر چل نکلے تھے۔ ۹ اپریل کا مکتوب اصلاً انھیں کی نذر ہے:۔

۱۔ در تفسیر بیان القرآن، جلد ۳۔ ص ۴۲۔ سورۃ المائدہ کی آیت وجعل منھم القردۃ والخنازیر کا ترجمہ "اُن کو بندر اور سُور بنا دیا" درج ہوا ہے مگر یہ ترجمہ تو جعلھم کا ہوا نہ کہ جعل منھم کا۔ من کی رعایت "شاہان دہلی" کے تینوں ترجموں میں ملتی ہے۔ ایہی صحیح ہے۔ اگرچہ اُس پر یہ سوال رہ جاتا ہے کہ کیا بعضے باوجود لعن و غضب کے اِس سزا سے محفوظ رہے اور کیوں۔ اور گو میرا ترجمہ من کے زائد مان لینے پر صحیح ہو سکتا ہے لیکن میں اِس توجیہ کو اپنے ترجمہ کے لئے اِس لئے پسند نہیں کرتا کہ اِس وقت اگر یہ دُنیا دمیرے ذہن میں ہوتی تو حسب عادت تفسیر میں اس سے تعرض ضرور کرتا۔ رہا سوال مذکور سو اس کا جواب کافی روح المعانی میں مل گیا لئے مسخ بعضھم قردۃ وھم اصحاب السبت وبعضھم خنازیر وھم کفار۔ اب اِس کا ترجمہ اِس طرح بدلتا ہوں "اُن میں سے بعضوں کو بندر اور سُور بنا دیا"۔

۲۔ ایک دُوسری بات اِس سے اہم تر عرض کرنی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ قردۃ سے اشارہ اصحاب السبت یعنی یہود کی جانب ہے اور خنازیر سے مُراد اصحاب مائدہ

یعنی عیسائی ہیں۔ سو اب اگر یہی مُراد لی جائے کہ کچھ عیسائی کسی زمانہ میں انسان سے سُور بن گئے تھے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ کب اور کہاں پیش آیا ہے؟ اصحاب السبت کے لئے تو یہ سوال ہلکا رہتا ہے، اِس لئے کہ اُس دَور کی تاریخ اتنی منضبط نہیں۔ لیکن عیسائیوں کا دَور تو عین تاریخی دَور ہے۔ اور حضرت مسیح کے بعد سے تاریخ مرتب اور مدوّن موجود ہے کیسے ممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کا ذکر تاریخ میں درج نہ ہو۔

ا۔ اگر اس شُبہہ کو وقعت دی جائے، تو قرآنی خوارق کا سب کا انکار کرنا پڑے گا۔ کِس کِس کو تاریخ سے ثابت کیا جائے گا[لہ]

م میں نے اپنے حاشیہ میں پہلے تو یہی قول جمہور نقل کیا ہے اس کے بعد راغب کے مفردات القرآن کے حوالہ سے عبارت ذیل لکھ دی ہے: ۔

"لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا، صوری نہیں یعنی اخلاق و خصائل خنزیری پیدا ہو گئے لیکن اجسام وابدان انسان ہی رہے جیسا کہ اسی طرح کی روایت حضرت مجاہد تابعیؒ سے اصحاب السبت کے متعلق بھی منقول ہے۔ راغب صاحب مفردات القرآن، زیر عنوان "خنزیر" لکھتے ہیں: "قوله تعالیٰ وجعل منهم القردة والخنازير قيل عنى الحيوان المخصوص وقيل عنى اخلاقه وافعاله مشابهة لاخلاقها لا من خلقه خلقتها والامران مرادان بالاية فقد روى ان قوما مسخوا خلقة وكذا ايضا فى الناس اذا عتبرت اخلاقهم وجدوا كالقردة والخنازير وان كانت صورهم صور الناس" بس اِس قدر لکھ کر چھوڑ دیا ہے، خود کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے! ارشاد ہو کہ یہ عمل کیسا ہے۔

لہ لیکن جب سے اور جس حد تک تاریخ مدون ہے، ہم تو ہر واقعہ کا جو قرآن میں مذکور ہے، خواہ خارق ہو یا غیر خارق، تاریخی ثبوت اُسی درجہ کا رکھتے ہیں جو درجہ اُس وقت کی تاریخ کا ہے۔ اور پھر یہاں تو ثبوت مفسرین کے بیان کا مانگا جا رہا ہے نہ کہ کسی نصّ قرآنی کا۔

ا۔ ایسے اقوال تو ہر واقعہ میں ملیں گے[1]۔ تو کیا ایسے اقوال سے اُن صحیح مسلّم اور عقلی قواعد[2] کو مثلاً النصوص تحمل علی ظواھرھا اور مثلاً لا یصار الی المجاز الا اذا تعذرت الحقیقۃ اور مثلاً الناطق یقضی علی الساکت اور علاوہ ان قواعد کے خود الفاظ قرآن اِس تاویل کو مستبعد بتلا رہے ہیں مثلاً لفظ جعل لغۃً تصییر پر دال ہے تو اس کا مفعول ثانی ایسی ہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے کے خلاف ہو اور قردۃ وخنازیر بالتاویل تو وہ خود ہی ہو چکے تھے۔ اس میں جعل کے کیا معنی اِس جعل کا تو یہ حاصل ہوا کہ جعل القردۃ قردۃ وجعل الخنازیر خنازیر۔ یا یہ عبارت دیگر جعل الخبیثین خبیثین۔ کیا اس کلام میں بے معنی ہونے کا شبہہ تو یہ نہیں ہو سکتا جو کلام اللہ سے نہایت مستبعد ہے۔ نیز وہ جب خود خبیث ہو چکے تھے ان کو خبیث بنانے کے کیا معنی۔ نیز سورۂ بقرہ میں ہے فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ سزا پر تو نکال اور موعظت صادق آتا ہے۔ مگر عقائد اور اخلاق فاسدہ خود موجب سزا ہیں نہ کہ سزا۔ غایت ما فی الباب ایسی تاویل کو نص کی تکذیب نہ کہیں گے لیکن کیا بدعت بھی نہ کہیں گے۔ اگر شبہہ کیا جائے کہ بعض سلف کو بدعتی کہنا لازم آتا ہے۔ سو بدعت اجتہادی محل وعید نہیں ہے۔ ورنہ اگر اس تاویل کو سنّت میں داخل کیا جائے تو جمہور کو بدعتی کہنا لازم آئے گا۔ اب دیکھ لیا جائے کون اسہل ہے۔ میری تفصیل مذکور سے فیصلہ خود بھی کر لیا جائے۔

م۔ لڑکی کے ہاں زچگی آج ہی کل میں ہونے والی ہے۔ دن لگ چکے ہیں۔ پہلا معاملہ ہے تسہیل کے لئے التماس دُعا ہے۔

ا۔ دِل سے دُعائے سہولت وحفاظت کرتا ہوں۔"

غایت ضعف سے اب حضرت کے ہاتھ میں کسی قدر رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اثر

---

[1] لیکن اسی لئے تو بڑے بڑے محتاط محقق حضرات مثلاً امام ابن جریر طبری نے سب ہی اقوال کو نقل کر دینا ضروری سمجھا ہے [2] یہ فقرہ اصل خط میں یونہی ناتمام رہ گیا ہے "پس پشت ڈال دیا جائے گا" یا "چھوڑ دیا جائے گا" لکھنے سے رہ گیا۔

پچھلے ایک آدھ خط پر بھی تھا، اور اس خط میں تو یہ اثر نمایاں تھا بعض لفظوں کے چلانے میں خاصی دشواری پیش آئی۔

مسئلہ مسخ میں ایک درمیانی راہ اختیار کرنے کی روشنی مل گئی۔ اس لئے معاً بعد، یعنی ۲۴ اپریل کو معروضۂ ذیل لکھا:۔

م۔ والانامہ بصیرت افروز ہوا۔ اس سے بھی وہی نفع حاصل ہوا جو عموماً جناب کے والاناموں سے حاصل ہوتا رہتا ہے یعنی مسئلہ کے وہ اطراف و جوانب بھی نظر کے سامنے آگئے، جن پر نظر از خود نہیں جا سکتی تھی۔

ا۔ آپ کی قدر دانی ہے جو چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے۔

م۔ اب صورت یہ خیال میں آئی ہے کہ پہلے تو وہی قول جمہور نقل ہو پھر قول راغب اور پھر اس کی تضعیف کے لئے آگے یہ لکھ دیا جائے کہ

"لیکن محققین کا قول یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (یہاں جناب والا کی عبارت ملخصاً دیدی جائے)"

ا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ۔ نہایت جامع حدود و رعایات تجویز ہے۔

م۔ اس سے انشاء اللہ وہی قول جمہور کا راجح و قوی ہونا ظاہر ہو جائے گا۔

ا۔ بالکل صحیح۔

م۔ کیا سب پہلوؤں کی رعایت کے لئے یہ کافی نہ ہوگا؟

ا۔ اُوپر عرض کر دیا گیا۔

م۔ مقصد تو صرف اس قدر تھا اور ہے کہ مسلک حق کے ترک ہوئے بغیر کوئی سہارا اُن لوگوں کو بھی ہاتھ آجائے جن کے ایمان ضعیف ہیں۔

ا۔ واقعی۔

تفسیری مذاکرہ کا سلسلہ اب پھر بدستور سابق چل رہا تھا۔ ۱۲ مئی کا عریضہ ملاحظہ ہو:

م۔ تفسیر بیان القرآن۔ جلد ۳۔ ص ۶۰ یا اولی الالباب کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے۔

ا۔ اس طرح بنا دیا "ڈرتے رہو اے عقل والو"

م - جلد ۴ - ص ۷۸ - انا س بیدہ کا ترجمہ رہ گیا۔

ا - اس طرح بنا دیا "ایسے لوگوں کو آئی ہوئی وحی (یعنی قرآن) کے ذریعہ سے فرمائیے"
اور تفسیر میں یہ عبارت لفظ "کفر" سے پہلے بڑھا دی گئی۔

م - جلد ۳ - ص ۷۹ - یا قوم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا - اس طرح بنا دیا گیا " فرمایا اے میری قوم بیشک "

م - جلد ۳ - ص ۸۳ - من ربہ کا ترجمہ رہ گیا

ا - اس طرح بنا دیا "کوئی معجزہ اُن کے رب کی طرف سے"

م - ایک جگہ اور یہیں کہیں ربہ یا س بک کے ترجمہ میں بجائے رب یا پروردگار کے 'اللہ' درج ہو گیا ہے۔ صفحہ اس وقت یاد نہ آیا، اور سرسری دوبارہ تلاش میں وہ مقام نظر نہ پڑا۔ لیکن اس کا دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔

ا - جب مقام ہی نہیں ملا پھر اصلاح کیونکر کی جائے لیکن اگر یہی ہے تو مصداق دونوں کا ایک ہی ذات ہے۔

م - سورۂ بقرہ میں و ما انزل علی الملکین کی تفسیر میں میں نے تمامتر بیان القرآن کا اتباع کیا ہے لیکن ایک شبہہ رہ رہ کر پیدا ہوتا ہے کہ فرشتے جب انسان کے قالب میں آئے تو منکرین نے اُن پر بھی وہی اشکالات وارد کئے ہوں گے جو اُن سے قبل انبیائے کرام کی نبوت پر کر چکے تھے۔ اُن کی نظروں میں تو کوئی فرق فرشتہ بشکل انسان اور نبی کے درمیان نہ ہوا۔

ا - میں اس عبارت کا حاصل اور مقصد نہیں سمجھا۔ نہ معذور کو سمجھانہ اُس کی بناء کو۔"

(۱۱۱)

۷ راگست کا معروضہ بھی ان ہی تفسیری مذاکروں سے لبریز ہے۔

م " کوئی تین ہفتے ہوئے میرے بھتیجے[1] نے سفر تھانہ بھون سے واپسی پر مزاج والا کی

---

[1] محمد ہاشم قدوائی۔ ایم۔ اے (پی ایچ ڈی) اُس وقت یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اس وقت (۱۹۶۰ء) میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سیاسیات کے ریڈر ہیں۔

خیریت بیان کی۔ اِس سے بڑا دِل خوش ہوا۔ فالحمد للہ۔

تفسیر بیان القرآن۔ جلد ۵ کے مقامات ذیل پیش کرتا ہوں :-

ص ۲۔ متن کی آخری سطر۔ اللّٰھم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔ اب اِس طرح بنا دیا "سُبحان اللہ یا اللہ"

م۔ ص ۲۔ متن کی آخری سطر۔ فیھا کا ترجمہ دونوں جگہ رہ گیا ہے۔

ا۔ اِس کے قبل معلوم نہیں کس وجہ سے میرے ہاتھ کا بنا ہوا تفسیر کے نسخہ میں ملا۔ دونوں جگہ لفظ "وہاں" لکھا ہوا ہے۔ اب عبارت یُوں ہو گئی "اُن کے مُنھ سے وہاں یہ بات نکلے گی کہ سُبحان اللہ یا اللہ اور اُن کا باہمی سلام وہاں یہ ہوگا السلام علیکم"

م۔ ص ۱۵۔ متن کی آخری سطر۔ شیئاً کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔ اب اِس طرح بنا دیا "لوگوں پر ذرا بھی ظُلم نہیں کرتا۔"

م۔ ص ۲۴۔ س ۲۔ متن۔ نطبع کا ترجمہ بجائے ضمیر جمع متکلم کے لفظ اللہ تعالیٰ کے ساتھ چھپا ہے۔

ا۔ اِس طرح بنا دیا "مان لیتے ہیں ہم اسی طرح"

م۔ جلد ۴۔ ص ۱۳۷۔ س ۴۔ متن یحلفون لکم میں لکم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔ اِس طرح بنا دیا "یہ تمھارے لئے"

م۔ جلد ۴۔ ص ۱۴۰۔ س۔ متن۔ من الاعراب کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا۔ حولکم کے بعد اِس طرح بنا دیا "گردو پیش والوں یعنی دیہاتیوں میں"

م۔ بیان القرآن کے مطالعہ سے جتنا نفع مجھ بے علم کو ہوا اور ہو رہا ہے اُسے بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ مجھ سے تو اگر کوئی یہ فرمایش کرے کہ تفسیر ابن عباسؓ سے لے کر تفسیر حقانی تک جتنا ذخیرہ تفسیروں کا تمھارے پاس ہے، سب سے دست بردار ہو کر صرف ایک تفسیر اپنے پاس رکھو۔ تو میرا انتخاب تو بیان القرآن ہی کے حق میں ہو گا۔

۔ عشق بعض اوقات عقل کے خلاف فتویٰ دیدیتا ہے جس میں وہ معذور ہے۔ مگر وہ فتویٰ حجت نہیں مانا جاتا۔"

سالک کا ایک اور مفصل عریضہ مورخہ ۲۴ / رمضان ۱۳۸۶ھ کا لکھا ہوا ہے:-

م: کل ۲۳ / رمضان کو ظہر کے فرض پڑھ کر حسب معمول مسجد سے گھر آیا ہی تھا، اور سنتوں کی نیت باندھ رہا تھا کہ یک بیک بلاکسی سبب ظاہری کے جناب والا کی یاد آئی اور اس زور و قوت کے ساتھ کہ میں اس سے بالکل مغلوب ہو گیا۔ تمثل یہ ہوا کہ آپ سامنے موجود ہیں، اور اس ناکارہ کو اپنی نااہلی کا احساس انتہائی شدت کے ساتھ ہو رہا ہے، اور میں پکار پکار کر کہہ رہا ہوں کہ کہاں مجھ جیسا ناقابل محض جس کی صرف و نحو بھی پوری طرح نہیں نکلی، اور نہ جسے کبھی اُستاد سے باقاعدہ کسی دینی درسگاہ میں سبق لینے کی عزت حاصل ہوئی اور کہاں قرآن مجید کی تفسیر! اللہ تعالیٰ جس سے جو کام چاہے، لیلے۔ باقی یہاں تو جو کچھ بھی آیا، سب ان ہی تھانہ بھون کے بڑے میاں کا فیض ہے۔ زبان پر یہ الفاظ ہیں، اور نظر آپ کی انگلیوں کی طرف جمی ہوئی ہے۔ (آپ کے چہرہ اور سر کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی) اور کہتا جاتا ہوں کہ اللہ اکبر، دین کی کیسی کیسی خدمات ان ہی انگلیوں نے انجام دی ہیں انتہا اسی حالت میں باندھ لی۔ نماز میں بھی یہ کیفیت برابر قائم اور آنکھوں سے آنسو مسلسل جاری۔ گریہ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ کئی منٹ گذر گئے۔ پھر کیفیت رفتہ رفتہ فرو ہوئی۔

یہ ذکر تو کل کا ہوا۔ آج دوپہر کو جب نماز ظہر کے لئے باوضو مسجد جا رہا ہوں، اور یہ عریضہ لکھنے بیٹھ گیا، گریہ کی اسی کیفیت کا اعادہ پھر پورے طور پر ہو رہا ہے۔

ا- الجواب۔ یہ سب حُبّ فی اللہ کے کرشمے ہیں اور چونکہ اس کی فضیلت نصوص میں وارد ہے اس لئے مبارک حالت ہے۔

م- آگے تفسیر بیان القرآن کے چند مقامات کے متعلق معروض ہے۔

جلد۵ - ص ۴۴ - ختم متن کے قریب - ان کنت من الصادقین کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا - اس طرح بنا دیا جائے "لے آؤ اگر تم سچے ہو"

م - جلد ۵ - ص ۲۵ - آخر متن - ارسلت بہ الیکم میں الیکم کا ترجمہ رہ گیا ہے۔

ا - اس طرح بنا دیا "مجھ کو تمہاری طرف"

م - جلد ۵ - ص ۳۸ - س ۳ - متن لوشاء ربك میں ربك کا ترجمہ "اللہ" چھپا ہے

ا - اس طرح بنا دیا "اور اگر تمہارے پروردگار کو"

م - جلد ۵ - ص ۹۷ کے وسط میں عزیز کے سلسلہ میں ہے کہ "یہ سلطنت مصر کے مدار المہام کا لقب ہوتا تھا اور نام اس شخص کا قطفیر ہے"

یہ ناچیز اپنے حقیر مطالعہ کی رو سے عرض کرتا ہے کہ قطفیر تو مصری زبان میں عزیز ہی کا مرادف ہے، اور عزیز گویا عربی ترجمہ ہے اس مصری لقب مدار المہام کا۔ اردو توریت میں اس کا املا فوطیفار دیا ہوا ہے۔

ا۔ الجواب - یاد نہیں میں نے کہاں سے لکھا مگر چونکہ مثبت مقدم ہوتا ہے نافی سے اس لئے آپ کی تحقیق کو ترجیح رہے گی میری تجویز پر"

سال کا آخری مفصل خط یہی تھا۔ سال ختم ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر حاضری کا موقع مل گیا۔ اور آہ کہ یہ آخری حاضری (حضرت کی حیات میں) تھی۔ قیام یقیناً مختصر ہی ہوا ہوگا۔ اب نہ مدت قیام ذہن میں، نہ متعین طور پر زمانۂ قیام ذہن میں ۲۶ نومبر ۴۲ء (۱۵ ذی القعدہ ۶۱ھ) جو کارڈ میرے اطلاع نامہ کے جواب میں موصول ہوا، وہ کل اس قدر ہے:۔

"السلام علیکم مسرور ہوا۔ اسے وقت تو خوش کردیں۔ اللہ تعالیٰ موانع سے محفوظ فرمائے قیام و وداع سب آپ کی مرضی پر ہوگا"

اب کی سفر ایک غرض اپنے دیرینہ کرم فرما اور حضرت کے بڑے مخلص اور کارگذار خادم

وصل بلگرامی کی قبر پر فاتحہ پڑھنا بھی تھا۔ بیچارہ ایک معمولی سی بیماری کے بعد ۲ ؍اکتوبر ۴۲ء (۲۸ ؍رمضان ۶۱ھ) کو دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے۔ اور حضرت ہی کے قبرستان میں دفن تھے۔ جنازہ بھی حضرت ہی نے پڑھایا تھا۔ باغ و بہار آدمی تھے، اور لکھنؤ کی رنگین صحبتوں کا خوب مزہ اُٹھائے ہوئے۔ سنّاٹے کے مقام میں اُن کی کچّی تُربت دیکھ کر دِل بے اختیار ہو گیا، اور قبر سے لپٹ کر اُن کی محبتوں اور شفقتوں کو یاد کر کے خوب رویا۔

خیال ایسا پڑتا ہے کہ اب کی بجائے مولوی شبیر علی صاحب کے مکان کے، قیام مہمان خانہ کے بالائی حصّہ میں رہا۔ حضرت سے رُخصتی سہ پہر ہی کو ہوئی، اور روانگی صبح سویرے کی گاڑی سے ہوئی ——— سہارنپور میں اب ایک عزیز خاص ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صدیقی شہر کے ہیلتھ آفیسر ہو کر آ گئے تھے۔ قیام اُن کے ہاں ہوا۔ ورنہ سہارنپور میں تو اب مُستقل میزبان شہر کے نامور معالج (ڈاکٹر) محمد حنیف صاحب تھے۔ مُلاقات حسب معمول مدرسہ مظاہر علوم والوں سے، خصوصاً مولانا محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث سے خوب رہی۔

۱۹۴۳ء

سال ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ بھوپال سے ایک مومنہ مخلصہ نے درخواست کی کہ ایک چادر حضرت کی خدمت میں تمھارے واسطہ سے پیش کرنا چاہتی ہوں، مجھ سے براہ راست حضرت کو تعارف حاصل نہیں، تمھارے واسطہ اور ذریعہ سے یہ نذر توقع ہے کہ قبول ہو جائے گی اِدھر کیا عذر ہو سکتا تھا۔ درخواست بارگاہ اشرفی تک پہنچادی گئی، جواب ۲۹ جنوری ۴۳ء کا لکھا ہوا حسب ذیل آیا:-

"ایسی چیزیں دو برکتیں ہوں گی۔ ایک مخلصہ کی ایک مخلص کی۔ دعا و شکریہ کے ساتھ بسروچشم قبول کر لوں گا۔ میں خیریت سے ہوں"

ہدیہ غالباً پارسل سے روانہ ہوا، اور رسید آگئی۔

(۱۱۲)

انگریزی تفسیر سے تو مدت ہوئی، اگست ۱۹۴۳ء ہی میں فراغت ہوگئی تھی۔ اور اب کام اردو تفسیر کا چل رہا تھا۔ اس میں حوالے بیان القرآن کے تو بہ کثرت اور اس کے علاوہ مسائل وسلوک میں کلام ملک الملوک اور حضرت کے بعض دوسرے رسائل کے بھی لانے پڑتے تھے۔ تلاش اس کی ہوئی کہ حضرت کے لئے کوئی مختصر وموزوں لقب ہر جگہ کے لئے مل جائے۔ اور کوئی لفظ ذہن میں آئے، مثلاً خالص تفسیری تحقیق کے موقعوں کے لئے، محقق تھانوی یا مفسر تھانوی۔ اور نکات صوفیانہ کے مقامات پر مرشد تھانوی یا عارف تھانوی۔ کسی ایک لفظ پر

دِل نہ جما۔ آخر میں خود حضرت ہی سے رجوع کیا ——— مناجاتِ مقبول[1] کا مطالعہ بھی اِدھر کچھ روز سے شروع کر دیا تھا، اور اس میں اتنا جی لگا، جو اس سے قبل دُعاؤں کی کسی کتاب میں نہیں لگا تھا۔ بعض کیا معنی اکثر دُعائیں تو بالکل وجد آفریں تھیں۔ اسی کارڈ میں اپنے اُن جذبات کا بھی اظہار کر دیا تھا۔ لیجئے وہ کارڈ ہی مُلاحظہ فرمائیے:۔

"اپنی اُردو تفسیر میں حوالے جہاں جہاں دیتا ہوں کہیں تو کتاب کا اسم مشہور لکھ دیتا ہوں۔ مثلاً کشاف، کبیر وغیرہ۔ اور کہیں مصنف کا اسم مشہور مثلاً ابن کثیر، بیضاوی وغیرہ۔ اسی طرح جناب والا کی تفسیر کا جہاں حوالہ دینا ہوتا ہے، تھانوی لکھ دیتا ہوں۔ یا کہیں پوری عبارت میں مفسر تھانوی مدظلہ کر کے لکھ دیتا ہوں۔

لیکن خالص تفسیری مسائل کے علاوہ آپ کے افادات سلوک و تصوف کی جب کوئی چیز مسائل السلوک وغیرہ سے لینا ہوتی ہے تو اس کے لئے ابھی کوئی ایک لقب نہیں متعین کر پایا ہوں، کہیں مُرشد تھانوی مدظلہ لکھ دیتا ہوں، کہیں عارف تھانوی اور کہیں محقق تھانوی۔

مناجاتِ مقبول پہلے کی بھی دیکھی ہوئی ہے، لیکن حال میں جب پڑھا تو اس درجہ دِل کو لگی کہ اُس وقت سے اس کی عربی عبارت کے روزانہ وِرد کا التزام کر لیا ہے۔ اِتنی جامع اور اتنی مُوثر دُعائیں اب تک تو کہیں اور نظر سے گذری نہیں ہیں۔ جزاک اللہ و ماشاء اللہ میں تو کہتا ہوں کہ بالفرض جناب نے اپنی بیشمار خدمات میں سے اور کچھ نہ کیا ہوتا تو صرف یہی ایک کارنامہ دوسرے مقبلین میں رشک پیدا کر دینے کے لئے کافی تھا۔ کیا حساب ہے آپ کے اجر کی!"

۲ر فروری کے جوابی کارڈ میں حضرت نے یہ لکھا:۔

"مکرمی دام حُبّہم و عزنا ہم۔ السلام علیکم۔ محبّت نامہ نے مُحبّت کا ممنون اور تلقیب (مُرشد

[1] اس کا پورا صحیح نام قربات عند اللہ وصلوات الرسول ہے۔ حضرت کے وصال کے ایک عرصہ کے بعد اس کی ٹوٹی پھوٹی شرح بھی اِس نامہ سیاہ کے قلم سے بن آئی، اور مناجات مقبول مع شرح کے نام سے شایع ہو گئی۔

(محقق مفسر عارف) سے بھی تجل فرمایا۔ میں بے تکلف اپنے لئے ایک لقب جس میں نہ تواضع ہے نہ ترفع خود تجویز کرتا ہوں، یعنی مؤلف تھانوی ۔ اگر سب جگہ یہی بدل دیا جائے تو اس سے بھی ممنون ہوں۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے آنکھ اونچی نہ ہوگی۔

علاج کار کج دمن خراب کج

باقی مناجات مقبول کے متعلق جو کلمات اس کے امتیاز کے تحریر فرماتے ہیں وہ ادعیہ کے مادہ اور ترتیب کے اعتبار سے بالکل صحیح ہیں۔ مگر میرا اس میں کیا دخل۔ اس کے جو دو ماخذ ہیں، حصن حصین اور حزب الاعظم یہ سب ان کے جامع کا کمال ہے۔ باقی میرا درجہ تو صرف اتنا ہے

چو موشش بہ سر دکان ادستا خورسند

مگر جب آپ کے حسن ظن کی دولت اس کے بدولت حاصل ہوئی اس لئے اس کو فال نیک سمجھوں گا، اور درخواست کروں گا کہ میرے حال سقیم پر اسی طرح ہمیشہ توجہ رہے۔ زیادہ کیا عرض کروں؟"

یہ سارا مضمون ایک پوسٹ کارڈ پر، بلکہ اس کے ایک ہی رخ پر آگیا ——— حضرت کی تحریر میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ جگہ بہت کم گھیرتی، اور پھر صاف پڑھ لی جاتی۔

آغاز کا انجام شروع ہو گیا ——— ہر آغاز کے لئے ایک انجام، ہر پیدائش کے لئے موت، ہر بچپن کے لئے بڑھاپا، اس دار ناپائدار کا دستور یہی رکھ دیا گیا ہے۔ ہائے کیسا بارک و مسعود ایک دن وہ بھی تھا، جب یہ متبرک مراسلت شروع ہوئی تھی، اور ۱۵ سال تک یہ گرانمایہ نعمت جاری رہی اور کیسی منحوس اور تیرہ و تار گھڑی اس دولت کے ختم ہو جانے کی آگئی! ——— مادی، روحانی، نجی، ذاتی، دینی، اخلاقی کون سا موضوع ایسا تھا، جس پر بے تکلف حضرت سے خط و کتابت نہ کرلیتا۔

۲۰ اپریل ۱۹۴۳ء کا عریضہ اس ذات با برکات جامع الصفات کے نام اس نامہ سیاہ کا

عریضہ تھا۔ آج کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بیٹھے ہوئے دل سے اسے نقل کرنا پڑ رہا ہے:۔

م:۔ حال میں ایک صاحب سے سننے میں آیا کہ خدانخواستہ مزاج والا پھر کچھ نادرست ہو گیا ہے، خدا کرے اس وقت تک افاقۂ کامل ہو گیا ہو اور اب مژدۂ صحت بھی سننے میں آئے۔

ا۔ بجز ضعف کے کوئی معتدبہ شکایت نہیں۔ اطمینان فرمائیں۔

م۔ کل دن میں آنکھ لگ گئی تھی۔ دیکھا کہ کسی بڑی اور عالی شان عمارت میں ہوں۔ ارد گرد انگریزی تعلیم یافتہ مجمع ہے، جیسے کوئی قومی جلسہ ہو رہا ہے۔ یک بیک زلزلہ آ گیا، اور بہت شدید قسم کا۔ میز، کرسی، ہر چیز اپنی جگہ سے ہلنے لگی، اندھیرا گھپ ہو گیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ خود وہ سنگین عمارت زمین پر آ رہے گی، لوگ بدحواس ہو کر چیخیں مارنے لگے۔ بعض فرط ہیبت و دہشت سے زمین پر گر کر ختم بھی ہو گئے۔ اپنے کو دیکھا، جہاں پر کھڑا تھا، وہیں قائم ہوں۔ زبان پر بسم اللہ جاری ہے، اسی کو بلند آواز سے پڑھتا جاتا ہوں، اور گرتی ہوئی چیزوں کو حتی الامکان سنبھالتا جاتا ہوں، اتنے میں ایک طرف بجلی چمک کر گری۔ اور لوگ اور زیادہ فرط ہیبت سے بیہوش ہو گئے۔ اپنے اوپر ہراس کا اثر سب سے کم پاتا ہوں۔ بس آنکھ کھل گئی۔

ا۔ قرآن مجید میں غزوۂ احزاب کے ذکر میں زلزلوا زلزالاً شدیداً وارد ہے۔ ظاہرا مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہے جیسی اُس وقت تھی کہ تمام قبائل عرب اُن کی مخالفت پر متحد ہو گئے تھے۔ اسی طرح اس وقت سب غیر قومیں مختلف سمت سے مسلمانوں پر نرغے کئے ہوئے ہیں۔ نیز اُس وقت منافقین ظاہر اسلامانوں کے ساتھ تھے، لیکن در پردہ ان کا ضرر کفار کے ضرر سے بھی اقبح و اشنع تھا، یہی معاملہ اس وقت اہل حق کے ساتھ مدعیان اسلام کا ہے، کہ اُن کے دین کے اصول کا قلع و قمع کر رہے ہیں۔ اور جو اُس وقت تدبیر فلاح کی بتلائی گئی تھی اس وقت بھی ایسے واقعات دکھلانے سے اُسی تدبیر پر عمل کرنے کی رہنمائی مقصود

ہے۔ وہ تدبیران آیتوں میں مذکور ہے۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اور

آیت وما زادھم الا ایماناً و تسلیماً اور آیت من المومنین رجال صدقوا رحمۃ

علیہ یہ چند سطریں بہ طور چہرہ امثل کے آپ کی خاطر سے لکھ دیں اورنہ

صلاح کار کجا و من خراب کجا — بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

اگر آپ کے بھی جی کو یہ جواب لگ جائے، بنوشید و بوشیاں موتیح کنید۔ واللہ اعلم۔

م۔ بارہا کا ایک تجربہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں سلوک و تصوف، خصوصاً مثنوی مولانائے

روم کا مطالعہ زیادہ رہا کرتا ہے، اچھے اچھے خواب بہ کثرت دیکھا کرتا ہوں کبھی زیارت

صالحین کبھی خود اپنے کو حالت نماز میں دیکھنا۔ وقس علی ہٰذا۔ اور جب یہ مطالعہ ترک ہو جاتا ہے،

ایسے خواب بھی بند ہو جاتے ہیں۔

ا۔ یہ ارتباط محض شہود تخیل ہے۔ ورنہ بعض محققین نے منکر خوابوں کو نور قلب کا اثر

بتایا ہے، جیسے روشنی میں مضر چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ بہر حال خواب کسی حالت میں مؤثر نہیں

بلکہ خود اثر ہے۔

اس وقت طبیعت کسل مند تھی، اس واسطے اپنے ہاتھ سے جواب نہیں لکھ سکا۔"

مکتوب گرامی کا یہ آخری فقرہ غضب کا تھا۔ بجز ۴۲ء کے ایک خط کے کہ اس میں دو

ایک فقرے کسی دوسرے کے قلم سے لکھے ہوئے تھے، یہ بالکل پہلا اتفاق تھا کہ حضرت کا

مکتوب اول سے آخر تک کسی اور صاحب کے قلم سے موصول ہوا —— اور آہ کسے خبر تھی کہ

یہی آخری خط بھی ہوگا! اب ہفتوں اور مہینوں نہیں، عمر بھر آنکھیں ڈاک کا راستہ دیکھیں گی،

اور اس پر نور و بصیرت افزا، بشارت نواز سواد خط کی جھلک بھی نصیب نہ ہوگی!

سورج ابھی ڈوبنے کو تھا، شفق پھول چلی تھی۔ عین اسی زمانہ میں، اردو کے مشہور شاعر جگر

مراد آبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی "تشنہ لبی خوشم" "والعجبی خوشم" کی زمین میں

لکھ کر، اور پانچوں شعر رنگین و پر بہار، حضرت کی خدمت میں نذرانہ کے طور پر بھیجی۔ حضرت

باضابطہ شاعر تو پہلے بھی نہ تھے، اور اب اس وقت تو ضعف و انحطاط نے جسم و دماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا۔ اِس پر بھی جو شعر جواب میں لکھ کر بھیجا، وہ اپنی نظیر آپ ہے ؎

نہ بہ نثر ناثرِ بے بدل، نہ بہ نظم شاعرِ خوش غزل
بہ غلامئ شہ عزّ و جل و بہ عاشقئ نبی خوشم[1]

مئی اور جون کے مہینے تو خیر جون توں کٹ گئے، جولائی سے پھر بڑی تشویش ناک خبریں آنے لگیں لیکن مسلسل نہیں، بلکہ افاقہ کے درمیانی وقفوں کے ساتھ۔ اور آہ، انسان کی فریب خوردگی، کہ طبیعت ان ہی عارضی اور وقتی افاقوں کا سہارا ڈھونڈھتی رہی! علاج علاوہ دوسرے معالجوں کے لکھنؤ کے نامور اور حاذق طبیب حکیم عبد المعید شفاء الملک کا تھا، جن کے علاج سے پہلے صحت ہو چکی تھی۔ لیکن آہ کہ طبیب کے بس میں موت کا علاج ہے کب؟ مقابلہ وہ مرض کا کر سکتا ہے، وہ بھی اذنِ الٰہی سے، نہ کہ خود قضائے الٰہی کا ——— خُدّام نے آخر آخر مشورہ ایک بار پھر لکھنؤ لانے کا کیا، لیکن اِس مشورہ پر عمل کا وقت گزر چکا تھا۔ شدتِ ضعف و نقاہت سے نقل و حرکت ناممکن تھی چہ جائیکہ اتنا طویل سفر! ——— تقدیر کے مقابلہ میں تدبیر کبھی بھی پیش پا سکی ہے؟

خُدّامِ خاص، ایک آدھ نہیں، کئی ایک پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ وصل صاحب کا وصال تو اسی پچھلے اکتوبر میں ہوا تھا، اور حکیم محمد مصطفےٰ صاحب بجنوری میرٹھی کی وفات چار سال قبل ——— بڑے حاکم جب کہیں کوچ کرنے والے ہوتے ہیں تو خُدّامِ ادب کی نین ڈوری پیشوائی کے انتظامات کے لئے پہلے ہی روانہ ہو چکتی ہے۔ سماں کچھ ایسا ہی اس وقت بھی نظروں کے سامنے پھر رہا تھا۔

(۱۱۳)

آگے جو کچھ ہوا، اور جو کچھ گذری، اُسے صادق ہی کی زبان میں سُن لیجئے:۔

---

[1] اِس شعر کے ساتھ جو مختصر خط حضرت نے جگر صاحب کو لکھا تھا، وہ بھی اپنی بلاغت اور رنگینئ عبارت میں کچھ کم دلآویز نہ تھا،

شیخِ وقت کی علالت	ایک صاحبِ علم و صاحبِ قلم لکھتے ہیں:۔
(صدق۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۴۳ء)	"حضرت مولانا تھانوی کے متعلق یہ معلوم کرکے فکر پیدا ہوگئی کہ اس

طرف پھر علالت کا سلسلہ ہوگیا ہے۔ اللہ امتِ محمدیہ پر رحم فرمائے۔ یہ دم جتنی گھڑی بھی ہے بس ایک رحمت ہے"

اس میں کیا شک ہے۔ حضرت مولانا کی علالت اس وقت تک بحمد اللہ کچھ ایسی زیادہ تو نہیں لیکن حضرت مدظلہ (اللہ اُن کی عمر میں بیش بیش برکت عطا فرمائے) ہیں عمر کی جس منزل میں، اس میں ہر معمولی سی علالت بھی ہر وقت خطرناک صورت اختیار کرسکتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تشویش ناک روز افزوں ضعف ہے۔ بے بس بندوں کے اختیار میں بجز دُعا کے اور ہے کیا لیکن دُعا خود بھی بڑی پُر قوت شے ہے۔ ہزار بار ہا تھ اگر ایک ہی وقت میں مخلصانہ دُعاؤں کے لئے بلند ہوجائیں، تو ناممکن نہیں کہ جو وقت ہر انسان کے لئے اٹل ہے، وہ بھی کچھ مدت کے لئے ٹل جائے!

شیخِ وقت کی علالت	عین جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، حضرت حکیم الامت مجددِ
(صدق ۲۶ر جولائی ۱۹۴۳ء)	ملت مولانا شاہ اشرف علی مدظلہ، متع اللہ المسلمین بطلیل بقاءہٗ کی

شدید تشویش ناک اطلاعیں برابر موصول ہو رہی ہیں۔ اور اندیشہ برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ انقطاع عن الخلق و توجہ الی اللہ کے سامان بڑی تیزی سے کرائے جا رہے ہیں، اور اطباء اسی کو مادی اصطلاحوں میں غفلت اور غنودگی کے دَورے پڑنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال شافی برحق سے دُعا ہے کہ اب بھی اُمتِ محمدیہ پر رحم فرمائے۔ اور اُس کی اس سب سے زیادہ قیمتی بضاعت کو ابھی مدتوں افادۂ خلق کے لئے سلامت و محفوظ رہنے دے۔ آمین۔

قطبِ ارشاد کا وصال	جس وقت کا ڈھرکا تھا وہ وقت آگیا آخر!
(صدق ۲ر اگست ۱۹۴۳ء)	جولائی کی غالباً ۱۲ تھی کہ میرے بھتیجے کا خط تھانہ بھون سے حسب ذیل

موصول ہوا:۔

"یہاں پہنچ کر واقعی حضرت کی طبیعت بہت زائد علیل پائی۔ نماز جمعہ کے قبل سے لے کر بعد مغرب تک مسلسل غفلت و غنودگی طاری رہی، اور حضرت اقدس مخصوص حضرات سے بھی مخاطب نہ ہوئے۔ اسہال کی شکایت قبل ہی سے تھی، مگر پرسوں سے غفلت اور غنودگی بھی شروع ہو گئی ہے۔ میرا ذکر ایک بار مولانا کے خادم میاں سلیمان نے قبل نماز جمعہ کیا، مگر حضرت غافل ہو گئے نشست کے وقت مولوی جمیل صاحب نے میری اور دوسرے لوگوں کی اطلاع کرنا چاہی مگر اُس وقت سے لے کر مغرب تک حضرت مسلسل غافل رہے، اِس لئے حاضری سے محرومی رہی۔ اللہ صحت دے۔ بعد مغرب خواجہ صاحب نے میرا ذکر کیا، حضرت نے میرا نام لیا اور پوچھا کہ اِس وقت موجود ہیں؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ نشست کے وقت تو تھے۔ فرمایا کہ میں اس قابل کہاں کہ کسی سے گفتگو کر سکوں یا متوجہ ہو سکوں۔ اِس کے بعد پھر حضرت غافل ہو گئے"

دل نے خط پڑھتے ہی کہا کہ خدانخواستہ یہ بیماری ہی اور ہے۔

رنجش از سودا و از صفرا نبود   بوئے ہر ہیزم پدید آید ز دود

طبیب اپنی مادی اصطلاحوں میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کر رہے ہیں، یہ تو سب سامان خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ و یکسوئی کے حصول کے ہو رہے ہیں۔ اور یہ عارضی و وقتی غیبت تمہید نظر آ رہی ہے طویل اور ناسوتی معیار سے اَبدی غیبت کی! ——— صدق نمبر ۱۲ میں ایک نوٹ اس کے قبل دیا جا چکا تھا، نمبر ۱۳ میں دوسرا نوٹ اِسی خط کی بنیاد پر دیا گیا۔

دِل اور زبان دُعاؤں میں لگ گئے ——— دُعائیں اپنے ہی مفاد کی خاطر اور اپنی ہی خود غرضی کی بنا پر ——— خود حضرت مولانا پر اب مراسلت کا بار ڈالنے کا کیا موقع تھا۔ وصل بلگرامی بہت یاد آئے۔ ایسے موقعوں پر بڑے کام کے نکلتے تھے۔ اب خود ہی مرحوم ہو چکے ہیں، خیر، بعد غور خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز (مولانا کے عاشق زار اور خلیفۂ خاص) تھانہ بھون کی خدمت میں چند ٹکٹ بھیج کر درخواست کی کہ حالات کی جلد جلد اطلاع پہنچتی رہے۔ اپنے خط کی عبارت اب کہاں یاد، البتہ ایک فقرہ یہ یاد

ہے: کہ "اللہ سے دُعا ہے کہ حضرت کی مدّت حیات ہم نیاز مندوں کی مرضی پر چھوڑ دے"۔ ۱۹؍ جولائی کی دوپہر کو عین انتظار میں خواجہ صاحب کا کارڈ ۲۰؍ کا لکھا ہوا پہنچا:۔

"والا نامہ شرف صدور لایا۔ حضرت کی خدمت میں پہلے خلاصہ پھر لعینہ زبانی پیش کیا۔ فرمایا "یہ آپ کی محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے"۔

جناب حکیم حافظ عبدالمجید صاحب لکھنوی کا علاج ہو رہا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ افاقہ کی صورت معلوم ہو رہی ہے۔ گو ابھی عوارض موجود ہیں، بالخصوص ضعف بے انتہا ہے۔ غذا عرصہ سے نہیں ہوئی تھی۔ کل سے بھیر کا آبجوش شروع ہوا ہے۔ خدا کرے روز بروز صحت و قوت ہوتی چلی جائے۔ اِس حالت میں بھی وہی احساسات، وہی انتظامات، وہی ضروری امور میں تفتیحات و تدقیقات موجود ہیں۔ جن سے سب کو حیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس چشمۂ فیض کو ہمیشہ جاری رکھے۔ آپ نے اپنی دُعا کا جو صیغہ ارقام فرمایا ہے، وہ درحقیقت ہم سب کے قلوب کی ترجمانی ہے۔ انشاءاللہ حسب ہدایت خیریت سے مطلع کرتا رہوں گا"۔

اِس خط سے دِل کو ڈھارس آن کی آن ہوئی۔ ٹوٹی ہوئی اُمید ذرا کی ذرا بندھی۔ شاید کہ اُمت محمدیہ کو وقت کی اِس نعمت عظمیٰ سے فائدہ اُٹھانے کی کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔

کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا، ساعت موعود اتنی قریب آگئی تھی! آفتاب علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں۔ اللہ کی رحمت نا اہلوں اور نا قدروں کی سے واپس لی جا رہی تھی۔ رسول اسلامؐ کا ایک سچا جانشین اپنے اللہ و مولیٰ کے دربار میں حضوری کے لئے بیقرار ہو رہا تھا۔ لشکر اسلام کا اپنے وقت کا بڑا جنیل، دین کے ہر ہر محاذ، ہر ہر معرکہ، ہر ہر مورچہ کا دلاور، اپنے جسم کا پورا پورا دین کی راہ میں جوڑ جوڑ کٹے ہوئے، قلب خاشع نفس مطمئنہ کے ساتھ عالم ناسوت کی بالکل آخری منزل طے کر رہا تھا۔ ۲۳؍ جولائی کو لکھنؤ سے ایک عزیز کا خط ۲۲؍ جولائی کا لکھا ہوا حسب ذیل ملا:۔

"شب کو بعد عشا خبر ملی کہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رفیق اعلیٰ سے جا ملے انا للہ

وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ اُدھر اتنا تو حال معلوم کر کے اطمینان ہو گیا تھا کہ ہم بے راہ رووں کے سنبھالنے کا یہ ستون ابھی کچھ دنوں کے لئے قائم رہنے دیا گیا ہے مگر آہ کہ وہ کُل مدّت دو ہی تین دِن میں ختم ہو گئی۔ عُمر شریف اور ضُعف کی زیادتی اور افاقہ کی خبر کے باوجود بھی علالت کی اطلاعیں خبر سُننے کے لئے ایک حد تک تیار کر چکی تھیں۔ اِس پر بھی واقعہ اتنا سخت تھا کہ قلب میں ایک دھچکا سا لگا، اور کچھ دیر تک قلب و دماغ میں ایک ہیجانی کیفیت برپا رہی۔ زبان سے تو حسبِ عادت اِنَّا لِلّٰہِ کہہ ہی دیا، لیکن دیر تک سمجھ میں نہ آیا، کہ کیا کیا جائے۔ بعد میں دُعا مغفرت و بلندی مراتب کے لئے کی لیکن بار بار یہی خیال آتا رہا کہ ایسی ہستی کے لئے یہ چیزیں تو گویا یقینی ہیں، پھر اِن کی کیا ضرورت۔ لیکن پھر اس کے اور ایصال ثواب کی دُوسری صورتوں کے علاوہ کیا کیا جائے؟ چنانچہ کئی بار دُعا کر چکا ہوں۔ چند اجزائے قرآنی پڑھ کر بھی ایصال ثواب کیا۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ — آہ کہ طبیبوں کی اٹکل پر قائم کی ہوئی امیدوں کی دُنیا کیسی ریت پر نکلی اور بشری تدبیر نے، خُدا داد تقدیر کے مقابلہ میں کس بُری طرح شکست کھائی! مولانا میرے اُستاد تھے، مقتدا تھے، سردار تھے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ میرے محبوب تھے! آہ! کہ عقیدت، عظمت، محبت، تینوں ایک ہی وقت میں کچلی گئیں! تعزیت کا مستحق میں خود ہوں، کسی دُوسرے سے تعزیت کیا کروں؟ —— اللہ نے اُن کی ذات میں نُورِ حق کی ایک جھلک دکھا دی تھی۔ ولیِ کامل کا نمونہ اِس چودھویں صدی عیسوی میں دکھا دیا تھا ؎

ما شُما را نُورِ مطلق دیدہ ایم ۔۔۔ نُورِ مطلق را ہمہ حق دیدہ ایم

دین کے خادم اور بزرگ اور بھی اِس وقت اچھے اچھے موجود ہیں، پر وہ ایک ہستی ان سب سے نرالی، ان سب سے الگ تھی، اپنی نظیر بس آپ تھی!

ع عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں!

ع بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری!

اللہ کے اس ولی کے حق میں دُعائیں کرنا، اس کا نہیں اپنا مرتبہ بڑھانے کے لئے ہے۔

سجدوں سے اَور بڑھتی ہے رفعت جبین کی

دُرود خوانی سے مرتبہ رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا نہیں بڑھتا، خود اپنا ربط و تعلق اُس ذات اقدس کے ساتھ زیادہ گہرا اور راسخ ہوتا ہے۔

ماتم کے لئے اپنی عُمر کا اب جتنا بھی حصّہ باقی ہے، باقی ہے۔ مولانا قدس اللہ سرہٗ کے مناقب و فضائل کے بعض گوشوں پر انشاء اللہ حسب توفیق ان صفحات میں گذارشیں پیش ہوتی رہیں گی۔ اِس وقت تو مقصود محض خبر کو ناظرین تک پہنچانا تھا ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز!

حکیم الامت (صدق۔ ۹ راگست ۱۹۴۳ء)

۲۳ رجولائی ۱۹۴۳ء۔ وقت چاشت۔ آج جمعہ ہے تفسیر قرآن کا کام جلدی ختم کرنا ہے۔ بعد نماز ڈاک آجائے گی، اور دوسرے کام شروع ہو جائیں گے۔ تفسیر کا کام یُوں بھی آج کل بہت سرسری ہو رہا ہے۔ اور آج تو جلدی ہی ہے روز کا معمول بہرحال کسی طرح پورا کر لینا ہے ——— لیجئے نماز کا وقت آگیا۔ آج کا کام اِس آیت پر ختم ہوا۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔	یہ دُنیا کی زندگی (تا وقتیکہ اسے بھی دین کا جزو نہ بنایا جائے) تو بس ایک کھیل تماشہ ہے (اپنی بے ثباتی، زود فنائی کے اعتبار سے) اصلی اور قیمتی زندگی تو بس عالم آخرت کی ہے (باقی رہ جانے کے لحاظ سے)

بعد دوپہر ڈاک آگئی۔ کیا بیان ہو، کیسی قیامت خیز خبر لائی! قلم کا جگر، حق تھا کہ شق ہو جاتا، قبل اس کے کہ اِس جگر خراش، روح فرسا، سانحہ کو صفحۂ کاغذ پر ثبت کرتا! ہندوستان کا

مفسرِ اعظم چل بسا۔ سب سے بڑا عالم ربانی رخصت ہو گیا، شیخ وقت اُٹھ گیا۔ آج کی آیت کتنی پُر معنی تھی۔ اشارہ کیسا صاف تھا، آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہلے نہ سوجھا۔ اپنے مبلغ علم سے خوب واقف ہوں، اپنی تفسیر دانی، تفسیر نویسی کا بھرم تو اُسی ذات سے قائم تھا۔ اپنا کام ہی کیا تھا، بجز اس کے کہ اُس عالم و عارف کے افاداتِ تفسیری، صفحہ کے صفحے، ورق کے ورق نقل کر دیئے، کہیں بجنسہٖ کہیں کتر بیونت کر کے! —— غالب نے شعر کہا تو ہے ایک بالکل دوسرے ہی معنی میں:

کر رہا ہوں اُسے میں نامۂ اعمال میں نقل ۔۔۔ کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی!

لیکن حق یہ ہے کہ حسبِ حال ہے، اور اس معنی میں بھی خوب چسپاں ہو جاتا ہے۔

دُکھے ہوئے دل، کانپتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ مسودۂ تفسیر میں یہ عبارت بڑھا دی:۔

حسرتِ عبرت

تفسیر یہاں تک پہنچی تھی کہ فاضلِ اجل، محققِ وقت، مفسرِ اعظم، مجددِ ملت، حکیم الامت مولانا و مقتدانا اشرف علی تھانوی کی رحلت کی خبر موصول ہوئی۔ قلم فاتحہ خیر پڑھ لے، جب آگے بڑھے۔

۱۹۔۲۰ر جولائی ۴۳ء (۱۵ر۱۶ر رجب ۱۳۶۲ھ) کی درمیانی شب میں اپنے وطن تھانہ بھون میں، تقریباً ۸۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔ ”مرشد تھانوی“ ”عارف تھانوی“ وغیرہ کے حوالے جو بار بار آتے تھے، اُن سے مُراد یہی ذات تھی۔ آج تک جو ”مدظلہٗ“ تھا، اب کل سے وہ ”رحمۃ اللہ علیہ“ اور ”قدس سرہٗ“ لکھا جائے گا۔“

ایک خانگی مکتوب صدق۔ ۹ر اگست ۴۳ء	(۲۴ر جولائی کو خواجہ عزیز الحسن مجذوب، صاحبِ ”اشرف السوانح“ کی خدمت میں تھانہ بھون روانہ کیا گیا)

کرم گسترا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

کیا عرض کیا جائے، کن الفاظ میں عرض کیا جائے کہ سانحۂ عظمیٰ کی خبر سُن کر دل پر کیا گذر گئی اور رہی دل پر میرے ہی نہیں، میرے گھر بھر کے۔ بیوی کے، لڑکیوں کے، لڑکوں کے، سب کے!

تعزیت کروں تو کس سے کہ میں خود ہی مستحق تعزیت ہوں!

اِنّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون۔

عالمِ اسلامی میں اس سے بڑھ کر قیامت خیز حادثہ اس وقت اور کیا ہو سکتا ہے! دُنیائے اسلام میں سناٹا ہو گیا۔ وقت کا سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عارف، محمدؐ کی فوج کا سب سے بڑا کارگذار اور وفادار جنرل رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا!

ہم بدبخت ایسی نعمت کے اہل ہی کب تھے؟ حیرت اس پر نہیں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ اپنے وقت پر واپس لے لی گئی، حیرت اس پر ہے کہ اتنے دنوں ہم میں رہی کیسے؟

تو بہارِ عالم دیگری زکجا باین چمن آمدی!

مصرعہ سُنا جا رہا تھا، علی مصداق اسی ذاتِ اقدس میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بڑے گھر اور چھوٹے گھر دونوں جگہ براہِ کرم اس تباہ کار کا مخلصانہ پیام تعزیت پہنچا دیجئے۔ دونوں کی تو سلطنت ہی لُٹ گئی! گو اس سلطنتِ فانی کے مقابلہ میں سلطنتِ باقی پر حق بھی قائم ہو گیا۔

آپ تو دادر مولانا ظفر صاحب۔ مولوی شبیر علی صاحب۔ مولوی جمیل صاحب سب یقین فرمائیں کہ دل و جگر محض اُن ہی کے دُکھے ہوئے نہیں ہیں، اُمت کے بیشمار افراد اُن ہی کی طرح مرغِ بسمل ہو رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کو صبر عطا فرمائے، تا آنکہ ہم سب اپنے مالک و مولیٰ کے حضور میں اس کے اسی مقبول بندہ کے واسطہ سے پہنچ جائیں۔

پرچۂ ملفوف از راہِ عنایت چھوٹے گھر پہنچا دیجئے گا۔ والسلام۔

محتاجِ دُعا۔ عبدالماجد

سچی باتیں
صدق ۔ ۹ / نومبر ۱۹۴۳ء

"مزار اشرف" پر حاضری کی تمنا دل میں عرصہ سے تھی۔ جولائی کے مہینہ سے یہ قرض برابر چلا آرہا تھا۔ نوبت وسط نومبر میں آئی۔ ۵ ار کی دوپہر سے ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن اسٹیشن پر اترا، اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا ــــــ تھانہ بھون کی حاضری اس ۱۵ برس کے عرصہ میں خدا جانے کتنی بار ہو چکی تھی، آج کا سفر ان سارے سفروں سے کتنا مختلف تھا! ہر بار کتنا اشتیاق ہوتا تھا! کیسا قوی اور کامل یقین کہ دُکان کھلی ہوئی ہے، مطب گرم ہے، جاتے اور پہنچتے ہی مرہم شفا ہاتھوں ہو گا! ہر درد کی دوا! ہر فکر و غم سے تشفی! آج رُت بدلی ہوئی تھی۔ آج قسمت پلٹی ہوئی تھی۔ دُکان بند، مطب اُجاڑ! شفا کے بجائے حسرتِ شفا! دوا کی جگہ دوا کی یاد! مکین کے عوض صرف مکان! ــــــ خوشگوار یادوں کا محفوظ رہ جانا بھی اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے!

---

۱۵ برس کا خوب جانا پہچانا ہوا، پچاسوں بار کا چڑھا اُترا ہوا، اسٹیشن آج اجنبی سا تھا، مانوس آج نامانوس تھا۔ ہر بار حضرت کا کوئی خادم اسٹیشن پر عزت افزائی کے لئے موجود ہوتا تھا۔ اور ایک آدھ بار تو حضرت نے کرم کی حد کر دی تھی، کہ بہ نفس نفیس تشریف لے آئے تھے! آج یہ سب خواب و خیال تھا! اسٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا، پورے دو فرلانگ بھی نہیں۔ اور مزار؟ آہ، مزار! نہ کوئی بلند گنبد، نہ کوئی کلس دار قبہ، نہ چار دیواری "نہ آستانہ" نہ جنگلہ نہ کٹہرا۔ ایک اوسط درجہ کی وسعت کا باغ۔ ایک سمت میں ایک مختصر پُر فضا عمارت وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ، اور وہی اللہ کے اس شیر کی خوابگاہ! نہ شامیانہ نہ چھت، صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تُربت! سادگی کی تصویر صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ! نہ لوح نہ کتبہ، نہ پھول نہ چادر۔ چند قدم کے فاصلہ پر جلیل بلگرامی مرحوم اور دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست! ــــــ زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسلین سے نیچے رکھتے تھے۔

تصوّر کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا، تخیّل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں کوئی کہے بھی تو کس زبان میں کہے!

این حدیثے را بیان نگریست!

مدّت ہوئی ایک بار امام ربّانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مزار کی زیارت ہوئی تھی۔ بس کہنا چاہیئے کہ وہی نقشہ یہاں بھی ہو بہو موجود! وہی سوزش وہی شورش، وہی سکینت وہی ٹھنڈک! وہی ہیبت وہی جلال، وہی اُنس وہی جمال!

مرأت کمال ذوالجلالی!

جی میں آیا کہ مٹّی اُٹھا کر آنکھوں سے لگائیے۔ عقل نے کچھ اور ہی سمجھایا۔ روتی ہوئی آنکھوں اور روتے ہوئے دل کے ساتھ سلام رُخصت عرض کیا۔ اور اپنے کو خانقاہ تک پہنچایا خانقاہ! آہ، وہ رُوح بے جسد، وہ مکان بے مکین، وہ اُنگشتری بے نگین! ہر سو جل رہا تھا، لیکن سہ دری خاموش و ویران، بجھی ہوئی شمع، ایک ہُو کا عالم، سناٹے کا مقام۔ نہ دری نہ جاجم نہ تکیہ نہ مسند۔ نہ ڈسک نہ قلمدان۔ یاد ایک ایک چیز کی آتی رہی، اور دل کو حسرت و عبرت کی ختم نہ ہونے والی داستان سناتی رہی۔ یُوں آنا ہوتا تھا، یہاں بیٹھنا ہوتا تھا۔ کیا کیا سننے میں کیا کیا دیکھنے میں آتا تھا! ——— آہ، تو کیا تیرا یہ بندہ بھی فانی تھا؟ بیشک موت و فنا تو اِس نامور خادم کے نامور آقا تک کے لئے مقدر کر دی گئی تھی۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ۔ یہ ایک آیت اُمّت کی تسلّی و تعزیت کی کیسی پوری دُنیا کی دُنیا اپنے اندر آباد رکھتی ہے!

(۱۱۵)

اے تو افلاطون و جالینوس ما

انہی اس ۶۵ سال[1] کی زندگی میں اللہ والے متعدد دیکھ ڈالے، اور اللہ والیوں میں تو

---

[1] اور اب کتاب کی نظرثانی کے وقت ۱۹۶۴ء میں، ۷۲ سال کی زندگی میں،

اپنی والدہ اور ہمشیرہ ہی کو دیکھا۔ بڑے بڑے عابد، زاہد، متقی، تہجد گذار نظر سے گذرے۔
یہاں تک کہ سرسری زیارت مکہ مکرمہ وقت کے مجاہد اعظم شیخ سنوسی ثانیؒ کی بھی نصیب رہی۔
لیکن اصلاح وارشاد کی مسند نشینی کا حقدار اپنے ۱۵-۱۶ سال کے تجربہ میں، جیسا حضرت تھانوی
رحمۃ اللہ علیہ کو پایا، کسی اور کو نہ پایا!

عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں!

نہیں، کہ یہ معصوم تھے، نہیں، کہ یہ بشریت کے عنصر سے ماورا منزہ تھے۔ جہاں جہاں
اُن کے مسلک میں کچھ باتیں اس نادان وکج بین کو اپنی فہم سے بالا نظر آئیں، ان کے اظہار
سے ان صفحات میں سکوت نہیں رہا ہے۔ اس پر بھی جتنے کمالات طویل سابقہ کے بعد اس ذات میں
نظر آئے، اُس کی نظیر سے اپنا خزانۂ دماغ خالی ہے ــــ "طویل سابقہ کے بعد" کی قید کو حقیر نہ
سمجھیے گا۔ کتنے ہی بزرگ صورت، درویش نما، عالم لباس، خرقہ پوش، عمامہ بند ایسے ملے،
جن کی حقیقت چند ہفتوں، یا چند مہینوں یا زیادہ سے زیادہ چند برسوں کے سابقہ کے بعد مخفی نہ
رہ سکی۔ قرآن مجید کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے برادری اور قبیلہ والوں کو
چیلنج کہ وفقد لبثت فیکم عمراً بے معنی نہیں، بہت باوزن ہے!

حضرت کے پرتو نظر سے زندگی بن گئی۔ زندگی، بے معنی، بامقصد ہوگئی۔ ورنہ خدا معلوم
مقسوم کہاں کہاں مارا مارا بھٹکاتا پھراتا رہتا! ــــ "جورِ اُستاد بہ زمہرِ پدر" مصرعہ
لڑکپن میں پڑھا۔ یہ حقیقت حضرت ہی کی صحبت میں رہ کر کھلی، کہ اُن کا اختلاف بھی
دوسروں کے اتفاق سے بڑھ کر نفع بخش، ہدایت آموز ہوتا تھا۔ اور مجذوبؔ نے جب درِ
اشرفی سے ناکام جانے والوں کے حق میں کہا کہ

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

تو شاعری نہیں کی صرف واقعہ بیان کر دیا۔

کاش اپنی جوانی حضرت کے سایۂ تربیت میں گذاری ہوتی! کاش اپنا بچپن اِن ہی

قدموں پر لوٹ لوٹ کر بسر کر دیا ہوتا! کاش پوری ضعیفی کو اس در پر دربانی میں صرف کر دینے کا موقع مل جاتا ——— حسرتوں اور تمناؤں کی فہرست کوئی کہاں تک کھولتا جائے!

یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم!

بلا کسی استحقاق اور جہد و طلب کے یہ نعمت جاں نواز کچھ کم شامل حال رہی، کہ اتنے ہی دن کی خدمت و صحبت نصیب ہو گئی! ——— یہ اور بات ہے کہ سکندر آب حیواں تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسے کا پیاسا واپس ہوا!

حضرت کی سوانح نگاری کا حق اور لوگ ادا کریں گے، حضرت کی مجددانہ مصلحانہ، حکیمانہ تعلیم و تربیت پر بھی وہ لوگ لکھیں گے جو اس کے اہل ہیں۔ ان صفحات میں تو اس نامہ سیاہ نے صرف وہی لکھا ہے، جو کچھ اپنے تجربہ میں براہ راست آیا، یا دو چار ایسے واقعے جو شنیدہ مثل دیدہ کے تھے ——— اس ظلوم و جہول کے حق میں تو حضرتؒ ایک معظم ترین بزرگ ہی نہیں شفیق ترین مخلص، دانا ترین مشیر، محبوب ترین عزیز سب کچھ تھے ——— عارف رومیؒ کی زبان میں

اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

یا خسرو دہلوی کی بولی میں

صد ہزاراں عید قربانت کنم اے ہلال ما خم ابروئے تو!

اپنی بھی بہت گذر چکی، اب تھوڑی ہی باقی رہ گئی ہے۔ حق تعالیٰ اُسے بھی عافیت اور ایمان کی سلامتی و تحفظ کے ساتھ گذار دے۔ اور حشر میں اپنے تمام مقبول بندوں کے ساتھ سُرخرو اُٹھائے۔

آج جمعہ ۲۰ راگست ۱۹۴۵ء مطابق ۱۴ ر شوال ۱۳۶۴ھ کو بہ وقت چاشت اس رسالہ کا مسودہ اول ختم ہو رہا ہے۔ اب اُس کی صاف کرائی اور پھر کتابت اور چھپائی میں جتنی مدت بھی صرف ہو جائے۔

مسودہ کی صفائی کے بعد نظرِ ثانی کی نوبت اپریل ۱۹۵۰ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۶۹ھ میں آئی۔ آج ۲۵ راگست ۱۹۵۱ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ کو یہ اوراق پریس کو روانہ ہو رہے ہیں۔

طبع ثانی کے لئے کتاب پر نظرِ ثانی کا کام جون ۱۹۶۲ء میں تمام ہوا۔ طبع و اشاعت کا کام مولوی سید رئیس احمد جعفری ندوی خیر آبادی ثم پاکستانی کی فرمائش سے ان کے حوالہ کیا جا رہا ہے۔

ضمیمہ۔ ایک قدیم مکتوب اشرفی۔ حال میں ایک پرزہ پر لکھا ہوا، ایک ادر چھوٹا سا مکتوب پرانے کاغذات کے انبار سے نکل آیا یہ میرے ایک عریضہ کے جواب میں اسی کے حاشیہ پر ہے۔ تاریخ اس میں بجائے عیسوی کے میں نے ہجری درج کی تھی۔ ۱۴ ر شوال ۱۳۴۳ھ ڈاکخانہ دریاباد کی مہر پر ۱۶ رمئی ۱۹۲۵ء درج ملی۔

اِس خط میں دو معمولی سے سوال عرض کئے گئے تھے، جو مع جواب نقل ہو رہے ہیں۔ اور یہ خوب یاد رہے کہ اس وقت تک خط کے کاتب کا تعلق حضرت سے ارادت و عقیدت کا بالکل نہ تھا۔ تاہم مولانا کے علم و فضل کی عظمت اُس وقت بھی قلب میں تھی۔ کاغذ کا آخری حصہ پھٹا ہوا ملا اِس لئے اسکی عبارت صرف آخر سے یہاں نقل کی جا رہی ہے۔

حضرت والا السلام علیکم و رحمۃ اللہ

باعث تصریح یہ امر ہے کہ بہشتی گوہر مطبوعہ انتظامی پریس کانپور ۱۳۲۵ء کے ص ۱۳۹ پر جناب کی یہ عبارت درج ہے کہ "پورا سر منڈادینا سُنّت ہے" اس کی بابت گزارش ہے کہ رسول اللہ صلعم کا بجز موقع حج کے اور کبھی سر منڈانا احدیث یا سیر کی کس کتاب میں درج ہے؟

[جواب۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سر منڈائے تو سُنّت یہ ہے کہ پورا سر منڈائے، بعض کا منڈانا، بعض کا نہ منڈانا خلافِ سُنّت ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ پورا سر منڈانا بمقابلہ سر منڈانے کے سُنّت ہے]

دُوسری بات یہ ہے کہ اِسی رسالۂ مذکور کے ص ۹۸ پر آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ خطبۂ جُمعہ کا عربی ہی میں ہونا ضرور ہے اور کسی دُوسری زبان میں خطبہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے لیکن مولانا محمد علی شاہ مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کے القول المحکم فی خطابۃ العجم [میں اس کے برعکس آپ کی تائید فارسی خطبہ کے جواز میں درج ہے]

[جواب۔ اِس مضمون کی عبارت لکھئے تو دیکھوں اس کے معارض ہے یا کیا۔ باقی بہشتی گوہر میں جو لکھا ہے اس کو صحیح سمجھتا ہوں]

حکیم الامتؒ

"نقوش و تاثرات"

حکیم الامت علامہ اشرف علیؒ تھانوی کے آخری ۵ سالہ زندگی
کا ایک زرّیں مرقّع، فقہ، تفسیر، حدیث، سلوک، کلام، ادب و حکمت کے صدہا مضامین

بعد نظر ثانی ترمیم و اضافہ

عبدالماجد دریابادی

ایم۔ شمس الدین تاجران کتب ۰ مسلم مسجد لاہور